ارمغانِ
عالی
جمیل الدّین عالیؔ
فن اور شخصیت
(چند پہلو)

ارمغانِ عالی

ارمغانِ عالی

پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی
کراچی ۔ لاہور

ارمغانِ عالی

(پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کراچی کی پیشکش)

مجلسِ ادارت

طبع اول ———— اگست ۱۹۹۸ء
تعداد ———— ایک ہزار
معاونِ ادارت ———— اشرف طارق
کور ڈیزائن ———— گوہر مقصود

طابع و تقسیم کار

لاہور
کوآپرا بک شاپ اینڈ آرٹ گیلری
۷۰۔شاہراہ قائد اعظم لاہور۔۳
فون۔۷۳۲۲۶۱

کراچی " " "
ھ۔بی ساؤتھ سی ویو ایونیو
فیز ۲ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
فون۔۵۸۹۳۵۱۷
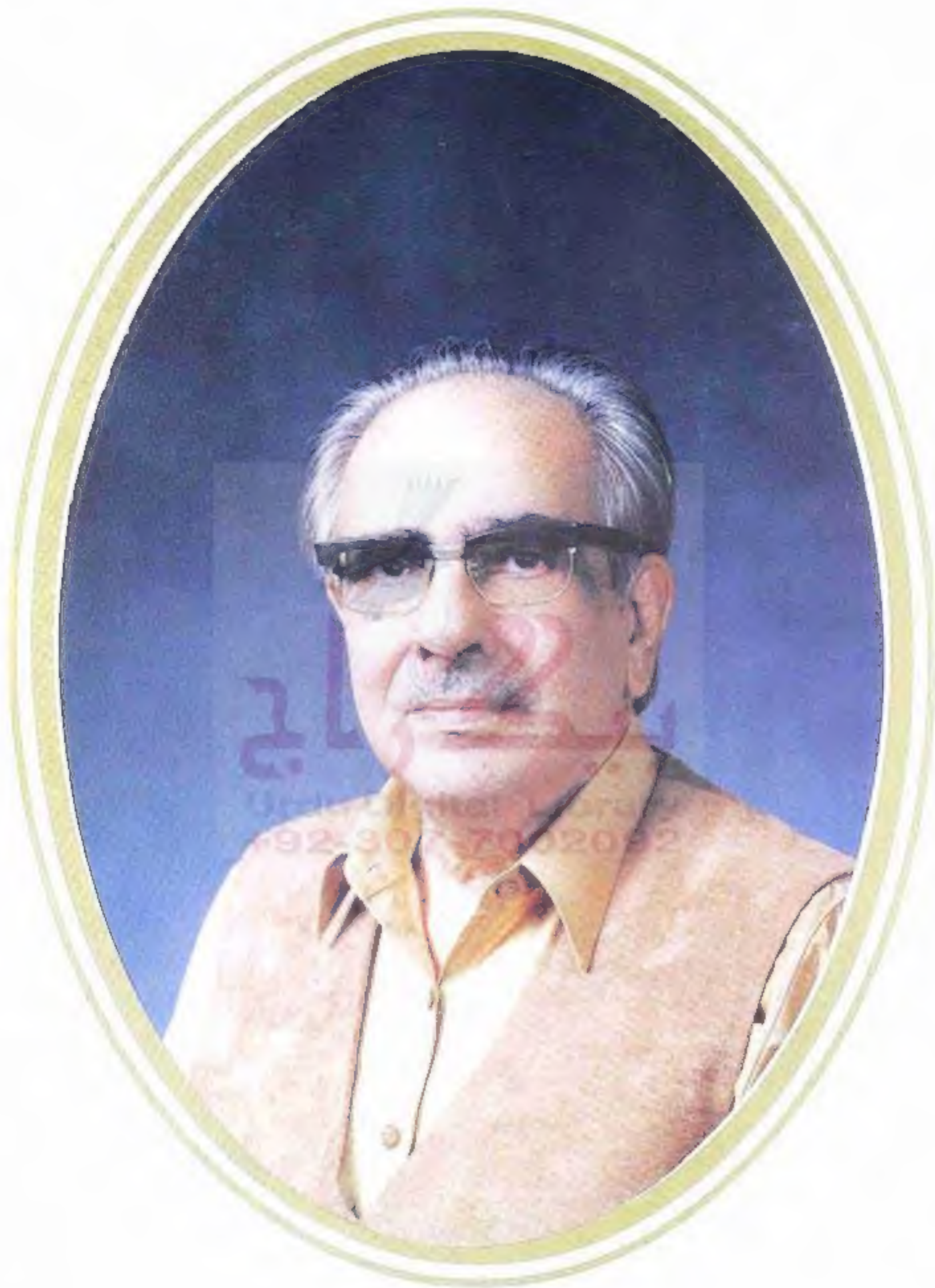
کسے خبر کہ یہ سرگرم رہروانِ حیات
رواں دواں ہیں تو کیا کیا فریب کھائے ہوئے

(غزلیں، دوہے، گیت)

جیون آنچ نے کیا بخشا اک سچے سر کی پیاس
وہ سچا سر لگا نہیں اور عالی گئے اداس

("لاحاصل")

چل، اتنی زیادہ کائناتیں
کیا ان میں بس اک کرے کی باتیں

("اے مرے دشتِ سخن")

اگلے صفحات پر

فہرست

ادبی تنقید

صفحہ نمبر

عکس تحریر' چند خطوط مشاہیر' پیغامات و دستاویزات

شخصیت

نمونہ نثر و نظم

گذارشات

اپنے محبوب کے سراپا کو نگاہ شوق کا نذرانہ دیتے ہوئے شاعر نے یہ فریاد کی تھی۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کچھ اسی قسم کی دشواری ایک ہمہ جہت شخصیت کے کارناموں کا احاطہ کرنے میں بھی پیش آتی ہے۔ علی صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں اور ان میں سے ہر ایک دامنِ دل کو اس طرح کھینچتا ہے کہ ان کے تمام محاسن ذاتی کا ایک رخ میں سمیٹنا سخت مشکل نظر آتا ہے۔ غزلیں، دوہے، گیت اور قومی نغمے سب ان کی فکر کی آماجگاہ ہیں۔ طویل نغمے، اظہاریہ، نثر اور سفرنگاری میں ایک منفرد انداز کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ خواندگی، تعلیم اور سائنس کو پھیلانے کی مہم میں وہ پیش پیش رہے ہیں، قومی زبان میں تعلیمی اداروں کے قیام اور استحکام سے انہیں دیرینہ وابستگی ہے، اردو زبان اور قومی یک جہتی کا فروغ ان کا مشن ہے، ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے ان کی سرگرمیاں ہماری ثقافتی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، مستقبلیات کو قومی سطح پر باقاعدہ ایک مضمون کی حیثیت سے متعارف کرانا ان کا کارنامہ ہے، اور معاشرے کو درپیش مختلف النوع مسائل کا بیباک تجزیہ کر کے قوم کو ان خطروں سے آگاہ کرنا جن سے وہ دوچار ہو سکتی ہے ایک ایسا فکری فریضہ ہے جو انہوں نے خود اپنے اوپر عائد کر لیا ہے۔ مدت العمر کی ان تمام مساعی کا احاطہ ایک ادبی ارمغان میں کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسے ایک حوالہ جاتی تحقیقی مطالعے کا نقطہ آغاز سمجھئے۔ بابائے اردو کے بعد اردو کالجوں کے تحفظ اور توسیع کے سلسلے میں ان کی مساعی کی ایک الگ داستان ہے۔

اس ارمغان میں جو مضامین ہیں ان میں بیشتر ان کی ادبی کاوشوں کا کسی حد تک جائزہ لیا جا سکا ہے اور وہ بھی خاطر خواہ شرح و بسط کے ساتھ نہیں امید ہے کہ یہ کام اسی سلسلے کی اگلی اشاعتوں میں پورا ہو سکے گا۔ اس ارمغان میں مشاہیر عالم سے ان کے روابط کی ایک جھلک بھی ہے۔ وہ مشاہیر جنہوں نے ادب کے علاوہ سائنس، سیاسیات، معاشیات، امنِ عالم اور دیگر علوم میں عالمگیر شہرت حاصل کی اور چند نے تو نوبل انعام یافتگان کے زمرے میں بلند مقام بھی پایا۔ اسی ارمغان میں روزنامہ "[illegible]" کی تقریب سپاس کی روداد کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ قومی سطح پر ممتاز ترین شخصیتوں نے علی صاحب کے علمی، ادبی اور ثقافتی کارناموں کا اعتراف کس کھلے انداز سے کیا ہے۔ اس تقریب میں بیانات اور خطبات کے ذریعے سربراہان حکومت، سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور سربرآوردہ فلاحی کارکنوں نے جس بھرپور انداز میں حصہ لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مدت سے ترقی یافتہ معاشروں کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ اپنی زندہ و تابندہ شخصیات کی کاوشوں، تصنیفوں اور کارناموں پر مشتمل ارمغان ان کی خدمت میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اس روایت کے نمونے ہمارے ہاں بھی ملنے لگے ہیں۔ آٹھویں دہائی سے تو امارات کے ادب دوست حلقوں نے اپنے پسندیدہ شعرا کے جشن منا کے خاصے ضخیم گلدستے پیش کرنے کی رسم کی بنا ڈالی، خود علی صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیرِ اہتمام بزرگ ادیبوں کو نشانِ سپاس پیش کرنے کا آغاز کیا اس سلسلے میں متواتر بڑے موقر اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اور اب انجمن نشان یافتگان پر ایک مجموعہ مرتب کر رہی ہے جس میں ان پر پڑھے جانے والے مضامین کے علاوہ ان کے کوائف بھی شامل ہوں گے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ عالی صاحب کی پذیرائی پاکستان ہی میں نہیں بیرون پاکستان بھی بہت ہوئی ہے ان کے ملی نغموں اور دوہوں کی گونج تو ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے اور وہ ان اصناف میں رجحان ساز قرار دیے گئے ہیں' امارات' امریکہ اور کینیڈا میں ان کے جشن منائے جا چکے ہیں اور انہیں اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔

کئی ادبی جرائد عالی صاحب پر گوشے مرتب کر چکے ہیں۔ وہ ان معاصر اہل قلم سے ہیں جن پر مسلسل مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی متعدد نامور ادیبوں کے مضامین زیر تحریر ہیں۔ بھارت میں ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ دو برس ہوئے جامعہ کراچی نے ان پر پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے کا رجسٹریشن منظور کیا تھا جس پر کام شروع ہو گیا ہے۔ اس سال جامعہ کراچی کے سنڈیکیٹ نے انہیں ڈی' لٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

عالی صاحب ان شخصیتوں میں سے نہیں ہیں جنہیں کسی سہارے یا اتفاق سے راتوں رات عالمی شہرت مل جاتی ہے۔ انہوں نے نہایت ثابت قدمی سے رفتہ رفتہ صرف اپنی محنت' لگن اور صلاحیت اور اللہ کی مہربانی سے وہ تمام منزلیں طے کیں ہیں جن کے بغیر کسی بھی شعبے میں کوئی ارفع مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا ("کوائف" ملاحظہ ہوں)۔ اس سفر میں انہیں طرح طرح کے مراحل کا سامنا کرنا پڑا بہت سے نشیب و فراز سر کئے' مثلاً کبھی ایک صدر مملکت کی جانب سے تہدید کا نشانہ بنے اور کبھی اسی منصب پر فائز دوسری شخصیت کی تحریر میں علامہ اقبال کی اس بشارت سے مشرف ہوئے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ نا خوردہ در رگ تاک است

(یہ گمان نہ کر کہ پیر مغاں کا کام ختم ہو گیا ہے' انگور کی بیل میں نہ جانے کتنی شرابیں ابھی کشید کی منتظر ہیں)

یہ شاید اس شعر کا اعجاز ہے کہ عالی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک دورہ قلب کے باوجود صرف آرام کرنے کی بجائے حسب سابق انجمن کی خدمت کے علاوہ اور بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے' گویا غالب کے الفاظ میں انہوں یہ ثابت کر دیا۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں

اور اپنے نامکمل نظمیئے "انسان" اور دیگر یادداشتوں اور تخلیقات کو مکمل کرنے بیٹھ گئے۔ پھر بغیر اپنی کسی کوشش کے سینٹ آف پاکستان کی عمومی نشست پر منتخب ہوئے (۱۹۹۷) اور وہاں جا کر سینٹ کی مجلس قائمہ برائے تعلیم' سائنس' اور ٹیکنالوجی کے صدر نشین کے انتخاب میں بھی کامیاب ہوئے۔ ساتھ ہی تین دیگر مجالس قائمہ کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے خواندگی اور سائنس کے معاملے میں کئی شعبوں کو بہت قلیل مدت میں خاصہ متحرک کر دیا ہے لیکن سینٹ میں ان کی تحریکوں' قراردادوں اور اقدامات کی کہانی تو ایک مدت معینہ کے بعد ہی لکھی جا سکتی ہے۔

اس ارمغان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختلف مکاتب فکر کے ادیبوں کی نگارشات پر مشتمل ہے۔ یہ ان کے طرفداروں ہی کا نہیں ان سخن فہموں اور دیدہ وروں کی تحریروں کا ملک میں پہلا مجموعہ ہے جنہوں نے ان کی شاعری' ان کی نثر' ادیبوں کے لئے ان کی خدمات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کے ان کی بہت سی کاوشوں' کارناموں' خامیوں اور ناکامیوں کا بے لاگ جائزہ لیا ہے۔ اب ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے۔

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

ناشرین

ڈاکٹر سید عبداللہ

دل والے کی بھاشا

1955ء میں مجھے جستجو ہوئی کہ اردو شاعری کی سالانہ رفتار یا اس کے تغیرات پر کچھ لکھا جائے۔ کتابیں بھی دیکھیں اور موقرادبی رسالے بھی پڑھے۔ اس ضمن میں عالی کا کلام بھی نظر سے گزارا۔ "ماہ نو" کے پرچوں میں جو کچھ ملا اس سے استفادہ کیا اس ادبی سیر و سفر میں عالی کا وہ دوہا بھی نظر سے گزرا جو اب 1958ء کے دیوان میں دوہوں کے آغاز میں ہے۔

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی پیاس بجھائے
من کی پیاس بجھی نہ کسی سے، اسے یہ کون بتائے

دوہا بہت اچھا لگا۔غالباً اس وقت شاعر کی شخصیت کا رسیلا یا رنگ بھرا روپ بھی اثر انداز ہوا ہو گا لیکن اب جب کہ میں خود کو اس شخص سے خاصا الگ کر کے شاعر سے زیادہ شاعری پر نظر ڈال رہا ہوں تو پختہ طور سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہی دوہا حسن اتفاق سے عالی کی شاعری میں جذباتی کلید کا حکم رکھتا ہے جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا۔

دم تحریر کہ عالی کے کلام پر لکھنے بیٹھا ہوں، ایک اور مصیبت سامنے آکھڑی ہوئی، وہ یہ کہ "غزلیں، دوہے، گیت" پر محمد حسن عسکری نے جو دیباچہ یا مقدمہ لکھا ہے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "انھوں نے (عالی نے) غزل، دوہے، گیت، نظم، معرّی سبھی کچھ لکھا...... (لیکن) انھوں نے اپنی "مرزائی شان" ہر جگہ برقرار رکھی...." اور مرزائی شان سے ان کی مراد شاید عالی کا یہ شعور ہے کہ وہ مرزا غالب کے رشتے دار ہیں، اور مرزا غالب بھی وہ جنہیں دودمان چنگیز سے ہونے پر فخر تھا۔ یعنی وہی مرزا غالب جو گدائی میں بھی (دل لگی سے ہی سہی) کج کلاہی کی شان رکھتے تھے۔ چنانچہ بھری محفل میں باآواز بلند کہہ دیا تھا کہ۔

آوازۂ انا اسد اللہ می زنم

تو اس ساری بحث سے مجھے نکتے صرف دو حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ عالی جو کچھ بھی لکھیں اس میں وہ بقول عسکری اپنی مرزائی شان برقرار رکھتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ عالی کا جی اگر لگتا ہے (اور ان کے من کی پیاس اگر بجھتی ہے) تو دوہے کی شاعری میں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں ایک طرف ایک عالی دودمان شہزادے سے واسطہ پڑے گا اور دوسری طرف ایک قلندر سیلانی سے، جس نے کبیر بھگت کے نرگن واد اور داؤد، جائسی اور قطبی کے پریم مارگ کی روایت کو

پھر سے زندہ کرنا چاہا۔ بس یہی وہ اجتماع ضدین ہے جسے عالی کی انفرادیت کہا جاسکتا ہے۔

قدیم زمانے کی طرح ہمارے زمانے میں بھی غزل کی شاعری بہت ہوئی ہے مگر عالی کی غزل اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ یوں کہ اس کے ہر شعر میں دو مختلف احساسات زندہ رہتے ہیں۔ ایک یہ کہ غزل کا وقار کہیں مجروح نہ ہونے پائے جو غالب سے ذہناً و نسباً" منسوب ایک غزل گو کے لیے لوازم میں سے ہے۔ غزل کو میر تقی میر کی غزل نہ بنایا جائے جس میں مسکینی اور عاجزی (بے کسی اور تنہائی) کا درد برنگ صوت جرس ابھرا ہوا نہ ہو۔ شوکت الفاظ اور تراکیب کا طنطنہ ہر حال میں قائم رہے' عالی کے شعور ولا شعور پر غالب اسطرح چھایا ہوا ہے کہ نادانستہ غزل کی وہ زمینیں بھی اس کے لیے "دعوت مژگاں" بن جاتی ہیں اور وہ اس وادی میں بے ساختہ گامزن ہو جاتا ہے۔ جس میں اس کے بزرگوار لوہا منوا چکے ہیں ممکن ہے کہ بزرگوار کا یہ برخوردار بھی رستم وسہراب کے مانند دیر تک اپنی شمشیر آبدار کا لوہا منوا کر برابر کی چوٹ کھاتا مگر اس کے ساتھ ہی اسے نرگن وادیوں کی موسیقی اور پریم مارگ والوں کا سوز مشتاق دکھانا بھی مقصود تھا اسلیے برخوردار 'برخوردار ہی رہا اور بزرگوار 'بزرگوار۔ بیان کی شوکت تسلیم مگر غالب کی سی پرواز کہاں سے آتی ۔بزرگوار فرماگئے ہیں۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

اور پھر ایک ظلم اس روح عصر نے بھی کیا جس میں عالی سانس لے رہا ہے اور اچھا نہ تھا وہ دن جس دن یہ ترکیب وضع ہو کر' ہمارے شعری علم الکلام میں داخل ہو کر' بڑے اچھے اچھے شاعروں کو مجروح کر گئی۔

میں روح عصر کے خلاف کچھ لکھنا اچھا نہیں لگتا کیونکہ عصر تو اس تازہ ہوا کا نام ہے جس سے ہمارے حواس ہر وقت متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جس "روح عصر" کے خلاف لکھ رہا ہوں اس سے وہ ساختہ پرداختہ خیالات واسالیب مراد ہیں جنہیں ہمارے بعض شعراء خود کو جدید ثابت کرنے یا کرانے کے لیے تکلف اور ساختگی سے اپنے اوپر وارد کرلیتے ہیں۔ یہ روح عصر نہیں' روح عصر کے ساتھ کھیل ہے۔ عالی بھی اس سے پورا بچ نہیں سکا لیکن کچھ تھوڑا سا بچ اس لیے گیا کہ بزرگوار کی آبرو مد نظر رہی۔ اس کے علاوہ بھگتوں کی زبان میں بات کرنے کی وجہ سے وہ اس بے باکی سے بچ گیا جو روح عصر والوں کے نزدیک ایک طرۂ امتیاز ہے۔ اس طرح عالی کی غزل اس شان کو برقرار رکھ سکی جو دلی والوں کے لیے باعث فخر وافتخار ہے۔ہاں' جہاں وہ خود کو معتقد خواجہ میر درد کہتا ہے' وہاں ہم اس سے اختلاف کریں گے کیونکہ عالی کی غزل میں ایک گونہ اضطراب واضطرار ہے جو آل گورگان کا خاصہ ہے ۔عالی کی غزل میں محبت کا عنصر اپنے عہد کی محبت کے انداز رکھتا ہے جس میں بلبل کے لیے ہر گل کا طواف' اور پروانے کے لیے ہر شمع پر جاں سوزی وجاں سپاری کا دعویٰ لازم ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالی نے یہ ادا بھی پریم مارگ والوں سے سیکھی ہے جن کے یہاں محبت ہی سب کچھ ہے خواہ وہ پتھر کی بنی ہوئی دیوی ہی سے کیوں نہ ہو۔

عالی 1957ء کے بعد "لاحاصل" میں الجھ گیا۔ "پاکستان کتھا" لکھی۔ "الجیریا بائی" میں طبع آزمائی کی ۔پورب پچھم کی باتیں (کہانیاں) سنائیں۔یہ اس" لاحاصل" کا ماحصل* ہے۔ پھر معلوم نہیں اسے "لاحاصل" کہنے پر اصرار کیوں کیا گیا' یہ

تو حاصل کلام ہے جس میں سیلانی شاعر گھوما پھرا' دیس دیس کے نظارے جمع کیے اور ہمیں دیے۔

یہاں عالی کبیر بھگت کے راستے سے بالکل ہٹ کر نظیر اکبر آبادی کی بولی بولنے لگا۔ زبان تو کبیر اور کرشن بھگتوں والی نہیں لیکن اس شہزادے کی بھی نہیں جو1955ء میں تھی۔ ایک مسافرانہ موڈ ہے' سیر اور سفر میں جو تاثر سامنے آیا' اسے قلم بند کیا۔ کہیں کہیں کبت کی شکلیں پیدا ہوئیں اور جہاں گیت کا ارادہ ہوا وہاں گائیگی اور رقص کے چھند بھی سامنے آئے۔

لیکن موڈ ہر جگہ مسافرت اور ہجرت کا ہے' کچھ بنجارے کی طرح' کچھ تماشا دکھانے والے کا۔ یہاں تماشا گاہ عالم کے بارے میں بے اعتمادی بہت بڑھ گئی ہر کوئی ایکٹر نظر آتا ہے جسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے جامے سے باہر ہے' بڑا چل چلاؤ ہے بڑی حرکت بڑا اضطراب ہے۔ کتنا ظلم کیا اس شخص نے جس نے اتنی بچی تصویر کو "لاحاصل" کہہ کر ہمیں حد سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی بدظن ہوگا۔ نقصان اٹھائے گا اور جو اس جھانسے میں نہ آئے گا وہ فائدے میں رہے گا۔

اب قصہ کچھ دوہے کا چلے۔ بظاہر دوہا لکھنا آسان کام ہے لیکن واقعتاً ایسا نہیں۔ عام شاعری میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ عام شاعری سے الگ (یوں سمجھیے) کیاریاں خود بنانی پڑتی ہیں۔ اس میں کل بیگانہ سے کام نہیں چلتا۔ اپنی ہی کیاری' اپنی ہی آبیاری' اپنی ہی سیرابی وشادابی اور اپنے ہی کاشتہ پھول' اپنی زمین میں اگا کر جمع کیے جاتے ہیں۔ یہاں شاعری سجاوٹ کے لیے نہیں کی جاتی۔ یہاں درد کے چراغ اور چراغوں کے روشن داغ دکھائے جاتے ہیں۔ یہاں بہتے ہوئے کہسار کے مانند' اپنے لیے اپنی گزرگاہ خود تلاش کر کے' کبھی ہموار' کبھی آبشار بن کر اپنے راستوں پر چلتی رہتی ہے' رواں دواں رہتی ہے۔ تمناؤں کا رنگ کچھ بھی ہو ان میں حسن اور نور ونغمہ پیدا ہوتا رہتا ہے' یہ ساری کائنات اپنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ہر شے سے اپنایت کا ترشح ہوتا ہے۔ اپنی زمین اپنا سامان' اپنے پھل پھول' اپنی بہار' اپنا حسن' اپنا دکھ' اپنے کنول...... غرض کہ سب کچھ اپنا ہوتا ہے۔

تلسی داس ہو یا سور داس' کبیر ہو یا نانک...... سچ سچ باتیں سادہ سے سادہ انداز میں کہتے ہیں......زندگی سے بہت کچھ سیکھتے ہوئے اور زندگی کو بہت کچھ سکھاتے ہوئے گیان کی ندی بہتی چلی جاتی ہے۔ کہیں نرگن ہے' کہیں اشتیاق اور سوز جدائی' کہیں رنگ ہے کہیں راگ سیلانیوں کی نوا اور سنیاسی کی بے نوائی! لیکن دوہا دکھ کی کیاریوں میں خوب پھلتا پھولتا ہے' وہی دکھ جس کی حقیقت کو سچ کر دکھانے کے لیے سقراط نے زہر کا پیالہ پیا تھا...... وہی دکھ جو کائنات کی بڑی سے بڑی شے سے لے کر چھوٹی شے تک میں الم کے تضادات کی صورت میں "بشنو از نے" کہتا سنائی دیتا ہے۔

عالی شہزادوں کے گھر میں پیدا ہوا پھر قدرت نے اسے سنیاسی تو نہ بنایا مگر سیلانی بننے کا پورا موقع دیا۔ سفارت ومسافرت اس کی تقدیر میں تھی۔ سیاسی احوال وواقعات نے جدائی کے درد سے کھل کر آشنا کیا۔ وہ نگر نگر پھرا کہ درد اشتیاق کی تسکین ہو لیکن درد بڑھتا گیا۔ گیانی دھیانی بن کر حیدر آباد بمبئی پونہ لاہور ہر جگہ گھوم گھما کر سچ کو جاننا چاہا' لیکن شہزادگی برطرف "بابوجی" ہی کہلایا۔ اس پر بھی جی نہ بھرا تو "دنیا مرے آگے" لکھ ڈالی۔ لیکن دنیا اسے بھگتی والا ہی سمجھی اور وہی سمجھی جو اصل میں ہے

کوئی کہے مجھے نانک چشتی کوئی کبیر کا داس
یہ بھی ہے میرا مان بڑھانا ہے کیا ہے میرے پاس

عالی کے دوہے تقلیدی نہیں، اپنی فضا کی پیداوار ہیں۔ان میں ایک افسردہ سی شہزادگی کی بوباس بھی ہے اور قلندر، جوگیوں، فقیروں کی ترنگ بھی..... مگر کرشن بھگتوں کے مانند پریم دھرم اس کا اصلی روپ ہے۔کچھ اس طرح لگتا ہے 'ایک تتلی ہے جو ہر پھول پر بیٹھنا چاہتی ہے' مگر پھول پتی سے ہونٹ لگاتے ہی یہ اڑی' وہ گئی...... اور پھر دوسرا پھول سامنے آیا' وہی ماجرا' وہی سرگزشت...... بس رس کی پیاس ہے جو بجھتی نہیں!

عالی کے دوہوں میں سنسار کے اخلاقی تجزیے تو ہیں لیکن الم کی چبھن پہلے سے کم ہے۔ اس کے علاوہ 'جوگیوں اور سنیاسیوں کی سی بھگتی بھی نہیں' معرفت کے نغمے نذارد' اور ساری تگ ودو کے بعد اگر کچھ ہے تو یہ کہ۔

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان
چڑھی ندی اور اتر گئی پر گھر ہو گئے ویران

یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ عالی ایک کتاب "انسان" کے نام سے لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔معلوم نہیں اس کا کیا ہوا لیکن جو کچھ لکھ گئے ہیں کیا وہ کم ہے۔ اہل درد کے لیے تو اس کا ایک دوہا بھی کافی ہے اور کلام عالی میں تو بہت سے ایسے دوہے اور اشعار ہیں جن پر اردو کا کوئی تالستائی یا دوستو۔ یفسکی اگر کوئی کہانی مرتب کرنا چاہے تو اس کی گنجائش بہر طور موجود ہے کیونکہ اس کی غزل' دوہا' گیت' جو کچھ اس نے لکھا ہے دل کی بھاشا میں لکھا ہے۔

* پہلا ایڈیشن "لاحاصل" 1974ء میں شائع ہوا تھا۔

(از ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی نومبر ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر مالک رام

حالی : روشن مستقبل کا شاعر

جمیل الدین عالی خاندان لوہارو کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کہیں گے : یہ خاندان لوہارو کیا چیز ہے؟ بے شک، یہ انتساب مسلّمہ روایت سے کچھ مختلف ہے لیکن جب..... لیکن آگے بڑھنے سے پہلے کچھ لوہارو سے متعلق سنیئے۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا، تو یہاں ہندوستان میں چھوٹی بڑی ۵۰۴ دیسی ریاستیں تھیں۔ ان میں سے بعض ریاستیں رقبے اور آبادی کے لحاظ سے یورپ کے متعدد بڑے ملکوں سے بھی بڑی تھیں اور بعض کا رقبہ اور آمدنی ملک کے کئی ضلعوں کے برابر، بلکہ دو ایک کا کم بھی تھا۔

ان ریاستوں میں ایک مختصر ریاست لوہارو تھی۔ یہ اب ملک کی ریاست ہریانہ کا ایک ضلع ہے۔ یہاں اس کی سیاسی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں۔ اس ریاست کی بنیاد ۱۸۰۲ء میں پڑی اور فخرالدولہ نواب احمد بخش خان اس کے پہلے حکمران مقرر ہوئے۔ نواب احمد بخش خان ہی کے چھوٹے بھائی اردو کے مشہور شاعر مرزا الٰہی بخش خان معروف تھے۔ اس خاندان کا "آبائی پیشہ سو پشت سے سپہ گری چلا آرہا تھا، لیکن الٰہی بخش خان معروف کی بدولت اس میں ادب اور شعر و سخن کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔

لیکن محض معروف کی شعر گوئی ریاست کو "خاندان لوہارو" سے موسوم کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ قدرت نے یہ کمی یوں پوری کردی کہ غالب کی شادی انھیں الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ شادی کے بعد غالب آگرے سے نقل مکان کر کے مستقلاً دلّی چلے آئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام یہاں دلّی میں اسی علاقے میں بسر کئے، جہاں لوہارو والوں کے مکانات تھے۔ یوں لوہارو والے ان کے خاندان کا حصہ بن گئے اور وہ خود اس خاندان کے فرد تسلیم کر لئے گئے۔

غالب کے اس تعلق ہی سے ریاست لوہارو کے حکمران خاندان کے افراد "خاندان لوہارو" کہلانے کے حقدار

ہوئے۔ آج آزادی کے زمانے کی ۶۰۵ ریاستوں میں سے کتنی بڑی بڑی ریاستوں کے نام بھی کسی کو یاد نہیں ہیں' لیکن چونکہ ہم غالب کا نام نہیں بھول سکتے اس لئے لوہارو کا نام بھی ان کے ساتھ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

اگرچہ معروف اس خاندان کے پہلے شاعر تھے' لیکن غالب کی آمد نے ان کے ہاں ادبی اور شاعری کی روایت کی بنیاد ڈال دی۔ نواب احمد بخش خان کے بیٹوں میں سے نواب امین الدین احمد خان لوہارو کی گدی پر بیٹھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خان متعدد دوسرے علوم میں مہارت رکھنے کے علاوہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی میں نیر تخلص تھا اور اردو میں رخشاں۔ وہ اپنے کلام پر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے..... سعید الدین احمد خان طالب اور شہاب الدین احمد خان ثاقب۔ سراج الدین احمد خان سائل دہلوی (تلمیذ داغ) انہیں میرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب کے بیٹے تھے۔ طالب اور ثاقب دونوں غالب کے شاگرد تھے۔

نواب امین الدین احمد خان کے بعد ان کے بڑے بیٹے علاء الدین احمد خان لوہارو کے حکمران ہوئے۔ یہ بھی شاعر تھے' علائی تخلص تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے اور ان میں غالب ہی سے مشورہ تھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سر امیر الدین احمد خان والی ریاست ہوئے۔ فرخ میرزا ان کا عرف تھا۔ ان کے نام بھی غالب کا ایک خط اردوئے معلی میں موجود ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا کے جس خط کا یہ جواب ہے' اس میں انہوں نے غالب کو دادا جان کہہ کر خطاب کیا تھا۔ اس پر مرزا غالب لکھتے ہیں:

میاں' دادا تو تمہارے نواب
امین الدین احمد خان ہیں : میں تو
تمہارا دلدادہ ہوں۔

تو خیر' ہمارے جمیل الدین عالی انہی نواب سر امیر الدین احمد خان مرحوم والی لوہارو کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے اپنے عالی مقام جد امجد نواب علاء الدین احمد خان کے تخلص علائی کی رعایت سے عالی تخلص اختیار کیا۔ گویا وہ نسلی لحاظ ہی سے نہیں' ادبی حیثیت سے بھی خاندان لوہارو کے صحیح وارث اور چشم و چراغ ہیں۔

(۲)

عالی غزل اور گیت اور دوہے کے شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے ان اصناف میں اتنا کچھ کہا ہے جو شاید کمیت کے لحاظ سے معتدبہ نہ کہا جا سکے' لیکن کیفیت کے پہلو سے کئی بسیار گو شعراء کے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہے۔

میں نے ان کا جتنا کلام دیکھا ہے' اس میں شاعر سے زیادہ ان کے انسان دوست ہونے کی جو تصویر ابھر کر میرے سامنے آئی' اس نے مجھے بہت متاثر کیا چونکہ یہ خصوصیت اب بہت نادر ہوتی جا رہی ہے' میں اپنے اسی تاثر میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔

(۳)

آج مشرق اور مغرب میں' بحر اور بر میں' زمین اور آسمان میں..... ہر جگہ فتنہ و فساد اور انتشار کا جو دور دورہ ہے' وہ

کسی سے مخفی نہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے انسان کے اپنے اعمال کا (بما کسبت ایدی الناس) ان حالات کا ذکر عالی شاعری کی زبان میں یوں کرتے ہیں :

کوئی شکار اور کوئی شکاری
انسانوں کی ناہمواری
بھوک' غریبی اور بیماری
سوچنے والوں کی لاچاری
دکھ ہی دکھ کی چتا ساری
نیک دلوں کی اہل تعصب شیطانوں میں دل آزاری

جہاں غریب کو کوئی نہ پوچھے' اسے اس کی محنت مزدوری کا ٹھیک معاوضہ نہ ملے' اور ملے تو دیانت داری سے بر وقت نہ ملے' اس سماج کا اور کیا حشر ہوگا! اس افسوسناک صورتحال کا نقشہ عالی کے الفاظ میں دیکھیے :

جس کی گاڑھی کمری کمائی مفت میں تم نے کھائی
آج سے پہلے' عالی جی! تمہیں اس کی یاد نہ آئی
جیتے جیتے لہو کے دریا جس نے روز بہائے
عالی جی! کبھی تم نے اس پر دو آنسو نہ گرائے
لوہے جیسے تن اور من سب جلتے جائیں راکھ
اور تم پتھر بن کر چاہو پارس جیسی ساکھ
چھایا مانگے اور پھل مانگے پنچھی سا مزدور
عالی! تیری کویتا ایسی' جیسے پیڑ کھجور
جس کی رنگت ہلدی جیسی' جس کی جان عذاب
اس کو بھول کے تو نے' عالی! سونگھے سرخ گلاب

یہ سب ریاکاری کا کرشمہ ہے۔ جن اصحاب کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہے' اور جو لوگوں کی مشکلات دور کرسکتے ہیں' وہ شروع میں دعوے تو بہت بڑھ بڑھ کر کرتے ہیں' اور وعدوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ لیکن دراصل ان کا نصب العین خدمت ملک و ملت نہیں' لوگوں کی ضرورت پورا کرنا نہیں' بلکہ خدمت نفس اور لوگوں پر اختیار حاصل کرنا ہوتا ہے اور جونہی ان کا یہ مقصد پورا ہوجاتا ہے' وہ اپنے تمام وعدے بھول جاتے ہیں۔ اب وہ حاکم ہیں' اور ساری دنیا ان کی محکوم' اور ان کی توجہ کا مرکز وہی لوگ بن جاتے ہیں' جن سے ان کے مفاد وابستہ ہوں' جن سے انہیں مستقبل میں اپنی طاقت برقرار رکھنے میں مدد ملنے کی توقع ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں کسی غریب کا' کمزور کا' نادار و مفلس کا کیا' مصرف! وہ نہ مدد دے سکتا ہے' نہ وقت پڑنے پر کسی کام کی گوں ہی ہے۔ صاحب اقتدار اتنا احمق

نہیں ہو سکا کہ وہ اپنا نفع نقصان نہ پہچانے' اور کسی کی خاطر' خواہ وہ کتنا ہی مستحق کیوں نہ ہو' اپنا مستقبل قربان کر دے۔
عالی نے اپنے دوہوں میں موجودہ سماج کی حالت بیان کی ہے' جو ان منافق لوگوں کے طفیل پیدا ہو گئی ہے :

دور ہی دور سے آس کی کرنیں چمک دمک دکھلائیں
جن کے گھروں میں گھور اندھیرے' ان کے پاس نہ آئیں
آج بھی اپنے کرتا دھرتا' سیٹھ انہیں کی بات
کل تک جن کا دھرم تھا سونا' روپا جن کی ذات
آج بھی کتنی کومل کلیاں' کانٹوں کی خوراک
آج بھی کوئی نہیں پہچانے' کیا کندن کیا خاک
بس اکلیں ہیں جن کی زبانیں' مر گئے جن کے نام
آج بھی جب بن برکھا برسے' آئے انہیں کے کام
آج بھی ہاری کھیت کو ترسے' کاریگر بیکار
آج بھی بچے ان پڑھ گھر میں' اور مائیں بیزار
آج بھی روئے کومل بانی' کوے ماریں تان
آج بھی ویر کھلے بیٹھے' اور بھانڈ چلائیں بان
آج بھی پربھا کالک پیسے' اوشا نیر بہائے
آج بھی چھایا کتھک ناچے' مایا گیان سکھائے
سو رنگوں کے سو بادل' لیں چار طرف سے گھیر
سورج تڑپ تڑپ رہ جائے' دور نہ ہو اندھیر
عالی! تو جو چاہے' کہے : ظاہر ہے ترا انجام
سو راون ترے بیری' اور تو نا لچھمن' نہ رام

خداوند تعالیٰ نے آدمی کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا تھا۔ نائب اپنے حاکم اعلیٰ کی تمام صفات اور اختیارات کا' چھوٹے پیمانے پر ہی سہی' مظہر ہوتا ہے۔ لازماً انسان میں بھی خدا کی تمام صفات ظلی صورت میں موجود ہیں۔ خالق حقیقی نے اسے اپنا نائب بنا کر یہاں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ ان تمام صلاحیتوں اور طاقتوں کو استعمال کرے' جو اسے ودیعت کی گئی ہیں۔

اگرچہ شیطان کے بہکانے میں آ کر اس نے آج تک وہ تمام توقعات تو پوری نہیں کیں' لیکن جہاں تک صفت تخلیق کا میدان ہے' یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح رستے پر ہے' اور اس میں اس نے بہت حد تک قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر اس نے اپنی موجودہ فتوحات پر قناعت کر کے کوشش سے ہاتھ نہ اٹھا لیا' تو امید کی جا سکتی ہے کہ اسے منشائے

خداوندی پورا کرنے میں اور کامیابیاں نصیب ہونگی۔

یہ حقیقت ہے کہ خلافت الٰہی کی تکمیل کا آغاز ہو چکا ہے۔ چونکہ انسان اپنی فکر میں (اور اپنے عمل میں بھی) کامل نہیں' اس لئے اس کے اس سفر میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے اور راہ سے بھٹک جانے کا امکان اور اندیشہ ضرور ہے۔ لیکن اگر اس کی نظر اپنے مقصد حیات پر جمی رہی' اور اس نے عزم کر لیا کہ میں یہ منزل سر کر کے رہوں گا اور راہ کی تمام مشکلات پر قابو حاصل کر لوں گا' تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی مساعی کامیابی سے کیوں ہمکنار نہ ہوں! عالی یوں حدی خوانی کرتے ہیں:

پھر شوق عمل' فکر کا ہمراز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
اے صید زبوں! تیرے لئے گھوم رہی ہیں
آزاد فضائیں
اے جذب جنوں! تیرے لئے جھوم رہی ہیں
یہ تازہ ہوائیں
پھر سوز دروں زمزمہ پرداز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
کچھ روشنیاں صاف نظر آنے لگی ہیں
لہرانے لگی ہیں
کچھ آرزوئیں حسن بیاں پانے لگی ہیں
بر آنے لگی ہیں
پھر عشق کا موسم اثر انداز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے
اے ہمسفرو! فکر و عمل کے یہ خزانے
بخشے ہیں خدا نے
اے ہم سخنو! گاؤ نئے زندہ ترانے
کیا راگ پرانے
پھر سارا جہاں گوش بر آواز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے

بے شک' مشکلات راہ حوصلہ شکن ہیں' اور ان میں روز بروز اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے' لیکن ایسے ہی میں تو' اپنی

تمام قوتیں مجتمع کرکے' مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ارشاد خداوندی سیجعل اللہ بعد عسر یسرا۔ اسی صورتحال کے لئے ہے۔ عالی نے اس رمز کو پالیا ہے۔

یہ "تال روپک" دیکھیے۔

جھنانن جھنن جھنانن جھنن
مستقبل میں جھانک کے دیکھو' کیا کیا امکاں رقصاں ہیں
کیا کیا خواب ہوئے ہیں پورے' کیا کیا ارماں رقصاں ہیں
نئے ساز ہیں' نئے گیت ہیں' نئے میت ہیں' نئی انجمن
جھنانن جھنن جھنانن جھنن
جو گزر گیا' اسے یاد کر' مگر اس طرف بھی تو کر نظر
یہ تجلیاں در و بام پر' یہ گل و گلاب چمن چمن
جھنانن جھنن جھنانن جھنن
وہ ستم زدوں کی رفاقتیں' وہ ہم اہل دل کی امانتیں
وہی بن رہی ہیں صداقتیں' وہی جلوہ گر ہیں کرن کرن
جھنانن جھنن جھنانن جھنن
یہ جو ارتقاء کا سرور ہے' یہ جو کشمکش کا شعور ہے
یہی انقلاب کا نور ہے' یہی انقلاب کا پیرہن
جھنانن جھنن جھنانن جھنن
نئے ساز ہیں نئے گیت ہیں' نئے میت ہیں' نئی انجمن
جھنانن جھنن جھنانن جھنن

عالی مستقبل سے مایوس نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ کمینگی' خود غرضی' نفس پرستی' بھوک' فریب' بیماری کی ظلمت کو دوام نہیں ہے' یہ سب چیزیں عارضی اور ختم ہونے والی ہیں۔ وہ دن آکے رہے گا' اور غالباً دور نہیں' جب ہر طرف روشنی ہوگی اور نیکی کا نور چار دانگ عالم کو منور کردے گا۔ وہی دن زمین پر خدا کی بادشاہت کا دن ہوگا۔ وہ دن انسان کی خلافت الٰہی کی تکمیل کا دن ہوگا۔ وہ بنی نوع انسان کی عید اور جشن کا دن ہوگا۔

عالی نے اپنی آنکھیں عطیہ کردی ہیں کہ ان کے بعد کسی محتاج کو لگادی جائیں۔ وہ اس شخص کو مخاطب کرتے ہیں جسے ان کی آنکھیں دی جائیں گی۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اگر یہ آنکھیں پاجانے کے بعد اس شخص کو بھی وہی المناک مناظر دیکھنا پڑے' جو آج ہمارے گرد و پیش ہیں' کمینے لوگ شرفا کی پگڑیاں اچھال رہے ہیں' اور ان کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں۔ سماج میں اتنی ناہمواری ہے کہ بلند کو یہ تک معلوم نہیں کہ پست کس حال میں جی رہے ہیں۔ حیوان اور انسان میں کوئی

فرق ہی نہیں رہ گیا' تو وہ شخص شکر گزار ہونے کی بجائے مجھے بد دعا دے گا کہ کیا اس شخص نے مجھے آنکھیں یہی سب کچھ دیکھنے کو دی تھیں' میں ان کے بغیر ہی عافیت میں تھا۔ عالی اسے امید کا سہارا دیتے ہیں' اور اس میں اپنی تمام آرزوؤں' تمناؤں اور ارمانوں کو جمع کر دیتے ہیں :

ہاں جو تجھے وہ عصر ملے
جب روشنیوں کو دیکھ سکے
اے آنکھوں والے! لازم ہے تو میرے اندھیرے یاد رہے
اور میرے لئے دو چار نہیں' تو ایک ہی اچھا لفظ کہے
گو اب ایسا دستور نہیں
اچھا سننا' اچھا کہنا
ہم لوگوں کو منظور نہیں

....

جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے
کچھ میری روح بھی یوں سوچے
میں نے تو نہیں دیکھے' لیکن
ان آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لئے
جن میں انسان' انسان ہوئے
سب پورے ہو نہ سکے' پھر بھی
پورے کچھ تو ارمان ہوئے
انسان کسی منزل میں تو انسان ہوئے

....

جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے
او دیکھنے والے! یاد رہے مرے جیتے جی
ان آنکھوں کو کوئی منظر اپنا نہیں ملا
سب غیر ملے
....

جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے

جس شخص کا انسان کے روشن مستقبل پر اتنا گہرا یقین ہو' اس کی انسان دوستی پر' اس کے انسانی مقاصد کی بلندی پر' اس کے انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے ایمان پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ دعا کرتے ہیں :

صدیوں کے اندھیار میں' بھگوان! دیکھو کبھی دکھائے
ایک ہی دن' جب کوئی کسی کو کوئی دکھ نا دینے پائے

اور انسان اور اس کے مستقبل پر اپنے ایمان کا یوں اعلان کرتے ہیں :

اک دوجے کا ہاتھ پکڑلو' اور آواز لگاؤ
اے اندھیارو! سورج آیا' سورج آیا' جاؤ

(کتاب "جمیل الدین عالی فن اور شخصیت"
مرتبہ ایم حبیب خاں
ناشر علمی مجلس' دلی ۸۸ء سے)

٭ ۔ شاید اس تعداد میں بڑی جاگیریں اور علاقے شامل کر لئے گئے ہیں۔ خود مختار (Sovereign) ریاستیں جن کی اپنی فوج پولیس اور دیوانی ہو تقریبا ساڑھے تین سو تھیں۔ لوہارو بہت چھوٹی ریاست ہونے کے باوجود جاگیر یا تعلقہ نہیں بلکہ اپنی فوج' اپنی پولیس اور اپنی دیوانی کے ساتھ "خود مختار" گو" باقی سب ایسی ریاستوں کی طرح' تاج برطانیہ کے زیر اقتدار' تھی۔ یہ محض ایک تاریخی وضاحت ہے۔ عالی صاحب اپنے حادثہ پیدائش کے حوالے سے کسی فخر و مباہات میں مبتلا نہیں انکے مضامین اور انٹرویوز ملاحظہ ہوں۔

پروفیسر محمد حسن عسکری

دیباچہ

(غزلیں' دوہے' گیت)

(۱۹۵۷ء)

"وہ جو غالب بھی تھا اور معتقد میر بھی تھا۔" اس کے خاندان میں پیدا ہونے کا جمیل الدین عالی کے حق میں ایک برا نتیجہ نکلا۔ ان کے دل میں خواہ مخواہ یہ بات بیٹھ گئی کہ میں کچھ بھی کیوں نہ کرلوں' غالب نہیں بن سکتا لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی اسی وقت شاعری کرے جب غالب بن سکنے کا امکان ہو۔ پہاڑ بھی ٹھیک اور اونٹ بھی ٹھیک۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اونچے لیکن عالی نے اونٹ کی خوبیاں تسلیم کرنے میں فراخ دلی سے کام نہیں لیا۔ ہے تو یہ بات دیباچہ نگاری کے مروجہ آداب کے خلاف' مگر میں تو ابتدا شکایت ہی سے کروں گا کیونکہ عالی کی شاعری اور شخصیت میں جو امکانات پنہاں ہیں ان کا اندازہ مجھے عالی سے زیادہ ہے۔ انہوں نے غزل' دوہے' گیت نظم معری' سبھی کچھ لکھا ہے' بلکہ غزل میں بھی مختلف اسلوب آزمائے ہیں۔ غالب کا رنگ ہو یا مومن کا یا اقبال کا فارسی ترکیبیں استعمال کرنے کا معاملہ ہو یا سلاست بیان کا انہوں نے اپنی مرزائی شان ہر جگہ برقرار رکھی ہے لیکن انہوں نے اپنی شاعری کو خود ایسی وقعت کبھی نہیں دی جس کے زور سے شاعر کے کلام میں ارتکاز پیدا ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ عالی کو "کیے جاؤ کوشش مرے دوستو" کے اصول پر عمل کرنا چاہئے۔ شاعری کوئی تجارت نہیں' یہاں محنت مشقت یا ریاضت کارآمد ثابت ہوتی ہے' لیکن جو چیز شاعری کو محض شاعری کے درجے سے اونچا اٹھاتی ہے وہ تو ایک غیر شخصی قوت ہے۔ ممکن ہے کہ سائل دہلوی کی شاگردی* کے زمانے میں عالی نے ریاض بھی کیا ہو لیکن وہ اپنی شاعری کو اتنی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے' جتنی وہ دراصل ہے۔ مثلاً" میں نے انہیں اکثر کہتے سنا ہے کہ میاں ہم تو مشاعرے باز آدمی ہیں۔ کاش کہ عالی کا یہ انکسار پرخلوص نہ ہوتا۔

چلئے' مشاعرہ بازی کا ہی معاملہ لیجئے۔ مشاعرے کے لئے غزلیں لکھنے یا عادتاً" مشاعرے میں پڑھنے کے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ نقصان تو یہ ہے کہ شاعر ایک دفعہ اندازہ لگالے کہ لوگ کس قسم کے جذبات اور بحریں

پسند کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے تجربات کو انھیں پیمانوں سے ناپ ناپ کر مقررہ بوتلوں میں بھرتا رہے۔ اس طرح شاعر پہلے تو نئے وسیع اور گہرے تجربات کی صلاحیت کھودیتا ہے' اور پھر سامعین بھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ حادثہ بہت سے شاعروں کو پیش آچکا ہے۔ جن میں سے بعض نہایت مشہور بھی ہیں۔ لیکن دوسری طرف مشاعرے بازی مفید بھی ہوسکتی ہے بشرطیکہ شاعر واد لینے کی خواہش کا شکار نہ ہوجائے۔ مشاعرے میں غزل پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے سننے والوں کے دل و دماغ کو اتنا حقیر نہیں سمجھتا کہ ان سے تخاطب کی زحمت ہی گوارا نہ کرے۔ مشاعرے کی بنیاد ہی اس یقین پر ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والوں کے درمیان چند ذہنی اور جذباتی اقدار مشترک ہیں' اور سننے والوں میں نئے تجربات کو قبول کرنے کی آمادگی ضرور موجود ہے۔ دوسری طرف مشاعرے میں پڑھنے والے شاعر سے ایک توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے جذبات پر شرماتا نہیں بلکہ دوسروں کے سامنے کھل کر ان کا اظہار کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ حالی مشاعرے باز شاعر سہی' مگر ان میں اچھے مشاعرے بازوں کی یہ دونوں صحت مند خصوصیتیں موجود ہیں۔ یعنی کھلے دل سے اپنی بات دوسروں کے سامنے کہنے کی ہمت بھی اور دوسروں کی ذہنی اور جذباتی صلاحیت پر اعتماد بھی اور ساتھ ہی سامعین سے مغلوب نہ ہونے کی طاقت بھی۔ مشاعرے باز شاعر ہوں یا غیر مشاعرے باز آج کل کے زمانے میں تینوں باتیں کسی ایک شاعر میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ حالی مشاعرے بازوں کے انجام سے کچھ ایسے گھبرائے ہیں کہ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ مشاعرے نے ان کی شاعری کو کیا فائدہ پہنچایا ہے اکثر مشاعرے باز اپنا ایک خاص ترنم وضع کرلیتے ہیں' اور غزل کو اسی لے میں ڈھالتے ہیں چاہے کسی خاص غزل اور ان کے ترنم کا آپس میں کوئی علاقہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن حالی کے یہاں ترنم اور شعر یک جان ہوتے ہیں۔ ان کی خوش گلوئی ان کی غزل میں گونجتی ہے' اپنی آواز اور اپنی شخصیت کے آہنگ کو شعر میں سمو دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ حالی کے یہاں اس اہلیت کی نشوونما اگر مشاعروں میں نہیں ہوئی تو اور کہاں ہوئی؟ حالی کے شعر بیک وقت دل اور دماغ دونوں سے تخاطب کرتے ہیں۔ اگر جذبے کا خلوص اور تازگی دل پر اثر انداز ہوتی ہے تو رویے کا تیکھاپن اور انداز بیان کی شوخی ذہن کو بھی چھیڑتی ہے۔ جذبے اور خیال کی یہ سادہ آمیزش دماغ اور دل کی یہ سنگت اگر مشاعرے میں پڑھنے کی مجبوری سے حاصل نہیں ہوئی تو کہاں سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ آپ کو حالی کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوگا' ان کے یہاں جو ایک ہلکی سی کھٹک اور چبھن ملتی ہے وہ انسانی زندگی اور انسانی جذبات کے اندرونی تضاد اور کشاکش کے احساس نے پیدا کی ہے۔ یہ شعور حالی کے یہاں ابھی اتنا گہرا تو نہیں کہ بڑی شاعری پیدا کرسکتا' لیکن اس حد تک ضرور موجود ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کے لئے خطرناک بن سکتا تھا۔ اس احساس کے طفیل اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی شاعری اور شخصیت دونوں گھٹن' جھلاہٹ اور بیچارگی کی دلدل میں پھنس کر رہ جائیں۔ حالی اپنے مشاعرے بازی اور مجلس آرائی کا شمار اپنی حماقتوں میں کرتے ہیں۔ لیکن انہیں چیزوں کی مدد سے انہوں نے اپنے آپ کو اس شکستگی سے محفوظ رکھا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا' اور

یہیں سے انہیں وہ توانائی اور استقامت ملی ہے جو ان کی غزلوں کے نفس مضمون میں ہی نہیں بلکہ لہجے میں بھی گونجتی ہے۔ مشاعرے بازی کی عادت نے عالی کو وہ جذباتی توازن اور تمکنت بخشی ہے جس کے لئے انہیں مشاعرے کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔ مشاعرے میں ابھی تک کتنی زندگی ہے اور یہ شاعروں کو کیا کچھ دے سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں عالی کا کلام پیش کیا جاسکتا ہے۔

اب عالی کی شاعری کا ایک اور پہلو دیکھئے یعنی ان کی شاعری اور شخصیت کا ایک دوسرے سے رشتہ' اس میں شک نہیں کہ عظیم ترین شاعری ہمیشہ شاعر کی شخصیت سے اتنی آگے ہوتی ہے کہ ہم اس کا شمار مظاہر فطرت میں کرسکتے ہیں۔ لیکن اس سے نیچے شاعری کے جتنے بھی درجے ہیں ان میں شاعری اور شخصیت کا تعلق کئی شکلیں اختیار کرسکتا ہے' کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت میں وہ امکان نظر نہیں آتے جن کا اظہار اس کی شاعری کرتی ہے۔ ایسی صورت میں شاعر کی ذات کا وہ حصہ شعر میں بولتا ہے جو کسی اور شکل میں بروئے کار نہیں آیا' بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعری اپنی جگہ وقیع ہوتی ہے مگر ان کی شخصیت میں کہیں زیادہ تنوع اور توانائی نظر آتی ہے۔ یعنی ان کی شخصیت ان کی شاعری سے آگے نکل جاتی ہے' یا یوں کہئے کہ شاعری شخصیت کے برابر تک نہیں پہنچ سکتی۔ بعض دفعہ شاعری اور شخصیت میں بالکل ہی تضاد ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی شخصیت دو الگ خانوں میں بٹی ہوتی ہے' ایک حصہ زندگی میں عمل کرتا ہے دوسرا شاعری میں' پھر کچھ ایسے شاعر ہوتے ہیں جن کی شاعری ان کی شخصیت کو مسخ کردیتی ہے' اور اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جن کی شخصیت ان کی شاعری کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عالی کی شاعری ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے۔ نہ یہ آگے نہ وہ پیچھے۔ نہ تو شخصیت نے شاعری کو ٹھکرایا ہے' نہ شاعری نے شخصیت کا گلا گھونٹا ہے عالی کے یہاں ان دونوں میں مکمل یگانگت ہے۔ عالی نے شاعری کو اپنی شخصیت کے ناآسودہ تقاضوں کے اظہار یا تسکین کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ان کی شاعری میں اجاگر ہیں' اور اسی طرح ان کی شاعری میں بھی کوئی ایسا عنصر نہیں ملے گا جو ان کی شخصیت میں نہ ملتا ہو ایک لحاظ سے یہ خامی بھی ہے۔ اپنی شخصیت کے اندر محدود ہو کے رہ جانا شاعر کے لئے کوئی اچھی بات نہیں۔ اس طرح آدمی اچھے شعر تو کہہ سکتا ہے لیکن پوری شاعرانہ عظمت حاصل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ عالی اب اپنی شاعری میں وسعت کے ساتھ ارتکاز بھی پیدا کریں' کیونکہ اوپر اٹھنے کے لئے پہلے اپنے آپ کو سمیٹنا لازمی ہوتا ہے۔ بہرحال عالی کی موجودہ شخصیت اور شاعری میں اتنے مختلف رنگ موجود ہیں کہ ان کے کلام سے اکتاہٹ نہیں ہونے پاتی۔ یہ رنگا رنگی بذات خود ایک لطف کی چیز ہے۔ پھر عالی کے یہاں اس بات کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ وہ کسی جذبے سے کترا رہے ہوں یا اس کے اظہار میں حجاب سے کام لے رہے ہیں۔ کھلے دل سے بات کرنے اور جھینپے اور گھبرائے بغیر جذبات کا بےلاگ طریقے سے اظہار کرنے کی بدولت ان کے کلام میں ایک ایسی سادگی اور معصومیت آگئی ہے جس کی آرزو ہر شاعر کو ہونی چاہئے۔ اور اس معصومیت کا راز یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے کسی گوشے کو نہ تو زندگی میں غیر آسودہ رکھتے ہیں نہ شاعری میں' اور اپنی شخصیت کو اس کی

خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر لیتے ہیں الم ہو یا نشاط' کامیابی ہو یا محرومی' کسی چیز کے بیان میں ان کی آواز ڈر سے کپکپاتی نہیں۔ وہ ہمیشہ جم کر بولتے ہیں۔ جذبات کا خوف عالی میں نام کو نہیں۔ میرے خیال میں یہ ان کی سب سے بڑی خوبی ہے' اور مجھے یقین ہے کہ اس قوت کے بل پر وہ اگر چاہیں تو اس سے بھی بہتر شاعری تخلیق کر سکتے ہیں۔

جذبات کے بے جھجک' بے لاگ' براہ راست اور معصومانہ اظہار کا یہ مطلب نہیں کہ عالی نے دماغ کو چھٹی دے دی ہے۔ چونکہ عالی ہر قسم کے جذبے کو بے کھٹکے قبول کر لیتے ہیں' اس لئے متضاد تجربوں کے آپس میں ٹکرانے کا موقع تو یوں ہی فراہم ہو جاتا ہے' پھر جذبے کے اندر رہتے ہوئے بھی اسے باہر سے دیکھنے کا' جانچنے کا شوق عالی نے غالب سے ورثے میں پایا ہے۔ وارفتگی کے عالم میں بھی وہ اپنا مشاہدہ کئے بغیر باز نہیں رہ سکتے۔ جذبات کے مشاہدے اور موازنے سے ان کے یہاں ایک حد تک مضمون آفرینی کا رنگ بھی آگیا ہے جس میں غالباً فارسی شاعری کے مطالعے کو بھی دخل ہے۔ ذہن جذبے میں کھو بھی جائے اور اس سے الگ رہ کر کام بھی کر رہا ہو' اس بات سے ان کے عشق تک میں ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آگیا ہے ان کے کسی شعر سے یہ نہیں ٹپکتا کہ عشقیہ جذبات نے انہیں پیس کر رکھ دیا ہو۔ عشقیہ زندگی میں سب سے بڑی قوت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی ڈھے جانے کے بعد پھر اٹھ کھڑا ہو' اور اس طرح کہ زمین پر قدم پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے جمے ہوں۔ لیکن ایسا تو اردو شاعری میں بس دو بار ہی ہوا ہے' ایک تو میر کے یہاں دوسرے فراق کے یہاں لیکن اگر یہ نہیں تو آدمی میں اتنی طاقت تو ہو کہ ڈھے جانے کے بعد لیٹا کا لیٹا ہی نہ رہ جائے۔ عالی کو سنبھلنا آتا ہے۔ اسی لئے گداز کے باوجود' ان کے عشق میں سڑاند پیدا نہیں ہوتی۔ کسی قسم کی پینترے بازی کے بغیر عالی اپنے آپ کو غم کی گراوٹ سے بچا لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر بیان میں جو نفاست' شگفتگی اور بانکپن ہے' اس میں فارسی ترکیبوں کے علاوہ بہت بڑا دخل ان کے مزاج کی صحت مندی کا بھی ہے۔ محبوب کے مقابل اکڑنے' برنے کا انداز ان کے یہاں نہیں' بلکہ اپنی ہستی پر ناز' یا اپنی شخصیت کا سرور ہے جو ان کے عشق میں پچھ چاپن نہیں آنے دیتا' اور دوسری طرف ان کی شاعری کو ایک ایسی شوخی' چلبلا پن اور طربیہ کیفیت بخشتا ہے جو نئی زمانہ کمیاب ہے۔ عالی کی شاعری بے حاصلی کا رونا جھینکنا نہیں۔ ان کے غم میں بھی جوانی کا نکھار ہے۔ عالی کا نشاط ہی نہیں بلکہ الم بھی ایک لہک رکھتا ہے۔ جذب اور قرار کا ایسا امتزاج عالی کی عمر کے شاعروں میں ذرا کم ہی ملے گا۔

اس مجموعے میں غزلوں کو جس طرح ترتیب دیا گیا ہے' اس سے یہ اندازہ ہونا مشکل ہے کہ عالی کی نشوونما کس انداز سے ہوئی ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ عالی کے یہاں انداز بیان کا تنوع بڑھتا جا رہا ہے اور وہ کئی شاعروں کے رنگ میں اپنا امتحان لے چکے ہیں ادھر عالی نے کئی غزلیں غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نئی زمینیں ایجاد نہیں کر سکتے' بلکہ اس طرح وہ اپنے آپ کو مانجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر دو چار غزلوں میں انہوں نے قافیہ اور آہنگ کے چھوٹے موٹے تجربے بھی کئے ہیں۔ مثلاً" وہ غزل جس کی ردیف

ہے۔ نیند آنے لگی" یوں عالی کو ادبی تجربوں کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس مجموعے میں ایک افسانہ شامل ہے جسے نظم کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے اور نثر کے طور پر بھی۔ نظم معریٰ میں ایک لمبا ڈرامہ وہ پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ لیکن ایسے تجربے وہ پہلے تفنن طبع کے طور پر کیا کرتے تھے' اب انہوں نے ذرا جم کر اسالیب بیان کی طرف توجہ شروع کی ہے اور اپنے لئے نئی راہیں ڈھونڈھ رہے ہیں نہ صرف غزل میں بلکہ اور اصناف سخن میں بھی۔ مجھے امید ہے کہ عالی کا دوسرا مجموعہ اور زیادہ متنوع' پہلودار اور دقیع ہوگا۔

رہے عالی کے دوہے' تو میں یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا کہ ہندی کے مشہور دوہوں کے مقابلے میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔ البتہ اپنی جگہ عالی کے دوہے اپنا ایک الگ لطف رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک عقلمندی یہ کی ہے کہ تلسی داس یا کبیر کی زبان میں نہیں لکھا۔ اس پرانی زبان کے پھیر میں پڑ کر بعض دفعہ آدمی تلسی داس یا کبیر کے خیالات اور جذبات اپنے اوپر اسی طرح حاوی کر لیتا ہے کہ شاعرانہ خلوص میں کمی آجاتی ہے اور دوہے نویسی محض ایک ادبی مشق بن کے رہ جاتی ہے۔ عالی نے اپنے دوہوں کے لئے مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے جس کی وجہ سے ان کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہو گئی ہے۔ پھر عالی نے ہندی شاعروں کے خیالات اور احساسات کی روایت کا تتبع کرنے کی بجائے' اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے۔ یعنی عالی کے دوہوں میں اسالیب بھی خود ان کے ہیں اور نفس مضمون بھی۔ لہٰذا عالی کے دوہوں کا تلسی داس اور کبیر کے دوہوں سے مقابلہ موازنہ کرنا کافی نہیں۔ عالی نے دوہے کو ایک نئی شکل میں زندہ کیا ہے۔ اس لئے ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ عالی کے دوہوں میں زندگی ہے یا نہیں۔

عالی کے دوہوں میں مضامین کا تنوع غزلوں سے بھی زیادہ ہے' چونکہ اس صنف کو انہوں نے گویا اپنی اختراع کے طور پر برتا ہے' لہٰذا یہاں انہیں آزادی بھی زیادہ حاصل رہی ہے۔ یوں تو انہوں نے دوہوں میں ہمارے زمانے کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے' لیکن وعظ یا اخلاقی درس کا رنگ کہیں نہیں پیدا ہونے دیا۔ ان کی حیثیت شاہد کی رہی ہے جو زندگی کی رنگارنگی سے لطف لیتا ہے اور آگے چل پڑتا ہے۔ حسن و عشق کے معاملے میں بھی یہاں ان کا یہی رویہ رہا ہے لیکن جہاں تک حسن کے مشاہدے کا تعلق ہے ان کی ایک نظر بھی مشہود کا سارا رنگ روپ نچوڑ لائی ہے وہ ہرے بھرے اور جیتے جاگتے احساسات جو عالی کے دوہوں میں ملتے ہیں وہ ان کی غزلوں میں بھی نہیں دکھائی دیتے۔ اپنی جمالیاتی حس کے آزادانہ اظہار کے لئے عالی نے چنا ہی اس صنف کو ہے۔ عالی کی جذباتی معصومیت جو غزلوں میں بھی نمایاں رہی ہے' یہاں آ کے دوچند ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ دوہے ہمارے زمانے کی اردو شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یوں کہنے کو دوہے اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی کہے ہیں۔ لیکن عالی کا سا رچاؤ اور بے ساختگی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب عالی اس فکر میں ہیں کہ اس صنف سے کوئی اور بھاری کام لیا جائے۔ مثلاً" انہوں نے سوڈیڑھ سو مسلسل دوہوں کا ایک خاکہ بنایا ہے جس میں کراچی کی زندگی پیش کی جائے گی۔

غزلیں ہوں یا دوہے' عالی دونوں طرف آگے بڑھنے اور پھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن کی لچک سے مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ وہ اردو شاعری میں اور بھی گراں قدر اضافے کریں گے۔ ذاتی طور پر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ عالی نئی نسل کے ان دو ڈھائی شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی شاعری سے مجھے آج بھی دلچسپی ہے' اور جن کی نشوونما کا میں بغور مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔

(۱۹۵۷ء)

عالی صاحب حضرت سائل دہلوی کے شاگرد نہیں تھے۔ رشتے کے بھتیجے اور حاشیہ نشین تھے۔ بزرگوں کے حکم پر حسب روایت شاگرد بھی ہونا چاہا مگر لڑکپن کی گستاخی نے ہونے نہ دیا۔ ملاحظہ ہو ان کا خاکہ "سراج الدین خاں سائل" مطبوعہ ماہنامہ "ہم قلم" کراچی۔ اگست ۱۹۷۱ء جو اس اشاعت میں بھی شامل ہے۔ ناشرین

قرۃ العین حیدر

جشن عالی (ابو ظبی) کا افتتاحی [illegible]

(۱۹۸۹)

اس وقت میں جمیل الدین عالی کے دوہوں میں روایتی امیجری کو [illegible]
خالص امیج اور آئیڈیا کے اظہار کے لئے سُر، رنگ اور لفظ تینوں [illegible] ضروری ہیں۔ سنسکرت جمالیات کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ سُر دکھلائی دینے لگیں اور رنگ سنائی دیں [illegible] کہا جائے گا کہ رنگ بولنے لگیں۔ امیج کا تعلق لفظ سے بھی ہے اور مخصوص تلازمہ خیال اور کیفیت الفاظ کے ساتھ بھی وابستہ ہیں۔ اس وجہ سے فارسی اور اردو شاعری کا انگریزی ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ ہندی اور اردو چونکہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں ان کے الفاظ سے وابستہ امیجری بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ ہمارے ذہنوں پر سیاست اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ ہم بیسویں صدی یا دورِ حاضر کی سیاست کی روشنی میں گفتگو ہی گذشتہ زمانوں کے معاملات پر کرتے ہیں۔ دوہوں کے سلسلے میں خاکسار کو شمالی ہند کہنے کی اجازت دیجئے۔ (اس علاقے کو شمالی ساؤتھ ایشیاء تو پکارا نہیں جاسکتا)۔ اس علاقے کا منظر نامہ ہمیں عالی کے دوہوں میں ملتا ہے۔

فارسی شاعری میں باغ مہکتا ہے خشک علاقوں میں Formal gardens اور نہریں خاص طور پر بنائی جاتی تھیں۔ فردوس کا تخیل بھی قدیم زرتشتی ایرانی تہذیب کی دین ہے وہی گلستاں، قالین اور موزیک کی گل کاری اور گل و بلبل، بہار و خزاں، صحرا اور غزال کے Stylised شعر کی موزیک میں منتقل ہوا۔ ترکستانی اور مغل قومیں باغ گویا اپنے ساتھ لے آئیں Formal Garden ہند قدیم میں نہیں تھے۔ ٹروپیکل نباتاتی افراط اور پانی، دریا، ندی، نالے، بارش کی فراوانی کی وجہ سے بن، اُپ بن پھول بن اس ملک کی خصوصیت تھے اور ان کی Poetic imagery میں، اور فضا بھی

زیادہ بے ساختہ' نیچرل اور earthly تھی۔ کلاسیکل اور لوک دونوں طرح کی ادبیات میں کیلے کے پتے' آم' کرم' مور' پپیہے' چکور' کوئل' راج ہنس کے علاوہ ہاتھی' کوے' مینڈک اور جھینگر بھی موجود ہیں۔ بہار ایران میں اہم ہے۔ یہاں بسنت کے علاوہ برکھا رت' چشمے کے بجائے کنواں' امیر خسرو سے لے کر آج تک پنگھٹ کی رونق برقرار ہے۔

سولہویں صدی میں کرشن بھگتی کے فروغ کی وجہ برج کی Myth Pasteral کا بول بالا ہوا۔ کرشن بھگتی نے بنگال' بہار' گجرات' راجھستان کی شاعری' رقص' موسیقی اور ناٹک یعنی ادب اور تمام Performing Arts کو بہت دور رس انداز میں متاثر کیا arts اور شاعر گوری' گوپی' گگری' پنگھٹ' بنسی' ڈگر اور جمناتٹ' میور پنکھ وغیرہ راس لیلا کی تمثیل اور اس کا بھگتی رس' شرنگار رس میں بھی تبدیل ہوا۔ معرفتی نغموں کے علاوہ آگے چل کر اس نے ٹھمری' داورے' کتھک ناچ اور رہس کے روپ دھارے' اودھ کے صوفی شعراء نے گوکل کی امیجری اسلامی تصوف کی اصطلاحات کے طور پر اپنے کلام میں پیش کی جو انہوں نے اودھی زبان میں لکھا۔ یہی کرشن لیلا مغل راجپوت پہاڑی مصوری کا ایک محبوب موضوع رہی۔ اکثر تصاویر میں سری کرشن اور رادھے سمیت گوکل کے تمام کردار مغلیہ لباس میں نظر آتے ہیں۔

بن یا خوبصورت ٹروپیکل جنگل اس شاعری اور اس فضاء کا ایک اہم جزو ہے۔ کرشن جی کے القاب بن مالی اور بن راج بھی ہیں' بے حد گھنی لتائیں' رنگ برنگے پھول' پیچیدہ شاخوں والے قدیم درخت' کنول اور تالاب' راج ہنس اور طوطے ان کے مدھوبن کے ڈیکور ہیں۔

یہی بن راج شادی بیاہ کے گیتوں میں بن را پھر بنڑا اور بنا بن گئے۔ الفاظ اصطلاحات اور ان سے منسوب تصورات' امیج اور کیفیات اس طرح بدلتی جاتی تھیں۔ بن' گوری' سانوریا اور پنگھٹ کی یہ امیجری مذہبی کے علاوہ رومینٹک اور سیکولر بھی ہوگئی۔ کنہیا کے بجائے مغل راجپوت فیوڈل دور کی یادگار "عالیجاہ بیگی" ہمیں راجھستان کے لوک گیتوں میں مل جاتے ہیں۔ دیہات کی تصویر ہمیں صوفیائے کرام کے دوہوں میں ملتی ہے جو انہوں نے Proto Urdu میں لکھے۔ علاوہ ازیں ہند قدیم کے گاؤں کے بے حد Realistic مناظر سانچی اور کوہ آبو کے دیوار' مندر کے سنگی اور مرمریں تصادم میں نظر آتے ہیں اور ان کا Idealistic versian انیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال اسکول کے Water colour اور عبدالرحمن چغتائی کی وہ پینٹنگز جو انہوں نے اسی جاپانی واش تکنیک سے بنائیں اور جو Chughtai Indian Painting کہلاتی ہیں۔ اور سب میں یہ گاؤں کی گوری گگری اٹھائے پنگھٹ سے جارہی ہے۔ مندر وغیرہ اور یہ decorative کیلنڈر پر منتقل ہو کر نئے مڈل کلاس ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچ گیا۔ اسی تصویر کو فکشن میں بھی پیش کیا گیا۔

بن اپ بن کے علاوہ اس شعری کائنات کا دوسرا مرکز پنگھٹ تھا۔ اور جمنا کا کنارا' رادھا' گوپیاں' بانسری' یہ ویشنو بھگتی میں معرفت الٰہی کی اصطلاحات ہیں۔ تصوف نے بھی ان کو اپنایا۔ لہٰذا درگاہوں پر آج تک "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" گایا جارہا ہے۔ قوال اگر پورب کا ہے وہ بہوت کٹھن ہے کہے گا۔ ڈگر اور پنگھٹ بہرحال اٹل ہیں۔

آج کے Media explosion سے بہت قبل پارسی تھیٹر، گراموفون اور سینما نے اپنی اپنی موسیقی کے ذریعے گیت عام کئے۔ بالخصوص نوشاد علی نے گزشتہ چند برسوں میں اتر پردیش کی مقبول لوک دھنوں اور گیتوں کو متعارف کیا ہے۔

یہ ایک علیحدہ اور ذرا الجھا ہوا اور اب اس سیاست پسند کرم فرمائی کا پولیٹیکل مسئلہ ہے کہ ایک زبان dialect کب تک رہتی ہے۔ اور ایک باقاعدہ زبان کب بن جاتی ہے۔ میتھلی اور اودھی باقاعدہ اعلیٰ ادب کی مالک زبانیں۔ اور وہ آسان بول چال کی زبان جسے انگریزوں نے، گاندھی جی نے اور آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستانی پکارا اور جس کی بنیاد کھڑی بولی ہے اس میں عظمت اللہ خان، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری اور آرزو نے گیت لکھے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ خاصا محدود تھا۔ ساجن، پیتم، آشا، من، جیون پیت، میت، آرتی، کومل، ہردے وغیرہ وغیرہ اور یہ بڑی آسانی سے گائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ حفیظ کے گیتوں کو ملکہ پکھراج کی آواز مل گئی۔ اور آرزو کو نیو تھیٹرز والوں کی۔

مشرقی شاعری سننے سنانے کی چیز بھی ہے۔ مغرب کے برعکس ہمارے ہاں پرنٹنگ پریس بہت دیر میں پہنچا۔ ہمارا کلچر بنیادی طور پر اسٹیج کلچر ہے۔

کلچر بنیادی طور پر اب تک Speach culture بھی ہے۔ ادب سننے سنانے کی چیز بھی رہا ہے۔ رامائن کی چوپائیاں، اردو داستانیں، پرانوں کی کتھائیں، شاعری، قوالی، اب Electronic media کی فراوانی کی وجہ سے ایک بار پھر ہمارا معاشرہ audio-visual کلچر کو اپنا رہا ہے اور printed word کو بھولتا جا رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ سے قطع نظر اسی دور میں ایک نئی overseas شاعری کلچر پیدا ہوئی ہے۔ جمیل الدین عالی کی مقبولیت نے اردو کی اس ترویج میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہمارے ہاں عصری تقاضوں کے لحاظ سے آرٹ فارم کے Contact کو جدید اور جدید تر بنانے کا رویہ پیدا ہوا۔ ادب اور مصوری میں ایسے تجربے کامیاب رہے۔ کلاسیکل موسیقی اور کلاسیکل رقص میں ناکام۔ عالی کے دوہے اردو کے کامیاب تجربوں میں شامل ہیں۔ گوری، ناری، پنگھٹ وغیرہ کے باوجود آج کی دنیا کے جدید دوہے ہیں ان میں آورد اور تصنع معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان اس شعری روایت اور امیجری سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ذرا تفصیل سے اس مضمون میں کیا ہے۔ میرے نزدیک فراق کی روپ والی رباعیاں موضوع اور الفاظ کے لحاظ سے رباعی کے form سے لگا نہیں کھاتیں اور محض ایک ادبی کوشش معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع تر ہے۔ عالی کی اس کامیابی کے لئے ان کو بہت بہت دھنیہ واد۔

*نقوش عالی صاحب اس خطبے کے تین صفحات کھو گئے ہیں محترمہ صاف کرنے کے لیے لے گئی تھیں دوبارہ نہیں لکھے۔ بہرحال یہ تحریر بھی بہت اہم اور تبرک ہے۔ اس جشن کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی نے کی اور افتتاح محترمہ قرۃ العین حیدر نے کیا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر ہی نے جشن عالی جدہ ۱۹۹۰ء کا افتتاح بھی کیا تھا۔ جدے میں بھی تقریباً" وہی خطبہ پڑھا گیا تھا۔ ناشرین

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
(۱۹۹۷ء)

جمیل الدین عالی اور آٹھویں سر کی جستجو

ایک عجب راگ ہے ایک عجب گفتگو
سات سروں کی آگ ہے آٹھویں سر کی جستجو

اگر "لاحاصل" کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو "اے مرے دشتِ سخن" "غزلیں دوہے گیت" کی تقریباً چار دہائیوں کے بعد شائع ہوا ہے۔ حرف آغاز میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو کہنا چاہئے تھا' لیکن ذکر نہیں ہے تو "غزلیں دوہے گیت" کا جس نے جمیل الدین عالی کو جمیل الدین عالی بنایا اور عالی کی شاعری کی وہ پہچان متعین کی جس کے قائل محمد حسن عسکری' ابن انشاء' سلیم احمد سب تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ پہچان عالی کے لئے بوجھ بن گئی یا عالی آگے بڑھنے کے لئے اس کو بھلا دینا چاہتے ہیں یا ان کے اندر کی بھیرویں کچھ اور کہتی ہے' یا یہ رد تشکیل کا وہ عمل ہے جسے طویل سفر طے کرنے والوں کی تخلیقیت اکثر روا رکھتی ہے۔ عالی میرے دوست ہیں اور دوستوں کے بارے میں بے تعلقی سے قلم اٹھانا بہت مشکل امر ہے' معروضیت تو ویسے بھی ناممکن ہے مگر عالی کے دوہے کے قائل ان کے مخالفین بھی ہوں گے' جس شخص نے ایک قدیم سنسکرت یا پراکرتی صنف کو اردو دایا اور اردو اصناف شعری کا حصہ بنا دیا اور اوائل عمر میں ہی رجحان ساز ہونے کا درجہ بھی پالیا' اس کو شاعری سے اور کیا چاہئے لیکن اگر واقعی ایسا ہوتا تو عالی دوسرے دیوان کا نام "لاحاصل" نہ رکھتے۔ حاصل اور لاحاصل کا یہ کیسا کھیل ہے؟ کیا کہیں کوئی داغ ناتمامی ہے جو اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ شاعر کو اکثر اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی مغفرت کس حوالے سے ہوگی اور ہوگی بھی کہ نہیں۔ پچھلی بار عالی پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ عالی کی شہرت دوہے سے ہوئی ہے لیکن عالی کا بنیادی محاورہ غزل ہے۔ تغزل کا جوہر عالی کی سائیکی میں جاگزیں ہے' دوہا بھی دہلی اور لوہارو کی روایت سے آیا ہوگا' اور بھگتی اور شرنگار رس کا کھیل غزل کے پہلو بہ پہلو کسی اجنبیت کا حامل نہیں۔ حقیقتاً یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ کب چت پٹ ہو جاتی ہے اور پٹ چت' شاعری یہ کھیل شاعر کو بتا کر نہیں کھیلتی کیونکہ شاعر جب کہہ چکتا ہے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا عمل شروع ہو جاتا ہے قارئین کا' جسے ہم اردو میں "زمانہ" یا "عہد" بھی کہتے ہیں۔ وسط

بیسویں صدی میں دو ہے میں خلا تھا' اس کی بازیافت اس وقت زمانے کو راس آئی۔ شہرت خوشی دیتی ہے مگر ہر خلش کا علاج نہیں۔ میرا خیال ہے عالی کی طبیعت غزل میں بھی برابر زور مارتی رہی' مگر زمانہ کی قبولیت (Reception) کا عالم نرالا ہے جس کو توقعات کی جس خراد پر اتار لے اتار لے۔ لگتا ہے عالی کی تشنگی کو بڑھاوا ملا ان کی سماجی مصروفیات' خدمت خلق' اردو اداروں کی عہدہ داری اور گلڈ اور انجمن کی سرداری و سربراہی سے' نیز کالم نویسی اور اخبار بازی سے۔ کہاں شاعری اور کہاں شوق صحافت کی فراوانی اور آئے دن کا بہتا پانی۔ غرضیکہ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا' اور تشنگی وہی رہی۔ عالی کی اخبار بازی ہو یا اردو اداروں کی صورت گری یا عہدہ سازی' فن کار اچھا ہو اور اس سے توقع شاعری کی ہو تو کوئی رعایتی نمبر دے بھی کیوں؟ اردو ویسے بھی اس معاملے میں زیادہ روادار نہیں۔ ادھر عالی نے چاہا تو بہت لیکن نہ اداروں کو چھوڑا نہ اخباروں کو' اور حق شاعری کا بھی ادا کرنا چاہا تو اندر کا تصادم اور اضطراب ایک Irony میں ڈھلتا چلا گیا جو عالی نسبی اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے پالکی سے نیچے پیر بھی رکھنے نہیں دیتی اور طعنہ نایافت بھی سننے نہیں دیتی۔ چنانچہ وہ پہلے ہی سے خود کی رو تشکیل Deconstruct کر دیتی ہے۔ دوہا تو دشت امکاں میں فقط اک نقش پا تھا' عالی کی شاعری ایک اضطراب زدہ روح ہے جو تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے کے لئے بے تاب رہی ہے' ایسا نہ ہوتا تو اس مجموعے کا نام "اے میرے دشت سخن" ہی کیوں ہوتا۔ مزید یہ کہ ہنگوہیں سر کی جستجو بھی آسان نہ تھی ـــــ "ایک عجیب راگ ہے ایک عجیب گفتگو' اندر کی آگ برابر جلتی رہی۔ اس نے کیا کیا نظمیہ شکلیں اختیار کیں' اس کا ذکر تو آگے آئے گا' پہلے اس درد کو سمجھنا ضروری ہے جس نے عالی میں ایک خاص طرح کی حس مزاح پیدا کی ہے خود شکنی کی' اپنے آپ کو رد کرنے کی' آگے بڑھنے اور خود پیچھے ہٹ جانے کی' یہ فقط حسن کی تغافل آزمائی نہیں جو بے خودی وہشیاری کو ایک ہی آن میں نبھا لے جاتی ہے بلکہ جو بلند حوصلگی کے احساس اور حالات و حوادث کے پیش نظر اس احساس کے شکست ہونے یا تکمیل کے امکان اور رد امکان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ذکر میں اس لئے بھی چھیڑ رہا ہوں کہ یہ Irony عالی کے یہاں ایک شعری محرک بھی ہے کہیں ظاہر کہیں مضمر' ظاہراً ان نظموں میں جہاں معاصرین کا ذکر آیا ہے اور مضمر ساری شاعری میں۔ بظاہر کچھ نظمیں سوانحی لگتی ہیں لیکن سوانحی نہیں ہیں :

دل دیوانہ من
کمہ نہ افسانہ من
سننے والوں کو بھلا کیسے یقیں آئے گا......
ہر طرف کذب و نمائش کا وہ غلبہ ہے کہ سچ مضحکہ اڑوائے گا
ان کے آگے نہیں چلتی ہے کوئی سعی فقیرانہ من
دل دیوانہ من
کمہ نہ افسانہ من

(پھر کئی بندوں کے بعد)

جیتے جی میرے کھلے گا نہ ذرا گلشن ویرانہ من......

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

آج تک خشک ہے زر دانہ من

یوں ہی روئے گا عزا خانہ من

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

(آشوب)

یوں تو "حد ادب" میں بھی یہی کیفیت ہے اور "نذر بابائے اردو" میں بھی، لیکن "نذر مشفق خواجہ" "ایک سادہ سی تقریب" اور "گواہی" اس پائے کی نظمیں ہیں جہاں یہ درد سرشاری کی حدوں کو چھونے لگا ہے اور شعری لطافت اپنا جواز خود بن جاتی ہے۔ "نذر مشفق خواجہ" مزے کی نظم ہے۔ سلیم واشاء کا احوال بر سبیل تذکرہ ہے، اصل معاملہ اپنے درد دل کا ہے۔ دوست باقی رہے نہ دوستیاں، زماں سیل رواں ہے، گزر رہا ہے، دوسرے نہیں رہے تو ایک دن شاعر بھی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس کی خواہش ہے کہ جہاں اس کی شاعری کو یاد کیا جائے وہاں دوسرے کاموں کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تاکہ پلڑا سبک نہ ہو:

تم پہ حق نہیں اتنا

مانگتا ہوں میں جتنا

میرے بعد جینا ہے

زہر زیست پینا ہے

مجھ کو یاد کر لینا

مختصر ہی کہہ دینا

انجمن کے دفتر میں

کالجوں کے محشر میں

ساتھ ساتھ راہوں میں

صبر میں کراہوں میں

جس قدر بھی دیکھی ہے

وہ جو مجھ پہ گزری ہے

غور طلب ہے کہ "نذر مشفق خواجہ" ہو یا "ایک سادہ سی تقریب" یا "گواہی" ان تینوں نظموں میں تصور اختتام سفر یعنی

موت کا ہے اور اپنی جمع پونجی یعنی شعری کمائی کا یعنی اثاثہ کیا ہے یا پیچھے کیا سرمایہ چھوڑا ہے؟ ان نظموں میں چونکہ منظر کا... بھی ہے اور جذبے کا فشار بھی' تینوں کی ہیئت مثنوی کی ہے جس میں عالی کی قدرت بیان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ایک تو درد کی زیریں لہر' پھر بے نیازی اور خود شکنی' ساتھ ہی روانی' سلاست اور گھلاوٹ' ملاحظہ ہو :

چلا جو میں تو مرا جلسہ وداع ہوا
کئی ہزار زبانوں کا اجتماع ہوا
پھر اپنے اپنے پھریرے ہوا میں لہرائے
اور ان کے سائے میں لاکھوں مصنفین آئے
پھر ایک وفد ز انبوہ قارئین آیا
اور ایک مجمع تنظیم ناقدین آیا

(ایک سادہ سی تقریب)

اور اس کے بعد یہ انکسار جو دعویٰ کمال کا پہلو بھی رکھتا ہے اور عالی نسبی کا بھی :

میں ہاتھ جوڑ کر ان سب کے سامنے آیا
حضور کیا ہے جو مجھ پر کرم یہ فرمایا
مجھے کبھی نہ کوئی دعویٰ کمال ہوا
نہ کچھ کسی سے مقابل کا ہی خیال ہوا
میں آپ سب کا کہاں تک لگا سکوں کا سراغ
مری متاع یہی ہیں بجھے بجھے سے چراغ

(ایک سادہ تقریب)

اس نظم کا اختتام بھی نہایت عمدگی سے شاعرانہ پیرائے پر ہوا ہے کہ مانا جانا نہ مانا جانا' شہرت پانا نہ پانا یہ سب اضافی باتیں ہیں' اصل چیز تو جذبہ شوق اور اندر کی تڑپ ہے اور اس میں سے کتنا زندہ رہ پاتا ہے' اس کی کسی کو خبر نہیں۔ فن تو اصلاً ہے ہی باب ناتمام سے' یہ تو احساس کا زخم ہے ہرا رہنا جس کا مقدر ہے :

تو کیا ہوا کہ ہر اک سمت سے صدا آئی
اور اپنی ساتھ عجب رنگ اک فضا لائی
چل آکہ تو بھی اسی باب نا تمام سے ہے
یہاں تو سب کو غرض اپنے اپنے کام سے ہے

"گواہی" میں اس خلش نے ایک اور مسئلہ کو چھیڑا ہے اور بڑے بڑوں سے مثالیں دی ہیں کہ ان میں سے بھی بعضے ایک صنف کے پابند نہیں تھے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس نے جو نثر لکھی ہے اس کا حق بھی اس کو دیا جائے' یعنی ذہن انسانی کی کچھ تازہ

دریافتیں اور ڈسکورسس (Discourses) ایسے ہیں کہ انھیں عوام کی سطح تک عوام کی زبان میں لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ہر کسے رابہر کارے ساختند' عالی نے جگہ جگہ جو شعر نکالے ہیں ان کی شعریت کی داد نہ دینا ظلم ہے:

سنا تھا ذہن میں کچھ خام مال ہوتا ہے
اسی میں صد ورق صد خیال ہوتا ہے

ودیعت ازلی' گردوپیش کے احوال
اگر سلیقے سے آمیز ہوں تو وہی مثال

کبھی وہ آب سے اولہ بنا کے دیتا ہے
کبھی وہ کوئلے کو ہیرا بنا کے دیتا ہے

میں اپنی حد میں غزل دوہے گیت کہتا تھا
خود اپنے سحر گلو میں بھی مست رہتا تھا

سوائے اس کے کوئی نثر کا خیال نہ تھا
غم عوام جڑوں سے شریک قال نہ تھا

خدا گواہ یہ اقرار استفادہ ہے
نہیں کہ اپنا ہی کچھ کیف وکم زیادہ ہے

شگاف سینہ فقط نظم ہی سے بھر نہ سکا
صغیر تھا کوئی فتح کبیر کر نہ سکا

میں ایک ذرہ صحرائے بے کران سخن
سوائے حسن طبیعت ملا نہ علم نہ فن
(گواہی)

یہ سارے مقامات وہ ہیں جہاں آپ بیتی شاعری بن گئی ہے۔ نظم منطق نہیں کہ دلیل کی تعبیر کو دیکھا جائے کہ کلیت کار شاعر کے حق میں جاتی ہے کہ نہیں اور جو منصفین ہیں وہی قارئین بھی ہیں' تاہم کون ہے جس پر خود شکنی اور دردمندی میں گندھی اس نظم کا جادو نہ چلے گا اور کون ہے جو اس کی خستگی کی داد نہ دے گا :

ہزار تفرقے' ناخواندگی' خرد بندی
زمیں پہ قبضہ بنام حق خداوندی

سو ان سے کشمکش صد جہات جاری ہے
بحفظ علم کہ ایک وہ بھی ذمہ داری ہے

ادھر کچھ ایسے بھی قاری کہ ذہن میں خارش
"خراب کردہ جہلے و فارغ از دانش"

تو میں جو تجلہ کہ شعر میں ہی رہ نہ سکا
سبب وہی ہے کہ بس اتنے بوجھ سہ نہ سکا

ملی جنہیں نہ کوئی بات قابل تعزیر
وہ قتل شعر سے ہی بس کی کر گئے تعبیر

وہ زور جتنا عیوب و صفات پر رکھیں
ذرا سی کلیت کار پہ نظر رکھیں

اس منظرنامے کے بعد آیئے دیکھیں کہ جس نئے طبیعیاتی سائنسی ڈسکورس پر عالی نے دسترس حاصل کی ہے اور جس کو وہ اردو میں لے آئے ہیں' شاعری میں اس کی ترکیب ذہنی کا عمل کیا ہے اور اس سے اثرپذیری کی کیا شکلیں بنتی ہیں۔ اس مجموعے کی خصوصیت خاصہ عالی کی شاعری کی یہی نئی جہت ہے۔ مجموعے میں ایسی نظموں کی اچھی خاصی تعداد ہے' لیکن شعری تشکیل کے اعتبار سے میرے نزدیک "امکان" اور "حجمی" بے مثال ہیں۔ "امکان" خلا کے موضوع پر ہے :

خلا خالی نہیں ہے

اس میں ایسے ایسے عنصر' بے ظہور اس طرح رہتے ہیں

کہ جیسے بعض شاعر بے لکھے بس ذہن ہی میں دل کے انگارے ملا کر شعر کہتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں وہ عنصر بے محرک' بے قوانین طبیعیات' ایک شوق خود وجودی میں
ابھر کر رقص کرتے ہیں

عناصر کا یہ رقص بغیر آغاز اور بغیر انجام کے ہے بلکہ زماں یا مکاں کا یہ پیانہ ہی نہیں ہوگا تو ہجر و وصال کی معنویت بھی بدل جائے گی :

اور اس کے بعد یا جب چاہیں ہم اک ساتھ ہی چھپ جائیں
دوبارہ کوئی قالب لیں نہ واپس آئیں
یہ ممکن ہے وہی وصل مسلسل ہو
ہماری نامکمل زندگی یعنی یہ بعدِ اختلاطِ جسم' آغاز و نشاطِ تشنگی' شاید وہاں
جا کر مکمل ہو

"حجی" خاصی طویل نظم ہے۔ متکلم خداوند سے خطاب کر کے اپنے عجز بیان کی معذرت چاہتا ہے کہ اس کی مشق سخن تنگ سخن نکلی کہ اس نے دانش کے مینا سے بھی سیراب ہونا چاہا اور جس صنف کو جتنا بھی اپنایا وہ مثال دلبر پیاں شکن نکلی۔ وہ گنج گہہائے بزرگاں کا احترام کرتا ہے کہ ان کے دبستانِ مراتب' صد مناقب' سجدہ تعظیم کے ارکانِ واجب' اپنا اپنا ایک عالم ہیں شاید وہ بھی "ان سے فیض اٹھا کر ان سے اونچا جانا جاتا ہے" لیکن :

کہاں ان کے ترانے اور کہاں میرے یہ بے رس' بے تراوش' تشنگان جہل اور
محروم ایمائیت افسانے

جمال و فن سے بیگانے
مودب ان نقوشِ پاس سے اک لمس جبیں کو بھی غنیمت جان کر تنہا گزرتا ہوں

یہ خودشکنی ایک شعری تحت بیانی بھی ہے جس کے پردے میں آدم اپنے حوصلوں' امنگوں کی بات کرتا ہے :

خداوندا
مجھے تو کم سے کم اتنی ہی صدیاں اور دے
دیکھوں' پڑھوں' سوچوں' لکھوں کچھ کام کر جاؤں
اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائق انعام کر جاؤں
نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اب یا عہد آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہِ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

خود کو بے الزام کر جانے کی خواہش عالی کی کلیدی خواہش ہے اور اسی نے عالی سے سائنسی نظموں کی جست لگوائی ہے۔

اس کے بعد شاعر کہکشاؤں' ماوراؤں کی بات کرتا ہے کہ یہ "کیسے بنتے اور خلا میں گھومتے رہتے ہیں' ہماری تقویموں میں ان کی ساعتوں' صدیوں کے پیمانے آتے ہی نہیں' ان کے سامنے سے روشنی گزر جائے تو اس کو بھی اندر کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھیل صدیوں سے جاری ہے اور صدیاں تو الف بے تھیں' اصل ہجی تو ابھی باقی ہے۔ اس کے بعد جلوۂ معنی کے حوالے سے Singularity کا قصہ چھیڑا ہے تو توانائی کا مسئلہ گویا قصوں کا قصہ ہے :

کر دیا ثابت توانائی
سمجھ میں آ کے بھی اب تک نہیں آئی
وہ کیا شے تھی
وہ کیا ہے کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے
کیا کبھی واپس بھی آئے گی جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہو گی

اس نظم میں ثابت وسیار اور پھر "انتشار" کی پوری داستان سموئی ہے۔ اس موضوع پر اس وضع کی دوسری نظم اردو میں نہ ملے گی۔ شاعر ہر صفحۂ معنی کو الٹ کر دیکھتا ہے کہ مفہوم سے محروم رہنا تو مقدر انسانی ہے۔ اب تک صدیوں کا الٹ پھیر تو پہلی یا دوسری کروٹ تھی' کائنات کے رازوں کو سمجھنے کے لئے مزید وقت چاہئے تاکہ ایسی زبان یا ایسا محاورہ بن سکے جو ہر کون ومکاں کے اسرار کی تعبیر پر قادر ہو' اب تک صدیاں تو محض الف بے تھیں' انسان کی تلاش بے کراں کا سفر جاری ہے' کیا معلوم یہ ہجی مکمل بھی ہو یا نہیں :

خداوندا
خیال اک زائرِ خوش گفتگو کو بے تسلی اک حریف آرزو نکلا
میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا
مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف ولفظ آ جائیں
انہی سے ایک زباں' تعبیر ہر کون ومکاں' اپنی بنائی ہے
مجھے سب ہوشمندان زر افشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی....

مگر اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

طویل نظمیہ "انسان" بھی شعر عالی کی نئی جہت کا حصہ ہے۔ سو اس کا ذکر بھی دوسری آزاد نظموں کے ساتھ کرنا مناسب ہے۔ "اے مرے دشت سخن" میں "انسان" کے چار حصے شامل ہیں جو تقریباً سوا سو صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں تین مسلسل ابواب ہیں اور چوتھا حصہ جس کا عنوان "حمد" ہے اس کی ترتیب ہنوز طے نہیں ہے۔ عالی اس نظمیے کو ایک مدت

سے لکھ رہے ہیں اور اس کے اجزا وقتاً "فوقتاً" رسائل وجرائد میں شائع ہو کر توقعات پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس پورے نظمیے میں منظر ناموں، کرداروں وغیرہ کی حرکات وسکنات، حلیے اور ڈرامائی متعلقات کو بقول مصنف قاری کی تفہیم وتصور پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا باب تقریباً بیس صفحوں پر مشتمل ہیں، حسد والا ٹکڑا بھی تقریباً اتنا ہی ہے، لیکن تیسرا باب پچاس صفحوں کو حاوی ہے۔ مکالمے چونکہ منظوم ہیں، پورے نظمیے کو غنائیے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ موضوع ومفاہیم کے اعتبار سے یہ ایک نادر الوجود اور بلند مقام کاوش ہے، خصوصاً ایسے دور میں جب طویل نظم پر توجہ بہت کم ہے اور روایتی رسمی شاعری کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ "انسان" کا کینوس ہی ایسا ہے کہ بہت سی توقعات پیدا کرتا ہے، لیکن چونکہ نظمیہ ہنوز نامکمل ہے، حتمی رائے دینا خارج از بحث ہے۔ یوں بھی سوا سو صفحات پر پھیلی ہوئی نظم کے مباحث ونکات سے انصاف کرنے کے لئے الگ سے مضمون کی ضرورت ہے۔ نظمیہ میں جمالی اور سیما دو بنیادی کردار ہیں، جمالی جسمانی طور پر اور سیما روحانی یا تصوراتی طور پر، کیونکہ اس کی یادیں بار بار لوٹ کر آتی ہیں۔ کئی مقامات پر سیما کی آواز مکالمے کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں مزاحم بھی ہوتی ہے۔ نظمیے میں کئی دوسرے نسوانی اور مرد کردار بھی ہیں جو مباحث اٹھاتے اور سوال وجواب کرتے ہیں۔ اسرار اور چند نوجوان احتجاجی صدائیں ہیں اور کئی آوازیں اور ہیولے بھی ہیں جو بار بار ابھرتے ہیں اور ڈرامائی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ جمالی اور اسرار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جمالی اسرار کو ذلیل، سیاہ باطن، مکروہ شکل والا کہتا ہے اور اسرار جمالی کو بیوقوف سمجھتا ہے/ کہ بس اتنی سی لونڈیا کے لئے مول لی اپنی بھی بدنامی/ لیکن حسینہ اس احتجاجی صدا کے بارے میں کہتی ہے/ کہ انھیں بھی جمالی سے کم مت سمجھئے/ جمالی شاعر کا Alter Ego بھی ہوسکتا ہے اور نظمیہ "انسان" اس حوالے سے اولاد آدم کے عذابوں، ثوابوں، خوابوں امنگوں، حوصلوں، خیالوں اور خلا کے رازوں کی داستان ہے:

کوئی مری داستان لکھئے
کوئی مری داستان لکھئے
جو میری مانند اور لاکھوں شکست کھائے ہوؤں کی تاریخ بھی رہے گی
جنھوں نے کس کس عذاب کو اک بہشت امید کی خوشی میں دبا رکھا تھا

بیچ بیچ میں عالی کی حس مزاح اور خود شکنی کے چھینٹے بھی ہیں:

میں کیسی انجمن میں جتا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور حکایتوں کے سنپولے اندر سے ڈس گئے ہیں
یہ میری کم مائیگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے لاؤ لشکر مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں

تاہم شاعر کی بلند حوصلگی لائق داد ہے کہ وہ ایسا بیان چاہتا ہے جو اپنی مثال آپ ہو:

زمیں کے مظلوم باسیوں کا فسانہ خود آسمان لکھئے
کوئی مری داستان لکھئے!

پہلے باب میں کون ومکاں اور تسخیر طبیعیات کی نئی دریافتوں کی طرف شاعرانہ اشارے ہیں، اس کا موثر ترین حصہ اس کا

اختتامیہ ہے جب جمالی کہتا ہے :

چلو بھی اب تم ہی اٹھو سیما
مری توانائی طلب سے تمام پردوں کو چاک کر دو
یہ پتھروں کی سلیں مری آتش تمنا سے خاک کر دو

ہوا اگر اس کے بعد کوئی نیا دھماکہ
تو وہ ہمارے لئے ہو جشن ابد اور اک ساتھ ہی چلیں ہم
زمین، شمس و قمر، سدائم
کوئی سمجھتا ہو ان کو تخلیق کوئی کہتا ہو ان کو دائم
یہ میرے جوش غضب کے آگے نہ رک سکیں گے
ہمیں تو وہ دوسرا دھماکہ عطا کرے گا
ہمارے سر اور سنگتوں کا اک ایسا شدھ اور ایک ایسا کال
عجیب عالم
جو آج ان کہکشاؤں کے رقص میں بھی بے بھاؤ اور مدھم
چھپا ہوا ہے

دوسرے باب کی جان وہ مکالمہ ہے جو نسوانیت پر حسینہ اور معینہ میں قائم ہوا ہے۔ حسینہ اپنا دکھڑا روتی ہے اور معینہ ہمت بندھاتی ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ مفاہیم جب موج در موج آتے ہیں تو مصنف مثنوی کا قالب اپناتا ہے اور مست و بے خود ہو کر داد سخن دیتا ہے :

معینہ

فرق طبقات ہی نہیں ہے غضب
شاونیت کا ارتقا ہے عجب
کیا لقب کیا حسین چابک ہے
"صنف نسواں تو صنف نازک ہے"
کی مقرر زراہ سر شوری
جسم کی وضع خاص کمزوری
جبکہ اس میں حمل کی طاقت ہے

بارہا زچگی کی قوت ہے

کم نہ تحقیر میں تھا مشرق بھی
اک مثل مغربی بھی خوب چلی
"شاخِ اخروٹ عورتیں کتے
جتنا پیٹا انہیں وہ ٹھیک رہے"
پچھلی صدیوں کا جو بھی ماتم ہے
اس صدی میں بھی روشنی کم ہے
ایک مسز ہیگمرسٹ پائی ہے
ایک سیموں دی بوار آئی ہے
اپنے ہاں ایک عصمت چغتائی
ان کے ہاں امرتا پریتم لائی
کچھ ادا جعفری کی سی بیاں
عورتوں کو دی عورتوں کی زباں
مادرِ ملت ایک روح زماں
جن سے ڈرتا تھا لشکرِ مرداں
ایک گذر گروں ہی بن کے رہیں
پھر بھی افواج ظالماں ہیں وہی
ایک صف بھی نہیں بنی ہے ابھی
جنگ کرنی بہت بڑی ہے ابھی

اور یہ عشق و شق کے ہفوات
یہ جو ہے ایک ادارہ جذبات
کچھ کثافت یہاں بھی دھونی ہے
اس کی تطہیر بھی تو ہونی ہے
کیوں رہے یہ چمن مراعاتی
رنگ و بو اس کے ہیں مساواتی

نغمہ یہ ہے رعایتیں مت دو
جو ہمارا ہے ہم کو واپس ہو

حسینہ

سیدھی سادی سی ایک حقیقت ہے
مجھ کو اک شخص سے محبت ہے
وہ کسی اور کا اسیر ہوا
چھوٹنا مجھ سے ناگزیر ہوا
پھر بھی ہر وقت اس کی یاد آئے
اور ہر ہر نفس میں بس جائے
میں کہ خود ایک حسین لڑکی ہوں
پڑھتی لکھتی ہوں اور سوچتی ہوں
اہل جاگیر کی نشانی بھی
یعنی معروف خاندانی بھی
کیسے کھودوں جو اس کو پا نہ سکوں
کیا کروں گر اسے بھلا نہ سکوں

....

ایسی باتوں کی کیا زباں ہوگی
کیا کچھ آرائش بیاں ہوگی
سیکس کی شرح و داستاں ہوگی
یا کوئی اور این و آں ہوگی

....

لفظیات نوی کے کیا معنی
کیا نہیں میرے دکھ ہی بامعنی

یہ اقتباسات قدرے طویل ضرور ہوگئے' لیکن یہ بحثیں کتنوں نے اٹھائی ہیں اور اس حسن معنی اور لطف کلام کے ساتھ۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دیگر مباحث بھی کس طرح پر ہوں گے' آفرینش کائنات اور ثوابت وسیارے کے لامختتم اسرار' انسانی فطرت' آگہی' خالق کون ومکاں' مذاہب عالم کی روایتیں' فلسفوں کے سلسلے' تاریخ' تشکیک اور بیسیوں دوسرے

مسائل تیسرے باب میں آئے ہیں۔ یہ سب ایک طرح کی خود کلامیاں بھی ہیں کہ عالی نے یہ سب مباحث ساز شوق کی دھن پر چھیڑے ہیں :

نہ بھولیو کہ مسلسل ہے ساز شوق کی دھن
بس ایک تار ہے ساری ردائے زیست نہ بن
سرور آگہی دیں گے نہ چند پیمانے
ہزارہا غم ہستی ہزار مے خانے

تاہم اردو نظم میں سائنسی فکر اور خرد افروزی کی بنا ڈالنے کو یہ چند پیمانے ہی بہت ہیں۔ شاعری اس سے زیادہ کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی۔ عالی نے جسے عذاب خرد پرستی کہا ہے' اس آتش کدہ خیال سے نکل کر عالی نے شاعری میں ایک پوری نئی گزرگاہ کو روشن کیا ہے۔ فکر و جذبہ' نیز تخیل و تجرید کی اس آمیزش سے شعر کا ڈھنا آسان نہ تھا۔ عالی کی جگر کاوی اور سینہ نگاری کی داد آگے چل کر ایک زمانہ دے گا۔ "انسان" اگر مکمل بھی نہ ہوئی تو بھی ایک مثالی نمونہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

اب آخر میں کچھ ذکر عالی کی مقبول صنف دوہے کا بھی ہو جائے جو عالی کے شعور کی زبان ہے اور پھر چلتے چلاتے ایک جھلک غزل کی جو عالی کے لاشعور کی زبان ہے۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ عالی موسیقی سے دوہے کی طرف گئے یا دوہے سے موسیقی کی طرف آئے' ان دونوں میں گہرا رشتہ ہو نہ ہو' عالی کی سائیکی میں سنگیت کے سر گھلے ہوئے ہیں۔ اس کی نشانیاں جگہ جگہ "اے مرے دشت سخن" میں بکھری ہوئی ملتی ہیں اور ان کی معنویت جیسی اس مجموعے میں نکھر کر سامنے آئی ہے اس سے پہلے ایسا نہ تھا۔ ویسے تو عالی نے اس کو سربستہ راز رہنے دیا ہے لیکن "گھنگھرو" سے پتہ چلتا ہے کہ مسلک خواہ یہ رہا ہو کہ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو' لیکن یہ سلسلے حضرت دہلی سے پونہ اور حیدر آباد تک پھیلے ہوئے تھے / تب سے مری روح میں وہ گھنگھرو / کبھی بجتے ہیں کبھی روتے ہیں / یعنی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جو ماورائے سخن ہوتی ہیں :

خود جھومیں گے پائل گھنگھرو ٹھمری اور کھماج
سر مرے جا کر گت تیری داسی میں گاؤں تو ناچ

ایک نظم راگ' جے جے ونتی' پر ہے جسے استاد فیاض خاں مرحوم کی نذر کیا ہے / من جھومے لہرائے' رے شیاما / یاد تمہاری آئے' رے شیاما / سر بھی ایک سعادت ہے جس کی معنویت فقط اس پر کھلتی ہے جسے یہ دولت نصیب ہو۔ عالی نے یہ مسئلہ 'سر کیسے بنا' میں چھیڑا ہے۔ اسی طرح "نذر امیر خسرو" اور "نذر شاہ لطیف" خاص ٹھاٹھ میں ہیں / یہ کافی ٹھاٹھ کی سندر راگنی / مدھم اور کھرج میں گاؤں ـــــــ ڈیرے جاؤں! / بلاشبہ یہ نغمے وہ ہیں جو ہر روح میں نہیں گونجتے۔ دہلی کے دو تاریخی واقعے میری یادداشت کے ہیں' ایک موقع پر میں شریک تھا دوسرے میں شریک نہ تھا۔ عالی کا قیام میرے یہاں تھا' ان کے ایک دوست تھے رجیؒ (راجندر کمار) بے حد باذوق انسان' زبردست حس مزاح کے مالک' باتوں باتوں میں اڑتی چڑیا کے پر کتر لیتے تھے' جیوتش ہدیا کے گنی' جوہریوں کے جوہری' حیات ریجنسی میں ٹھکانہ تھا' امریکی یورپی بالکائیں طواف کرتی تھیں' بہر حال سنگیت کے ایسے رسیا کہ کوئی استاد کیسا کم آمیز ہو' رجی کی سب سے آشنائی تھی۔ (افسوس کہ قدح بشکست و آں ساقی

نمائند) عالی سے ایسی گاڑھی تھی کہ عالی دہلی میں جہاں ہوں جس جگہ ہوں' یہ کھوج نکالتے اور قدرِ مشترک فقط اتنی تھی کہ راگ انوراگ سنگیت کے دونوں رسیا۔ بہرحال مشہور فلم اسٹار کبیر بیدی کے یہاں محفل تھی جس میں پروتما بیدی تو تھیں ہی' مشہور اداکارہ اور کسی زمانے کی شعلہ جوالہ وجینتی مالا بھی بھارت ناٹیم کر رہی تھیں۔ "کالی داس نے شکنتلا کے" والے دوہے اسی موقع کی یادگار ہیں۔ ان دوہوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باوجود شدائد کے ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی آس سنگیت کی مٹھاس میں کی گئی ہے :

کلا جہاں ہو پیار کریں گے اگر لیا پہچان
کلا کا سورج دیش نہ دیکھے وہ جگ بھر کی جان
ہندوستان اور پاکستان پہ ہے کڑے کیوں آئے
آج نہ سمجھیں کل سمجھیں گے عالی کے ادھیائے
جتنا ہے بس نیتا ہے رس کیسے ملے مٹھاس
اے دونوں ہمسایو پھر بھی گھولتے رہنا آس

دوسرا موقع وہ ہے جب عالی دہلی کلاتھ مل کے مالک لالہ جنسی دھر کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے' موریہ شیرٹین میں استاد اللہ رکھا اور طبلہ نوازی کے نوجوان جادوگر ذاکر حسین کا پروگرام تھا۔ عالی کی نظم "یہ خسرو کی ایجاد" جس میں دھواریں' ضربیں' گوتیں' نوک جھونک' خالی وغیرہ عالی نے کچھ نہیں چھوڑا' اسی موقع کی نظم ہے جب ذاکر حسین کی انگلیوں کے رقص نے سماں باندھ دیا تھا۔ عالی کی تخلیقیت کا موسیقی سے جو رشتہ ہے' اس بارے میں غزل کے ان دو شعروں میں بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے :

اتنی بڑی بزم موسیقی میں تری
اپنی یہی لے مدھم مدھم کافی ہے
جیون راگ کے تان پلٹ کیا سمجھوگے
عالی صاحب تم کو سرگم کافی ہے

سر سرگم سے عالی کا جو رشتہ ہے اسی کے پیش نظر ذیل کے دوہوں کی لفظیات اور اصطلاحوں اور فضاسازی پر غور کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

مجھ میں کچھ سر کھوئے ہوئے ہیں وہی لگائیں اٹک
نا یہ پہاڑی نا بھٹیالی یہ ہے دوہا راگ
سر اور شبد اور دھیان کی اگنی شعلے جن کے لاکھ
خسرو پر جو جلیں پتنگے عالی ان کی راکھ

ان دوہوں کو مزید دیکھیے کہ اول تو عالی نقطے گننے والوں کو کس خوبی سے لاجواب کر رہے ہیں کہ چیزیں جب ایک پھر سے

دوسرے کو منتقل ہوتی ہیں تو نہ صرف وضع قطع بدل جاتی ہے بلکہ جمالیات بھی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور شاعری ہو یا سنگیت' سارا کھیل رس یعنی تاثیر کا ہے' یہ نہیں تو خالی لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا :

تانپورہ بھی گھر میں رکھا سارنگی بھی لائے
اے بھی گائک سر کے بنا سر کھیل نہ کھیلا جائے

طبلے رے طبلے تیری ٹھک سے پڑے ہے دل پہ چوٹ
پگلے رے پگلے یوں بھی نہ ہو تو ہم دونوں میں کھوٹ

میرے ماترے گننے والے تو سچا پر یار
جب خسرو کے ہاتھ سے گزری وینا ہوئی ستار

یہ تو سنگیت سے رشتے کی بات تھی' ورنہ دوہے میں عالی کی جو حیثیت ہے' وہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا' (ویسے' یہی داد دینے والوں میں ایک کافر بھی ہے) عالی کے دوہوں' عشق و عاشقی کے پیرایوں' پریم رس اور بھگتی رس کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ سامنے کی باتوں کی تکرار عبث ہے' یہ فصل کبھی کی کٹ چکی اور اب تو اٹھ چکے ہیں زمیندار ان زمینوں کو۔ سوائے اس کے کہ سردست زیر نظر مجموعے سے میں اپنی پسند کے کچھ دوہے نشان زد کر لوں۔ ان کی معنویت اکہری نہیں' اور اس بارے میں فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میرے نزدیک یہ تمام دوہے اچھے خاصے پولیٹکل بھی ہیں اور مٹی سے جڑے ہوئے ہیں :

ایسا تجھے بنا کر اپنے خوش تھے اور حیران
تیرے من میں نرمی رکھنا بھول گئے بھگوان

گوری تیری بھینٹ کو شبد اور دھیان کہاں سے لائیں
سندرتا کی سبھی مثالیں خود تجھ سے شرمائیں

جھنّا راج بھی راجا جیسا اصل سمجھ نہ پائے
جو آنکھوں کی سوئیاں نکالے وہی رانی بن جائے

جب تک سے نہیں دیتا ان نیتاؤں کو چھانٹ
تاش کے ہیں وہی باون پتے جیسے بھی دو بانٹ

ڈوڑنے والو دوڑ پر یہ دھیان نہ جانے نہ پائے
آخر میں بس وہی جیتے گا جس کو سے جتائے

میں نہیں کوئی کٹر پنتھی سنو مرا اودھیائے
مسجد کو مندر کہنے سے خدا نہ بدلا جائے

پھر بھی دوہا دوہا ہے اور غزل غزل' اتنا تو پہلے کہہ چکا ہوں کہ غزل عالی کے دل کا چور ہے وہ مغل بچے ہیں' دوہے کی سندر ناؤں اور راس لیلاؤں کو انہوں نے جوانی ہی میں مار رکھا تھا' چھیڑ خوباں سے بھی جاری رہی گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ حسرت بھی شاعری میں بڑے بڑے کام کرالے جاتی ہے۔ دوہا عالی کی دھرتی ہے تو غزل عالی کی زمین ہے۔ عالی کی درویش صفت قلندری نے دھرتی سے بھوئی ہے تو زمین سے بھی ناتہ نہیں توڑا۔ البتہ آٹھویں سر کی تلاش میں انہوں نے زیادہ خون جگر نظم میں کھایا ہے۔ غزل سے اس کم تنگی کے باوجود جب جب غزل ہوئی ہے' لطف واثر اور آزادگی و بے نیازی کا چشمہ پھوٹ بہا ہے۔ ان شعروں پر کس کی نگاہ نہ ٹھہرے گی :

ساری رات ستاروں آگے کیا رونا
صبح ہی کرلے گریہ شبنم کافی ہے
ابھی ترے انکار پہ کیوں روؤں مجھ میں
اپنے آپ پہ ہنسنے کا دم کافی ہے
لطف نگہ کی خواہش تھی سو کب کرتے
آج تلک وہی چشم برہم کافی ہے

اس غزل میں کراچی کا اشارہ نہ بھی آتا تو بھی فضا کہہ رہی ہے کہ کس درد نے یہ شعر کہلوائے ہوں گے :

دوڑو کہ ے کشوں کے شرار نفاق سے
اک آگ سی خبر ہے کہ مے خانہ جل گیا
محدود رکھ نہ اپنے سیاق و سباق میں
ہر خواب کی قسم کہ ہر افسانہ جل گیا
مابین والیان چمن کیا تپش ہے یہ
ایک ایک میرے پھول کا زردانہ جل گیا
روکو یہ آگ ورنہ کراچی کے ساکنو
جنت سا ایک شہر تمھانہ جل گیا

آبِ حیات جیسے وہ معمار واپس آگئیں
دیکھیں کہ کتنی جلد یہ کاشانہ جل گیا

جس طرح دوہوں کا حصہ میں نے اپنے پسندیدہ دوہوں پر ختم کیا تھا' اب شعروں کے انتخاب سے رسوا ہونا ہی ہے تو پھر پسند بھی سہی۔ ملاحظہ ہو حالی نے غالب کی زمین میں یہ تغیر قافیہ کیا گل بوٹے نکالے ہیں*** ان اشعار میں برش و روانی اور جزالت و محشتگی اس درجہ ہے کہ بہائے لئے جاتی ہے اور پھر انسان سوچتا ہے کہ حسن و لطافت کی جو پرچھائیں سی گزر گئی' اس کی معنویت کے ہیچے تو کچے نہیں :

گزر گیا ہے جو وقت اس میں جاکے دیکھتے ہیں
طرح قبول غزل آزما کے دیکھتے ہیں

دکان کم سخنی کی بھی منفعت مت پوچھ
ہم اپنے آپ کو برسوں گنواکے دیکھتے ہیں

ہر آدمی پہ ہوئی وحی کائنات ارزاں
سب اپنے طور سے جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ تحریر خود کو لکھوائے
مجھے ہٹا' مرا دیوان اٹھاکے دیکھتے ہیں

دل تباہ و فسردہ تمہیں قبول نہیں
کہو تو علف و اضافت ہٹا کے دیکھتے ہیں

ہم اہل بزم کو کیوں اپنے اعتماد میں لیں
کہ وہ بھی تو ہمیں نظریں جھکا کے دیکھتے ہیں

جن اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
انہیں یہ بسی و پنہوں سنا کے دیکھتے ہیں

عالی نے بہت پہلے کہا تھا 'کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز' ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز' عالی کی شاعری کی غالب کیفیت خود کلامی کی ہے' اور اب تو انہوں نے دشت سخن کو آواز دی ہے' ان کی تحت بیانی بھی اسی حوالے سے ہے' مرزا غالب اور خواجہ میر درد دونوں سے ان کا رشتہ ہے' ایک سے دودھیالی دوسرے سے ننھیالی' کلاسیکی رچاؤ میں اس روایت سے اثر لینا برحق' لیکن راہ عالی نے ہمیشہ اپنی لی ہے۔ اختر الایمان ان کے دلی کالج کے ساتھی تھے' ان سے دوستی بھی بہت تھی' اور اپنے عہد پر اختر الایمان کا اثر بھی ہے لیکن نہیں ہے تو عالی پر۔ عالی فیض' راشد' میراجی سب کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ مانتے صرف میراجی کو ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے۔ "میراجی کو ماننے والے کم ہیں لیکن ہم بھی ہیں۔ فیض کی بات بڑی ہے پھر بھی اب ویسا کون آئے گا"۔ ایک اور نظم "جو بولے مارا جائے" میں صاف اقرار کیا ہے کہ سب تو میراجی کو بھول گئے' لیکن مجھ جیسا معتوب زماں میراجی کو یاد کرتا ہے۔ پھر ایک اور نظم میں :

اب فیض بھی ہیں اور راشد بھی

وہ بہت بڑے پر میراجی!

ہاں میراجی وہ چمکتے ہیں

کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی کس شان کے ساتھ دمکتے ہیں!

میراجی سے یہ نسبت کس حوالے سے ہے؟ بقول میر۔ کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں' اجل رسیدہ' جفادیدہ' اضطراب زدہ۔ اس ملامتیہ احساس کا کچھ رشتہ (عالی جی کے اشراقیہ سے ہونے کے باوجود) ان کی خود شکنی' بے نیازی اور خستگی سے ہو سکتا ہے' یا پھر میراجی کا غیر رسمی نرم لہجہ' یا تجربیت یا تازہ کاری' یا پھر دھرتی کا رس جس اور لوک رشتوں کی جڑوں میں اترا ہوا ہونا' بہرحال مطابقتیں یا جزوی مناسبتیں اتنی سادہ نہیں ہوا کرتیں کہ حتمی طور پر بیان میں آجائیں۔ عالی کا رول ماڈل جو بھی رہا ہو' انہوں نے شعر کی وادی میں اپنی راہ چننے کے بل طے کی ہے اور اپنی ڈگر الگ بنائی ہے۔ دوہا نگاری کو اردو میں اس طرح رچا بسا دینا کہ وہ اردو کی صنف ہو جائے' عالی کا ایسا تاریخی کارنامہ ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا لیکن انہوں نے اس پر قناعت نہیں کی' غزل تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے' مثنوی کو بھی انہوں نے بہت نبھایا اور اب نظم میں سائنسی فکری جہت کھول کر ایسا معنی خیز تخلیقی تجربہ کیا ہے جس کے آئندہ امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں جو کچھ ہوتا ہے اندر کی آگ سے ہوتا ہے۔ عالی کا کہنا ہے کہ "سات سروں کی آگ ہے آٹھویں سر کی جستجو" آٹھویں سر کی جستجو گویا ناممکن کو ممکن بنانے کا عمل ہے اور یہی سچی شاعری کا منصب ہے' جس کا عزم عالی نے کیا ہے۔

۱۹۹۷ء

☆ ڈاکٹر نارنگ کا یہ مضمون بھی جلد دوم میں شامل ہو رہا ہے۔ وہ ۱۹۸۸ء میں چھپنے والی کتاب "عالی فن اور شخصیت" مرتبہ ایم حبیب خاں' علمی مجلس' دہلی میں شائع ہوا تھا۔

☆☆ نظیری نیشاپوری

☆☆☆ یہ غزل ستاون شعر کی ہے۔ پوری غزل مجموعے "اے مرے دشت سخن" میں شامل ہے۔ ناشرین

ڈاکٹر وحید قریشی

سجل جذبوں اور کومل آواز کا شاعر

عالی کے دو روپ ہیں۔ایک عالی وہ ہے جو اپنی شاعری میں راجہ اندر دکھائی دیتا ہے ایک ایسا شخص جو حسین وجمیل ہے جس میں دوسروں کو لبھانے اور چاہے جانے کی شدید خواہش ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں سب سے حسین چیز اس کی اپنی ذات ہے جسے یہ گمان ہے کہ ساری دنیا کے پری رواس پر مرتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو "مرزا پارس ناتھ" خیال کرتا ہے اور جس کا ایک لمس انسانوں کو سونا بنادینے کے لیے کافی ہے سندر ناریں اس کا دم بھرتی ہیں شہرت اس کے پاؤں چومتی ہے اور عشق وعاشقی کے سوا دن رات اسے کوئی کام نہیں یہ جمیل الدین ایک نواب زادہ ہے جسے دنیا جہان کی آسائشیں میسر ہیں۔ اس کے ہاں رنگ ورامش کی محفلیں سجتی ہیں اور اس برات کا دولہا وہ خود ہے۔ وہ مرزا غالب کے خاندان کا فرد ہے اور آغاز جوانی کے سارے قصے جو غالب کے ساتھ مشہور ہیں جمیل الدین عالی کو اپنی ذات کے ساتھ منسوب دکھائی دیتے ہیں۔ اسے خانوادہ غالب سے متعلق ہونے پر فخر ہے۔ مرزا کی عیش پسندی اس کا آئیڈیل ہے اور انا کے سہارے وہ اپنی شاعری کے لب ولہجہ کو بھی مرزا غالب کے قریب تر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ "غزلیں' دوہے' گیت" کا عالی بظاہر مرزا غالب ہی کا دوسرا روپ ہے۔ غالب کی بحریں' غالب کا ذخیرہ الفاظ' غالب کی سرخوشی وشادابی عالی کے پہلے مجموعہ کلام میں بنیاد بنتی ہے۔ دوہوں میں غالب والا روپ ذخیرہ الفاظ سے اگرچہ دور چلا جاتا ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے یہاں بھی عاشق مزاج عالی ہے جس پر مرنے والوں کی کمی نہیں جو خوبان دہر کو راتوں کی زینت اور ان کے قرب کو اپنی متاع عزیز جانتا ہے۔ لیکن "لاحاصل" تک آتے آتے یہ رنگ ماند پڑنے لگتا ہے۔اب اسے اپنی بدنامی کا احساس ہے۔ سو حصی کے ہاتھوں لٹنے میں شکست کا ہلکا سا احساس بھی ہے۔ سندر ناریں جو آپ طلب بن جایا کرتی تھیں' اب ماضی کی یاد بن کر سنگ انفتی ہیں میر کارواں تھک چکا ہے۔اب ٹھکرائے جانے کا خوف بھی ہے۔خوف زدہ رہنے کی داخلی کیفیت اسے چین نہیں لینے دیتی اور وہ مرگ اور خوف مرگ کے عذاب میں مبتلا ہے "غزلیں دوہے گیت" کے عالی کے ہاں بھی یہی دوہری شخصیت تھی لیکن وہاں اپنے حسن کی پوجا زیادہ ہے اور عورت کو محض کھیل تماشا دیکھنے کا قصہ زیادہ تیز تھا اور اپنی ذات کا داخلی حزن وملال بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں یہ احساس اسے ستانے لگتا تھا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے محض اندر سے ٹوٹنے ہوئے ہونے کی علامت ہے۔ اس کا سارا جوش انجمن آرائی اصل میں باطنی خلا کو پر کرنے کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔

عجیب ہے مری بے مدعا حیات اے دوست
کہ اور بڑھتا چلا جارہا ہے ذوق ستیز

تمام عمر رہا خوف ناپذیرائی
جدھر سے گزرے ہیں دیوانہ وار گزرے ہیں
(غزلیں دوہے گیت)

میری ہنگامہ پسندی پہ نہ الزام رکھو
شاید اک یہ بھی علاج غم تنہائی ہے
جلسوں اور ہنگاموں میں جب تنہائی ڈستی تھی
باغوں اور ویرانوں میں جاکر دل بہلاتے تھے
ہائے یہ اندر کی تنہائی جس کے لیے ہم چھوڑ آئے
تیرے شہر اور تیرے قریے اور اپنے ویرانے بھی (لاحاصل)

عالی کی ذات کا خارجی روپ اس نواب زادے کا ہے جو اپنے درباریوں میں گھرا ہوا ہے' جو کانوں کا کچا ہے جس کی انا اسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی' جسے ہر رات نئے چہرے سے واسطہ ہے جو اپنے شبستان کو سجانے کے لیے نئے نئے شکار کرتا ہے جس کے دن سیاسی جوڑ توڑ اور محفل آرائی کے لاکھوں جتنوں پر مشتمل ہیں دن کی سرگرمیاں ہمہ وقت مصروف رہنے اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی خواہش' کسی پر بھروسا نہ کرنے اور قریبی دوستوں کی خاطر توڑ پھوڑ میں مصروف رہنے کی بے تابانہ لگن اسے شاعری پر توجہ کرنے سے روکتی ہے"غزلیں 'دوہے گیت" سے "لاحاصل" تک کا سفر شعری اعتبار سے ایک ست روسفر ہے۔عالی کے اندر شاعری کی بے پناہ صلاحتیں موجود ہیں لیکن ان سے جو کام اس نے لیا ہے اس کے نتیجے میں اس کا سرمایہ قلیل اور اس کا دائرہ اثر محدود ہے۔ عالی کے ہاں غزل کا رچاؤ اس کے اولیں مجموعے میں صرف کبھی کبھی سامنے آتا ہے۔ابتداء میں وہ ایک سکہ بند شاعر کے طور پر سامنے آیا۔ غزل کے رسم ورواج اسے اساتذہ کے پختہ رویوں کی بار بار یاد دلاتے ہیں۔ پہلے مجموعے میں ایسے لمحات کم ہی ہیں جب عالی نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کو گرفت میں لیا ہو۔ وہ صرف دوہوں میں اساتذہ کے کلام کی بازگشت سے چھٹکارا پاسکا ہے۔ غالب سے اس کی رشتہ داری مسلّم 'لیکن غالب اس کے حقیقی راہبر نہیں۔۔ غالب کی فلسفیانہ افتاد طبع اور عالی کی رومانی وضع میں بہت فرق ہے۔ اس لیے پیروی غالب زیادہ سودمند نہیں رہی۔ وہ اس سے ہٹ کر جب دوہوں کی زبان میں بات کرتا ہے تو زیادہ اعتماد کے ساتھ اور بہتر شعری تجربے کا اظہار کرتا ہے ۔غالب کی آواز سے آواز ملانے کی خواہش تو انا کا ایک ایسا پرتو ہے جس میں اس کا اپنا خون شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اول اول قارئین کے لیے اس کی غزلیہ شاعری درخور اعتنانہ تھی' بلکہ اسے دوہوں کے شاعر کے طور پر ہی شہرت ملی۔ یہی نہیں کہ دوہے اردو میں نئی چیز تھے اور عالی نے ان کو اختیار کیا بلکہ عالی کے دوہوں کا آہنگ' قوت وسرشاری عالی کا فن بنی۔ اس نقش گری نے اسے روایتی اور رسمی شاعر کی جگہ ایک اچھا شاعر ثابت کیا۔ اس رنگ میں عالی کو کسی دوسرے شاعر کی انگلی پکڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اپنے لہجے کی کھنک اور عشقیہ کیفیتوں کے سیدھے بیان کی وجہ سے زیادہ کامیاب ہے۔ دراصل عالی جذبے اور احساس کا شاعر ہے۔اس

کے عشقیہ تجربات نرم ونازک کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے ہاں غالب کا سا کوئی بڑا دعویٰ نہیں، یہاں عالی زندگی کو فلسفے کی مدد سے حل کرنے یا اس کا تجزیہ کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا ہے۔ وہ تو صرف ہلکی ہلکی رومانی کسک کا اظہار کرتا ہے۔ یہ دھیمی لے اس کے دوہوں کے علاوہ غزلیہ اشعار میں بھی ہے۔

جانے کیوں اک در ودیوار کا پابند ہوا
میں کہ منسوب کیے جاتے تھے صحرا مجھ سے

اے دل کے طوفانو اٹھو، اے آنکھو اب برسو بھی
تھوڑی دیر میں چاند کا مکھڑا بدلی میں چھپ جائے گا

رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سوتا نرم خیالوں کا
دن ہوتے ہوتے یہ کس کس دھارے میں مل جائے گا

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں ناامید بھی نہ رہوں

حیراں ہوں کہ آج تیرے جلوے
محتاج نگاہ ہو گئے ہیں!

اب ایسی حیرت ووارفتگی کو کیا کہیے
دعا کو ہاتھ اٹھائے اٹھا کے بھول گیا

یہ بھی سمجھ سکی ہے نہ اب تک نگاہ شوق
تم نے کہاں فریب دیا اور کہاں رہے

کرب ہو کہ لذت ہو زندگی غنیمت ہے
اے شرارۂ بے تاب بس یہی غنیمت ہے

یہ سب اشعار، غزلیں، دوہے گیت، کے ہیں۔ یہی رومانی تصور "لاحاصل" میں زیادہ نمایاں ہے۔ یہاں روایتی پرت اور بھی کم ہو گئے ہیں۔

ہم نے سحر میں بھی رو رو کے جو پکارا ہے تجھے
کتنے غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئی ہے

ہوئی امید کہ اب قید تن سے اٹھتی ہے
اک آگ سی جو مرے تن بدن سے اٹھتی ہے
کہاں سے گزرے کسے پائمال کر جائے
بس ایک تند ہوا ہے دمن سے اٹھتی ہے
عجیب رنگ کا طوفان باد ہے اس بار
تمام گرد حصار چمن سے اٹھتی ہے

جدا ہوئے بھی تو دونوں کی راکھ چمکے گی
سلگ چکی ہے تری روح میری جاں کی طرح
پہنچ کے منزل جاناں پہ ہم بکھر سے گئے
کسی تھکے ہوئے سالار کارواں کی طرح

عالی سجل جذبوں اور کومل آواز کا شاعر ہے۔ "غزلیں دوہے گیت" میں یہ احساس زیادہ تر دوہوں میں ابھرا ہے اگرچہ غزلیں بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں۔ لیکن "لاحاصل" میں اس کے رومانی رویوں میں ذرا تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی عمر اور تجربے کی دین ہے۔ عالی نے خارجی روپ کی بجائے داخلی روپ کی طرف رخ پھیر لیا ہے۔ اپنی "مجلسی حرکات" اسے خود اوپری لگنے لگی ہیں۔ وہ "کھیل تماشے" کی جگہ ماہ وسال کو سوچ کی میزان پر تولنے لگا ہے۔ اس "بازتوجہی" کے زیر اثر اس کی شاعری میں "کچی عمر" کی عاشقانہ لن ترانیوں کی جگہ احساسات پر غور وخوض کا مرحلہ بھی آیا ہے۔ اب وہ الجھے ہوئے جذبات کا مصور محض نہیں' ان کی نوعیت سمجھنے کی کوشش میں سرگرم ادھیڑ عمر کا شاعر ہے۔ اب اسے احساس ہے کہ اس کی صدی محض اس کی ذات کی صدی نہیں۔ ذات سے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔

ہر صدی کے موڑ سے راستے وہی کھلے
لوگ دیکھتے رہے چھپی حقیقتوں کے خواب

کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں
کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی

سننے والو غور نہ کرنا ورنہ پتا چل جائے گا
ہم نے جتنے باغ سجائے وہ اب تک ویرانے ہیں

عالی کو اپنی "بے حاصلی" پر غور کرنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ اب اسے معلوم ہے کہ وہ دن کو اتنا سرگرم عمل کیوں رہتا ہے۔ اپنی تنہائی کو کس طرح چھپانے کے لیے اس کی ذات کا ایک رخ اسے بار بار دھو کے دیتا رہتا ہے۔ اب تک وہ اپنے آپ کو کیا کیا فریب دیتا رہا ہے۔ اس نے کشمکش میں کتنے مخلص ساتھی اور کتنے پیارے دوست کھو دیئے ہیں۔

اس چالیس برس میں تم نے کتنے دوست بنائے ہیں
اب جو عمر بچی ہے اس میں کتنے دوست بناؤ گے
بچپن کے سب سنگی ساتھی آخر کیوں کر چھوٹ گئے
کوئی یار نیا پوچھے تو اس کو کیا بتلاؤ گے
جو بھی تم نے شہرت پائی جو بھی تم بدنام ہوئے
کیا یہی ورثہ اپنے پیارے بچوں کو دے جاؤ گے

سننے والو غور نہ کرنا ورنہ ہمیں ٹھکرا دو گے
ہم اندر سے سخت کمینے باہر سے دیوانے ہیں

عالی جب اپنی سابقہ "کارگزاریوں" پر نظر ڈالتا ہے تو اسے یہ مساعی محض انا کی تشفی کا سامان نظر آتی ہیں۔ ان بے سود سرگرمیوں کو جب وہ غور سے دیکھتا ہے تو اس کا داخلی حزن اسے اور بھی پریشان کرتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنے آپ سے خوف آنے لگتا ہے۔ وہ خوف مرگ کا شکار ہے۔ موت کا خیال بار بار اسے پریشان کرتا ہے۔ گھبراہٹ اور خوف اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتے۔

کچھ ناکام ارادوں نے بھی ہمت توڑ کے رکھ دی ہے
کچھ اپنی کم مائیگیوں کے خوف سے بھی گھبراتے ہیں
نوعمری میں عشق کی گلیاں اندھے پن سے مل نہ سکیں
اور اب جاتی عمر کے سائے کوسوں دور بھگاتے ہیں

اس بار جو آیا ہوں تو اے کوچہ جاناں
تیرے در و دیوار صدا کیوں نہیں دیتے

احساس محرومی اور شدت تنہائی میں شاعر موت کے خوف میں بھی مبتلا ہے۔ بظاہر وہ موت کو دعوت دیتا نظر آتا ہے لیکن یہ دراصل کیمو فلاج کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ اس کے خوف ہی کا ایک رنگ ہے۔ وہ موت کی ہر آہٹ پر کان

لگائے ہوئے ہے۔وہ اپنے انجام کو دیکھتا ہے۔ خواہش مرگ اور خوف مرگ کے درمیان کشاکش اس کی شاعری میں ایک نئی جہت کے طور پر راہ پاتا ہے۔اس کشاکش میں حزن وملال کی وہ رو بھی ہے جسے رومانی شاعری کا بنیادی وصف قرار دیا جاتا ہے۔

ہنستے ہو جو ہر لمحہ مرے قتل انا پر
لوگو مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

میں ایک جان ہوں کب تک ہزار سمت کھنچوں
اب آئے موت گلے سے لگائے ماں کی طرح

پہلے تو یہ تجربہ صرف نیند تک گیا تھا اور شاعر اس میں یک گونہ لذت بھی محسوس کرتا تھا۔

ذہن پر چھا گئی موت کی بے حسی نیند آنے لگی
ڈھونڈتا ہوں اندھیروں میں آسودگی نیند آنے لگی

لیکن نیند سے ایک قدم آگے عالی موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اپنی زندگی اور حاصل زیست کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی بے حاصلی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

عالی کس کو فرصت ہوگی ایک تمہیں کو رونے کی
جیسے سب یاد آجاتے ہیں تم بھی یاد آجاؤ گے

آہستہ آہستہ موت کے غار میں اتر جانے والا عالی' نشاط زیست کی منزل سے موت کی وادی میں داخل ہونے والا عالی' اپنے انجام پر حیران ہے۔اب تیسرے مجموعے سے پتا چلے گا کہ اس نے اس انوکھے تجربے میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے؟

عالی کی پہلی اسٹاک ٹیکنگ "لاحاصل" میں ہو چکی ہے۔ دوسری اسٹاک ٹیکنگ تیسرے مجموعے میں ہوگی۔ محمد حسن عسکری نے عالی سے بعض توقعات وابستہ کی تھیں' وہ "لاحاصل" میں تو مکمل طور پر پوری نہیں ہوئیں شاید تیسرے مجموعے میں پوری ہو جائیں۔ عالی نے اب غوغا آرائی اور انجمن سازی کو ترک کر دیا ہے۔ہو سکتا ہے یہ تبدیلی عالی کی شاعری کے لیے مفید ثابت ہو۔اور ہم گلڈ والے عالی کی جگہ شاعر عالی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔۔۔۔ وہ شاعر عالی جس سے ابھی یہ توقع ہے کہ اس کا نام اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہنے والے شاعروں کے ساتھ لیا جائے گا۔

(از "تخلیقی ادب" کراچی ۱۹۸۴ء'
(از عالی۔ "فن اور شخصیت"
مرتبہ۔ ایم حبیب خاں [illegible] مجلس دہلی ۱۹۸۸)

محترم ڈاکٹر وحید قریشی [illegible] میں [illegible] گلڈ مغربی پاکستان شاخ میں [illegible] کے لئے عہدہ دار بھی رہ چکے ہیں۔ ناشر

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

جمیل الدین عالی ایک منفرد شعری آہنگ کا شاعر

(اقتباسات)

جمیل الدین عالی ہمارے جانے مانے شاعر ہیں اور جب ان کی شخصیت اور شاعری کی نسبت سے ان کو جانا مانا کہا جاتا ہے تو اس سے ان کی مقبولیت اور شہرت کا وہ وسیع تر حلقہ پیش نظر آتا ہے جو یہ کہئے کہ ایک معنی میں مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مقبول و معروف ہونا کسی بھی فن کار کے لئے طمانیت و مسرت کا باعث ہو سکتا ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کی ٹوٹی ہوئی کمان کا شکستہ تیر ان کا قلم بن گیا ہے لیکن شاعری ان جیسے کسی شخص کے لئے سو پشت سے جس کا پیشہ آبا سپہ گری ہو' ذریعہ عزت نہیں ہو سکتی یہ بات غالب سے بھی کچھ زیادہ بے تکلفی کے ساتھ جمیل الدین عالی کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ جس دودمان عالی سے تعلق رکھتے ہیں اس کے افراد کا صاحب سیف ہونا تو اپنی جگہ مسلم ہے لیکن انہوں نے قلم کی فتوحات کو اپنی میزان قدر میں کچھ زیادہ اونچا درجہ دیا اور ہندوستان و پاکستان میں ایسے کم خاندان ہوں گے جن میں ایک کے بعد دوسری نسل زبان و ادب کی خدمت اور اہل فن کی قدر افزائی کرتی ہوئی نظر آئے جس طرح لوہارو خاندان نظر آتا ہے۔

عالی صاحب نے جس شوق و شغف کے ساتھ اور بڑی حد تک ناسازگار حالات میں اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور ایک نو آفریدہ ملک میں ترقی کرتے ہوئے ایک بلند مقام تک پہنچے' جہاں عزت شہرت اور دولت ان کے ہمزاد فرشتوں کی طرح ان کی زندگی کا حصہ بن گئیں وہ خود اپنی جگہ لائق تعریف اور قابل تحسین ہے لیکن ان کی شخصیت کی کشش ہمیں کچھ اس سے بھی آگے لے جاتی ہے ایسا بھی ہوا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ زندگی میں بڑائیوں کی طرف جانا آدمی کو بہت سی خوبیوں سے دور کرتا جاتا ہے لیکن عالی صاحب کے یہاں صورت حال مختلف رہی وہ جتنا خاندانی طور پر بڑے تھے اتنا ہی ذاتی طور پر بڑے آدمی بنے اور جتنا جتنا ان کے قدم آگے بڑھتے گئے ان کی نظر میں انسانی خوبیوں کی قدر و قیمت اسی نسبت سے کچھ اور آگے بڑھ گئی اور وہ زندگی کی اچھائیوں اور سچائیوں سے اور بھی قریب ہوتے گئے۔

کچھ عجب حالت ہے راہ منزل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

عالی صاحب نے اپنی زندگی کے سفر میں اپنے ادبی ذوق کی تربیت اور اپنے تخلیقی شعور کے فن کارانہ اظہار پر ہمیشہ توجہ مبذول رکھی میرے نزدیک ان کی انسانی شخصیت کی بڑائی کا سب سے اہم پہلو ان کے یہاں اعلیٰ انسانی قدروں کا احترام اور ادب و شعر سے ان کا تعلق خاطر ہے جو "فرسٹ لو" کا سا درجہ رکھتا ہے۔

عالی صاحب غزل بھی کہتے ہیں اور گیت بھی اور دونوں میں ان کے ادبی لہجہ کی انفرادیت کو بہ یک نظر محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن جس صنف سے ان کی نسبت خاص نے ان کی شاعری کو اردو شعر و ادب کی موجودہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ بنادیا ہے وہ ان کی دوہا نگاری ہے جس میں ان کی آواز اور ان کا شعری انداز ادھر سے ادھر تک الگ پہچانا جاسکتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو اس پر چونک اٹھتے ہیں۔

اردو شاعری کی راہ ارتقاء میں دوہا ایک نہایت اہم اور کلیدی رول ادا کرتا رہا ہے بلکہ یہ سوچنا شاید غلط نہ ہوگا کہ دوہے سے صرف نظر کر کے ہم اردو شاعری کی ابتدا کی مختلف کڑیوں کو تلاش کرنے اور انھیں ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتے حضرت امیر خسرو سے منسوب گیت 'بہت دو سٹے کہ مکرنیاں ڈھکوسلے' ان مل بے جوڑ رنگ اور منڈھا گیت دراصل اردو شاعری میں کافی بعد کا اضافہ ہیں جو اردو شعر کی عمومی روایت کی طرف اشارہ کرتے ویں لیکن دوہا تو جیسے اس کے ضمیر و خمیر میں داخل ہے حضرت محبوب الٰہی کے وصال پر حضرت امیر خسرو کا یہ شاعرانہ اظہار ملال جو ہماری ادبی تاریخ کے صفحات پر ایک امٹ نقش ثبت کر گیا خود ایک دوہا ہے۔

گوری سوے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپ نے سانجھ بھیو چودیس

اپا بھرنش کے آخری دور کی بے مثال شعری تخلیق "سندیش راسک" میں جس کا مصنف ابدہ مان حضرت امیر خسرو کا شریک عصر ہے' دوہے کا بہت ہی خوبصورت اور ادبی اثر و تاثر کے اعتبار سے بھرپور استعمال ملتا ہے۔اس کے مرتب ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی نے لکھا ہے کہ دوسری پراکرتوں کے مقابلہ میں اپابھرنش کی شاعری دوہے کے شعری استعمال کے اعتبار سے زیادہ پرکشش اور متمول ہے۔

کبیر کے یہاں دوہا ہندوی شاعری کی اور عوامی فکر و فن کے بھرپور اظہار سے اور زیادہ قریب آگیا اودھی بھاشا کے پریم مارگی صوفیوں اور شاعروں کی تخلیقات میں تو دوہا چوپائی چھند ہی سب سے زیادہ مقبول اور محبوب ہے۔ برج بھاشا کی شاعری میں اس کا عمومی اور تاثراتی انداز اور بھی زیادہ دل کو چھونے لگا حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے "رشدنامہ" سے لے کر بہاری کی "ست سئی" تک دوہے کی ادبی طرح داریوں اور شاعرانہ سحرکاریوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری میں ایہام گوئی کی روایت کو دوہے کے سبزہ خود رو کا رنگ بتایا ہے۔ انہوں نے ایک اور اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ ولی کی غزل کی مقبولیت کے ساتھ گیت اور دوہے موقوف ہوگئے۔ اہل حال وقال کی محفلوں میں ان کی غزلیں گائی جانے لگیں۔ یہ ماننا تو مشکل ہے کہ اہل حال و قال کی محفلوں اور اہل ادب کے تذکروں سے اس کے بعد دوہا غائب ہوگیا لیکن یہ بات اپنی جگہ پر قابل توجہ ہے کہ ولی کی آمد تک اہل حال وقال کی محفلوں پر گیتوں اور دوہوں کا گہرا اثر تھا۔

سانگ سنگیت کے مجموعوں میں صدہا دوہے اب بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں اس میں اودھی برج اور کھڑی کی کوئی تخصیص نہیں ہمارے اردو شعراء کے یہاں دوہے کی ادبی روایت کے تتبع کی گوناگوں مثالیں مل جاتی ہیں جمیل الدین عالی کے یہاں گیت نگاری اور دوہے کی روایت کی تخلیقی باز آفرینی کو جب اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو اردو زبان اور ادب و شعر سے اس

روایت کے گہرے رشتوں کی بات سمجھ میں آتی ہے۔

دوہے کی زبان دوہے کا حال و خیال اپنے تخلیقی اظہار کے لئے کچھ فطری تقاضوں کو ناگزیر قرار دیتا ہے جتنی گنجائشیں غزل کے شاعر کے لئے تغزل کے فارم میں موجود ہیں اتنی بھی دوہے میں بظاہر نہیں ہیں اس کے لب و لہجہ اس کی زبان اور اس کے فارم میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور پھر بھی آج کے ایک دوہا نگار کو تحول صورت و معنی کے اس مرحلہ سے گزرنا ہوتا ہے اور اپنی بات کو صرف دو مصرعوں یا ایک شعر میں تمام کر دینا ہوتا ہے اور اس میں بات کہنے کے لئے ردیف و قافیہ کا سہارا لینا اور وہ بھی غزل کے انداز میں' اس کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

س صورت حال کا کچھ اندازہ عالی کے دوہوں کو پڑھ کر زیادہ بہتر صورت میں ہو سکتا ہے۔

تہہ میں بھی ہے حال وہی جو تہہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

جیون بوجھ بہت بھاری اور بوجھ کے سو سو ٹھاٹ
سامنے ہے اک لمبا مرگھٹ جس کو کہہ دیں باٹ

لئے پھریں دکھ اپنے اپنے راجا میر فقیر
کڑیاں لاکھ ہیں رنگ برنگی ایک مگر زنجیر

اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

یہ دوہے کی درویشانہ روایت کا عکس ہے جو بھگتی تحریک کے زیر اثر ہندوستانی شعرا کے ذہن پر ابر پاروں کی طرح چھایا رہا ہے اور جس سے دوہا نگاری کی روایت ہی کو نہیں خود اردو شاعری کی روایت کو الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔

اپنے مطالعہ میں انہوں نے دوہے کے بڑے بڑے فن کاروں کو سامنے رکھا ہے اور اس کا اظہار بھی انہوں نے کر دیا ہے۔

سور کبیر بہاری' میرا' رحمن ' تلسی داس
سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس

اور سچ یہ ہے کہ کسی کی تقلید سے کبھی ایک سچے فن کار کی پیاس نہیں بجھتی اور فن کی نئی بلندیوں تک پہنچنے کی خواہش اور خوشی فنکار کی اپنی صلاحیت اور اسی کی طبیعت کی اپج کا تقاضہ ہے۔

کیا بھرمر کیا شربھر پیو دھر کیا کچھپ کیا بیال
اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

ان کے دوہے آج کی غزل کی طرح نئے شہروں کی فضا اور ان کی تہذیبی حسیت سے جڑے ہوئے ہیں۔ کسی کا شعر ہے۔

چلتے رہئے کہ یہاں دھوپ کڑی ہے سر پر
دور تک دشت وفا میں کوئی سایہ بھی نہیں

عالی کا دوہا اسی حقیقت کی دوسرے لفظوں میں ترجمانی ہے۔

اوپر سورج خود دہکے نیچے دھرتی دہکائے
پھر کیوں کر دم لے نہ مسافر چھاؤں جہاں آجائے
اگنی سی ہے روئیں روئیں میں نس نس دکھ سے چور
عالی ہم پر جیون کا جو وار پڑا بھرپور
روشنیاں ہی روشنیاں ہیں پریم گھروں کے سائے
شرط یہ ہے کوئی ان کی طرف بن آنکھیں کھولے جائے

ان کے یہاں اس بات کا جو مفہوم ہے اس کا اندازہ صحیح طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے شعری مجموعوں میں شامل دوہوں کا مطالعہ کیا جائے لیکن ان کی زبان قلم بھی گاہ گاہ اس کی طرف اشارہ کر جاتی ہے۔

کانٹے چننا کلیاں چننا' چننا ڈھاک اور پات
کیا جانے کب کون ملے کب کیا آئے ہات
اک گہرا سنسان سمندر جس کے لاکھ بہاؤ
تڑپ رہی ہے اس کی اک اک موج پہ جیون ناؤ

عالی صاحب کے دوہوں کے مطالعہ کے وقت مجھے ایک بات کا احساس ہوا اور پھر وہ بات تھوڑی سی توجہ کے بعد سمجھ میں آگئی کہ انھوں نے اپنے دوہوں میں نائکہ بھید کو بڑی خاموشی مگر خوبصورتی سے پیش کیا ہے اردو شاعری کی روایت میں ہم اسے (بارہ پیاریاں) کے روپ میں محمد قلی قطب شاہ کے یہاں دیکھ سکتے ہیں یا پھر عالی صاحب کے یہاں' انھوں نے ان دوہوں کو نائکہ بھید کے عنوان سے پیش تو نہیں کیا لیکن ایک موقعہ پر نائکہ بھید کی طرف اشارہ ضرور کر دیا ہے۔

ہم نے پڑھی ہر دیس کی پستک دیکھے چاروں دید
چین سے لے کر لندن تک ہے ایک ہی نائکہ بھید

اور ان میں جن جن ابلاؤں اور سندر ناریوں کا ذکر ہے عالی صاحب کے دل و فطرت کا رشتہ بھی ان سے دھنک کے رنگوں جیسا ہے جو ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مکمل مل نہیں گئے یہاں قربت بھی فاصلوں ہی کا سا انداز رکھتی ہے۔

عالی صاحب نے دوہے کو ایک نیا آہنگ ہی نہیں دیا ایک نیا شخصی رنگ بھی دیا ہے اس شخصی رنگ میں ایک پہلو ان کا اپنی بیوی سے اظہار عشق بھی ہے اکثر ایرانی تہذیب میں غیر ازدواجی رشتہ ہی عشق و محبت کا رشتہ ہوتا ہے چاہے وہ کتنا ہی روایتی ہو لیکن ہندو روایت شعر میں اپنی شریک حیات ہی وہ محبوبہ دلنواز ہوتی ہے جس سے (پوروراگ) کے مرحلے سے گزر کر بار بار والہانہ انداز سے اظہار عشق کیا جاتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا کی تعریف کی ہوتی ہے۔

عالی صاحب کے یہاں بھی اس روایت کا ایک جیتا جاگتا عکس ملتا ہے۔

عالی تیرا بھید ہے کیا ہر دوہے پر نل کھائے
میں جانوں ترے پاپی من کو گھر والی یاد آئے
نا مرے سر کوئی طرہ کلغی نا کیسے میں چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری ساتوری اور اللہ کا نام

ان کے دوہے ان کی ذہنی زندگی اور احساس جمال کی پرچھائیاں ہی نہیں ہیں بلکہ جگہ جگہ ان میں ان کے سفر و حضر کی واردات بھی موجود ہے جن سے ان کے سوانح و سیرت کے مطالعہ میں مدد مل سکتی ہے۔ مشرق و مغرب کے بہت سے ملکوں میں ان کا شاعرانہ سفر ایک ادبی سفارت بھی ہے۔ یہ دوہے جب کسی کے سامنے آتے ہیں تو صرف شعری تخلیقات نہیں رہ جاتے اردو کی مقبولیت اور عالی صاحب کی شاعرانہ شہرت کے رنگا رنگ دائرے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

لندن بھی مرے جیون جیسا کچھ دھولا کچھ کالا
تھوڑی وہسکی باقی پانی بھرا تھمد پیالا
ڈوبتے بجتے ٹوٹتی کرنیں مدھم ہوتے ساز
پیرس اور لاہور میں سنئے بہت جھجھر کی آواز
بمبئی پونا ' حیدر آباد نہ آئے ہم کو راس
پیٹ کو بھر کر کیا کیجئے جب من ہی رہے اداس

ان کے یہاں آوازوں کے رقص اور شبدوں کی جھنکار کی بھی کچھ دلکش مثالیں ملتی ہیں۔

چھم چھم چھم چھم کرنیں برسیں ٹوٹن پکھاوج تھاپ
تم ہی کہو اب ایسے سمے میں کیا پن ہے کیا پاپ
جھنن جھنن خود باجے مجیرا آپ مرلیا گائے
ہائے یہ کیا سنگیت ہے جو بن گانک ابھرا آئے

از "عالی فن و شخصیت"

مرتبہ۔ ایم حبیب خان۔ علمی مجلس۔ ۱۹۸۸ء

شان الحق حقی

غزلیں' دوہے' گیت

دور جدید کے مزاج میں ہنگامہ پسندی کو بڑا دخل ہے' جس کے لئے ایک بڑا دلچسپ لفظ "سنسنی خیز" ہماری زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ اس مذاق نے ادب پر بھی ضرور اثر کیا' کمتر متضاد اور اکثر موافق۔ ایک طرف وہ تیور چمکائے گئے جو مشاعروں میں مقبول ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نئے شاعروں کو جستجو رہی کہ کوئی بہت ہی غضب کی جدت کر گزریں اور ہو سکے تو ادبی دھارے کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیں۔ ان دو رجحانات کے مابین بعض نوجوان شعراء بڑی گومگو میں رہے اور کسی حد تک بے اختیاری کا شکار بھی ہوئے۔ عالی بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ تاہم وہ ہمارے ان نئے شاعروں میں ہیں جن کی شعری افتاد بڑی محکم تھی۔ وہ بڑی سلامتی سے اپنی روش پر رہے اب انہوں نے اپنی شاعری کا ایک دلپذیر مجموعہ پیش کیا ہے "غزلیں' دوہے' گیت"

عالی کے مجموعہ کلام سے کوئی تہلکہ تو ادبی دنیا میں نہیں مچا لیکن اس کی حیثیت پائیدار معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف شعر کی روایات سے پختہ ربط رکھتا ہے تو دوسری طرف شعر کے مستقبل کے بارے میں بھی اچھی آس بندھاتا ہے۔

بڑی شاعری کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ یا تو شاعری میں کسی نئے باب کا اضافہ کرے یا کسی باب کو اپنے ساتھ ختم کر دے۔ اس کی پرکھ مستقبل ہی کے ہاتھ ہوتی ہے۔ فی الحال دوہوں کا باب' جسے اردو میں عالی نے شروع کیا' تقلید کے قابل معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاید قابل تقلید ثابت نہ ہو۔ عالی جتنے بھی دوہے اردو کے لکھ جائیں غنیمت ہوگا۔ انہوں نے موضوع کی اتنی راہیں اس ایک انوکھی صنف میں نکال لی ہیں کہ ان کے دم تک تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی پیاس بجھائے
من کی پیاس بجھے نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

ہمیں ان کی اس پیاس سے اور بھی توقعات ہیں۔ اس صنف کو جس طرح عالی نے برتا ہے اس میں ایک ترقی کی کیفیت اور بڑی گنجائش نظر آتی ہے۔ ہم نے اس کو ناقابل تقلید کہا تو اس لئے کہ برج بھاشا تو بہت سے لوگ لکھ سکتے ہیں اور شاید عالی سے زیادہ خالص برج بھاشا لکھیں۔ مگر دلی کی گلیاں 'لوہارو کے دیہات' دیس دیس کی سیر' غالب کا پرتو' درد کی میراث اور ان کے ساتھ مرزا جمیل الدین عالی کا سارا چھیل چھبیلا پن جب تک جمع نہ ہو ان دوہوں کا لہجہ' روپ' رس اور تاثر کوئی چیز بھی نہ بن سکے گی۔ یہ دوہے بڑے جادو اثر ہیں اور عالی نے ہمیشہ اپنی ہی زبان میں لکھے ہیں۔ برج بھاشا کے دوہوں میں اب معنی آفرینی تو ممکن ہے لیکن واردات کی یہ کیفیت اور آمد کی شان نہیں پیدا ہو سکتی جو عالی کی اپنی زبان سے ان کے تجربات میں اور تجربات سے زبان میں پیدا ہوئی ہے۔ دراصل کوئی ادبی جدت' روایت سے بالکل علیحدہ رہ کر تو نہیں پنپ سکتی۔ عالی کے ہاں بھی دوہے کی فارم کے علاوہ' ہندی کے آسان بولوں کی آمیزش میں روایتی آہنگ موجود ہے۔ بلکہ جہاں کہیں صرف مضمون آفرینی کی گئی ہے' کلام میں کلاسیکی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح کے دوہوں کو کبیر کا نہیں مگر رحمن کا سمجھ سکتے ہیں۔

کہو چندا رہاں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری ناری کو دیکھ آئے

مگر عالی کا یہ کلام اس تقلید پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جہاں جہاں آمد کا زور ہے لہجے کی متانت بڑھ گئی ہے۔ زبان روایتی وضع (Mannersim) سے پاک ہو کر خالص اردو ہو گئی ہے۔ اردو تاثیر میں یہ دوہے کہیں غزل سے جا ملے ہیں تو کہیں جدید نظم کا عمدہ نمونہ بن گئے ہیں۔

آلہا اودل گانے والے پہاڑے سے ٹکرائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

اے بھیتن وہ دیکھ سمے نے اپنی تان لگائی
اے بھیتن وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

موضوع کے لحاظ سے یہ دوہے بڑے متنوع ہیں۔ ان میں وحدت صرف شاعر کے لہجے اور شخصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ "عالی جی" کا اپنا کردار شروع سے آخر تک نمایاں رہتا ہے۔

عالی جی اک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر نروش رہیں اور جیون بھر بدنام

مزاج ان کا عموماً تغزل آمیز ہے' لیکن شخصی واردات و تجربات کے اظہار اور ایک مخصوص رومانوی کردار کے باوجود ان میں کافی آفاقیت موجود ہے۔ اسی طرح بعض کوائف اور مخصوص کنایات کے باوجود ان کا لطف اور تاثیر محدود نہیں ہونے پاتی۔ یہ اس کلام کا وہ غیر مرئی غیر محسوس عنصر ہے جسے کمال سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل میں عالی کی ریاضت استاد سائل مرحوم کی صحبت میں یا اس کے باوجود اس رنگ کی تقلید سے شروع ہوئی ہے جس پر غالب کا پرتو تھا' پھر رفتہ رفتہ اپنے نکھار پر آئی۔ رفتہ رفتہ اپنا رنگ ابھرا ہے جسے نئی غزل کا عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا
کب یہ در و دیوار سجیں گے کب یہ چمن لہرائے گا

ایک آدھ نئی غزل میں عالی نے اپنی روش سے ہٹ کر بھی چلنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجربے اہل کمال کو راس نہیں آتے۔ بعض کلام اس رنگ سے مختلف اور اس کیفیت سے خالی ہوگیا ہے جو ان کے عام کلام میں ملتا ہے۔ یہاں ہم عسکری صاحب کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ عالی کو اپنی شعری صلاحیتوں کے باوجو اپنے کلام کے بارے میں کسی قدر بے اعتمادی لاحق رہی ہے۔

عسکری صاحب نے اپنے مقدمے میں عالی کی شاعری کے بارے میں بعض بڑی خیال آفریں باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک عالی کی شاعری اور شخصیت میں بڑا توافق ہے جو کمیاب ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا دراصل بڑا مشکل ہے کہ خارجی شخصیت کی حدود کہاں قائم ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی اپنی شاعری میں اکثر صاف پہچانے جاتے ہیں اور ان کی شخصیت اپنی جگہ بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے لیکن ایک دقیع تر داخلی شخصیت بھی ضرور موجود ہے۔

"ماہِ نو" کراچی ۱۹۵۸ء

ڈاکٹر پروفیسر مسعود حسین
(شیخ الجامعہ، جامعہ علی گڑھ)

محاورہ مابین ناقد و شاعر

جمیل الدین عالی کے کلام کے دو مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں، پہلا "غزلیں، دوہے، گیت" جو پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اور دوسرا "لاحاصل" جس میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اور جو ۱۹۷۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

پہلے مجموعے کی اردو داں طبقہ میں بڑی دھوم مچی۔ محمد حسن عسکری جیسے بالغ نظر نقاد نے اس کا دیباچہ لکھا اور یہ پیش گوئی کی "غزلیں ہوں یا دوہے، عالی دونوں طرف بڑھنے اور پھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے ذہن کی لچک سے مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ اردو شاعری میں وہ اور بھی گراں قدر اضافے کریں گے۔ ذاتی طور پر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ عالی نئی نسل کے ان دو ڈھائی شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی شاعری سے مجھے آج بھی دلچسپی ہے اور جن کی نشوونما کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا ہوں"

اس مجموعے کی تیسری اشاعت میں "دیباچہ سے پہلے" کے عنوان کے تحت جمیل الدین عالی نے اپنا احتساب کرتے ہوئے یہ "اعتراف" کیا ہے "افسوس کہ میں عسکری صاحب کی توقعات پوری کرنے میں بہت جلد ناکام ہوگیا..... اس مجموعے سے پہلے بھی مطمئن نہ تھا، اب جو دیکھتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی"

اپنے کلام کے بارے میں شاعر کی یہ لے جاری رہی۔ "دوسرا مجموعہ "لاحاصل" زیر ترتیب ہے دراصل وہ بھی کلام منسوخ ہے، یعنی جو کہا ہے اس سے سخت نامطمئن ہوں"

ناقد اور شاعر کے درمیان مکالمہ کا جب یہ انداز ہو تو سوچنا پڑتا ہے کہ کس کا اعتبار کیا جائے میرے خیال میں شاعر غلط نہیں کہتا جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ شعر میں وہ جس قدر دے سکتا تھا نہ دے سکا۔ ایک طرح سے یہ اس کی

شاعرانہ شخصیت کا المیہ ہے جس کا اصل سبب اس کی وہ غیر شاعرانہ مصروفیات ہیں جن کا بہت جلد وہ شکار ہو گیا۔ میں اس کے اس خیال سے سو فیصد متفق ہوں کہ "شعر سے بے رخی کی جائے تو شاعری سخت ترین سزائیں دینے سے بھی باز نہیں آتی" شعر کی دیوی نے عالی کو یہ سزا دی کہ رفتہ رفتہ وہ اپنے شعری وجدان کے سرچشموں سے دور ہوتے گئے۔ یوں بھی شعر کی اوسط عمر تیس سال بتائی گئی ہے۔ اس لئے کہ ادھیڑ عمر تک عشقیہ شاعری کا نہ وہ شخص رہتا ہے اور نہ اس کے تصور' کی مرہون رعنائی خیال' اچھی شاعری ذات سے ابھرتی ہے' وہ عالی نے جوانی میں بھی بھرپور انداز میں کرلی۔ عظیم شاعری کے لئے ایک نقطہ نظر اور فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے' یہ بہت سے اچھے شاعروں کی طرح عالی کے پاس بھی نہ تھا۔ میرا خیال ہے عالی نے جو کچھ کہا اس سے آگے وہ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن عالی نے ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۰ء تیس سال کے عرصے میں جو کچھ کہا ہے وہ کئی لحاظ سے وقیع ہے۔ وہ اپنے دوہوں کے لئے مشہور ہیں لیکن میں ان کی غزلوں کو دوہوں سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ غزل میں انفرادیت پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن عالی نے اس مشکل کو بھی آسان بنالیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ انداز اور یہ آواز کسی دوسرے غزل گو کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کی غزل کے عناصر ترکیبی پر بحث کرنے سے پہلے اس کے تیور دیکھ لینا ضروری ہے۔

اب جو یہ اعتراض ہے اتنے برس میں کیا کیا
تیرے بغیر صبح و شام اپنے کہاں تھے صبح و شام

خدا کہوں گا تمہیں' ناخدا کہوں گا تمہیں
پکارنا ہی پڑے گا تو کیا کہوں گا تمہیں

تم شرافت۔ فن کی کہ اب غزل میں بھی
تمہارا نام' نہ لوں گا صبا کہوں گا تمہیں

خزاں میں کوئی پریشاں نہیں ہمارے سوا
بہار ہو تو سبھی کو ہے شوق جامہ دری

بایں فسردہ دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دے چلی جاتی ہے زندگی آواز

مری نوائے محبت کبھی نہ پست نہ تیز
بس اک رچی ہوئی کیفیت الم انگیز

کوئی تو رنگ سخن دے کہ لوگ کہتے ہیں
کبھی تھی آگ تو کچھ آگ کا نشاں ہوتا

اک عمر بعد اپنی تلون نگاہ میں
کتنی محبتوں کا خزانہ نہاں ملا

گزر رہی ہے عجب طرح زندگی عالی
نہ بجھ رہا ہے چراغ اور نہ جل رہا ہے چراغ

اب ایسی حیرت و وارفتگی کو کیا کہئے
دعا کو ہاتھ اٹھائے' اٹھا کے بھول گیا

دل کی جو نہ کہئے تو زباں کا شغف اسرار
اور دل کی جو کہئے تو زباں کچھ بھی نہیں ہے

جب ہو آنکھوں سے دور وہ صورت
دل سے کتنی قریب ہوتی ہے

ابھی سے حرف تمنا کی شرح و بسط نہ مانگ
ترس ترس کے تو کہنے کا حوصلہ آیا

دل ہمیشہ وہی مانگے ہے جو اُس پاس نہ ہو
مسئلہ کچھ نہ تمنا نہ تمنائی کا

یہ عشق میر نہیں زندگی ہے غالب کی
کہ اک دل میں رہا اور دوسرا آیا

حالی کے اس رنگ تغزل پر غالب کا پر تو صاف نظر آتا ہے۔ غالب' حالی کا منتہائے مقصود ہے لیکن حالی' غالب کی نقل نہیں۔ دونوں کا آہنگ ایک ہے لیکن دونوں کی واردات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

کوئی سنائے تو حالی کا حال غالب کو
کہ ان کی آگ میں یہ جل رہا ہے بے چارا

اوپر دیئے ہوئے اشعار میں ان اشعار کی آنچ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ وہی کھلتی ہوئی آواز' وہی بلند بانگ انداز' تخیل کی وہی بے پناہ پرواز' فرق صرف یہ ہے کہ غالب نکتہ داں ہے۔ اس کے کلام میں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے اور تجربات کے اتار چڑھاؤ زیادہ ہیں۔

حسن عسکری نے ٹھیک ہی لکھا ہے "ان کے (حالی کے) دل میں خواہ مخواہ یہ بات بیٹھ گئی کہ میں کچھ بھی کیوں نہ کروں' غالب نہیں بن سکتا' ممکن ہے یہ ضرور ہے کہ آدمی اس وقت شاعری کرے جب غالب بن سکنے کا امکان ہو' پہاڑ بھی ٹھیک ہے اور اونٹ بھی ٹھیک' دونوں اپنی اپنی جگہ اونچے۔ لیکن حالی نے اونٹ کی خوبیاں تسلیم کرنے میں فراخ دلی سے کام نہیں لیا۔"

دیکھئے ناقد بات کی رو میں کس قدر اوٹ پٹانگ بات لکھ گیا ہے۔ حالی نے غالب کا آہنگ تو اختیار کیا ہے لیکن مجھے جو چیز متاثر کرتی ہے وہ ان کی اپنی "گرہ کا مال" ہے جو کسی دوسرے غزل گو کے مال سے کم نہیں۔

میری ہنگامہ پسندی پہ نہ الزام رکھو
شاید اک یہ بھی علاج غم تنہائی ہے

تمہاری بزم سے آکر وہی خیال رہا
ہم ایک بار گئے' تم ہزار بار آئے

جب بھی بزم عالم میں کوئی فتنہ اٹھتا ہے
یا تمہاری محفل سے' یا غریب خانے سے

کریں نہ ذکر تمہارا تو کیا کریں کہ ہمیں
کچھ اور مل نہ سکا اپنی داستاں کے لئے

یہی حال حالی کے اسلوب کا ہے۔ یہ ان کا اپنا ہے۔ کبھی کبھی وہ غزل کے ڈانڈے گیت سے ملا دیتے ہیں لیکن ان کی

غزل کا اصل اسلوب وہی ہے جس کے نمونے میں پیش کرتا آیا ہوں۔ اس اسلوب کی بنیاد گہرے صوتی آہنگ' استعارات کی تکثیف' بے جھول سلاست مگر محاورہ بندی کی ہلاکت اور بے محل روز مرے سے اجتناب۔ انھیں زبان پر مکمل قدرت حاصل ہے' وہ زبان جو میر کے علی الرغم غالب نے اپنی غزلوں کے لئے ایجاد کی تھی' وہ لاکھ عجز اور انکسار کی باتیں کریں۔ وہ غالب کی طرح ایک زبردست انا کے مالک ہیں۔ ان کے انکسار میں بھی افتخار کے سینکڑوں پہلو نکلتے ہیں چاہے اس کا تعلق عاشقی سے ہو یا اپنی سخنوری سے۔

عالی اردو کے ان چند جدید شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو اور ہندی شعر کی دونوں پٹریوں پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ راقم الحروف کا مجموعہ کلام "دونیم" پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا اور جمیل الدین عالی کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا۔ دونوں نے غزل اور گیت ہر دو اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن دونوں سیاسی حالات کی حائل دیوار کی وجہ سے ایک دوسرے سے غافل رہے۔ گیت کی فارم دور تک دونوں کی دستگیری نہ کر سکی۔ یوں بھی عالی کے گیت اوسط درجے کے ہیں جو کوئی دوسرا گیت نگار بھی لکھ سکتا تھا۔ وہ تو انھوں نے اس (پٹری) پر اپنا سفر دوہے کے سہارے جاری رکھا اور خوب خوب شہرت پائی ہر چند دوہے کی صنف ہندی کا شاعر کب سے ترک کر چکا ہے۔ اردو میں بہرحال یہ ایک نئی چیز تھی' خاص طور پر کھڑی بولی کے محاورے میں۔ حسن عسکری نے عالی کے دوہوں سے یہ کہہ کر اغماض کیا ہے "رہے عالی کے دوہے تو میں یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا کہ ہندی کے مشہور دوہوں کے مقابلے میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے" اس کے بعد ان کے اس تجربے کو سراہا ہے کہ عالی نے دوہوں کی زبان کے لئے "مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے.... عالی کے دوہوں میں اسالیب بھی خود ان کے ہیں اور نفس مضمون بھی"

یہ رائے دیتے ہوئے حسن عسکری نے ایک بار پھر ادبی بصیرت سے کام لیا ہے۔ عالی کے دوہے قطعاً روایتی انداز کے نہیں۔ یہ انھوں نے اپنے من میں ڈوب کر لکھے ہیں اور چوں کہ دوہوں کے روایتی اسلوب سے گریز کیا ہے اس لئے ان کے لئے ایک نیا محاورہ بھی تراشا ہے۔

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تیو ہار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

چھوٹے بڑوں کے سنگم کا سب دیکھ لیا انجام
پاٹ بڑھایا جمنا نے' پر ہے گنگا کا نام

اگنی پوجیں' سورج پوجیں' پوجیں جل اور ناگ
عالی اپنی نار کو پوجیں' یہ عالی کے بھاگ

عالی کا کیا ذکر کرو ہو کوئی تو وہ کہلائے
جو ناخن سے پربت کاٹے اور پربت کٹ جائے

عالی نے دوہوں کو دوہوں تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے مسلسل دوہے بھی لکھے ہیں مثلاً "کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس" ایک بیوہ کی غم ناک داستان ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں وہ گئے ہیں اس شہر پر پانچ سات مسلسل دوہے لکھے ہیں جیسے حیدرآباد دکن یا پنڈی دیس' یا بنگلہ دیش۔ اس طرح دوہا نگاری میں نئے تجربے کا اضافہ تو ہوا ہے لیکن ان میں سے دوہے کی روح پرواز کر گئی ہے۔ دوہے کا تعلق "فردیات" سے ہے' اس لئے اس میں جذبہ یا فکر کا غیر معمولی ارتکاز ہونا چاہئے۔ لیکن جب اسے بیانیہ بنا دیا جائے تو اس کی ہیئت کدائی ہی بدل جاتی ہے' عالی نے اکثر جگہ صنف دوہا کی ترکیب میں جس قدر ماتراؤں کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے' اس وجہ سے گیت یا وشرام (وقفہ) کی جگہ بھی بدل گئی ہے۔ اس کا جواز صرف ان کے اس اعتذاریہ دوہے سے نکالا جا سکتا ہے۔

اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے "عالی چال"

عالی نے چوں کہ اظہار کے لئے دو شعری روایتوں..... اردو اور ہندی کا بہ یک وقت سہارا لیا ہے اس لئے بعض اوقات دونوں کو ہمہ گیر بھی کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض بہت اچھی غزلیں گیت کی زبان میں لکھی ہیں۔

چند نئے شعروں کے شعلے کیسی لے میں بھڑکتے تھے
تم آ کر سنتے تو سہی' کل ساری رات اجالا تھا

جانے کیوں لوگوں کی نظریں تجھ تک پہنچیں' ہم نے تو
برسوں بعد غزل کی رو میں اک مضمون نکالا تھا

-- -----

اجنبیوں سے دھوکے کھانا پھر بھی سمجھ میں آتا ہے
اس کے لئے کیا کہتے ہو' وہ شخص تو دیکھا بھالا تھا

---- ----

تپتی دھوپوں میں بھی آکر ساتھ ہمت دے جاتے ہیں
چاند نگر کے انشا صاحب' عالی جن کا ہالا تھا

یہ عالی کا انکسار ہے کہ وہ خود کو انشاء صاحب کا ہالا سمجھتے ہیں یا خود کو میراجی کا ماننے والا بتاتے ہیں۔ یا ناصر کاظمی سے معاصرانہ تحقیقی تحریک کا رشتہ بھی ملاتے ہیں مگران کی غزلیہ شاعری کا اصل ماخذ غالب کا اسلوب ہے اور اس کے موضوعات کا مرکز خود ان کی ذات ہے

غالب ہوئے بنا بھی رہمٹیں غالب سے انداز

مجموعی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ عالی کا قلم اب تھک چکا ہے۔ قلم کا جب میں ذکر کرتا ہوں تو اس سے مراد قلم شعر ہے ورنہ یہ سفرناموں اور فکری' صحافتی' کالموں کے اب بھی ڈھیر لگا رہا ہے' ان کی عمر اب ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے' مصروفیات "ذات" سے متعلق رہنے کے بجائے کائنات کی طرف بڑھتی جارہی ہیں۔ ان کا یہ احساس کہ جس دیس کی روٹی کھائی ہے' اس کا بھی حق ادا کرنا چاہئے' اسی نے ان کے وطنی نغموں مثلاً "جیوے جیوے پاکستان" کو جنم دیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ عالی اپنا کام تمام بھی کر چکے ہیں اور ختم بھی۔ انہیں اب میں اپنی طرح "ریٹائرڈ" شاعروں کی فہرست میں رکھوں گا۔ اس بارے میں خود ان کا بھی یہی احساس ہے۔ برسوں کے بعد جب کوئی غزل ہوجاتی ہے تو اس طرح جھوم اٹھتے ہیں۔

اک برس بعد صرف ایک غزل
کیا کمی اور کیا مزہ آیا (۱۹۸۳ء)

جوش ملیح آبادی سے منسوب یہ روایت ہے کہ وہ چھوٹے بڑے شاعروں کی تقسیم ان کی "بیٹریوں" سے کیا کرتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے مجاز کی بیٹری چھوٹی تھی اس لئے جلد جل بجھی۔ خود اپنی بیٹری کو وہ بڑی بتاتے تھے۔ اس لئے ساٹھ کے بعد تک چلتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ عالی اس اعتبار سے مجاز کی طرح اردو شاعری کے "شعلہ مستعجل" بھی نے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اپنی ذات سے توقعات نہ رکھتے ہوئے بھی انہوں نے حسن عسکری کی توقعات کو بوجوہ احسن پورا کیا ہے۔ ناقد جیتا' شاعر ہارا۔ اردو شاعری میں ان کا نام اور مقام ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا اس افسوس کے ساتھ کہ وہ غالب کی صدائے بازگشت اور کبیر کی دور افتادہ آواز بن کر کیوں رہ گئے؟ ☆

در کتاب "جمیل الدین عالی' فن اور شخصیت"

مرتبہ ایم حبیب خاں

علمی مجلس دلی سنہ ۸۸ء

☆ کاش اب ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۵ء تک کلام پر مشتمل مجموعہ "اے مرے دشت سخن" اور دس ہزار مصرعے سے زیادہ غیر مطبوعہ طویل نظمیہ "انسان" جس کے کئی اجزا چھپ چکے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب کی نظر سے بھی گذر جائیں۔ ناشرین

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جمیل الدین عالی

جدید اردو شاعری میں ایک نئی آواز

جمیل الدین عالی نے اپنے آپ کو مرد سادہ لیکن "خاکستر شرار انگیز" کہا ہے۔ یہ بات بڑی ہی بلیغ اور معنی خیز ہے' اور ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ شاعری اور شاعرانہ مرتبے پر بھی صادق آتی ہے۔ انہوں نے جدید شاعری میں بعض اہم اضافے کئے ہیں۔ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزلیں کہی ہیں اور ان غزلوں میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے دوہے کہے ہیں۔ اور ان دوہوں [illegible] جدید شاعری ایک نئی صنف سخن سے آشنا ہوئی ہے۔ انہوں نے گیت لکھے ہیں اور ان گیتوں نے بھی جدید شاعری کو ایک نئی لے اور ایک نئے لہجے سے روشناس کیا ہے۔ وہ نئی نسل کے شاعر ہیں' اور ان کی شاعری میں نئی نسل کی مخصوص آواز گونجی ہوئی ہے۔ وہ نوجوان ہیں لیکن پختہ مشقی اور قادر الکلامی کی دولت بیش بہا انہیں نصیب ہے۔ جدت پسندی ان کی شاعری کا جوہر ہے۔ وہ نئی زندگی کی ترجمان اور نئے حالات کی عکاس ہے۔ اس میں نئی نسل کا مزاج اور اس کی مزاج دانی ہے۔ وہ زندگی اور جولانی سے بھرپور ہے۔ اس میں ولولے اور حوصلے کی روشنی ہے' ایک ہلکی سی خلش اور چبھن کا احساس اس میں ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس خلش اور چبھن میں اس لذت کی بھی کمی نہیں ہے جو تیر نیم کش کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ رندی اور سرمستی' سرور اور سرخوشی کی بھی اس میں کمی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نئی زندگی کی لغزش مستانہ کی تصویر ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بڑی متوازن اور مہذب شاعری ہے۔ اس میں بڑی گرمی اور روشنی کا احساس ہوتا ہے اور جگہ جگہ پھلجڑیاں سی چھوٹتی اور جگنو سے چمکتے نظر آتے ہیں۔

یہ شاعری عالی کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ وہ ان کے مزاج کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے۔ اس میں ان کی افتاد طبع وذہنی رجحانات' افکار وخیالات' عقائد وتوہمات اور نظریات وتصورات کا صحیح عکس نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی غزلیں خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔

ان غزلوں میں حالی کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہے۔ ان کے مختلف اشعار حالی کے مشاہدات و تجربات' ان کی ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں میں واقعیت کا رنگ بہت گہرا اور حقیقت کے نقوش بہت تیکھے ہیں۔ یہ سیدھی' سادہ اور سپاٹ نہیں ہیں۔ ان میں ایک تصورانہ شان پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف احساس اور جذبہ ہی ان سے متاثر نہیں ہوتا' تخیل میں بھی تحریک پیدا ہوتی ہے اور شعور بھی حرکت میں آتا ہے' وہ جذبات کو برانگیختہ ہی نہیں کرتیں۔ ان میں تہذیب و توازن بھی پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں ذہنی آسودگی کا سامان بھی فراہم ہوتا ہے۔ وہ غور و فکر کے لئے زمین بھی تیار و ہموار کرتی ہیں۔ غرض حالی کی غزلیں خاصی پہلو دار ہیں۔ ان میں تنوع اور رنگا رنگی' وسعت اور ہمہ گیری ہے اور وہ لوچ اور تہ داری اور بانکپن کی خصوصیات سے معمور نظر آتی ہیں۔

حالی کی غزلوں کا بنیادی موضوع عشق نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے غزلوں میں اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کی ہے' ان کی عشقیہ شاعری کا منبع ایک نیا احساس اور ایک نیا جذبہ ہے' نئی نسل کے ایک ایسے فرد کا احساس اور جذبہ جس کی زندگی میں حجابات نہیں ہیں۔ جو ذہنی الجھنوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جس کے یہاں صفائی اور صاف گوئی' بے ساختگی اور بے باکی ہے۔ جو کسی بات کو چھپاتا نہیں بلکہ بے لاگ اور دوٹوک بات کرتا ہے اسی لئے اس میں صداقت پائی جاتی ہے۔ حالی کی عشقیہ شاعری میں بھی صداقت اور خلوص کا احساس ہوتا ہے' وہ براہ راست بات کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کی نگاہیں دیکھتی ہیں جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں او جو کچھ ان پر گزرتی ہے اس کی ساری تفصیل وہ اپنی غزلوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں کہیں بعض فروعی باتیں بھی ان کی غزلوں میں داخل ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کے بعض شعر سیدھے اور سپاٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بے باکی اور صاف گوئی' غزلوں میں واقعیت اور حقیقت کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔ وہ بڑی سادگی اور معصومیت سے عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کو پیش کرتے ہیں' ان میں ایک تنوع اور رنگا رنگی کا احساس بھی ہوتا ہے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی رک رک کر بات نہیں کرتے' ان کے یہاں ذہنی اور جذباتی رکاوٹیں نہیں ہیں اسی لئے جو کچھ ان کے دل میں آتا ہے' جس خیال کی لہر بھی ان کے یہاں اٹھتی ہے' وہ اس کو غزل کے شعر کی شکل دے دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں سکہ بند عشقیہ شاعری نہیں ملتی۔ عشقیہ شاعری کے پردے میں انہوں نے مختلف انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے اور اس کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کیا ہے۔ عسکری نے صحیح لکھا ہے کہ "حالی کی موجودہ شخصیت اور شاعری میں اتنے مختلف رنگ موجود ہیں کہ ان کے کلام سے اکتاہٹ نہیں ہو پاتی۔ یہ رنگا رنگی بذات خود ایک لطف کی چیز ہے۔ پھر حالی کے یہاں اس بات کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ وہ کسی جذبے سے کترا رہے ہوں یا اس کے اظہار میں حجاب سے کام لے رہے ہوں' کھلے دل سے بات کرنے اور جھینپے اور گھبرائے بغیر جذبات کا بے لاگ طریقے سے اظہار کرنے کی بدولت ان کے کلام میں ایک سادگی اور معصومیت آگئی ہے جس کی آرزو ہر شاعر کو کرنی چاہئے اور اس معصومیت کا راز یہی ہے کہ وہ اپنی

شخصیت کے کسی گوشے کو نہ تو زندگی میں غیر آسودہ رکھتے ہیں نہ شاعری میں' اور اپنی شخصیت کو اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر لیتے ہیں۔ الم ہو یا نشاط' کامیابی ہو یا محرومی کسی چیز کے بیان میں ان کی آواز ڈر سے کپکپاتی نہیں۔ وہ ہمیشہ جم کر بولتے ہیں' جذبات کا خوف عالی میں نام کو نہیں۔ میرے خیال میں یہ ان کی سب سے بڑی خوبی ہے' اور مجھے یقین ہے کہ اس قوت کے بل پر اگر چاہیں تو اس سے بھی بہتر شاعری تخلیق کر سکتے ہیں۔ یہ خوبی سب سے زیادہ ان کی عشقیہ شاعری میں نمایاں ہوتی ہے اور اس عشقیہ شاعری کا شباب ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔"

یہ غزلیں سیدھی سادی ہیں کیونکہ ان میں سیدھے سادے عشقیہ جذبات کا اظہار ہے۔ ان میں رنگینی نہیں ہے۔ کیونکہ عالی ان غزلوں میں عشقیہ جذبات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتے ہیں' انکے اظہار میں کسی قسم کی رومانیت کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان میں' ایسے مضامین زیادہ نظر آتے ہیں جن میں عشقیہ کیفیات اور واردات سے زیادہ انسان کی عام حرکات و سکنات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں یا اس کی بے بسی اور مجبوری' اس کے عمل اور ولولے' اس کی خوشی اور غم کے مختلف روپ نظر آتے ہیں' عالی کی عشقیہ شاعری میں ناز حسن اور نیاز عشق کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن اس کو پیش کرنے کا انداز عمومی ہے۔ وہ چونکاتے نہیں۔ کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتے۔ اسی لئے انکی غزلوں کے بہت سے اشعار تو عشقیہ اشعار معلوم ہی نہیں ہوتے۔ ان میں تو زندگی کا کوئی رمز یا نکتہ موجود ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار انکی غزلوں کے ایسے اشعار ہیں جن میں عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کی وضاحت ضرور کی گئی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو انکے پردے میں کچھ اور ہی منظر نظر آتا ہے۔

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے نگہ غلط خرام
یا کوئی منزل سکوں یا کوئی راہ بے مقام
کیا ہے وہ اک غم دروں جس کے جلو میں سوجنوں
کیا ہے وہ آگ اور کیوں جس کا رکھا ہے عشق نام
اب جو یہ اعتراض ہے اتنے برس میں کیا کیا
تیرے بغیر صبح و شام اپنے کہاں تھے صبح و شام
ذہن تمام بے بسی روح تمام تشنگی
سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

ہزار خشک رہا اپنی زندگی کا چمن
تری بہار کو لیکن کبھی خزاں نہ کہا

وہی تعلق خاطر ہے آج بھی تجھ سے
یہ ایں [illegible]

جھکا ہوا ہے جو سر آج تیرے قدموں پر
اگر نہ وقت بگڑتا تو آستاں ہوتا

کیا کیا رہی نشاط نظارہ اور آج کل
یہ بھی خبر نہیں وہ ملے تھے کہاں مجھے

اس اک سکوت سے اس ایک جنبش لب تک
وہ کش مکش تھی کہ احساس مدعا نہ رہا
تجھے تو شوق وفا ہے مگر خدا کے لئے
میں کیا کروں گا اگر مجھ سے تو خفا نہ رہا

مری پسند میرے نام پہ نہ حرف آئے
بہت حسین بہت باوفا کہوں گا تمہیں

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارہ

کچھ ان کی جستجو ہے نہ کچھ اپنی گفتگو
یہ کیا بنا دیا ستم روزگار نے

تجھے تو کیسے بتاؤں کہ خود بھی یاد نہیں
کہاں کہاں کی ترے غم نے خاک چھنوائی

اٹل ہے آس کہ آخر کبھی تو آئے گا
وہ ایک لمحہ کہ جب تیرا انتظار نہ ہو

زمانہ گزرا کہ تجھ سے تھی رسم و راہ بہت
سو آج بھی ہے وہی انتظار کا عالم

منجملہ ہزار غم عشق و روزگار
وہ غم بھی ہے [illegible] سی مداوا کہیں جسے

دل میں ہے گو زباں نہیں کھلتی
کاش تجھ کو کسی کا غم ہو جائے
رو کے بھی دیکھ لیجئے عالی
شاید اس طرح درد کم ہو جائے

اندھیری رات میں کیا کیا صدائیں آتی تھیں
سو ان کو یاد کیا اور وہ یاد آئے گئے

الجھے ہوئے ہیں گیسوئے جاناں میں آج تک
عالی چلے تھے کاکل گیتی سنوارنے

ان اشعار کا پس منظر وہ جذبہ ہے جس کو عشق کا نام دیا جاتا ہے لیکن عالی نے اس جذبے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں فرد کی نفسیات اور اس کی سماجی اور اجتماعی محرکات کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اسی لئے یہ اشعار ایک وسیع پس منظر رکھتے ہیں' یہ بے بنیاد نہیں ہیں۔ ان میں ایک استواری نظر آتی ہے۔ یہ زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں محض جذباتی رومانیت نہیں ہے۔ واقعیت اور حقیقت پسندی کا میلان ان میں بہت نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں پیش کئے ہوئے موضوعات محض جذبات کی ترجمانی ہی تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں خارجی حالات اور اجتماعی معاملات کا شعور بھی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں غم عشق کے ساتھ غم روزگار اور گیسوئے جاناں کے ساتھ دنیا کو سنوارنے کے خیالات اکثر نظر آتے ہیں۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ عالی عشق سے زیادہ زندگی کے شاعر ہیں اور [illegible] سے

عشق بھی ان کے یہاں زندگی کا ایک حصہ ہے۔ وہ اسے اس زندگی سے الگ کرکے نہیں دیکھتے۔ اسی لئے ان کی عشقیہ شاعری میں زندگی کی باتیں ملتی ہیں اور عشق اس زندگی سے فرار' اس سے علیحدگی' چشم پوشی اور روگردانی کا نام نہیں رہتا۔ عالی عشق کے پردے میں زندگی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں مجموعی طور پر عشق سے زیادہ زندگی کے معاملات و مسائل کا بیان نسبتاً زیادہ ہے۔ اس زمانے کی زندگی جن حالات سے دوچار ہے ان حالات کے نتیجے میں انسانی اور خصوصاً نئی نسل کے نوجوان پر جو کچھ بیت رہی ہے جن مسائل کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس کے مخصوص مزاج نے خود اپنے لئے جو مسائل پیدا کرلئے ہیں' ان سب کی تفصیل عالی کی غزلوں میں ملتی ہے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ انھیں مقامات پر ان کے جوہر کھلتے ہیں اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نہ صرف باعتبار مضامین غزل کو وسعت دینے بلکہ ایک نئے انداز اور ایک نئے لب و لہجے میں بات کرنے کا وہ کتنا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے ان اشعار میں زندگی کا احساس اور اس کی نباضی کا شعور کتنا گہرا اور کیسا رچا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ احترام تعلق یہ احتیاط تو دیکھ
کہ زندگی کو کبھی ہم نے رائگاں نہ کہا

یہ عمر عمر کے رشتے جو ٹوٹ جاتے ہیں
گلہ ہی کیا ہے کہ ظالم ہے وقت کا دھارا
کسی میں عیب نکالیں تو کیا کہ ہم اپنا
ز فرق تا بہ قدم کر چکے ہیں نظارہ

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دمساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

ہزار ہنستی ہوئی صورتیں نظر آئیں
مگر ہر ایک تبسم کی لو تھی اشک آمیز

کوئی کار گاہ بھی ہے تیری کارگاہ یارب
کہیں چند لوگ گریاں کہیں چند لوگ خنداں

کبھی طلوع ہو وہ صبح جس کا وعدہ ہے
ہر ایک رات گزرتی ہے لو لگائے ہوئے

نہ تھی بہار تو سب کو تھا ادعائے جنوں
بہار آئی تو خالی پڑے ہیں ویرانے

گزر رہی ہے بس اک سوز و کرب پیہم میں
کہاں جلا تھا مرا آشیاں نہیں معلوم

نہ پوچھ مجھ سے کسی شے کی اصل اے ہمدم
کہ دیکھتا ہوں میں آبادیوں میں ویرانے

یہ اشعار غزل کے اشعار ہیں اور ان میں غزل کے اشعار کا مخصوص رنگ و آہنگ بھی موجود ہے۔ لیکن ان میں عام زندگی کی باتیں ہیں۔ زندگی کو رایگاں نہ کہنے' وقت کے دھارے کو ظالم سمجھنے۔ کسی کو عیب سے خالی نہ دیکھنے' زندگی کے دشت میں کسی ہمدم دمساز کے نہ ملنے اور صرف اپنی ہی آواز کے سننے' ہزاروں ہنستی ہوئی صورتوں میں سے ہر ایک کے تبسم کی لو کو اشک آمیز دیکھنے' اس کار گاہ عالم میں کسی کے رونے اور کسی کے ہنسنے' صبح کے طلوع نہ ہونے' اور رات کو صبح کی آس میں لو لگائے رہنے' بہار آنے کے بعد بھی جنوں سے بے گانہ رہنے' آشیاں کے جلنے اور زندگی کے ایک مسلسل کرب پیہم میں گزرنے اور یہ آبادیوں میں ویرانوں کو دیکھنے کے جو خیالات پیش کیے گیے ہیں' ان کا تعلق عام انسانی زندگی' اس کے انفرادی اور جذباتی معاملات اور اجتماعی اور خارجی مسائل سے ہے۔ عالی کی غزلوں میں اس قسم کے خیالات کی فراوانی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی سے قریب ہیں۔ انھوں نے اس کے نشیب و فراز کو دیکھا ہے' اور اس کے مدوجزر کی اصل کیفیت ان پر روشن ہے۔

غزلوں کے ساتھ ساتھ عالی نے دوہے بھی لکھے ہیں۔ اور ان دوہوں کی خاصی تعداد ان کے مجموعہ کلام میں موجود ہے۔ یہ دوہے غزلوں کے مقابلے میں زیادہ حسین اور دل آویز ہیں۔ ان میں نسبتاً زیادہ زندگی ہے۔ یہ زیادہ رنگین و پرکار ہیں' ان میں رعنائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ یہ شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی شاعری ملتی ہے۔ جذبے اور تخیل کی ہم آہنگی کا ان میں کمال نظر آتا ہے۔ ان میں شروع سے آخر تک ایک رچی ہوئی کیفیت ہے۔ اس میں جو پیکر تراشی اور تصویر بندی ہے اس کے رنگ بہت شوخ اور خطوط بہت تیکھے ہیں' ان میں تشبیہات و استعارات میں بڑی ہی تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا وزن و آہنگ بھی نیا ہے اور اس

سے وزن و آہنگ میں ایک فطری روانی اور بہاؤ کی کیفیت نظر آتی ہے اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے حالی کے ان دوہوں کو بہت دلکش اور دل [illegible] بنا دیا ہے۔ اسی لئے یہ دلنشیں ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ حسیاتی شاعری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کے حواس پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں۔

ان دوہوں میں حالی نے نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ ان کے مشاہدات و محسوسات کی ساری تفصیل ان میں موجود ہے۔ ان میں حسن اور حسن نظر دونوں کا شباب نظر آتا ہے۔ شباب اور نگاہ شباب دونوں ان میں بے نقاب دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی اور زندگی کا احساس بھی ان میں جلوہ گر ہے۔ حالات اور حالات کا شعور بھی ان میں کمال پر ہے۔ غرض کہ یہ دوہے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر ہیں اور ان میں قدم قدم پر ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے اور جگہ جگہ حسن و شباب کی بجلیاں سی کوندتی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان میں صرف ذوق نظر کی تسکین کا سامان ہی نہیں ہے۔ ذوق حیات کی تکمیل کا سامان بھی موجود ہے۔ ان دوہوں کا مقصد تفریحی نہیں ہے۔ یہ بقول حالی من کی آگ بجھانے کے لئے کہے گئے ہیں۔ لیکن من کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ یہی ان دوہوں کا مقصد ہے۔ یہ من کی آگ کو بجھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس احساس کو بھی بیدار کرتے ہیں کہ انسان کے من کی آگ کا بجھنا آسان نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ دوہے دل سے نکلی ہوئی آواز ہیں۔ یہ آواز دلوں میں اترتی ہے، ذہنوں میں گونجتی ہے اور روح پر منڈلاتی ہے۔

یہ دوہے حالی کے لطیف احساس جمال اور ذوق حسن کی پیداوار ہیں۔ ان میں حسن کا بہت ہی رچا ہوا احساس ملتا ہے۔ حالی کی نگاہیں اس حسن کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتی ہیں، اور وہ انسان، زمانے اور زندگی سب میں حسن کے پہلو تلاش کر لیتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر حالی کی طبیعت کا رجحان انسانی حسن کی طرف زیادہ ہے، وہ گوشت پوست کے انسان میں حسن دیکھتے ہیں۔ انہیں رنگ روپ میں حسن نظر آتا ہے لیکن وہ اس حسن کو صرف خارجی زاویہ نظر سے دیکھ کر اس کا بیان ہی نہیں کر دیتے، اسے شدت کے ساتھ محسوس بھی کرتے ہیں۔ ان کے حواس پر وہ اثرات کے گہرے نقوش بھی چھوڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کے ان دوہوں میں حسن کا بیان صرف مشاہدے ہی تک محدود نہیں ہے، اس کا تعلق محسوسات سے ہے۔ اسی لئے اس میں وہ رشتہ اور تعلق نمایاں نظر آتا ہے جو حسن اور حسن نظر، جمال اور ذوق جمال میں ہوتا ہے۔ یہ دوہے اسی رشتے اور تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھینچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اتار

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا اوتار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

کہو چندر ماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری نار کو دیکھ آئے

روپ بھرا مرے سپنوں نے یا آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

پورب کی ابلا دکن کی ابلا یا پنجاب کی نار
عالی اپنے من پر سب کے گہرے گہرے وار

نا تری ایسی بالی عمریا نا ایسی نادان
پر جب ہم کوئی بات کہیں تو بنے یونہی انجان

یہاں متوارے نیناں کے ساتھ ساتھ نس نس کے کھنچنے، گھنی گھنی پلکوں اور گرماتے روپ کو چھاؤں اور دھوپ کہنے، ناری کو دیکھ آنے کے ساتھ چندرماں کے جوت بڑھانے، میت کے آنے کے ساتھ چاندنی کی ایک ایک کرن کے سنگیت بن جانے، پورب، دکن اور پنجاب کی ابلاؤں کو دیکھ کر گہرے گہرے وار سہنے، بات کہنے کے ساتھ محبوب کے انجان ہو جانے کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان میں مشاہدات سے زیادہ محسوسات کا رنگ نمایاں ہے، اور اس رنگ نے ان دوہوں میں بڑا رچاؤ پیدا کر دیا ہے۔

لیکن حسن کا حسیاتی یا محسوساتی اظہار عالی کے دوہوں میں اتنا نمایاں نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی کی جذباتی کیفیات اور ذہنی واردات کی کوئی حقیقت ہی باقی نہ رہے۔ عالی نے اپنے دوہوں میں ان کیفیات اور واردات کو بھی پیش کیا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے جذباتی عمل اور رد عمل کی حقیقت میں بڑی ہی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ مثلاً محبوب سے دوری اور ہجر و فراق کی کیفیت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

ٹھنڈی چاندنی اُجلا بستر بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں جن کو ترس گئے مرے نین

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نا کوئی دکھ نا سوگ
دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

جاڑا آیا ٹھنڈی ہوائیں من سب کے برمائیں
کتنے درد کی بات ہے گوری ہم تجھے یاد نہ آئیں

اور محبوب سے ملنے کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

لیکن عالی کے ان دوہوں کی اہمیت ان کیفیات کی ترجمانی میں نہیں ہے ان کی اہمیت تو زندگی کے حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں ہے۔ عالی کا مزاج یہی ہے کہ وہ زندگی کو صرف ایک جذباتی اور رومانی زاویہ نظر ہی سے نہیں دیکھتے۔ ان کی نگاہیں تو زندگی کے حقائق کو ٹٹولتی ہیں اور اس کی سنگینیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس سلسلے میں عالی نے گہرے انسانی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ ذاتی معاملات ہوں یا انفرادی کیفیات' اجتماعی مسائل ہوں یا آفاقی تجربات کی ترجمانی۔ عالی کے دوہوں میں ملتی ہے۔ عالی بنیادی طور پر رومانی شاعر نہیں ہیں' ان کا مزاج حقیقت پسندانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جذباتی معاملات کو بھی حقیقت و واقعیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں' ان کے بیشتر دوہے اسی صورت حال کے ترجمان اور عکاس ہیں۔

غزلوں کی طرح ان دوہوں میں بھی وہ عشقیہ معاملات کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ملا دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ اپنا ہی رونا نہیں روتے خود اپنا ہی ساجن انہیں جدا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ ان کی نگاہیں ساری انسانی زندگی کو اس صورت حال سے دوچار دیکھتی ہیں اور ساجن کا مل کر جدا ہونا انہیں ہر فرد کا مقدر نظر آتا ہے۔ ایک دوہے میں اس حقیقت کو اسی طرح واضح کرتے ہیں۔

اپنے ہی من کا رونا کیا ہر من میں لگی ہے آگ
ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کس کے بھاگ

اسی طرح ایک دوہے میں پریت کے روگ بن جانے کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں ناکوئی غم نا سوگ
دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

غرض عالی کے دوہوں میں جگہ جگہ ایک آفاقی آہنگ بھی ملتا ہے۔ اور ان کے دوہوں کی یہ خصوصیت انہیں بہت موثر بنا دیتی ہے۔ غزلوں کی طرح عالی کے دوہوں میں بھی حجابات نہیں ہیں وہ غزلوں کی طرح ان دوہوں میں بھی دوٹوک بات کہتے ہیں۔ اسی لئے زندگی کی بہت سی حقیقتیں ان میں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ عالی کے یہاں کسی

قسم کی جھجک نہیں ہے۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ اسی لئے جو کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اور جن خیالات کی لہریں بھی ان کے یہاں اٹھتی ہیں انہیں ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً چند دوہوں میں انہوں نے حیدر آباد (دکن) جانے کا ذکر کیا ہے اور اس کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے۔

حیدر آباد کا شہر تھا بھیا اندر کا دربار
ایک ایک گھر میں سو سو کمرے ہر کمرے میں نار

لیکن پھر اس کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔

ہم کو حیدر آباد نہ بھایا تھا جو روپ انوپ
اندر کتنی کالک تھی اور باہر کتنی دھوپ

اور یہ رائے ان کی واقعیت پسندی اور حقیقت پرستی پر دلالت کرتی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں عالی کے دوہوں میں ملتی ہیں۔

معاشرتی حالات کا شعور بھی عالی کے یہاں نمایاں ہے۔ ان کے دوہوں میں سے بیشتر میں یہ شعور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے' بعض جگہ تو وہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ زندگی میں معاشی حالات کی ناہمواری انسان کی انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے۔ پیٹ بڑا پاپی ہے' وہ انسان سے کیا کیا کچھ کرواتا ہے۔ روٹی کی تلاش اسے در در کی خاک چھنواتی ہے۔ انسان اس کے لئے نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ چند دوہے انہیں خیالات کو پیش کرتے ہیں۔

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جیسے مہا کوی بھی بابو جی کہلائے
روٹی جس کی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

واں وہ نین کنول مرجھائے سوکھ گیا یاں ہاڑ
بھوک کی گرمی سب کو بھونے ندی ہو کہ پہاڑ

اور ان ناسازگار حالات نے معاشی اعتبار سے زندگی میں جو کشمکش اور آویزش پیدا کی ہے' عالی نے اس کو بھی محسوس کیا ہے۔ چنانچہ بہت واضح' الفاظ میں وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ
ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ

آلھا اودل گانے والے پیادے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں
کھیت کٹا تو لے گئے ٹھاکر منشی ساہو کار
گھر پہنچے تو بھوکی بہو اک برچھی سی دے مار
بھیتی سونا چاندی اگلے گھر میں پہنچے روگ
پاسی آگ انگار چبائیں بنئے اڑائیں بھوگ

اور زندگی کی اس حالت کو دیکھ کر عالی یہ راگ چھیڑتے ہیں۔

عالی نے اک لیا مجیرا اور چھیڑا یہ راگ
جس کا کھوج لگا پچھم میں پر جو سب کی آگ
ہے بھیتن یہ کھیت ہمارے انہیں میں سے سرکار
ہے بھیتن ہم ایک ہی ندی وہی جل اور وہی دھار
ہے بھیتن اس دھرتی ماں کی کوکھ میں سب کا تاج
ہے بھیتن اس دھرتی ماں پر ایک کرے کیوں راج
ہے بھیتن یہ تیری باہیں جیسے لوہا لاٹ
ہے بھیتن یہ تیری باہیں سب کو کرائیں ٹھاٹ
ہے بھیتن ترا جھلسا چہرہ ان کے رنگ بڑھائے
ہے بھیتن تری اپنی عورت دوجے کے گھر جائے

اور آخر میں یہ للکار بھی ان کے بیان میں سنائی دیتی ہے۔

ہے بھیتن وہ دیکھ سے نے اپنی تان لگائی
ہے بھیتن وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی
اک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ
اے اندھیارو! سورج آیا سورج آیا' جاؤ

اس طرح عالی ایک نئی زندگی اور ایک نئے نظام کا خواب دیکھتے ہیں۔ سورج انہیں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اور اندھیاریاں چھٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ خیالات ان کے گہرے سماجی اور طبقاتی شعور کو واضح کرتے ہیں۔ یہ خوبی ان کے دوہوں میں ایسی ہے جو انہیں وقت کا صحیح نباض اور حالات کا صحت مند نقاد بنا دیتی ہے۔

یہ دوہے اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں عالی نے براہ راست بغیر کسی جھجک کے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اسی لئے ان کا نقطہ نظر اور نظریہ حیات ان میں جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور اس طرح

ان کی شخصیت اور مزاج پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور ان دوہوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات تو اپنی ذات سے شروع کرتے ہیں لیکن آخر میں کوئی ایسا نتیجہ نکالتے ہیں جس سے انسانی زندگی کی کوئی اہم حقیقت واضح ہوتی ہے مثلاً ایک جگہ اپنی بابو گیری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کیسی اہم حقیقتوں کو واضح کیا ہے۔

بابو گیری کرتے ہو گئے عالی کو دو سال
مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑ گئے بال
دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ
چیکے چیکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ

دھرتی سے آکاش پہنچے دھنک نے کیا بل کھائے
کوئی دیکھے کوئی سوچے من سب کا لہرائے

نا کوئی اس سے بھاگ سکے اور نا کوئی اس کو پائے
آپ ہی گھاؤ لگائے ہے اور آپ ہی بھرنے آئے

چند اور دوہوں میں زندگی اور روح اور اس کے دکھ سکھ کی حقیقت پر اسی طرح روشنی ڈالی ہے۔

سنو سنو یہ بالک میرا یوں ہی نا چلائے
کھوے ہے اس بندی گھر میں کا ہے مجھے لے آئے
آتما جیسی بانکی تتلی جب بن جائے شریر
اور نہ جانے اب جیون کی کیا کیا ہو تاثیر
ہے بالک اس چکر کو پہچانتا خود بھی روئے
جیون کی تو ذات ہی کالی کون سیاہی دھوئے
ہے بالک تو جگ جگ جیوے رکھیو یاد یہ بول
جیون کے اندھیارے میں ہیں دکھ ہی سکھ کا مول
ہے بالک اس جگ میں رکھیو آندھی جیسے ٹھاٹ
نیچے پودے اونچے کیجو اونچے دیجو کاٹ
ہے بالک سب دھوکا ہے وہ نیائے ہو یا انیائے
پر وہ دھوکا کبھی نہ دیجیو جو تو آپ نہ کھائے

یہاں کچھ واعظانہ انداز ضرور نمایاں ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ ان دوہوں میں انسانی زندگی کی اہم

اور بنیادی حقیقتوں کا اظہار ہے اس لئے یہ اثر کرتے ہیں اور ان کا یہ اثر دیرپا ہوتا ہے۔

یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ عالی کے دوہوں میں مضامین کا تنوع ہے۔ اس میں ان کے ذاتی مشاہدات اور جذباتی تجربات' ذہنی واردات اور فکری تصورات ہیں' انہوں نے ان دوہوں میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان گنت معاملات و مسائل کو رچے ہوئے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے' یہی وجہ ہے کہ وہ دل و دماغ دونوں کے لئے غذا فراہم کرتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے' اس میں شبہ نہیں کہ عالی کے یہ دوہے ایک تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک نئی امیجری' ایک نئی زبان اور ایک نیا لب و لہجہ ملتا ہے جو عالی کی جدت پسند طبیعت کا ایک کرشمہ ہے۔ اس تجربے نے جدید اردو شاعری کو ایک صنف سے آشنا کیا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہی نہیں ایک فنی دریافت بھی ہیں اور اس فنی دریافت کا سہرا عالی کے سر ہے۔

عالی کے مجموعہ کلام میں کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ اور یہ گیت بھی کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں۔ ان میں بھی ایک جدت پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک نئے رنگ و آہنگ کے حامل ہیں۔ ان کے موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں جو غزلوں اور دوہوں کے ہیں لیکن ان میں آفاقیت کا وہ رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں ہے جو گیتوں کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے اور جس سے ان میں ایک ایسی دلکشی پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق فن سے زیادہ موضوع کے حسن سے ہوتا ہے۔ ویسے فنی اور جمالیاتی حسن بھی ان گیتوں میں کچھ کم نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ عالی نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنے گیتوں میں بڑے سلیقے سے یک جا کیا ہے۔ یہ جسے فکری اعتبار سے کتنے خیال انگیز اور جمالیاتی لحاظ سے کس درجہ دلاویز ہیں۔

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

سخت اور تیز کلہاڑوں جیسے
دیکھے لوگ پہاڑوں جیسے
کتنی جلد بکھر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

آدم سے عالی تک آئے
سب کے سب اک جیسے پائے
پیدا ہو کر مر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

کوئی آئے گا کوئی آئے گا

آدرشوں کا خوں پیتے ہیں

ہم اسی سہارے جیتے ہیں

کوئی اپنی پھلواری کو بھی

مہکائے گا

کوئی آئے گا

یہ قافلے ہیں انسانوں کے

یا کھیت ہیں سوکھے دھانوں کے

کبھی ان پر بھی کوئی مدہ کھا

برسائے گا

کوئی آئے گا

("سالنامہ ساقی" کراچی)

جنوری ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
(ماہنامہ "سہ رنیم روز" کراچی ۱۹۵۸ء)

ایک نیا شعری مجموعہ
"غزلیں، دوہے، گیت"

اتنی بات ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ ہماری شاعری ایک سنگم اور ایک دوراہے پر پہنچ گئی ہے۔ ایک طرف ہماری کلاسیکی شعری روایات ہیں جو ہمارے ادبی مزاج میں رچ بس گئی ہیں اور دوسری طرف نئے تجربوں کی وہ لگن ہے جو ایک نئے ذہن کی علامت ہے اور آج جو کشمکش ہے وہ انہی دونوں میں توازن یا مفاہمت پیدا کرنے کی ہے۔ روایت سے بغاوت کی آندھی بڑی تیزی سے چڑھی تھی اور اسکے سامنے کلاسیکی اقدار خس و خاشاک کی طرح اڑنے لگیں لیکن آندھی کا زور ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ ان اقدار میں بڑی جان اور توانائی تھی۔ ان کے مقابلے میں نئے تجربوں میں بڑا کھوکھلا پن تھا' یہی وجہ ہوئی کہ ہیئت اور اسلوب میں جو انقلاب آفریں تجربے ہوئے ان میں اکثر سسک سسک کر ختم ہوگئے۔ لیکن اس آندھی نے پرانی روایات اور اقدار کے چہرے پر سے بھی گرد اڑائی اور انہیں نیا روپ بخشا یہ نیا روپ جو آج کی غزل گیتوں اور دوہوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔

اس سارے ہنگامے میں غزل بیچاری بڑی رسوا ہوئی اور اس "نیم وحشی صنف" کو اردو ادب سے نکال کر کالے پانی بھیجنے کی تجویز بھی ہوئی لیکن یہ تھی بڑی سخت جان' جس نے نادر گردی' ابدالی کی لوٹ مار اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب دیکھا ہو وہ ایسی بودی نہ تھی کہ آسانی سے سولی چڑھا دی جاتی جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور آج غزل پھر ہمارے سر پر چڑھ کر بول رہی ہے۔

جمیل الدین عالی کے اس مجموعہ کلام کی ترتیب میں سب سے پہلے غزل ہی ہے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا جو اپنے آپ کو دہلوی کہتا ہے آل میر درد میں اپنے آپ کو شمار کرتا ہے۔ میر اور غالب سے اپنا ذہنی ناطہ جوڑتا ہے اور جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اقبال سے بھی متاثر ہے جسے فیض کی بڑائی کا احساس ہے۔ وہ غزل کہے گا اور ضرور کہے گا۔ پھر غزل محض باتیں بنانے کا نام نہیں' اس کے لئے چوٹ کھایا ہوا دل' ایک لگن اور سوز ناتمام بھی درکار ہے' پھر اس کا ایک اپنا انداز اور آہنگ الگ ہے جو اس میں آبگینے کی نزاکت اور نفاست پیدا کرتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں ان باتوں کا سراغ ملتا ہے' یہ چند اشعار دیکھئے۔

جب ترا ذکر چھڑا نام کی یاد آئے — دل آشفتہ پہ الزام کی یاد آئے
ان سے ہی جیون بنتا ہے سوجیون بن جائے گا — کچھ چھوٹے چھوٹے دکھ اپنے کچھ دکھ اپنے عزیزوں کے
پکارنا ہی پڑے گا تو کیا کہوں گا تمہیں — خدا کہوں گا تمہیں ناخدا کہوں گا تمہیں
امید بھی نہ رکھوں نا امید بھی نہ رہوں — تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
بہار آئی تو ہے دامن تمنا چاک — رہی خزاں میں تمنا کہ پھول چن لیتے
بہت حسین بہت مضطرب' بہت غمناک — ادا نہیں ہے یہ ہے زندگی ان آنکھوں میں
ہمیں تو کل ترے کوچے سے یار گزرے ہیں — ہمیں سے تذکرہ قحط عاشقاں توبہ
تری قسم ہے کہ اب وہ بھی ناگوار ہے آجا — وہ تیری یاد جو اب تک سکون قلب بنی تھی
کیا خبر کیا پیام آجائے — دل ابھی آرزو کو ٹھہرائے
مچل رہی ہیں کسی جور ناگہاں کے لئے — مسرتیں جو ملیں تیرے لطف پیہم سے

یہ اور ایسے مضامین اس مجموعہ کی غزلوں میں جابجا موجود ہیں لیکن غزل کی کائنات اور پھر آج کے غزل کہنے والے شاعر کا سرمایہ صرف یہی اشعار نہیں' آج کا غزل گو ایک نئے ذہن کا مالک بھی ہے۔ آج کے مسائل اور تقاضے بھی ہیں اور غزل کی دلنوازلے میں اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ یہ آوازیں بھی آتی ہیں۔

لب بھی نہ ان کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا — سوکھ چلے وہ غنچے جن سے کیا کیا پھول ابھرنے تھے
یہیں سے ہے مری روداد شوق کا آغاز — خزاں میں منظر گل درد ناک ہے لیکن
کہ تیرے چاہنے والے سحر بھی دیکھ چکے — اب انتظار کی کچھ اور منزلیں اے دوست
یا منزل نزدیک آپہنچی یا راہ بدلتی جاتی ہے — یہ کچھ دن سے دیوانوں کی حالت جو سنبھلتی جاتی ہے
اے باد سحر اے باد سحر کیوں ہم کو مسلتی جاتی ہے — ہم نے ہی خزاؤں میں اکثر کی تازہ ترے آنے کی خبر

ایسی باتوں کو غزل کی زبان اور غزل کے اشاروں میں کہنے سے بڑی فنی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر یہاں پیشہ وارانہ انقلابی' مصلح اور واعظ بن کر سامنے نہیں آتا' وہ اثر طلب نہیں کرتا' پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ نئے صحت مند ذہن کی ایسی بہت سی جھلکیاں ان اشعار میں موجود ہیں۔

غزل اپنی ہیئت اور فن میں جدت طرازی کے عمل جراحی کی متحمل نہیں ہو سکتی' آپ اس ہرن کی پیٹھ پر گھانس نہیں لاد سکتے اور اس مجموعے میں ایسی کوئی کوشش نہیں'

اس کے بعد دوہے شروع ہوتے ہیں' غزل کی طرح دوہوں کی بھی ایک چھب الگ ہوتی ہے اس کے لئے موضوع کی قید نہیں البتہ جذبے کی شدت اور بیان کی سادگی اور بیساختگی درکار ہے دو مصرعوں میں پورے خیال کو صفائی سے ادا کرنا کہ بھرپور تاثر قائم رہے ایک مشکل فن ہے ان دوہوں کو دیکھئے جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔

چڑھی ندی لوو اتر گئی پر گھر ہو گئے ویران — عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے — جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار — پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

اپنے ہی من کا رونا کیا ہر من میں لگی ہے آگ — ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کس کے بھاگ

کوچندر مال تج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھانے — میں جانوں کہیں رستے میں میری ناری کو دیکھ تسے

میں نے کہا کبھی سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی — اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

ڈھونڈ لو میری ناری کو ہے اس کی اک پہچان — چنکی لو تو پھول بنے اور پوجو تو بھگوان

ان دوہوں میں فنی شعور آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا ہے محض ہندی الفاظ کا رسمی استعمال نہیں' نہ محض کبیر' بہاری' میرا' رحمن اور تلسی داس کی صدائے بازگشت ہے' عالی نے ان دوہوں کے لئے ایسی زبان استعمال کی ہے جو بڑی حد تک ان کی اپنی ہے' اور پھر ان دوہوں میں بھی صرف پریم داس نہیں' دھرتی کی کٹھن راہوں کے بنجارے کو یہ بول بھی سنائی دیتے ہیں۔

اے بالک تو جگ جگ جیوے رکھیو یاد یہ بول — جیون کے اندھیارے میں ہیں دکھ ہی سکھ کا مول

اے بالک اس جگ میں رکھیو آندھی جیسے ٹھاٹ — نیچے پودے اونچے کیکر اونچے دیکھو کاٹ

اک گہرا سنسان سمندر جس کے لاکھ بہاؤ — تڑپ رہی ہے جس کی اک اک موج پہ جیون ناؤ

کیا جانے یہ چلی کہاں سے اور کہاں تک جائے — کون کنارا چھوڑ آئی ہے کون کنارا پائے

ان دوہوں کے مجموعوں میں دو مسلسل مضمون کے دوہے بھی ہیں' ایک میں حیدر آباد اور بمبئی کے سفر کے تاثر ہیں دوسرے کا آغاز اس دوہے سے ہوتا ہے۔

عالی جی اک گوری رسیلے دھنک سے جن کو پیار
پہنچ گئے اک گاؤں کبھی جو دھنک کے ہے اس پار

اس نگر میں وہی ریت تھی جو ہمیں اپنے چاروں طرف ملتی ہے۔

گاؤں کی سب سے سندر ابلا مار گئے سرکار — گاؤں کی نمبر اول گیتا لے گئے تھانیدار

آلہا اودل گانے والے پیادے سے کترائیں — ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

مضمون کو خاصا پھیلانے کے بعد کوی کہتا ہے۔

کس کس ماں کی کوکھ جلے کس کس دلہن کا سہاگ
ایک پرانی چنگاری سے کب تک جلے گی آگ

اسکے بعد چند دوہوں میں البتہ کوی نے اپنے رنگ کو چھوڑ دیا اور دوہے کے مدہم سروں کو انقلاب کے نعروں میں الجھا دیا ہے۔

اے بھین وہ دیکھ سے نے اپنی تان لگائی — اے بھین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

اک دوجے کا ہاتھ پکڑلو اور آواز لگاؤ   اے اندھیارو سورج آیا سورج آیا جاؤ

البتہ آخری دو دوہے بہت اچھے ہیں۔

مجموعے میں کچھ گیت بھی ہیں لیکن گیتوں میں ابھی عالی کا انداز پوری طرح ابھرا نہیں ہے آخر میں ایک کہانی ہے "دو مغموم آنکھیں" جو ہے تو نثر میں لیکن شروع سے آخر تک فعولن فعولن میں لکھی گئی ہے یہ ایک تجربہ ہے اور بس!

بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ ہمارے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے کلام کا اچھا ترجمان ہے' میں یہ تو نہیں کہوں گا جیسا اس مجموعے کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے۔ کہ عالی ان دو ڈھائی شاعروں میں ہیں جن کے کلام کا وہ دل چسپی سے مطالعہ کرتے ہیں' ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ عالی کی آواز اس کی اپنی آواز ہے جو سب سے الگ صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کا نقطہ عروج ابھی نہیں آیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(۱۹۹۷ء)

''اے مرے دشتِ سخن'' اور جمیل الدین عالی

جمیل الدین عالی رواں صدی کے نصف آخر کے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے منفرد اسلوب اور اندازِ فکر کی بناء پر سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ الگ نظر آنے کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں کے درمیان وہ رس بس رہے ہیں یا جس فضاء میں سانس لے رہے ہیں ان سے لاتعلق ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بات کہنے کا لب ولہجہ' طرزِ فکر اور الفاظ کا فنی برتاؤ معاصر شعرا سے بہت الگ رہا ہے۔ لہجے کی تازگی' فکر کی توانائی اور لفظوں کی موسیقیت نے باہم مل کر عالی کی شاعری میں ایک ایسا آہنگ' ایسا تیکھاپن' ایسی چاشنی اور ایسا ذائقہ پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کی شاعری پچھلی پچاس سالہ اردو شاعری کے انبار میں آسانی سے پہچان لی جاتی ہے۔ چنانچہ یوں تو ان کے یہاں کہیں کہیں فیض احمد فیض کا دھیما لہجہ بھی مل جائے گا' بعض مقامات پر ن' م' راشد کی فارسی بردوش لفظی پیکر تراشی اور میراجی کے اظہار کی بے باکی اور ایک آدھ جگہ جوش ملیح آبادی کے رومانی اندازِ فکر و نظر کا پرتو بھی دکھائی دے گا لیکن یہ چیزیں عالی کی شاعری میں اس طرح نہیں آئیں کہ عالی کو فیض و راشد یا جوش و میراجی کا خوشہ چیں کہا جاسکے۔ عالی کی شاعری کی ڈگر ان سب سے الگ ہے۔ ان کے بقول ''آپ بنا بنجارہ میں اور آپ بنائی باٹ''

قومی و ملی نغموں سے قطع نظر' عالی کے تین شعری مجموعے اب تک سامنے آچکے ہیں۔ ''غزلیں دوہے گیت'' ''لاحاصل'' قومی نغموں کو چھوڑ کر (جیوے جیوے پاکستان) اور اے'' مرے دشتِ سخن''۔ یہی آخرالذکر شعری مجموعہ اس وقت پیشِ نظر ہے۔ ہر چند کہ اس مجموعے میں بھی وہی اصناف شامل ہیں جن سے اس سے پہلے کے مجموعے مزین ہیں لیکن یہ اس کی ظاہری صورت ہے باطن و معنی کے اعتبار سے ''اے مرے دشتِ سخن'' عالی کے دوسرے مجموعوں سے بہت مختلف ہے۔ دوسرے مجموعوں سے صرف یہی نہیں کہ مطالعے سے قبل ہی ان کے مشمولات کا واضح انداز ہو جاتا ہے بلکہ بعض ناموں خصوصاً ''لاحاصل'' جیسے نام سے تو بعض تعبیرات کے مطابق وہ تاثر بھی ڈھکا چھپا نہیں رہتا جو خود شاعر نے ان سے قبول کیا ہے لیکن ''اے مرے دشتِ سخن'' کا معاملہ جدا ہے۔ اس کے تیور یکسر بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے نام کا ندائیہ لہجہ داد و فریاد یا ترحم طلبی کا لہجہ نہیں بلکہ مصاف زندگی میں بے خطر کود پڑنے اور ناسازگار حالات سے پوری مقاومت کے ساتھ تبرد آزمائی کا لہجہ ہے یہ

وشت وہ دشت نہیں جو اپنی فتح مندی و میرابی کی خبریں 'علامہ اقبال نے لے کر فیض احمد فیض تک اس طور پر دیتا رہا ہے کہ:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے
(اقبال)

ہے دشت' اب بھی' دشت مگر خون پا سے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں
(فیض)

عالی کے پاس کسی خاص موضوع کو مہارت فن کا محور بنا لینے کے حوالے سے وہ نسبت نامہ بھی نہیں کہ وہ میر انیس کی طرح یہ ادعا کر کے ذرا دیر کو اپنا جی خوش کر لیتے کہ:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

رہ گیا وحشت دل اور جنون عشق کے حوالے سے دشت کا وہ عمومی استعارہ جس نے اردو کو اس نوع کے بعض خوبصورت اشعار دیے ہیں۔

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
(ہوس شاگرد میر)

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑ کائے ہے
مژدہ خار دشت' پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
(ذوق)

سو' یہ استعارہ بھی اردو فارسی شعرا کے کثرت استعمال سے ایسا پامال ہوا کہ اپنی افادیت کھو بیٹھا اور اس میں جرات رندانہ وہمت مردانہ کا جو عنصر کار فرما تھا وہ بھی بے قدر و بے اثر ہو گیا اور پھر جب استعارے کے اس عنصر پر غالب نے یہ کہہ کر:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

ضرب کاری لگادی تو اس استعارے کی رہی سہی وقعت بھی باقی نہ رہی البتہ جس وقت جنوبی ایشیا میں سالہا سال کی غلامی کے بعد سامراج کے خلاف جمہور کی آواز بلند ہوئی اور مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی تو علامہ اقبال نے اپنے اس نوع کے اشعار:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

کے ذریعے دشت کے استعارے کو از سر نو حیات افروز بنادیا۔ اسی نوع کے بعض حیات افروز استعارے اقبال سے پہلے غالب کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن اس وقت جنوبی ہند کے مسلمانوں پر ایسی گہری نیند طاری تھی کہ غالب کے اس نوع کے شعر بھی:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دیوانے کا خواب لگے اور انہیں بیدار نہ کرسکے۔ نتیجہ محکومی و غلامی نے ان کے اجتہادی فکر کے سوتوں کو تادیر منجمد رکھا البتہ جیسے ہی غلامی کی زنجیر ٹوٹی اور مسلمانوں کو آزاد مملکت کے شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا تو ان کے اجتہادی سوچ کے وہ دروازے جو ان پر کئی سو سال سے بند ہو چکے تھے' دوبارہ کھل گئے نئے علوم کی تازہ ہواؤں نے ان کے دل ودماغ میں تازگی و بالیدگی پیدا کی' سائنس و فلسفہ سے لے کر تصوف و مابعد الطبیعیات تک سارے مسائل حیات کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ چنانچہ اسی بدلے ہوئے انداز فکر کی ایک تازہ مثال عالی کا مجموعہ کلام "اے مرے دشت سخن" ہے۔

"اے مرے دشت سخن" اسم عام کی صورت میں ایک ندائی فقرہ ہے لیکن اس ندائی فقرے کا لب ولہجہ اس انداز کا نہیں ہے کہ "چل مرے خامے بسم اللہ" بلکہ اس کا انداز زندگی کے خطرے اور مسائل سے بے جھجک آنکھ ملانے' ان کے حل میں اجتہاد فکر سے کام لینے اور اپنے عہد کے ہمراہان سست گام کو غالب کا یہ شعر سنا کر آگے بڑھ جانے کا انداز ہے:

عشق اگر مرد است' مرد تاب دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

(غالب)

اس انداز نظر کا سائبان بحیثیت مجموعی "اے مرے دشت سخن" کی ساری فضاء پر چھایا ہوا ہے اور صاف پتہ دیتا ہے کہ عالی نے پچھلے پچیس تیس برسوں میں بہت پڑھا ہے' بہت سوچا ہے اور جو کچھ سوچا اور پڑھا ہے اسے جذبات میں تحلیل کرکے شعر کا قالب دے دیا ہے۔ سائنس کی روز افزوں ایجادات و تیکنیکی فتوحات سے ان کو بہت گہری اور خصوصی دلچسپی رہی ہے چنانچہ تاریخ انسانی کے جلو میں انہوں نے ان ایجادات و فتوحات کو جس طرح دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے اور جس انداز سے شعر کا موضوع بنایا ہے' ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی نے بنایا ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ نئے علوم و مطالعات کے اخذ کردہ خیالات کو انہوں نے خام مواد کے طور پر الفاظ میں خواہ مخواہ داخل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسی وقت کچھ کہا ہے جب کہ یہ خیالات 'جبر اندروں کے تحت خود بخود زبان پر آگئے ہیں بدوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ فکر تازہ اور مسائل نو کے حوالے سے عالی نے جو کچھ کہا ہے وہ درون خانہ کے ہنگاموں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا ہے۔ اس لئے اگر وہ یہ

دعویٰ کریں کہ:

مجھے انتعاش غم نے پے عرض حال بخشی
ہوس غزل سرائی تپش فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پہ دل و جاں کی میہمانی
(غالب)

تو بے جا نہ ہوگا' یہ الگ بات ہے کہ "اے مرے دشت سخن" میں بہت کچھ کہہ دینے کے بعد بھی عالی جتنا کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ نہیں سکے۔ ان کے سوچ کی بھٹی ابھی اسی طرح دہک رہی ہے اور وہ ہم سے یہ کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ:

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرار آید
تپ شعلہ کم نہ گردد ز گسستن شرارہ
(اقبال)

چنانچہ اگر آپ ان سے سوال کیجئے کہ آپ کو آخر کیا چیز مستقلاً بیتاب و مضطرب رکھتی ہے اور آپ کس قسم کے غم کی آگ میں جل کر اندر سے پگھلے اور راکھ ہوئے جارہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ بتا سکیں گے اور سوال کے جواب میں غالب کا یہ شعر سنا کر خاموش ہوجائیں گے کہ:

نہ شرر رفتہ ز جا و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم لیک نہ دانم بچہ عنوانم سوخت
(غالب)

عالی کے بارے میں یہ باتیں بلادلیل نہیں کہی جارہیں۔ "اے مرے دشت سخن" کا ورق ورق شاہد ہے اور پورا مجموعہ قاری سے اپنے مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر قاری کو کم از کم اس کتاب کی چند نظموں خصوصاً "ایک سادہ سی تقریب" "تجی" "امکان" "چھپکلی کا دماغ" "گولر کے بھنگے" اور "بے یقینی" پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ ان سے عالی کی رسائی فکر اور علوء فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن نظموں کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے یہ نظمیں اپنی فنی حیثیت یعنی اظہار و ابلاغ کے باب میں نہ تو خالص استعاراتی ہیں نہ بیانیہ نہ تو انھیں ترچھی ٹیڑھی (oblique) کہا جاسکتا ہی نہ راست (Direct) بلکہ دونوں کے بین بین ہیں اور ان کا اسلوب فکر و فن قاری کو ایسے انبساط ذہنی اور نشاط روح سے ہم کنار کرتا ہے کہ وہ داد دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے نظموں کی طرح غزلوں اور دوہوں کی بھی یہی کیفیت ہے لیکن اس کتاب کا بیشتر حصہ چونکہ نظموں پر محیط ہے اس لئے اس جگہ صرف بعض نظموں کے حوالے ہی سے کچھ کہنے کی کوشش کی جائے گی۔

اے مرے دشت سخن کی پہلی نظم جسے عالی نے "ایک سادہ سی تقریب" کا نام دیا ہے ایک مکالماتی بیانیہ نظم ہے۔ اسے خود

عالی کی وضع کردہ اصطلاح میں نہاں خانہ دل کا اظہاریہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم الفاظ کی سطح پر فی الواقع ایک سادہ سی نظم ہے مگر جب اس کے باطن میں جھانک کر دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ نظم سادہ نہیں بہت پرکار اور بہ اعتبار معنی پرت درپرت ہے یہ سادہ سی تقریب صرف عالی کی تقریب نہیں ہے اور نہ اس کا ہیولا محض تخیلاتی ہے بلکہ اس کا ایک ایک مصرعہ فکر کے رشتے سے جڑا ہوا ہے اور یہ رشتہ فکر دنیا کے سارے اہل قلم سارے اہل نظر سارے اہل کمال اور سارے تخلیقی فن کاروں کی جبلی خواہش اور شعوری آرزومندی سے ہم رشتہ ہے اس نظم میں جس "جلسہ وداع" کا تذکرہ ہے اس کا تعلق کسی خاص زبان کسی خاص فرد یا کسی خاص طبقے کے نمائندوں سے نہیں بلکہ رنگ ونسل اور زبان وعلاقہ کی سطح سے بلند تر سطح پر دنیا کے ان سارے خلاق ذہنوں سے ہے جنھوں نے بارہا یہ سوال اٹھایا ہے کہ زندگی اور آرٹ کی ماہیت کیا ہے ان دونوں میں کیا رشتہ ہے اور ان میں سے کون دیرپا ہے یہ سوال نیا نہیں بہت پرانا ہے اور تاریخ انسانی کے ہر دور میں اٹھایا گیا ہے اور شاید یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے عالی نے بھی ایک صاحب فکر شاعر کی حیثیت سے یہی سوال اٹھایا ہے اور سوال کو ماضی حال اور مستقبل سے منسلک کرکے دیکھا ہے سوچا ہے اور اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کے بہانے انھوں نے اردو کو ایک بالکل اچھوتے موضوع پر نہایت خوبصورت اور فکر انگیز نظم دیدی ہے ہرچند کہ وہ بھی دنیا کے دوسرے صاحبان فکرونظر کی طرح سوال کا حتمی جواب تلاش نہیں کرپائے اور نظم کے اختتام پر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ :

"یہ کون جانے ازل جانے یا ابد جانے"

بہ ظاہر اسی مقام پر واپس آگئے ہیں جہاں سے چلے تھے لیکن ان کی یہ لاجواب واپسی مستقلاً" سوچ سے باز نہیں آتی۔ "اے مرے دشت سخن" کا لفظ لفظ پتا دیتا ہے کہ یہ سوچ عالی کا برابر پیچھا کرتی رہی ہے اور ان کی غزل گیت نظم اور دوہا سب کے تخلیقی عمل میں ساتھ لگی رہی ہے چناں چہ اس سوچ نے عالی کی شاعری پر تامل و تفکر کا ایک سایہ کردیا ہے جو عالی کے دوسرے شعری مجموعوں میں نسبتاً کم نظر آتا ہے۔

"اے مرے دشت سخن" کی دوسری اہم نظم "تجی" ہے جو اشارہ ہے حروف "تجی" یعنی الف بے تے کا اور کنایہ ہے آغاز کار کا۔ یہ نظم پہلی نظم کی بہ نسبت کئی گنا بڑی ہے۔"ایک سادہ سی تقریب" میں صرف چھتیس مصرعے ہیں جبکہ تجی میں دوسو سے زائد ہیں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ پہلی نظم قافیہ وردیف کی پابند مثنوی کی کلاسیکی ہیئت میں ہے جبکہ "تجی" ایک جدید طرز کی آزاد نظم ہے مصرعے حسب ضرورت چھوٹے بڑے ہیں لیکن نظم کی بحر سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ یعنی ایک ہی بحر کے ارکان میں سے ہیں یہ تو اس نظم کی ظاہری صورت ہے لیکن معنی ومفہوم کے اعتبار سے اگر اس نظم کو "ایک سادہ سی تقریب" کی توسیع کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا اس لئے کہ اس میں اسی قسم کے سوال کو قدرے تفصیل سے موضوع سخن بنایا گیا ہے جس کا مجمل تذکرہ "ایک سادہ سی تقریب" میں آیا ہے البتہ علامہ اقبال کے اس فلسفہ حیات کو کہ۔

وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل

ذہن میں رکھ کر غور کریں تو یوں لگتا ہے جیسے عالی کی پہلی نظم کا "جلسہ وداع" حقیقتاً "وداع غنچہ کے جلسے کی روداد ہے اور

دوسری نظم "تجلی" رازِ آفرینش کل کو پالینے کی کوشش کا منظر نامہ — ایسا منظر نامہ جو علوم جدیدہ کی اعانت' سائنس کی حیرت انگیز فتوحات ارضی اور تسخیر فلکی کی معاونت کے باوجود ذہن انسانی کی طمانیت کے باب میں ہنوز بے اثر و بے ثمر ہے۔

اس منظر نامے میں تاک جھانک کرنے والے سوال ایک دو نہیں متعدد ہیں اور یہ سوالات محض طبیعیاتی نہیں مابعد الطبیعیاتی بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ "تجلی" میں بھی پہلی نظم کی طرح کے سوالات زیر بحث آئے ہیں اور اس میں بھی شاعر کی بنیادی کھوج یہی رہی ہے کہ انسان حقیقتاً کیا ہے اور کیوں خلق کیا گیا ہے خلق کیا گیا تھا تو پھر اسے مقام احسن پہ لے جاکر اسفل کی کھائی میں کیوں پھینکا گیا اور کاغذی پیرہن دے کر نقش فریادی کیوں بنادیا گیا ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں صوفیان باصفا سے لے کر جویان علم و حکمت تک سبھی سرگرداں رہے ہیں انفرادی سطح پر مجاہدے مکاشفے اور مراقبے کیے گئے ہیں اور اجتماعی سطح پر مکالمے معارضے اور مناظرے ظہور میں آئے ہیں غرض کہ انسان کائنات اور خدا کے وجود اور ان کے باہمی رشتوں پر ہر زمانے میں اہل فکر و نظر کے ہر حلقے میں غور کیا گیا ہے سب نے ان کے کنہ و ماہیت کا سراغ لگانے پر اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں اور کبھی کبھی شارحین عقل و عشق نے رسائی فکر کے باب میں ایک دوسرے کی برتری کا اعتراف بھی کیا۔ اس اعتراف کے شواہد میں ایک بہت مشہور واقعہ یہ بھی ہے کہ جب اپنے وقت کے دو ہم عمر و ہم سبق نابغۂ روزگار مولانا ابو سعید ابوالخیر اور حضرت بو علی سینا مناظرے کے بعد محفل سے باہر آئے تو حاضرین میں سے بعض نے بو علی سینا سے ابو سعید ابوالخیر کے علم و فضل کے بارے میں سوال کیا بو علی سینا نے جواب دیا جو کچھ میں سوچتا ہوں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یہ ایک بندہ خدا کے بارے میں دوسرے بندہ خدا کا اعتراف ہے لیکن علت اولیٰ کی غایت سے آگاہی کے بارے میں دونوں ہی نے اپنے اپنے عجز کا اعتراف کیا گویا ان میں سے ہر ایک نے جانا کہ نہ جانا کچھ بھی جانتے بھی تو کیسے جانتے جبکہ۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
(شاد عظیم آبادی)

بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
(فانی)

گویا بے خبری کی تصدیق و توثیق کردی گئی۔ اس لیے اس بحث کو کہ زندگی اور کائنات کو کون کیا سمجھا ہے اور کیا نہیں سمجھ سردست یہیں چھوڑ کر علی کی نظم "تجلی" پر غور کریں تو کہنا پڑتا ہے کہ ارتقائے تہذیب انسانی کا وہ تاریخی شعور جس نے قرۃ العین حیدر سے جنوبی ایشیا سے وابستہ تاریخ تہذیب کے زیر اثر "آگ کا دریا" لکھوایا اور جس نے انسانی زندگی کے سارے نشیب و فراز کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کوشش میں آخر آخر خود ناول نگار کو تاریخ کے شکنجوں میں جکڑ لیا اور یہ ناول نگار اپنے قاری کو زندگی کے ایک دھندلے مبہم پیچیدہ اور مخفی تصور سے زیادہ کچھ اور نہ دے سکا وہی تاریخی کرب و شعور جمیل الدین

عالی کی اس نظم کا محور ہے لیکن اس نظم کا خالق تاریخ کے کثیف و عمیق غار میں پناہ گزیں ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اپنی غیر معمولی قوت متخیلہ کی مدد سے فکر و فن کی لطیف و جمیل سطح پر کامیابی کے ساتھ ابھر آیا ہے اور اپنی نظم کی وساطت سے اپنے قاری کو تہذیبی زندگی کا ایک ایسا تابناک شعور دے گیا ہے جسے ایک بڑا تخلیقی فنکار اپنے عہد کو تابناک تر بنانے کے لئے اپنے تخیل میں ہمیشہ سجائے رکھتا ہے۔

عالی کی نظم سے قاری کو جو مجموعی تاثر ملتا ہے اسے تابناک پیام شعور سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ عالی نے اگرچہ انسان و کائنات نیز ان کی تخلیقی غایت کے سلسلے میں طرح طرح کے سوالات اٹھائے ہیں اور ان سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ذہن انسانی سے ان گنت صدیوں کی مسافت بھی طے کرائی ہے اور اس لمبی مسافت میں ہر چند کہ سوالوں کے خاطر خواہ جوابات بھی نہیں مل سکے۔ ایں ہمہ فکر انسانی کی اس ناکامیاب تگ و تاز سے عالی ایک لمحے کے لئے بھی بے دلی و مایوسی کا شکار نہیں ہوئے وہ اس کے معترف ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ صدیوں سے اپنے کھوج میں سرگرداں رہنے کے باوجود انسان کو اب تک ذات و کائنات کا کوئی سچا عرفان حاصل نہیں ہو سکا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے انسان نے حقیقت جوئی کے سلسلے میں اب تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور یہ ہزاروں صدیاں جو بیت گئیں وہ آغاز سفر کے بالکل ابتدائی مرحلے یعنی الف بے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتراف حقیقت کے باوصف عالی نے نہ تو خود کو بھی ایک لمحہ کے لئے درماندہ دل گرفتہ محسوس کیا اور نہ پیش رووں کی ناکامی کو اپنے آپ پر یا اپنے بعد کی نسل انسانی پر منطبق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ اس سلسلے میں دو سو مصرعوں کی لمبی نظم "حجی" کے صرف آخری چند گو سادہ سادہ مصرعے دیکھیے جبکہ اولین حصوں میں ان کی لفظیات ایک سحر کی طرح ذہن پر چھا جاتی ہیں۔

خداوندا! خیال اک زائر خوش گفتگو ہے تسلی اک حریف آرزو نکلا
میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا
مجھے تو میرے ہی آئینوں میں عکس نمود دکھلا
مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آجائیں
انہی سے اک زباں' تعبیر ہر کون و مکاں' اپنی بناتی ہے
مجھے سب ہوشمندان زرافشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی
مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں مقید ہے
دوانی ہے
مرا اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

اوپر نقل کیے ہوئے مصرعے غالب کے اس شعر کے مصداق ہیں کہ

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لیکن عالی کے ان مصرعوں سے تھکن یا درماندگی کا اظہار ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس وہ سوالوں کے جوابات کی تلاش میں ہر لحظہ سرگرم و ہمہ وقت آمادہ سفر نظر آتے ہیں ان کے ذہن کا ایک سوال اور ان کی نظموں کا ایک ایک مصرعہ یہ التجا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اوپر دیے ہوئے مصرعوں میں عالی نے اپنی درازیٔ عمر کی دعا یا کچھ دنوں اور جینے کی جو مہلت مانگی ہے وہ بھی خود غرضانہ نہیں بلکہ صرف اس غرض سے ہے کہ کار جہاں دراز و پیچیدہ ہے۔ نہ صرف دراز و پیچیدہ ہے بل کہ سائنس کی تازہ دریافت کے مطابق اس جہاں کے ہر ذرے میں اور ذرے کے ہر جزو میں ایک نہیں 'کئی کئی جہاں آباد ہیں اور ان میں سے ہر جہاں اپنی تازہ کاری و گرہ کشائی کے لئے ذہن انسانی سے وقت کا طالب ہے۔ یہی وہ آگہی و زاویہ نظر ہے جس کے سبب عالی اپنے پیش روؤں کی ناکام مہمات سے آزردہ و افسردہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ تازہ دمی کے ساتھ نئی مہم کے لئے آمادۂ سفر رہتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ جس ذہن انسانی نے ذات و کائنات کے بارے میں نئے نئے سوالات اٹھائے ہیں وہی ذہن انسانی 'آج نہ سہی کل سہی' بہرحال ان کے جوابات بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر اس سلسلے میں جو تھوڑا سا وقت طلب کیا ہے اور جینے کی مہلت مانگی ہے اس میں علامہ اقبال کی طرح یہ کہہ کر کہ "کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر" کی روش مدعیانہ اختیار نہیں کی۔ بلکہ غالب کے اس شعر کے مصداق:

یوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ایک شدت عزیمت کے ساتھ اپنی عاجزانہ استدعا کو سراپا التجا بنالیا ہے خدا کرے ان کی یہ التجا قبول ہو۔ ان کے اس مجموعے کا ایک کلی تاثر یہ ہے کہ وہ تسخیر کائنات کے قائل ہیں اس لئے "تجی" تمام عجز و جستجو میں کسی آخری فتح کا امکان چھپائے ہوئے ہے۔ اسے پرانی اصطلاح میں وصال یار بھی کہا جا سکتا ہے۔

فکر و نظر کے حوالے سے عالی کی دوسری نظموں 'غزلوں اور دوہوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے لیکن اب میں اس جگہ ان اصناف سخن کو چھیڑنے کے بجائے عالی کی اس طویل نظم کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جو "انسان" کے عنوان سے "اے مرے دشت سخن" میں شامل ہے اور جو اپنے قامت 'موضوع اور حسن بیاں کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک بے مثال اضافہ ہے۔ یہ نظم اپنی قد آوری' ارتفاع فکری اور عظمت فن کے لحاظ سے چونکا دینے والی نظم ہے اور چار ابواب کی صورت میں ایک سو تیس صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ جبکہ تکمیل بھی نہیں۔

جدید اردو شاعری میں اگر عالی کی اس نظم سے مماثل جدید و طویل نظمیں تلاش کی جائیں تو صرف گنتی کی نکلیں گی۔ اس

سلسلے میں یوں تو جوش کی نظم "حرف آخر" علی اختر حیدر آبادی کی نظم "قول فیصل" سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" اور اختر الایمان کی نظم "سب رنگ" وغیرہ کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں لیکن ان میں قابل توجہ صرف جوش اور سردار جعفری کی نظمیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظمیں بھی خاصی طویل ہیں اور اپنے اندر بہت سے مسائل حیات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ زندگی' کائنات' انسان' خدا اور ان کے باہمی رشتے کیا ہیں؟ اس نوع کے بعض سوالات کسی نہ کسی نہج سے ان نظموں میں زیر بحث آئے ہیں اور یہ نظمیں لطف سخن کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو بہت کچھ سوچنے کو بھی دیتی ہیں لیکن یہاں بھی عالی کا انداز فکر اور ان کی شاعری کا ڈکشن' جوش یا سردار جعفری سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عالی نے اپنی نظم میں فطرت انسانی کے ان سارے متضاد و متناقص' مثبت و منفی' خوفناک و مہلک اور تعمیری و تخریبی پہلوؤں کو ذہن میں رکھا ہے جن کے عمل اور ردعمل کے نتیجے میں آج کا انسان اپنی موجودہ منزل تک پہنچا ہے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عالی کی سوچ کی رینج (Range) جوش اور سردار کی بہ نسبت بہت دور رس ہے اور اس کا سبب عالی کے فکر و مطالعہ کی گہرائی اور وسعت ہے۔

جوش کی طویل نظم "حرف آخر" ان کی دوسری نظموں کی طرح شکوہ لفظی اور طمطراق تشبیہات سے ایسی سجی ہوئی ہے کہ جوش کی حذاقت لسانی کالوہا منوالیتی ہے لیکن معنی و موضوع دبے دبے سے رہتے ہیں اور یہ اعتبار موضوع و معانی یہ نظم اتنی طویل نہیں جتنی کہ لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جوش کی نظم اگرچہ عدم آباد یا دوسرے لفظوں میں ازل سے شروع ہو کر وجود کے آغاز و ارتقاء تک پہنچتی ہے لیکن اس کی معنوی سطح بسیط و عریض نہیں اس لئے یہ نظم صنعت گرانہ اطناب کے باوصف تازہ جہات معنی کی فتح مندی سے محروم رہتی ہے۔ اس کے برعکس عالی کی نظم الفاظ کی سطح پر سادہ ہو کر بھی نہایت فکر انگیز و پرکار ہے اور قاری کو اس کے ماضی بعید سے لے کر مستقبل قریب تک' غور و فکر کا ایسا سامان فراہم کرتی ہے جو عالی کے معاصر شعراء کے یہاں تو نہیں' ہاں ممتاز و ہم عصر ناول نگار' قرۃ العین حیدر کے بعض ناولوں خصوصاً "آگ کا دریا" میں ضرور نظر آتا ہے لیکن اس جگہ نثر نہیں' شاعری زیر بحث ہے اس لئے قرۃ العین اور عالی کے فکری رویوں اور مسافتوں کا تقابل درست نہ ہوگا۔ البتہ جوش کی نظم "حرف آخر" کے ساتھ عالی کی نظم کو رکھ کر دیکھنا مناسب ہوگا۔

اول اس لئے کہ جوش کی طرح عالی کی نظم بھی بہ اعتبار تعداد اشعار بہت طویل ہے اور ایک نشست یا ایک سانس میں نہیں کہی گئی بلکہ اس کے لکھنے میں سالہا سال صرف ہوئے ہیں اور یہ ہنوز نامکمل ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح جوش کی نظم کے مختلف اجزاء مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اسی طرح عالی کی نظم "انسان" کے جستہ جستہ حصے بھی اخبارات و رسائل میں پچھلے چالیس برسوں سے چھپتے رہے ہیں اور اردو کا قاری اس کے موضوع و اسلوب سے مانوس رہا ہے لیکن جوش کا ڈکشن ان کی عام شاعری کی طرح کچھ اتنا پر جلال اور پرشور و پرشوکت ہے کہ نظم کے معنی دب کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور قاری کو اس سے معنوی حظ اٹھانے میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عالی کی نظم کے مصرعے بیشتر چھوٹے چھوٹے اور نہایت فکر انگیز و تہہ دار ہیں ان کی یہ تہہ داری یقیناً کہیں کہیں قاری کو الجھن میں تو ڈالتی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ قاری مصرعوں کے سیاق و سباق ہی کو بھول جائے اور معنی تک رسائی محال ہو جائے۔

ایک اور بات جو عالی کی نظم کو جوش کی نظم سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جوش کی طویل نظم شروع سے آخر تک پابند ہے یعنی مروجہ بحروں میں قوافی و ردیف کا پورا پورا التزام ہے لیکن بصورت مثنوی کسی ایک بحر میں نہیں ہے بلکہ اس میں چھوٹی بڑی کئی بحریں استعمال ہوئی ہیں۔ نظم کے جو اجزاء چھوٹی بحر میں ہیں وہ بہت خوبصورت ہیں اور جوش کے کمال فن کا اعتراف کروالیتے ہیں مثلاً "جوش کی نظم کا وہ ابتدائی ٹکڑا جس کا عنوان ہے "سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب" تخلیق فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں جوش نے تخلیق سے پہلے عدم و وجود میں جو کشاکش و کشمکش ہوئی ہے اس کی بہت خوبصورت تصویر کشی کی ہے:

ایک افسوں بدوش ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم

روئے خنداں نہ دیدۂ گریاں
جلوہ گل نہ رشحہ شبنم

ساز دیوانگی نہ سوز خرد
نغمہ سرخوشی نہ نوحہ غم

سوز تخلیق ساز در پردہ
اور بظاہر نہ کوئی زیر نہ بم

جامد و پا بہ گل عناصر میں
اک ابھرتا ہوا سا جذبہ رم

خود سے الجھی ہوئی سی اک زنجیر
خود سے کھلتا ہوا سا اک عالم

ایک تعمیر بے در و دیوار
ایک تشکیل بے حدوث و قدم

اک حکایت بغیر گوش و زباں

ایک کتابت بغیر لوح و قلم

اک نادیدہ عقدہ بے ناخن
ایک آوارہ راز بے محرم

اور اس آوارہ راز کے اندر
قلب خالق کی جنبش پیہم

یہ جوش کی نظم "حرف آخر" سے چھوٹی بحر کا ایک نمونہ تھا اب قدرے طویل بحر کا ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا دیکھیے۔ اس میں عناصر اربعہ کے ایک عنصر یعنی "آگ" کو موضوع سخن بنایا گیا ہے:

آگ جولانی، حرارت، مسکراہٹ روشنی
آگ ہستی سرخوشی، مستی، جوانی زندگی
آگ، آب چہرہ شب، آگ تاب حسن روز
موج رقص و موج رنگ و موج ساز و موج سوز
گرم، گل گوں، گل چکاں، گلبار گل رخ، گل صفات
ہمہمہ، جدت حرارت، حوصلہ، ہلچل، حیات
آگ حرف اولین خطبۂ خلاق نور
سرخی افسانہ، ایجاد پیغام ظہور

اس نوع کے اشعار، لفظی مرصع سازی کے سوا کسی فکر بلند یا خوبصورت خیال کے حامل نہیں۔ صرف تشبیہوں کا ایک بے کیف سلسلہ ہے جس سے جوش کی صناعانہ قوت تخلیق کا تو اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس میں قاری کے جذبات میں ارتعاش پیدا کرنے والی شاعری کے اجزا بہت کم ہیں۔

سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" بلاشبہ ایک خوبصورت اور فکر انگیز نظم ہے۔ یہ نظم خاص پس منظر میں کہی گئی ہے اور ایک مخصوص فضاء کی تخلیق ہونے کی بناء پر مقبول بھی ہوئی ہے۔ لیکن جیسے ہی فضاء بدلی، نظم بھی پردہ خفاء میں چلی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نظم کی فضاء کا تعلق نفسیات انسانی اور اس کے مسائل و اقدار سے اتنا نہ تھا جتنا کہ خاص نوع کے سیاسی موسم اور اس کی تبدیلی کے حالات و اثرات سے۔ یہ نظم جیسا کہ اس کا نام اس طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ حقیقتاً اگست ۱۹۴۷ء میں بیرونی سامراج سے آزاد ہونے کی خوشی میں پاک و ہند کی تحریک آزادی کے مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں کے لئے ایک شاعر کی طرف سے ایک قسم کا نذرانہ عقیدت و پیغام تہنیت ہے۔ پوری نظم، ہنگامی و رومانی شاعری کا ذہنی جوش و

خروش رکھتی ہے جو سردار کی شاعری کا عمومی طرۂ امتیاز ہے کتابی صورت میں یہ نظم سردار کی ایک اور نظم "جمہور" کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ پوری کتاب میں ایک سو چھتر صفحات ہیں جن میں سے ایک سو بیس صفحات زیر بحث نظم "نئی دنیا کو سلام" کو دیے گئے ہیں۔ نظم کا مجموعی تاثر خاصا خوشگوار ہے اور صاف پتا دیتا ہے کہ یہ نظم رسمی یا مصنوعی انداز میں نہیں کہی گئی بلکہ سچے جذبات و محسوسات نے اسے جنم دیا ہے۔ نظم کا اسلوب رمزیہ و تمثیلی ہے اور یہ کچھ اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ اسے منظوم ڈراما بھی کہا جا سکتا ہے۔ گویا اسلوب کی سطح پر نظم، عالی کی نظم سے ملتی جلتی ہے لیکن جعفری کی نظم کا کینوس بہت مختصر ہے اور پھر یہ کینوس اس انداز کا بھی نہیں جس میں بنی نوع انسان کے سارے ازلی و ابدی مسائل سے منسلک ہو کر ایک محور پر آگئے ہوں اور ان میں مقامیت سے بلند سطح پر آفاقیت کے آثار پیدا ہو گئے ہوں۔ البتہ آزادی و آزادی کی تحریک کے حوالے سے ساکنان پاک و ہند کو ان کے روشن مستقبل کی خوش خبری سنائی گئی ہے اور یہ خوشخبری شاعری کی ایسی ہیت و اسلوب میں ہے جسے قدیم و جدید کا سنگم کہا جائے گا اس لئے کہ اس کے بعض اجزاء کلاسیکی طرز پر، بحر و قافیہ و ردیف کے پابند ہیں اور بعض اجزاء آزاد یعنی بلینک ورس میں ہیں۔

جوش اور سردار کی نظموں کے برعکس عالی کی نظم فکر و نظر کا بہت بڑا افق رکھتی ہے اور حیات انسانی کے نہایت بسیط و عریض عالم پر محیط ہے۔ اس میں آفرینش آدم سے لے کر آج تک کے انسان کی ارتقائی منزلوں کا جائزہ ایسے تاریخی شواہد و نفسیاتی کوائف، عمرانی اور سماجی اصول، فلسفیانہ تاملات اور سائنسی توجیہات کے ساتھ لیا گیا ہے کہ عالی کی ژرف نگاری، بشریات و سماجیات سے ان کی آگاہی، معاشرتی و معاشی مسائل و عوامل سے ان کی وابستگی علوم جدیدہ سے ان کی واقفیت، مشرق و مغرب کے مطالعے کی وسعت اور اس وسعت کو شاعری کی زبان دینے کی غیر معمولی صلاحیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

عالی کی اس نامکمل نظم میں سردست تقریباً دس ہزار مصرعے کہے گئے ہیں اور اس کے چند اجزاء ۱۹۵۰ء سے لے کر آج تک مختلف رسائل و جرائد کے ذریعے منظر عام پر بھی آچکے ہیں۔ زیر نظر کتاب "اے مرے دشت سخن" میں بھی نظم کے صرف چار حصے یا چار اجزاء شامل ہیں اور ان اجزاء میں نظم کا تقریباً پانچواں حصہ سما گیا ہے پھر بھی نظم کا بیشتر حصہ جو کہ سات آٹھ ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے، ہنوز سامنے نہیں آیا۔ اس لئے صرف پیش نظر اجزا کی مدد سے پوری نظم کے مشمولات کا مکمل ادراک مشکل ہے۔ پھر چوں کہ عالی کی پوری نظم تقریباً استعاراتی ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ استعارہ متعدد معنی کا حامل ہونے کے سبب پرت در پرت ہوتا ہے اس لئے اس کے حقیقی معنی کا ادراک آسان نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ایک استعارہ کسی خاص شخص کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور مطالعات کا زائیدہ ہوتا ہے اور جب تک کوئی شخص اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں ان منزلوں سے نہ گزرا ہو جن میں کوئی خاص استعارہ وجود میں آیا ہے، اس وقت تک وہ شخص استعارے کے حقیقی معنی یا استعارہ تخلیق کرنے والے شاعر کے معہود ذہنی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ تبھی تو فانی نے کہا تھا کہ:

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں
اک بے قرار تڑپا اک بے قرار رویا

کم و بیش یہی صورت علامت، رمز، اور تمثیل کی ہے کہ یہ سب استعارے کی ذریات میں سے ہیں حالی کی نظم کے استعاراتی اسلوب سے قطع نظر ایک اور پہلو نظم کی تفہیم کو مشکل بنا دیتا ہے۔ اس پہلو کی طرف خود حالی نے یہ کہہ کر اشارہ کردیا ہے کہ:

"اس پورے نظمیے میں منظرنامے، کرداروں کی حرکات و سکنات، حلیے اور ڈرامائی متعلقات قاری کی تفہیم و تصور پر چھوڑے گئے ہیں۔"

(اے مرے دشت سخن، ص ۱۵۴)

ایسے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محض چند اجزاء کو نظر میں رکھ کر حالی کی نظم "انسان" کے بارے میں نہ تو کوئی حتمی یا کلی رائے قائم کی جاسکتی ہے اور نہ اسے دنیا کی بڑی نظموں کے مقابل رکھ کر جانچنا پرکھنا ممکن ہے یہ کام اس وقت ہو سکتا ہے جب حالی کی مکمل نظم ہمارے سامنے آجائے۔ پھر بھی اس زاویہ نظر سے کہ:

ہر جزو کو، کل کے ساتھ معنی ہے اتصال
دریا سے در جدا ہے پہ ہے فرق آب میں

(خواجہ میر درد)

جزو کی روشنی میں کل کے بارے میں کلی اور حتمی طور پر نہ سہی جزوی اور ضمنی طور پر سہی کوئی نہ کوئی رائے بہر حال قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ نظم پر طائرانہ نظر ڈالی جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے عنوان و موضوع یعنی "انسان" کی پیدائش وغایت اور ارتقا کے نظریات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ نظم کو سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

انسان اور اس کے عالم وجود میں آنے کے مسئلے پر غور کرنے والوں میں صوفیا کرام، علما و فقہا، فلسفی، سائنس داں اور شاعروادیب سبھی شامل رہے ہیں۔ ان سب کو ان کے انداز فکر کی روشنی میں دو خاص جتھوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

ایک طبقہ وہ ہے جو مذہبی صحیفوں اور آسمانی کتابوں کی روشنی میں یہ حکم لگاتا ہے کہ انسان یا آدم کو اول اول اسی شکل و صورت میں پیدا کیا گیا جس شکل و صورت میں آج وہ موجود ہے۔ کیسے اور کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ اس سوال کے جواب میں مذہب نے کہیں تو یہ بتایا کہ آدم کو پانی سے بنایا گیا ہے، کہیں یہ کہ اسے مٹی سے بنایا گیا ہے اور کہیں یہ بتایا گیا کہ اسے پانی اور مٹی کے گارے سے بنایا گیا، کہیں یہ کہ اسے کھنکناتی ہوئی مٹی کی سخت ٹھیکری سے بنایا گیا اور کہیں قدرے تفصیل سے یہ بتایا گیا کہ آدم کی تخلیق کے لئے پہلے خمیری مٹی کا ایک قالب تیار کیا گیا، پھر اس مٹی کے قالب میں روح پھونکی گئی نتیجتاً یہی قالب گوشت پوست والا انسان بن گیا۔ اس طرح کی اور کئی روایتیں دینی کتابوں اور ان کی تفسیرات میں ملتی ہیں اور ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ ابتداً انسان کو ویسا ہی پیدا کیا گیا جیسا کہ وہ آج نظر آتا ہے ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا گیا کہ وہ بطرق احسن خلق کیا گیا ساری مخلوقات سے افضل قرار دیا گیا۔ زمین کی سرداری و خلافت عطا کی گئی امانت الٰہی کے اس بارگراں کو اٹھانے کا اہل ٹھہرایا گیا جسے اٹھانے سے فرشتوں اور دوسری مخلوق نے انکار کردیا تھا۔ اسماالحسنٰی کا درس دے کر اسے دستار علمی

سے سنوارا گیا۔ بعد ازاں سجود ملائک کے مرتبے پر فائز کر کے اسے ابلیس کی سرکشی کا مدمقابل اور اس کی مذموم شری حرکتوں کا مانع و دافع بنا دیا گیا۔

یہ تکوین آدم کے مسئلے کا ایک رخ ہے اور بنی نوع انسان کے ایک طبقے کا ترجمان ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس مسئلے کو عقائد سے یکسر الگ کر کے خالص علمی و سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس طبقے کے نزدیک آدم اپنی ابتدائی تخلیق میں ایسا نہ تھا جیسا کہ آج وہ ہے بلکہ وہ ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر کر جانوروں کی متعدد صورتیں اختیار کرتا ہوا اپنی موجودہ شکل و صورت تک پہنچا ہے۔ اس نظریے کا سب سے مشہور و ممتاز داعی و مفسر، مغربی اسکالر ڈارون ہے۔ ڈارون کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق موجودہ انسان دراصل بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ڈارون کے اس نظریے کو خالص مغربی اور مادہ پرستانہ جان کر علمائے مشرق خصوصاً" علمائے دین نے اس سے اختلاف کیا اور اس نقطہ نظر کے قائل رہے جو انہیں اپنی کتابوں سے ملا تھا لیکن ڈارون کے نظریے کو خالص مغربی علم و فکر کا حاصل جاننا درست نہیں معلوم ہوتا' اس لئے کہ خود مشرق میں اس کے ابتدائی نشانات موجود تھے خاص طور پر مولانا روم نے ڈارون سے بہت پہلے ارتقائے انسانی کے باب میں اسی طرح کی باتیں کہہ دی تھیں:

آمدم اول بہ اقلیم جماد
وز جمادے در نباتے اوفتاد
وز نباتے چوں بہ حیواں اوفتاد
نامدش حال نباتے ہیچ یاد
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تاشد اکنوں عاقل و دانا وزفت

مولانا روم کے بعد بیدل عظیم آبادی نے تو اپنے شعر میں تقریباً بالکل وہی بات کہہ دی تھی جو ڈارون نے ایک مدت کے بعد اپنی کتاب میں کہی بقول بیدل:

ہیچ شکی بے ہیولیٰ' قابل صورت نہ شد
آدمی ہم پیش ازاں کا دم شدہ بوزینہ بود

تکوین آدم کے باب میں ان نظریات کے بارے میں رائے زنی نہ ہمارا مقصد ہے نہ اس جگہ اس کا موقع۔ اس لئے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہنا صرف یہ ہے کہ آفرینش آدم کے باب میں نظریاتی اختلافات کچھ بھی ہوں اس امر پر سارے علمائے مشرق و مغرب کا اتفاق ہے کہ انسان ہی کائنات کی بہترین مخلوق ہے اور عقل و حکمت کا یہ خاکی پیکر ایسے عمل و کردار کا مکلف ہے کہ اس کا وجود بے سبب و بے مقصد یا محصور و مجبور محض نہیں بلکہ اپنے عمل و ارادہ میں آزاد و مختار ہے مخلوق ہونے سے پہلے تک یا عمل تخلیق کے درمیانی عرصے میں یقیناً وہ مجبور و غیر مکلف کہا جا سکتا ہے۔ لیکن خلق ہونے کے فوراً بعد وہ اپنے عمل و ارادہ میں بااختیار ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ پیدا ہوتے ہی وہ اپنے تحفظ و دفاع کے لئے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیتا

ہے۔ اس کا یہ جبلی عمل تربیت و تجربے کی معرفت آخر کار اسے شعور کی منزل تک لے جاتا ہے اور شعور کی پختگی کے بعد بھی اس میں اپنے وجود کی عظمت کا یہ احساس ابھرتا ہے کہ:

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

(میر)

اور کبھی عجز و فروتنی کی یہ لہر اس کے سکون کا باعث بن جاتی ہے کہ:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

(میر)

گویا رفتہ رفتہ اس میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے مکافاتِ عمل کے قانونِ فطرت کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول پر ایمان لے آتا ہے۔ یہی ایمان اس کو جبر و اختیار کی حدود سے آشنا کر کے اسے حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے اپنی اہمیت و افادیت کا احساس دلاتا ہے اور اس کے ذہن سے یہ بات نکال دیتا ہے کہ اس کی تخلیق یا اس کا وجود بے مقصد و بے معنی ہے۔ خاص طور پر جب اس میں یہ احساس ابھر آتا ہے کہ اللہ نے اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نواز کر اشیاء کا علم عطا کر کے اسے فرشتوں سے برتر اور ابلیسی و طاغوتی قوتوں سے عظیم تر کر دیا ہے تو اس کی مشکل پسند اور دشوار طلب طبیعت میں غضب کی خود اعتمادی و خودنگری اور بلا کی فطرت مندی و خودداری جاگ اٹھتی ہے اور اس کے اندر تسخیرِ کائنات کے باب میں اپنی فاتحانہ بے کرانی کا ایسا شعلہ لپک اٹھتا ہے کہ گاہے گاہے وہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہہ اٹھتا ہے کہ:

این جہاں چیست صنم خانہ پندار من است
جلوہ او گرو دیدہ بیدار من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را
حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن ما
چہ زمان و چہ مکاں شوخی افکار من است

یہ ہے وہ انسان جس کے علم و فکر کا مجمل کا ذکر اوپر آیا اور جسے جمیل الدین عالی نے اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے اور روزِ آفرینش سے لے کر آج تک کے انسان کی داستانِ فتح و شکست کو اس انداز سے قلمبند کر دیا ہے کہ اس کا قاری انسان ہونے کے ناتے خود کو اس سے مانوس بھی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کے بلند و پست اور خوب و ناخوب پہلوؤں کو اپنی ہی زندگی کا جزو خیال کرنے لگتا ہے اور اس کی احسن و اسفل صورتوں کو اپنے اعمال خیر و شر کا آئینہ جان کر اس میں اپنا چہرہ بھی دیکھنے لگتا

ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ایک انسان جب عالی کی زبانی انسان کی کہانی سنتا ہے تو وہ اسے اپنی کہانی سمجھ کر کبھی خوش ہوتا ہے کبھی افسردہ۔ کبھی اس کے اندر غم و غصہ کروٹ لیتے ہیں کبھی ملامت پہلو بدلتی ہے۔ کبھی محبت کی آگ بھڑکتی ہے کبھی محبت کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کبھی رشک کبھی حسد' کبھی بدی' کبھی نیکی' کبھی عداوت کبھی رافت' کبھی اطاعت کبھی بغاوت' کبھی سرکشی' کبھی خود سپردگی کبھی رعونت' کبھی فروتنی کبھی جبر اور کبھی اختیار غرض کہ طرح طرح کی نفسی کیفیات سے انسان دوچار ہوتا ہے اور کچھ ایسی نہج سے دوچار ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس امر کا اقرار کرلیتا ہے کہ "اے مرے دشت سخن" میں جو کہانی سنائی گئی ہے وہ کسی خاص فرد یا صرف عالی کی کہانی نہیں' بلکہ دنیا کے سارے درد مند اور سوچتے ہوئے دل و دماغ رکھنے والوں کی کہانی ہے اور یہ کہانی اس انداز سے سنائی گئی ہے کہ جو سنتا ہے اس کی داستان معلوم ہوتی ہے۔

عرض کیا جا چکا ہے "اے مرے دشت سخن" میں دس ہزار مصرعوں پر مشتمل عالی کی طویل نظم "انسان" پوری کی پوری شائع نہیں ہوئی بلکہ مشکل سے اس کا پانچواں حصہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ پانچواں حصہ بھی چار اجزاء میں تقسیم ہے اور ہر جزو سینکڑوں مصرعوں پر مشتمل ہے اور ماضی و حال سے بحث کرتا ہو نفس انسانی کے درجنوں پہلوؤں کو زیر بحث لاتا ہے اور زندگی و کائنات اور انسان و خدا کے باہمی رشتوں کے بارے میں ایسے سنجیدہ و مابعد الطبیعیاتی سوال اٹھاتا ہے کہ نظم کے مختصر سے مختصر جزو کی تفصیل میں جانا بھی اس وقت ممکن نہیں۔ بعض بعض مصرعے پورے کے پورے مضمون لگتے ہیں۔ لفظیات' جمالیات' فکریات کا ایک طلسمات ہے جو تہ در تہ کھلتا اور پھیلتا جاتا ہے مگر فی الوقت ہم اتنی تفصیل میں نہیں جاسکیں گے۔ اس لئے نظم کے مطبوعہ حصے کے آخری دو ابواب یا آخری دو نظموں یا آخری دو نظموں پر اجمالاً اظہار خیال کیا جائے گا۔

پہلی نظم جسے کتاب میں تیسرا باب قرار دیا گیا ہے کم و بیش پینتالیس صفحات پر محیط اور چھ سو سے زائد مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جمالی اور ہیولوں کے روپ میں 'زندگی' انسان' کائنات اور فرد و معاشرہ کے آغاز و ارتقا اور عروج و زوال پر گفتگو کی ہے۔ خالق و مخلوق کے باہمی رشتوں' رشتوں کی استواری اور بودا پن' فکر انسانی کی رسائی و نارسائی' جدید علم و فکر کی مدد سے ذہن انسانی کی فتوحات اور اس کی کارکشائی کے امکانات پر ایک دو نہیں درجنوں سوالات اٹھائے ہیں۔ ایک نسوانی کردار (جسے ازلی جستجو کہا جاسکتا ہے) کئی ہیولائی صداؤں کی مدد سے بہت دلچسپ و فکر انگیز مکالموں کی معرفت سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہت مضبوط شاعری بھی ہے۔

عالی کے اٹھائے گئے سوالات اور ان کے جواب کی تلاش کا سلسلہ نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ ہر دور' ہر زمانے ہر انسانی معاشرے میں یہ سوالات زیر بحث رہے ہیں اور ان کے اپنے بالغ ترین و بہترین ذہنوں نے ان سوالوں کے تحت موضوع گفتگو بننے والے مسائل کے حل میں زور مارا ہے۔ سوالات و مسائل ایسے پیچیدہ و مشکل ہیں کہ غیر معمولی دل و دماغ کے مالک اور جدید و قدیم علم و فکر سے پوری طرح بہرہ مند اشخاص کے سوا کسی دوسرے کے لئے جوابات کی تلاش تو دور کی بات ہے سوال کرنا بھی آسان نہیں ہے' اس لئے کہ سوالات خواہ کسی قسم کے ہوں صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کا ذہن موضوع زیر بحث سے خاطر خواہ آگہی کے ساتھ حصول جواب کے لئے ہمہ وقت مضطرب بھی رہتا ہو اور جس کے پاس کسی نہ کسی شکل میں

ان سوالوں کے جوابات بھی موجود ہوں۔ جمیل الدین عالی ایک ایسے ہی بالغ نظر اور مضطرب ذہن کے مالک شاعر ہیں۔ اپنی مکالماتی نظم میں انسان و حیات اور کائنات اور ان کی تخلیق و غایت کے بارے میں صرف سوالات نہیں اٹھائے بلکہ اپنے آپ کو بھی ضمیر متکلم کبھی ضمیر مخاطب اور گاہے ضمیر غائب کی صورت میں رکھ کر بحث و استدلال کے ذریعے' سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مکالماتی پس منظر میں جو موضوعات بہت نمایاں ہو کر قاری کے سامنے آئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

○ بہ اعتبار فکر و نظر اور بلحاظ تسکین جسم و روح' شاعر کی تنہائی اور تنہائی کے احساس کا کرب شدید۔

○ فرد یا ذات کی خرد افروزی و سعی بے نہایت کے ذریعے کوئی انمٹ' یادگار اور پیغمبرانہ کارنامہ چھوڑ جانے کا شوق مضطرب۔

○ جبر و اختیار کے مسئلے کے حوالے سے حشر و نشر' حساب و کتاب' ثواب و عذاب جزا و سزا اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں فرد کو ذمہ دار ٹھہرانے کا جواز' عدل و انصاف کے ترازو کی تلاش' تقلید و اجتہاد کا آشوب۔

○ غم اور خوشی کی حقیقت' ان کے بدلتے ہوئے روپ فرد بفرد اور طبقہ بہ طبقہ بدلتے ہوئے ان کے مفاہیم' مفاہیم بامعنی و بے معنی اسباب و جواز' تشریحات' ترجیحات اور نظریات کی معنویت۔

○ تازہ علم و فکر اور جدید سائنسی تجربات کے ہاتھوں نظام حیات انسانی کے شب و روز' تغیرات' افکار و جذبات اور اقدار زندگی کی بے ثباتی و ناقدری اور اقدار کے کسی عنصر حتیٰ کہ جذبہ عشق کو بھی مطلق و ابدی خیال کرنے کے عقیدے کا تزلزل' ساتھ ہی سب کو مسخر کر لینے کا عزم و امکان۔

○ جہل و لاعلمی کے سبب انسان کی ہنوز اپنی ذات و صفات کی قدر و قیمت سے بے خبری اور علوم کی مبادیات' بے خبری کے باوصف انسان کے دعوئ خود شناسی کا مضحکہ و ماتم۔

○ جدید علم النفس اور جدید سائنس کی فتوحات و تجربات کی روشنی سے بے نیاز کسی قوم یا فرد کی بے خبری کی صورت حال' علم و خرد کی کاملیت اور مدلل عقلیت پسندی کے بغیر کسی مسئلے پر غور و فکر کے نتائج کا مفید ہونے کے بجائے مہلک ہونا۔

○ انسانی فکر و دانش کے ایک نہ ایک دن کامیاب ہونے اور زندگی کی تیرگی کو روشنی میں بدل کر انسانیت کو مسرت ابدی سے ہم کنار کر دینے کی امید و بشارت۔ یہ ایک سب پر غالب خیال ہے جو ان ابواب کے دروں میں کبھی خفی کبھی جلی مضطرب نظر آتا ہے آگے جا کر عالی کسی نتیجے تک پہنچیں گے یا کیا پیام دیں گے یہ ابھی ان ابواب کے مجموعی تاثر سے نہیں ابھرتا اب تک تمام منفیات کے باوجود عزم و امکان تسخیر زندہ نظر آتا ہے۔ یہ ہیں باختصار وہ مباحث و مضامین جنہیں شاعر نے موضوع گفتگو بنایا ہے۔ گفتگو کی صورت یہ رہی ہے کہ مکالماتی مباحثے میں شاعر کے ساتھ مختلف مرئی کردار شریک رہے ہیں لوع بہ نوع سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ پھر واقعاتی دلائل اور تاریخی شہادتوں کے ذریعے ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کوشش خشک مزاج فلسفیوں یا کم علم ملاؤں جیسی نہیں بلکہ نہایت خوش ذوق و بالغ نظر اسکالرز جیسی ہے اور عالی کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت' حیرت انگیز وسعت مطالعہ اور لائق تحسین طرز استدلال پر دلالت کرتی ہے' مذکورہ

بالا موضوعات و نکات کی خوش آہنگ اور دل آویز بحث کے ثبوت میں نظم کے طویل اقتباسات کو اس مضمون میں جگہ دینا ممکن نہیں پھر بھی مختلف نکات و موضوعات سے متعلق اجزائے چند' متعلقہ مصرعے اور اشعار نیچے درج کئے جاتے ہیں۔ ان کی مدد سے یقین ہے کہ شاعر کے ذہن میں کلبلاتے ہوئے سوالات و جوابات کا ایک مختصر سا اشاریہ ضرور قاری کے سامنے آجائے گا اور اس سے پوری نظم کو سمجھنے میں یک گونہ آسانی ہو جائے گی۔

جمالی

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مراد ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

ہیولے

تو کاروبار شراکت میں رکھ نہ سوز و گداز
ہر ایک فرد کی فرہنگ غم میں سود و زیاں کے الگ الگ انداز
ہر ایک لفظ میں لاکھوں فسانہائے دراز
بطور خاص یہ حرف اساس یاد رہے
جو اپنی اپنی صلیبوں کو خود ہی لے کے پہنچ جائیں قتل گاہوں تک
انہی میں سے کسی خوش ذہن پر کھلا ہے وہ راز
انہی میں سے کوئی پاتا ہے وہ لب اعجاز
جو اس کی ذات سے اس کا مکالمہ بھی کرائے
جو بے شمار دکھی مرد و زن کے درد بٹائے
اور اپنے گرد سے یا اپنے بعد جس کو چنے یا جو اس سے فیض اٹھائے
وہ عہد عہد میں اس کا ہی ترجمان کرامت بیاں بھی کہلائے
اور ایک روز کوئی مکتب حیات بھی منسوب اس سے ہو جائے

جمالی

یہ جو بھی بول رہا ہے وہ سامنے بھی آئے
مجھے کچھ اور نہ سکھلائے بس یہ بات بتائے
وہ میری دوست.........
میں جس کی طلب میں بیٹھا ہوں
وہ کب ملے گی' ملے گی بھی یا نہیں مجھ کو
مجھے ذرا نہیں مطلوب کوئی سر حقیقت کوئی متاع نظر کوئی منصب پرداز
میں اپنی شدت احساس کے بیان پہ قادر نہیں سہی لیکن

مری طلب کی تو بنیاد میں وہ شعلے ہیں
جو سازگار ہواؤں سے پرورش پا کر
سواد کون و مکاں میں وہ روشنی پھیلائیں
کہ سارے چاہنے والے جدائیوں کے سمندر عبور کر آئیں
سنا ہے ایسی ہی شعلوں کی آنچ سے بھی ابھرتے رہے ہیں پیغمبر

ہیولے

نعوذ باللہ
خبردار! مگو تحقیق
ابھی نہیں ترے بس کے یہ نکتہ ہائے دقیق
ذرا بھی آگے بڑھے گا تو کفر کی منزل
ہزارہا روشِ جہل اور ہر ایک قدم پر ہزارہا مشکل
نہیں عزیز! ابھی تو نہیں ہے اس قابل
کہ اتنی بات بھی سمجھے جو ہم نے کہہ دی تھی
ہے تیری عمر ابھی ہاؤ ہو ہی کرنے کی
اگر جیے تو ملاقات پھر کبھی ہو گی

جمالی

بزرگوار کہاں میں کہاں مسائل ایمان و کفر کے پیچاک
نہ میں ہوں کوئی مفکر نہ دہریہ نہ مجھے وہم دانش و ادراک
چلے گئے تو چلے جاؤ اور دوبارہ کبھی آؤ نہ آؤ
بس آسماں کے حوالوں سے مسئلے نہ اٹھاؤ
کہاں چلی گئیں سیما کہ جب تلک تم تھیں
مجھے تمہارے سوا کوئی بھی خیال نہ تھا
اور اب ہزار خیالوں نے گھیر رکھا ہے
وہی ہزاروں خیال
وہی سوال، وہ تقلید و اجتہاد کے آشوب میں رموز سے بھرپور
شرحوں سے معمور
مشاہدوں سے دلائل سے تجربات سے چور

کہ ہیں قدیم مگر آج تک ہیں لا ینحل
کبھی حصول و وصول اور کبھی فضول و خلل
طلسم و خواب سوالوں نے گھیر رکھا ہے
جو ہوش آتے ہی یلغار کر کے آتے ہیں
اور ان کے دام میں اک بار پھنسنے والے لوگ
تمام عمر انہیں ساتھ لے کے گھومتے ہیں
تمام عمر انہیں ساتھ لے کے سوتے ہیں
اور اٹھتے ہیں تو وہ سب ساتھ ان کے ہوتے ہیں

ایک اور مثال'
ایک ہیولے سے:

ہمارا علم مکمل نہیں تو کیا معلوم
ہمارے فیصلے کتنے درست ثابت ہوں
کہیں زیادہ ہو نقصان فائدہ کم ہو
تمام عمر ہر اک فیصلے کا ماتم ہو
ہر ایک بات پہ شک کر
تمام باتوں کے
بہت سے پہلو ہیں
تاریک بھی ہیں اور روشن بھی
اور ایسے بھی ہیں جو تاریک ہیں نہ روشن ہیں
معاف کیجو کہ نقد جمالیات سروج ذرا جھگڑتی ہے
مگر مثال مقامات چند علامہ
اگرچہ معجزہ ہے ان کی جنبش خامہ
کہیں تو سادہ بیانی ہی کرنی پڑتی ہے

گل و گلاب گریباں بھی ہیں مگر کم کم
زیادہ تر تو وہی خار خار دامن ہیں
تو پھر شکوک کی دنیا بسائے جا پیارے

نہ کوئی حق ہو نہ باطل نہ کوئی خیر نہ شر
روایتوں سے
اصولوں سے
کلیوں سے
مگر
تمام کشمکش فکر و جستجو سے حذر
وہ کیا ہے......
شعلۂ خورشید آرزوئے حقیقت وہ اک طویل سا نام
شروع و ختم ہیں جس کے ہزار ہا ابہام
اگر وہ بھڑکے تو اس کو بھی جان رقص شرر
دل و نگاہ کو رکھو وسوسوں کی راہ گزر
اسی میں خجلت عصیاں کے سینکڑوں تریاق
اسی میں سارے حسابات خود بخود بے باق
نہ اس میں زیست المیہ طربیہ اور نہ مذاق

اس کے بعد جمالی کا مکالمہ ہے مگر پھر دوسرے ہیولے کا ایک نہایت فکر انگیز بیان ہے اس میں سے چند مصرعے

دوسرا ہیولے

یہ پودنے کہ جو بنتے ہیں عزم و جہد و کمال
نہ جانے کس لئے دیوتا سے لڑتے ہیں
رچا ہوا ہے جب انسان میں شیطنیت کا خمیر
جب آج تک بھی نہیں طے کہ چیز کیا ہے ضمیر
ضمیر یعنی وہ بے شرط مصلحت کوئی اندر کی رہنما تاثیر
رہی نہ ہو جو کسی جبر و تربیت کی اسیر
کوئی بتائے حقیقت اور اس کے ساتھ ضرورت ہی خیر کی کیا ہے
خوشی کے جتنے ہیں مفہوم ہر نظر میں الگ بلکہ مختلف متضاد
ہر ایک دور میں بدلی ہوئی بدلتی ہوئی قدر نیک و بد کی نہاد

جہاں

میں سوچتا تھا کہ ان مسئلوں کو بھی سمجھوں
اگر ملے وہ ترازو جو خیر و شر تولے
اگر ملے کوئی مکتب جہاں کوئی استاد
مری حدود میں رہ کر مری زباں بولے
تو میں بھی دیکھوں کہ وہ مجھ پہ رمز کیا کھولے

مرے خدا تو اگر ہے تو صرف یہ بتلا
کہ خود ہی نطفہ و بیضہ میں اتصال کیا
کہ مجھ سے پیش حیات ایک مشورہ نہ لیا
مجھے فسانہ میثاق خود ہی بخش دیا
اور اس کے ساتھ یہ مشق حیات و موت کی مجھ کو ہی مل رہی ہے سزا
مرے خدا تو اگر ہے تو صرف یہ بتلا
میں جبر زیست سے مجبور ، اسیر عقل و جنوں
کہاں تک ایسے سوال و جواب میں تڑپوں

ایک اور مثال
نسوانی ہیولے

بتا کہ تیرے کھرب در کھرب وہ ہم نفساں
جو تیرے غم سے زیادہ غموں سے گزرے ہیں
گزر گئے مگر ایسے ہی بے شمار انساں
نہ جانے کتنے ارب سال اور گزریں گے
تو کیا علاج غم دل ہے صبر بے خبری
تو کیا کبھی نہ ہوں ثابت عقائد نظری
تو کیا دوام ہی کردیں ہم اپنی بے اثری
نہیں نہیں یہ نہ ہوگا مآل جامہ دری
کبھی تو کام دکھائے گی سعی چارہ گری

جو بے الف کے پڑھے میم نون کرتے ہیں
وہ صرف و نحو و معانی کا خون کرتے ہیں
میں اتفاق و مشیت کو کیسے پہچانوں
میں ابتدا کے بغیر آج کیا ہوں کیا جانوں
رہی یہ بات کہ دیدار یار کب ہو گا
تو جب ہوا وہ اسی ذہن کے سبب ہو گا
کہ ذہن منطق و ایمان و واردات بھی ہے
مشاہدے ' نظریات ' تجربات بھی ہے
"یہ مہر و مہ یہ ثریا یہ وسعت افلاک"
کرم ہے یا کہ ستم کیوں نہ ہو یہ پردہ بھی چاک
وہ نور ارض و سما وہ حریم ذات و صفات
ہماری دسترس شوق میں نہ ہو ہیہات
کہ ہم اسی سے تو ہیں
کہ ہم اسی کے تو ہیں

ایک اور مثال
جمالی

نہ جانے عمر ہے کتنی طویل اور کب تک
اسی طرح سے شب و روز مجھ سے جنگ کریں
حقیقتیں جو بہت بے حیا ہیں تنگ کریں
سنا یہ ہے کہ جنہیں انتظار مرگ رہے
انہی سے موت کو اکثر گریز رہتا ہے

اب ایک روایتی انداز کا مکالمہ ایک روح کی زبان سے۔ اس نظمیے کے مطابق سیما جو مر چکی ہے اور جو اس کے سامنے آجاتی ہے جمالی سے کہتی ہے:۔

ہاں مری جان یاد ہیں تم کو
اپنے وہ فلسفے وہ سب باتیں
جن کو دیں ہم نے کتنی ہی راتیں

اپنے اعلان یاد ہیں تم کو
تم تو کہتے تھے عشق مطلق ہے
عشق بے نفس و بے تمنا ہے
عشق بے قید ہر زمان و مکاں
عشق بس عاشقوں کی روح رواں
عشق بیگانہ وصال و فراق
عشق ہر قہر و زہر کا تریاق
عشق میں مدعائے عشق نہیں
عشق کچھ ماسوائے عشق نہیں

(ایک نسوانی کردار حسینہ جو جمالی کو قبرستان سے واپس لے جانے آئی ہے۔ یہ شعر اور دوسرا شعر عالی کے پہلے مجموعے میں بھی موجود ہیں۔)

حسینہ

ہنسی میں تلخی ایام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یونہی بار حیات اٹھائے ہوئے

جمالی

ہوئی طلوع نہ وہ صبح جس کی حسرت تھی
ہر ایک رات گزرتی ہے لو لگائے ہوئے

مندرجہ بالا مصرعے یا اشعار جس نظم سے لئے گئے ہیں جیسا کہ اوپر بھی ذکر آچکا ہے اس میں قضا و قدر، جبر و اختیار حادث و قدیم، تقلید و اجتہاد، عقل و وجدان، ذات و صفات، فرد و کائنات، بندہ و خدا، مبدا و معاد، خیر و شر اور سزا و جزا کے سیکڑوں نکتے اور بہت نازک و پیچیدہ مسائل زیر بحث آئے ہیں اور امکان اس کا تھا کہ اس بحث میں عالی کسی نہ کسی جگہ پھنس کر رہ جائیں گے لیکن چونکہ وہ ہر مسئلے کے بارے میں کھلا ہوا خود اعتماد ذہن رکھتے ہیں اور جن مباحث کو موضوع سخن بنایا ہے وہ سب ان کے علم و فکر کی سطح پر ستارے کی طرح روشن ہیں۔ اس لئے وہ ہر طرح کی نظری و فکری گمراہی سے بچ نکلے ہیں اور اپنے قاری کو وہ کچھ دے دیا ہے جس کی "انسان" جیسے بسیط و عظیم موضوع پر، نظم کہنے والے ایک عظیم شاعر سے توقع کی جاسکتی تھی۔ دوسرے باب میں تحریک نسواں کی طرف بھی بعض بلیغ اشارے ہیں جن سے عالی کا ترقی پسندانہ رویہ جھلکتا ہے۔

یقیناً اس نظم میں بعض بہت نازک اور سخت مقامات آئے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے رہرو راہ محبت کا بچ کر نکلنا مشکل ہو گا لیکن عالی کی تخلیقی صلاحیت لسانی جمالیات، ہمت عالی اور وسعت مطالعہ انہیں نہایت خوش اسلوبی سے اس دشوار گزار مرحلے

سے نکال کر لے گئی۔خصوصاً" لائق تحسین یہ امر ہے کہ تخیل و تفکر کی اس صبر آزما طویل مسافت میں کسی ایک جگہ بھی نہ تو ان کے قدم ڈگمگائے نہ ان پر واماندگی طاری ہوئی اور نہ قنوطیت و روایتیت ہی کو انہوں نے اپنے قریب آنے دیا۔ ہر چند کہ جبر واختیار کے مسئلے کو انہوں نے بار بار چھیڑا ہے اور قضا و قدر کو کئی جگہ موضوع سخن بنایا ہے لیکن عقیدے کے جبریت ان کے فکر آزاد اور توسن اختیار کو ایک جگہ بھی بے اثر نہیں بنا سکی اور معقولات کی ہر بحث میں ہر مقام پر ان کا معقولاتی ذہن غالب رہا ہے بلکہ فرد کی اہمیت اور اس کے علم و فکر کی برتری کے اظہار کے باب میں تو وہ واضح طور پر کہیں کہیں معتزلائی فکر کے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ لیکن معتزلائی فکر سے قریب ہونے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ عقلیت پسندی کے سلسلے میں بعض دوسروں کی طرح انتہا پسندانہ زاویہ نظر رکھتے ہیں وہ اپنے جمال پرستانہ مزاج اور طبعی نرم خوئی کی وجہ سے شاید ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے چنانچہ انہوں نے عقلیت پسندی میں معتزلائی علماء کے فکر کا وہ راستہ اختیار کیا ہے جو درمیانی یا اوسط الامور کا راستہ کہلاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ معتزلائی مفکرین کے برعکس سارے معقولاتی علماء خواہ ان کا تعلق کسی طبقے سے ہو قضا و قدر کے باب میں تین خاص طبقوں میں تقسیم نظر آتے ہیں ایک وہ جن کے نزدیک انسان کاملاً "خود مختار ہے۔ دوسرا وہ جو انسان کو کلیتہً مجبور یعنی حکم الٰہی کا پابند جانتا ہے۔ تیسرا وہ جو انسان کو قضا و قدر کا پابند بھی سمجھتا ہے اور آزاد بھی۔ جمیل الدین عالی کو ہم اس تیسرے گروہ سے وابستہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جبر و اختیار کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے عموماً" اسی نقطہ نظر سے خود کو ہم آہنگ رکھا ہے۔ لیکن اس جگہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم جمیل الدین عالی نامی کسی متکلم یا فیلسوف کے خیالات سے بحث نہیں کر رہے بلکہ ہمارا موضوع حقیقتاً" وہ جمیل الدین عالی ہے جو ہمارے دور کا عظیم شاعر ہے اور جس نے اردو کو "انسان" کے عنوان سے ایک فکر انگیز طویل نظم دی ہے۔

زیر بحث مطبوعہ نظم کا آخری جزو جسے "دشت سخن" میں چوتھا حصہ یا چوتھی نظم کہا گیا ہے۔ ابتدائی تین حصوں کے مقابلے میں سادہ بھی ہے اور مختصر بھی' سادہ ان معنوں میں کہ اس کا موضوع اور عنوان "حسد" ہے اور یہ عنوان خود آپ اپنا انکشاف ہے مختصر یوں کہ اس کے مصرعوں کی تعداد دوسری نظموں کی بہ نسبت کم تر ہے۔ پوری نظم کو بہ اعتبار ہیئت طویل منظوم ڈرامے کا جزو بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاعر اور شاعر کے ہم زاد کے مابین مکالماتی نظم کا نام بھی دے سکتے ہیں اور ریڈیائی منظوم فیچر سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ پوری نظم میں صرف "حسد" کا موضوع 'اپنے جملہ معاشرتی اسباب و علل اور انسان کے طبع و فطری خصائل کے سیاق و سباق میں زیر بحث رہتا ہے اور اس بحث میں صرف دو کردار بوڑھا اور جمالی حصہ لیتے ہیں۔ دونوں کے بول حقیقتاً" شاعر ہی کے بول ہیں جو گلستان و بوستان کے شیخ سعدی کی طرح زندگی کے مختلف سماجی مسائل کو زیر بحث لا کر ان کے نفع و ضرر کے سارے پہلوؤں کو اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے کہ قاری 'اصل داستان گو کو بھول کر صرف داستان اور داستان سنانے والے ضمنی کرداروں کے ساحرانہ مکالموں میں اس طرح کھو جاتا ہے گویا سعدی کو بھول کر سعدی کی تخلیق کردہ حکایات اور حکایات سنانے والے بادشاہوں' وزیروں درباریوں اور مشیروں کو حقیقی کردار سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح کا جادو جمیل الدین عالی نے اپنی نظم "حسد" میں جگایا ہے۔ اس میں "بوڑھا اور جمالی" "حسد" کے موضوع پر کچھ ایسے فنکارانہ اسلوب اور شاعرانہ سلیقے سے گفتگو کرتے ہیں کہ حقیقی شاعر یکسر پس منظر میں چلا جاتا ہے اور

پوری نظم سے لطف اندوزی کے ساتھ سیراب ہو جانے کے بعد یہ راز قاری پر کھلتا ہے کہ بوڑھا اور جمالی حقیقتاً" دونوں ہی شاعر کے روپ ہیں۔ ایک نوخیز نو آموز اور حصول علم و آگہی کی منزلوں کے نوجواں راہی کا ہے دوسرا روپ ایک جہاں دیدہ' تجربہ کار اور سرد و گرم چشیدہ عمر رسیدہ بزرگ کا روپ ہے۔ دونوں میں "حسد" کے حوالے سے کیسی خوبصورت عالمانہ اور بچی بحث ہوتی ہے اجمالا" اس پر ایک نگاہ ڈالتے چلئے۔

بوڑھا

حسد سے خبردار رہنا
حسد سے خبردار رہنا

مری جاں
پڑھی ہے کبھی بوستاں اور گلستاں
وہ کیا ہے
سہیلی
نہیں پنچ تنتر
کلیلہ و دمنہ
حکایات ایسپ
ہزاروں ہی قصے
اور ان کے وہ دانش فزا ایسے حصے
جو ہم نے سنے اور پڑھے تھے شپاشپ

مری جاں
چلو میں ہی ڈالوں تمہاری جوانی کے توشے میں کچھ ساز و ساماں
بہت سے سبق ہیں
کچھ آسان اور کچھ ادق ہیں

چلوں اب کہ بھائی تمہارا مسلسل جمالِ سماعت' جلالِ خموشی
مجھے بھی لگا دے نہ آزارِ سرمہ گلوئی و پنبہ بگوشی
تو بولو کہ میں کچھ بتاؤں
نہیں تو تمہیں سارے دانے تمہارے ہی چڑیا سے پوٹے کی حد میں کھلاؤں

سو ایسی تو خوراک پا ہی رہے ہو
یہ جو ہڑانا کے
یہ تالاب
ناواقفیت سے لبریز لیکن تمہارے تصوّر میں آبِ بقا کے
تمہارے لئے حوضِ خاصِ شہاں ہیں
سو کچھ ڈبکیاں ان میں کھا ہی رہے ہو
وہ جیسے بھی معیار کا ہو مزا وہ اٹھا ہی رہے ہو
بہت سے میاں جتن اپنی پتی ورت آنکھیں ڈھکے اور چپ چاپ گھر والیوں کو
جلیبی امرتی ملائی کھلا کر یہ کہتے رہے ہیں
مزے ہی مزے ہیں
مزے ہی مزے ہیں

جمالی

حضور آپ کو جو بھی کہنا ہے کہیے
بس اپنے بیاں میں متانت کو ملحوظ رکھیے
اور اخلاقِ اسلاف کے دائرے میں بھی رہیے

بوڑھا

ابے کیا میں اہلِ زباں ہوں
فصیح البیاں ہوں
کسی داغ کا جانشیں ہوں
کسی بارگِ استاد میں تیرا نائب امیں ہوں
ابے کیا میں تیرے اتالیق کی نوکری پر ترے گھر کے شاگرد پیشہ علاقے کا مسکیں مکیں ہوں
ہمیں یہ دلا دو ہمیں یہ نہ چھیڑیے!
ابے واہ رے آدابِ محفل کے بیٹے

یہ بابِ حسد ہے
حسد یعنی اک زندہ ناسور جو از دو حوشِ ازل تا ابد ہے

اگر کوئی حد ہے
میں فطرت نہیں اس کو کہتا کہ فطرت بتانے کے رستے میں حائل
بڑی سخت مشکل
اسی بحثِ تخلیق، اس مکتبِ ارتقا کی وہی شد و مد ہے

میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس سمندر میں میرے بنائے ہوئے چپوؤں سے مسلح
مگر اپنی نادر توانائیاں مجتمع کر کے کشتی چلائے

بوڑھا

یہ باب حسد ہے
حسد جو کبھی ایک سبب ہے، کبھی ایک وتد ہے
ہوا یہ ہے بھیا
کہ جو ساتھ والے ذرا دیکھ لیں کوئی بڑھنے لگا ان کی مرتی ہے سیّا
عزیز اور دوست اور بچپن کے ساتھی
بہن بھائی ماں باپ میں بھی فقط ماں کو ہی چھوڑ کر
اے خدائے حقائق نہ رکھنا مری بات کا رخ ذرا موڑ کر
سگے رشتہ دار اور کزن یار غار اور وہ تایا چچا خالہ خالو
وہ ہاتھی وہ گائیں وہ بھیڑیں وہ بھالو
وہ سب دور و نزدیک کے ماتھے گامے
وہ پھوپھا وہ مامے
اگر تجھ کو اپنے سے بالشتہ بھر آگے نکلتے ہوئے دیکھ لیں
جل مریں گے
چھپی اور ظاہر ہزار ایسی باتیں کریں گے
کہ تجھ تک وہ بن بن کے پہنچیں فسانے تو تیری شرافت ہزار ان کو چھانے
ہے اغلب کہ ان کے تواتر سے خود نفرتی میں ہی پھنس جائے
تجھے کیا بتاؤں حسد کے رتوندے میں بیمار
ہو جاتے ہیں کس قدر خوار

سرِعام صد کذب و افواہ کے کارخانے بنائیں
اور اس ہوشیاری سے ہر سمت تشہیر کروائیں
کہ ہر دم پریشانیاں اور بغیر گنہ بھی پشیمانیاں
اور حیرانیاں
تیرے چاروں طرف دلدلیں بن کر ابھری چلی آئیں
اور ترا ماضی و حال اور آنے والا زمانہ
سبھی
ان میں دھنس جائیں

اب معاصر
معاصر عجب چیز ہے میرے بھائی
اور ان میں سے جو دوست بنتا ہے تیرا
وہ دراصل 'اچھا' 'عمو' ہے زہر ہلاہل بظاہر مٹھائی
مگر ہاں وہ تو بھی ہو سکتا ہے میرے پیارے
کبھی یہ سمجھ لے کہ بس تو ہے محمود، حاسد ہیں سارے
معاصر جو وہ بھی ہیں تو بھی
رہے یاد یہ نکتہ گفتگو بھی
معاصر جو اکثر کسی سے بھی خود کو کسی طرح کمتر نہ مانیں
وہ جب بھی کسی بھی معاصر کا دیکھیں کوئی کارنامہ
اگر ان میں دم ہے تو ایسے تڑپتے ہیں جیسے ہوا تار تار ان کے امکاں کا جامہ

ابھی آگے چل کر سناؤں گا ان کی کئی وارداتیں
میاں میں بناتا نہیں تم سے باتیں
عجب ان کے حیلے، عجب ان کی گھاتیں
مگر کیوں
یہی جاننے میں تو میں نے گزارے بغیر نتیجہ
کوئی ساٹھ صدیوں کے دن اور راتیں

مگر خبر اس وقت تم صرف تیار رہنا
خبردار رہنا

جمالی

مگر یہ تو فرمائے چلئے یہ سب کچھ ہوا کیا
کسی کو اگر کچھ ملا ہے کسی نے اگر کچھ کیا ہے تو اس کی خطا کیا

بوڑھا

تو بس ایک صحبت میں سب کچھ بتا دوں
یہاں کوئی ایسا بھی ہو گا جو سب جانتا ہے
میاں دیکھتے ہو یہ بوڑھا بھی کس دھوپ میں کیسے بوسیدہ خیموں کی کیسی چھتیں تانتا ہے
کوئی بھی ذرا سی ذہانت کا مارا معاصر کسی دوسرے کا کوئی حقِ ارفع نہیں جانتا ہے
اگر جبر یا صبر یا مصلحت یا نمائش کی پابندیاں ہوں
تو جیسا بھی ظاہر کرے
سچ یہی ہے یہی ہے یہی ہے
کہ وہ اپنے اندر کی چھلنی میں صرف اک حسد چھانتا ہے
وہ سچائی کے ساتھ پوری صدی میں فقط اپنا چہرہ ہی پہچانتا ہے

حسد سے خبردار رہنا
کہ بیٹے
اگر تم نہیں نکلے قسمت کے بیٹے
تو سب کا حسد تم کو کھانے لگے گا

جمالی

مناسب تو اب پھر حسد کی طرف آیئے اور بتلایئے
کس طریقے سے ممکن ہے یہ پیچ در پیچ احوال سننا

بوڑھا

وہ نسخے یہ ہیں مجمل و مختصر

نسخۂ اولین

ایک دارو ئے صبر

جس میں محنت مشقت محبت کے ہمراہ

ایک جزو اعظم ہے

اظہارِ ردِ عمل پر بڑا سخت جبر

وہ عطش

العطش العطش

سخت دھوپوں میں چلتے جاؤ اور مت رکو

نرم راتوں میں بستر سے ہٹ کر تڑپتے رہو اور کہو

اے خدا

عالم اندروں

تو ہی مجھ کو پرکھ تو ہی مجھ کو بتا

کیا کروں

یا الٰہی اگر میں غلط چل رہا ہوں تو پھر راست رستے دکھا

ورنہ مجھ کو مری راہ پر تیز تر اور محکم چلا

ابتدائے سفر میں ہے ایک شے ضمیر

وہ بھی دیتا ہے سب خامیوں کا پتا

وہ بھی بانگِ خودی

وہ بھی صوتِ خدا

اس کو مرنے نہ دے

اس کو اک زخم ہی کی طرح دل میں رکھ اور بھرنے نہ دے

جب رہے گا بڑا ہی غضب ڈھائے گا

جانے کن کن دکھوں میں تجھے کیسا کیسا مزا آئے گا

حسد کا وہ حملہ وہ غوغا مٹے گا تو کیا

ہاں تری خلوتِ فکر و تخلیق میں بار کم پائے گا

عالی کی مندرجہ بالا نظم کا موضوع نیا نہیں ہے روز مرہ کی گفتگو سے لے کر نثر اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے اور جیسا کہ خود عالی کی نظم سے ظاہر ہے ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ حسد کے حوالے سے غالب کے یہ شعر تو غالباً "سارے

صاحبانِ ذوق کے حافظے میں ہوں گے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہئے

آخری شعر میں تو غالب نے وہی سب کچھ "مجملاً" کہہ دیا ہے جسے حالی نے مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ نثر میں تو حسد کا موضوع مذہبیات و سماجیات سے لے کر حکمت و نفسیات تک سب میں زیرِ بحث آیا ہے اور بیشتر اسی رنگ و رخ کے ساتھ زیرِ بحث آیا ہے جو حالی کے یہاں ملتا ہے۔ سورۂ فلق کی آخری آیت میں "من شر حاسد اذا حسد" تو ہر مسلمان کے ذہن میں ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں پناہ مانگتا ہوں حاسد سے جب کہ وہ حسد کر رہا ہو۔" تفسیرِ قرآنی میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ جب حاسد اپنی قلبی کیفیت کو ضبط نہ کر سکے اور عملی طور پر حسد کرنے لگے یعنی دوسروں کو ملی ہوئی نعمت الٰہی سے سرفرازی کے زوال وجاہی کی آرزو کرنے لگے تو اس کے شر سے پناہ مانگنا چاہئے اس لئے کہ اس نوع کا حسد کسی شخص کی عظمت و نعمت کو حقیقتاً" کوئی نقصان پہنچ سکے یا نہ پہنچا سکے لیکن ذہنی تکدر اور پریشانی کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔

حسد نے اس خوفناک و مہلک اثرات کے واقعاتی ثبوت پند و نصائح کی حکایتوں سے لے کر مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں تک سبھی میں موجود ہیں خصوصاً" حالی نے اپنی نظم میں جن کتب و مجموعہ ہائے قصص کے حوالے دیئے ہیں ان میں تو حسد اور ان کے مضر نتائج کے سیکڑوں شواہد ملتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادگان یا برادرانِ یوسف علیہ السلام کے واقعات کا بنیادی محرک بھی ان کے بھائیوں کا حسد ہی رہا ہے لیکن حسد کے سلسلے میں مردوں کی تخصیص نہیں خواتین کے کارنامے اس سلسلے میں مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ حالی نے شاید طوالت کے خوف سے خواتین سے متعلق حسد کی بحث نہیں چھیڑی اور اجمالی سے صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ:

میں لایا نہیں عورتوں میں حسد کے مسائل
اگر میں جیا اور ہم آگے چلے تو کبھی ان کے تیروں سے بھی تم کو کروں گا گھائل
یہاں تو ابھی ایک محدود سی جستجو اور معاصر کے اطوار پر گفتگو ہے

لیکن حسد کے بارے میں علم النفس کے ماہرین 'مذاہب و تواریخ اور ادبیات و شعریات کی روایات سے الگ بلکہ ان سے یکسر مختلف زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسد ایک جبلّی عمل ہے اور اس کی جذباتی کیفیات اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہیں اور یہ کیفیات معاشرے اور فرد دونوں کے ارتقاء وار تفاع میں مثبت اور بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خود زندگی کا مقصودِ اصلی 'بقائے زندگی' ہے یعنی زندگی کو بہرصورت یہ ہر عالم اور ہر لمحہ برقرار رکھنا ہے اور خود زندگی کی تخلیق چونکہ اشتیاقِ زندگی کے وفور و اشتعال سے ہوئی ہے اس لئے زندگی خود اپنی زندگی کے لئے برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے۔

یہی صورت زندگی کے سب سے فعال عنصر انسان کی ہے وہ کسی قیمت پر مرنا نہیں چاہتا اور اسی لئے فطرت کی طرح وہ خود بھی تخلیق یا تخلیقی عمل کو اپنے لئے مستقل وظیفہ بنائے رکھتا ہے جس طرح فطرت بذات خود:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

بالکل اسی طرح انسان بھی اپنی ذات و صفات کی بقا کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل ہے اور یہ تخلیقی سرگرمی صرف اس لئے ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ادب و شاعری کی اصل غایت بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ حقائق سے گریز پائی کا دوسرا نام ہے۔ یہ گریز پائی مرنے کے بعد جیتے رہنے کی آرزو مندی کے سبب ہوتی ہے اور ایک ادیب یا شاعر صرف اس لئے تخلیقی عمل میں تسکین و انبساط محسوس کرتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

بقائے زندگی کی اس آرزو مندی یا کوشش میں جب ایک تخلیقی ذہن کا مالک عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس فطری خودی کو اپنی بقا کے لئے دوسروں کی خودی سے متصادم ہونا پڑتا ہے۔ اس تصادم میں اگر آدمی کامیاب و سرخرو ہو گیا تو اس میں فخر و انبساط کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں اور وہ آدمی زندگی میں کامگار و کامیاب کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس بقائے حیات کے تصادم میں ناکامی ہوئی تو پھر آدمی احساس افسردگی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں دوسرے کے خلاف غم و غصہ، نفرت و عداوت اور رشک و حسد کے جذبات ابھر آتے ہیں وہ مدمقابل کے زوال کی آرزو کرنے لگتا ہے، لیکن اگر تخلیق کار ذہن و باشعور ہوا تو دوسروں کے زوال کی خواہش میں مبتلا رہنے کے بجائے اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل دینے کی تازہ کوشش شروع کر دیتا ہے اور غم و غصہ یا رشک و حسد کے جذبات کو ترفع و تصعید کی ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس میں اپنے حریف و مدمقابل سے مقاومت و نبرد آزمائی کی نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں اختراع و ایجاد کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور آخر کار وہ حاسد کا مدمقابل بن جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا جذبہ حسد اپنے محسود کے حق میں ہمیشہ مضر و مہلک ہی نہیں ہوتا بلکہ محسود میں مسابقت و مقاومت کی ایک نئی طاقت پیدا کر کے ناسازگار حالات سے آنکھ ملانے اور اپنی انا کو جراحت سے محفوظ رکھنے کا ایسا سلیقہ بھی سکھا دیتا ہے کہ محسود نہ صرف یہ کہ حاسد کی زد سے اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے بلکہ خود کو حاسد سے برتر و افضل ثابت کر دکھاتا ہے۔

حسد کے اس کے مثبت و تعمیری پہلو کی طرف شاید حالی کی نظر نہیں گئی ورنہ وہ حسد کے اثرات سے نوجوان حالی کو بوڑھے کے پند و نصائح سے اس طرح خوف زدہ نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ پھر بھی جہاں انہوں نے حالی کو معاصرین کے حسد سے محفوظ و مامون رہنے کے نسخے بتائے ہیں وہاں اس امر کا اظہار بھی ہو گیا ہے کہ حالی کے نزدیک حسد کا مرض لاعلاج نہیں ہے بلکہ انہیں یقین ہے کہ اگر محسود محبت اور محنت و مشقت کا دامن استقامت کردار کے ساتھ تھامے رہے تو وہ اپنے ضمیر اور اپنی انا کو حاسدوں کی ضرب و زد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

حالی کی نظم "حسد" سے ایک اور بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نظم محض تخیلاتی نظم نہیں ہے یعنی اس کا انداز وہ نہیں ہے جو عموماً "نظری و غیر مرئی موضوعات مثلاً "زندگی، موت" "خزاں، بہار" "غم، خوشی" "نفرت، دشمنی" اور

"کذب۔ صداقت" جیسے موضوعات پر کہی گئی نظموں کا ہوتا ہے بلکہ اس نوع کی نظموں سے بہت مختلف ہے۔ ان کی نظم کے متعدد اجزاء اور درجنوں مصرعے ایسے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت دیتے ہیں کہ "حسد" ان کی عملی زندگی کے تجربے کا حصہ ہے اور وہ گھر سے لے کر باہر تک اپنے حسنِ سیرت و صورت اور کمالاتِ فکر و فن کی بنا پر نوعمری ہی سے حسد کا نشانہ بنے رہے ہیں۔ کبھی قریبی عزیزوں نے کبھی دوستوں نے، کبھی رفقائے کار نے، کبھی ہم عمروں اور ہم چشموں نے، کبھی ہم عصروں اور ہم رتبہ ساتھیوں نے ان پر حسد کے زخم لگائے ہیں۔ ان زخموں میں بیشتر مندمل ہوگئے ہیں لیکن بعض ناسور بن گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا عالی خود کو حاسدوں کے ہر گروہ اور ہر فرد سے بچالے گئے ہیں اور اپنے دفاع و تحفظ میں انہوں نے برابر ضبط، تحمل و برداشت اور شفقت و محبت کے انہیں نسخوں کے استعمال سے کام لیا ہے جو انہوں نے ایک بوڑھے اور تجربہ کار مردِ دانا کی حیثیت میں جمالی کو بتائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ عالی نہ تو خاندان کے حاسدوں کے سامنے کبھی سپر انداختہ ہوئے اور نہ ہم عمروں اور ہم عصروں یا ہم رتبہ یا ہم مشربوں کے حاسدانہ حربوں اور رویوں سے خوف زدہ ہوئے۔ مشکلیں بہت سی آئیں، مصائب بہت سے ٹوٹے اور عذاب طرح طرح کے جھیلے لیکن اپنی ذہانت کی مدد سے اپنے ضمیر اور اپنی انا کو حاسدوں کی گزند سے بچائے رکھا نتیجتاً" وہ اپنے عہد کے ایک نہایت معتبر و منفرد شاعر، صاحبِ مطالعہ و باشعور دانش ور ہر دل عزیز نغمہ نویس، گیت نگار اور موقر و معتبر اظہاریہ نویس کی حیثیت سے ابھرتے چلے گئے اور آخر کار فکر و فن کے ایسے بلند منصب پر فائز ہوگئے کہ پوری پاکستانی قوم اور پوری اردو دنیا کے لئے قابلِ احترام و لائقِ تقلید مثال بن گئے۔ اللہ انہیں تادیر صحت و توانائی کے ساتھ سلامت رکھے۔

سلیم احمد

خطرناک شاعر

یادش بخیر ایک زمانہ تھا جب مرزا جمیل الدین عالی شاعر' غزل گو "دوہا نویس" ہوا کرتے تھے۔ اور بقول خود اپنی پھینپھیر غزلیں' اپنے بے حد دلکش ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ خوش گلوئی ایسی کہ "شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو" کا عالم تھا اور صورت ایسی موہنی پائی تھی کہ طبقہ اناث و مرد کی قید نہیں' جو دیکھتا تھا دل تھام کر رہ جاتا تھا۔ گرمیٔ حسن اور نرمیٔ آواز کے ساتھ گرمیٔ کلام کا یہ حال کہ چقماق زبان سے شعلے جھڑتے تھے اور غیروں کے خس و خاشاک تو کیا خزینہ قلب و جاں میں آگ لگاتے تھے۔ کراچی میں تو یہ حال تھا۔ معلوم نہیں دلی کا پانی پاکستان بننے سے پہلے کیا کیفیت رہی ہوگی۔ خود انہیں کی روایت ☆ ہے کہ وہاں سرخ گلاب سونگھتے تھے اور نواب کہلاتے تھے۔ کراچی نو دولتیوں اور پھسٹ ہمتیوں کا شہر ہے۔ یہاں شجروں کی ساکھ کچھ زیادہ نہیں چلتی اور جن کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری رہا انہیں بھی پونے ڈیوڑھے کے حساب سے چوکس رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ عالی کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مرزائی برطرف' اس شہر غدار میں شاعرانہ انا کی دیوار عہدہ و منصب کے بغیر پائیدار نہیں ہوگی۔ نوابزادہ ان کے خون میں پہلے سے موجود تھا۔ اب یہ احساس جو بڑھا تو حلقہ احباب میں صاف صاف کہنے لگے کہ نواب زادوں کے لئے ذلت ہے۔(☆☆) کار قافیہ بندی۔ ہمارے بھائی گلزار احمد جمال پانی پتی اور برخوردار عظیم احمد سلمہ طولعمرہٗ کہ عالی کو بلبل خوشنوا سمجھتے تھے انہیں جب شاعری کے خلاف برملا تبرا پڑھتے دیکھتے تو سخت گھبراتے اور مجھ سے آکر کہا کرتے کہ دیکھئے عالی بھائی کو کیا ہوا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عالی کو کچھ نہیں ہوا۔ نواب زادے کی خودی بیدار ہو رہی ہے اور کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا ہو رہا ہے۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ عالی سی۔ایس۔پی ہو گئے اور اپنے صاحب سیف و قلم بزرگوں کی تصویریں جھاڑ پونچھ کر اپنے دیوان خانے (☆☆☆) میں سجانے لگے اور پھسٹ ہمتے شاعروں اور نو دولتے افسروں نے برا مانا کہ لیجیے عالی بھی تجمل حسین بننے کے خواب

دیکھنے لگے ہیں۔

تجمل حسین خاں غالب کی بھی کمزوری ہے اور عالی کے لئے بھی ایک مستقل دھمکی یا ترغیب ثابت ہوئے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے ان کے حوالے سے بیان کی وسعت طلب کی تھی اس لئے کہ شاعر ہی تھے اور شاعر ہی رہ گئے۔ عالی نے بیان کی وسعت پر مکان کی وسعت کو ترجیح دی اور جب موقع آیا تو غزلیں' دوہے' گیت کو لپیٹ کر اور محمد حسن عسکری صاحب کی توقعات کو ٹھینگا دکھا کر اس وادی کی طرف چل نکلے کہ دراں خضر را عصا خفت است۔ اردو شاعری میں ایک صاحب نظیر اکبر آبادی ہو گزرے ہیں کہ "گھوڑے زین سنہری کے اور ہاتھی لال عماری کے" دیکھ کر مرعوب نہ ہوتے تھے اور ہر کسی بنجارے کو "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا" کہہ کر ڈراتے تھے۔ ہم نے عالی کی نئی کھیپ تیار دیکھی تو کلیات نظیر بغل میں مار کر عالی کو بنجارہ نامہ سنانے پہنچے۔ اور صاف کہا کہ "میاں سردار عبدالرب نشتر کو دیکھو تمہارا تخلص عالی ہے۔ جس راہ پر تم چلتے ہو اس میں یہ بھی ایک دن نشتر بن کر رہ جائے گا۔ برادرم محمود ریاض کا بیان ہے کہ "عالی کی گفتگو کا یہی اسلوب ہے کہ کتنی بھی سامنے کی بات ہو وہ زماں ومکاں کی گتھیوں میں الجھ جاتے ہیں۔" سو ہم نے بھی عالی کو ان گتھیوں میں الجھایا زماں کی کم مکاں کی زیادہ۔ بولے "تمہیں معلوم ہے بڑا شاعر کون بنتا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ ہی فرمایئے" ارشاد ہوا۔ "شاعر وہ ہوتا ہے جس کی خواہشیں اور خواب بڑے ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ دنیا کا سارا اقتدار اس کے پاس ہو۔ ساری دولت اس کے پاس ہو اور ہاں ساری صورتیں اس کے پاس ہوں۔ وہ جوش کی طرح کہتا ہے کونین کو فقیر کی جھولی میں ڈال دے یا پھر غالب کی طرح دونوں جہاں لے کر بھی طنز کرتا ہے۔ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں۔" ہم نے کہا۔ "عالی جی۔ غالب اور جوش کو دونوں جہاں کی نعمتوں میں سے جو کچھ ملا وہ ہمیں بھی معلوم ہے۔ بڑا شاعر وہ بنتا ہے جو چاہے تو یہ سب کچھ' مگر بے عملی کا بہانہ بنا کر یا تقدیر کا شکوہ کر کے یہ سب کچھ حاصل کرنے کے بجائے شعر کہتا رہے۔ تمہارا راستہ غالب اور جوش کی بجائے سکندر ودارا وغیرہ کی طرف جاتا معلوم ہوتا ہے۔" عالی کو غصہ آگیا۔ بولے "چیز قتاتی پن کی باتیں مت کرو۔ اچھا تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم جب سکندر اعظم بن جاؤ تو مجھ میں اتنی قوت ہونی چاہئے کہ میں تم سے کہوں کہ ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔" عالی کا سکندر اعظم میرے چھوٹے موٹے دیو جانس کلبی کو دیکھ کو بھڑک گیا۔ اور اس وقت سے عالی نے مجھے جہانگیر روڈ کا بقراط اور سنکی کہنا شروع کردیا۔ خیر کراچی کا ایک چیز قتاتی چھٹ بھیا غزل گو تو میں بھی ہوں۔ میں نے بھی عالی کے خلاف خوب دل کا غبار نکالا اور جب عالی ادبیت کے اپنے خود ساختہ معیار کی تلاش میں گلڈ کے راستے ایوب خاں تک پہنچے تو بھائی طفیل احمد جمالی مرحوم کو ڈھاکے سے فون کرنا پڑا کہ تمہارا دوست نما دشمن سلیم احمد تم پر "قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی" کی پھبتی کس رہا ہے۔ عالی کی عالی ظرفی تھی شہ کا مصاحب ہونے کے باوجود مجھے توپ دم کرنے کی بجائے کہا تو یہ کہا کہ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔

بات یوں نہیں ہے کہ میں یا کوئی اور بہت اچھا آدمی ہے اور عالی کوئی بہت برا آدمی ہے اور پھر عالی برا بھی ہوگا تو کیا اتنا کہ گلستان شاعری کا ہر "چرکوا" اس کے مقابلے پر "چوں چوں" کرے اور بوستان ادب کی ہر "کچڑی کنجی" عالی کے حضور میں نوا سنجی کرتی پائی جائے۔ موقع ملنے پر اخلاقیات سب بگھار لیتے ہیں اور تنقید کرتے وقت اپنی ہلدی پھٹکری کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ رنگ چوکھا آئے لیکن حسد اور کمینگی لاکھ آوازیں بدل کر بولے' جاننے والے پہچان لیتے ہیں کہ عالی پر تنقید کے پردے میں نہ جانے کیا کیا احساس کمتری بول رہا ہے۔ عالی کا قصور صرف اتنا ہے کہ شاعر تھا۔ ورنہ افسروں کی ذات اور ابن الوقتوں کی اوقات نہ عالی پر ختم ہے اور نہ ایسا ہے کہ عالی کے سوا شہر میں اور کوئی قاتل ہی نہ رہا ہو۔ بہرحال عالی کی "ذات یا بذات" میرا موضوع نہیں۔ یہ اس کے دوستوں کا کام ہے۔ اس موضوع پر ابن انشاء اور شوکت صدیقی گفتگو کریں تو اچھا ہے۔ میں تو یہ مضمون عالی کی مدد سے اپنے زمانے کے ایک مخصوص تجربہ کو سمجھنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ یہ کیا بات ہے کہ ہمارے زمانے میں شاعری یا تو میٹھے برس کے خوابوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے یا پھر اکثر شاعر کچھ دن اچھا خاصا شعر کہنے کے بعد یا تو چپ ہی ہو جاتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں یا ایک احساس کمتری اور حد درجہ تلخی کا شکار ہو کر شاعری اور شاعرانہ زندگی ہی کو کچھ تحقیر کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور شاعری چھوڑ کر یا کم کر کے یا سانپ کے منہ کی چھچھوندر سمجھ کر کسی اور دھندے میں لگ جاتے ہیں؟ حفیظ سے ناصر تک ناصر سے عالی تک' عالی سے ساقی فاروقی تک یہ سوال ہمیشہ میرا پیچھا کرتا ہے اور افسوس ہے کہ اس کا صحیح جواب مجھے معلوم نہیں۔

خیر صحیح جواب کا میں نے ٹھیکہ بھی نہیں اٹھایا۔ میرا کام تو اتنا ہے کہ جو سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا ہے اس پر الٹا سیدھا کچھ سوچنے کی کوشش کرتا رہوں۔

حفیظ ہوشیارپوری مرحوم پر ایک مضمون لکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔ ان کی ذات اور شاعری کا المیہ ان کے ترک محبت کے تصور میں پوشیدہ ہے۔ حفیظ صاحب عشق اور شاعری کو زندگی سے چھوٹی چیز سمجھتے تھے اور زندگی ہر ایک کے یہاں اقبال کی طرح "پیہم رواں ہردم دواں" نہیں ہوتی۔ اکثر اس کے معنی چھوٹی یا بڑی نوکری اور دو وقت کی روٹی کے ہوتے ہیں۔ ترقی پسند نظریات ہمارے یہاں ویسے ہی عام نہیں ہوئے۔ چنانچہ حفیظ صاحب کی زندگی ان کے فلسفیانہ ذوق کے باوجود "مقصوریت" کی نفی کا شکار ہو گئی اور وہ تمام عمر اچھے شاعر سے زیادہ اچھے افسر یا بقول اپنے "اچھے آدمی" بننے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی شاعری ویسے بھی "زیر لب" کی شاعری تھی۔ زندگی یا نوکری سے ٹکرا کر ان میں کچھ زیر لب کہنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا۔ مارے باندھے' داخلی تقاضوں سے مجبور ہو کر کچھ تھوڑا بہت کہا بھی تو اس کے مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے تک چڑیاں چگ گئیں کھیت والا معاملہ ہو چکا تھا اسی طرح ناصر پر ایک مضمون لکھتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ زندہ اور حساس شاعر اپنے زمانے کے نظام زر کا شکار ہو گیا اور لطف یہ ہے کہ ساری زندگی اس سے لڑنے کے باوجود اسے اپنے اس حقیقی دشمن کا پتہ نہ چلا اور

جب آخر عمر میں اس نے اپنے اس دشمن کو پہچانا تو اس کے حملوں سے زخمی ہو کر میو ہسپتال پہنچ چکا تھا۔ ساقی فاروقی جب تک کراچی میں رہا سی۔ایس۔پی کا فارم بھرنے کی خواہش اس کی شاعری سے ٹکرا کر اسے لہولہان کرتی رہی۔ اور پھر نہ جانے کوہ ندا کی طرح وہ کون سی آواز سن کر لندن کی طرف دوڑا۔ اور اب سنا ہے کہ دس دس ہزار کی مسہریاں خریدنا پھرتا ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو میں اپنی اردو شاعری اور تنقید کا ایک گھسا پٹا لفظ استعمال کروں۔ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان شاعروں میں غم روزگار اور غم عشق کی کشمکش تھی جس میں کسی نہ کسی طرح غم روزگار غالب آگیا۔ یعنی بقول فیض۔

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

یا بقول غالب۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی

اچھا اب اگر ہمارے سوال کی صورت درست ہے تو آیئے اسے معاشرتی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں اردو شاعری کی تاریخ میں حالی پہلا آدمی تھا جسے احساس ہوا تھا کہ معاشرہ میں شاعری "کار بے کاراں" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ احساس غالب کو بھی ہوا تھا مگر اس کے یہاں اس کی حیثیت ایک "خیال گزراں" کی ہے جبکہ حالی کے یہاں یہ احساس اتنا مستقل ہے کہ حالی کی پوری شخصیت اور شاعری کو متاثر کرتا ہے۔ حالی اس احساس سے اتنا بے زار ہوا کہ اس نے شاعری ترک کرنے کا ارادہ کرلیا لیکن ایک سچے عاشق اور سچے شاعر کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے ترک محبت کے خواب پورے نہیں ہوتے۔ شاعری حالی کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی۔ وہ اسے چھوڑنا چاہتا تھا مگر کافر منہ کو ایسی لگی تھی کہ اس کا چھٹنا محال ہی نظر آتا تھا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ حالی کے یہاں اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے عشقیہ شاعری ترک کرکے افادی اور قومی شاعری کی ابتدا کی۔ حالی کے بعد اقبال کے یہاں بھی ہم اس کشمکش کو انہیں تفصیلات کے ساتھ دوبارہ دیکھتے ہیں۔ وہ بھی ترک شاعری کے ارادے کے بعد "سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را" تک پہنچ جاتے ہیں۔ افادی اور مقصدی شاعری ترقی پسندوں نے بھی کی ہے مگر ان میں حالی اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے یہاں ایسی کسی کشمکش کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے ان کی شاعری ایک سچے سوال کا جھوٹا جواب ہے۔ اس مسئلہ کی باقی تفصیلات میرے مضمون "حالی سے لامساوی انسان تک" میں دیکھئے۔

بہرحال ان مثالوں سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ غالب کے بعد ہمارے شعور میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ کوئی سچا شاعر اس وقت تک سیدھے سبھاؤ سے شاعری نہیں کرسکتا جب تک وہ غم عشق اور غم روزگار کے اس جان لیوا سوال سے دوچار ہو کر اس کی کشمکش سے گزرنے کا تجربہ نہ کرے۔ اب حالی کے یہاں اس کشمکش کی کیا

صورت ہے۔ یہ ہمارے دیکھنے کی چیز ہے۔

"یہ عشق میر نہیں' زندگی ہے غالب کی" غم روزگار اور غم عشق کی کشمکش کا تجربہ عالی کے یہاں "عشق میر" اور زندگی غالب کے تقابل کی صورت میں نظر آتا ہے۔ عالی نے اپنی شاعری کے پہلے ہی دور میں ہمیں اپنے بنیادی مسائل کے بارے میں تین باتیں بتادی تھیں۔ (۱) غزل میں اسلوب تازہ کی تلاش۔ (کہاں یہ ہوش کہ اسلوب تازہ سے تجھے لکھوں) (۲) تجمل حسین خاں بننے کی حسرت (مرا بھی نام تجمل حسین خاں ہوتا) اور (۳) زندگی غالب کو اپنی زندگی بنا کر اس کو اپنے شاعرانہ تجربات کا موضوع بنانے کی خواہش۔ اس کے ساتھ ہی عالی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس کے تجربات یہ مخصوص شکل کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عالی ایک حد درجہ خود آگاہ شخص ہے۔ وہ آنکھ بند کر کے نہ عشق کر سکتا ہے نہ شعر کہہ سکتا ہے۔ عشق میں اس کا تجربہ انا کے پیچاک میں الجھا ہوا تھا۔ (رہے سب اس کی شراب نگاہ کے قائل سمجھ سکا نہ کوئی میرا راز تشنہ لبی) وہ اپنی غزلوں میں بار بار اپنا اور محبوب کا تقابل کرتا نظر آتا ہے۔ اور ایک بار اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کا عشق خود اس کی اپنی فطرت آشفتہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ "حالانکہ وہ غارت گر جاں کچھ بھی نہیں ہے۔" پھر عشق کا یہ تجربہ اسے زندگی کے کسی مرحلہ پر چھوڑ جاتا ہے اور اب اسے دنیا اور دنیا کے کام اپنی تمام اہمیتوں کے ساتھ یاد آنے لگتے ہیں۔

کچھ نہ تھا یاد بجز کار محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

عالی نے اپنے تجربہ کی اس نوعیت کو یقیناً بڑی دلیری سے قبول کیا اور بعض ایسی باتوں کا اعتراف کیا جنہیں تسلیم کرنے میں بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جائے۔ اشعار آپ خود یاد کیجئے لیکن میں "غزلیں' دوہے' گیت" میں اس کی کئی غزلیں آپ کو یاد دلادوں گا جن میں وہ اپنے عشق اور اپنے شعر کا تقابل دوسروں سے کرتا نظر آتا ہے۔ اور تلخی سے دوسروں کے جھوٹے تجربات پر نشترزنی کرتا ہے مثلاً وہ غزل جس کا شعر ہے۔

ترے کرم کو کرم ہی کہا ستم کو ستم
زہے خلوصِ تمنا کہ امتحاں نہ کیا

عالی کی خود آگاہی کی وجہ سے اس کی شاعری میں کچھ خوبیاں بھی پیدا ہوئیں اور کچھ خامیاں بھی۔ خوبی تو یہ پیدا ہوئی کہ اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں عالی واحد شاعر ہے جس کے اشعار بقول عسکری "ہمارے دماغ کو بھی چھیڑتے ہیں" عالی ناصر کا بہت قائل ہے اور اب تو شاید اسے اپنا استاد قسم کی چیز بھی سمجھنے لگا ہے۔ لیکن ناصر عالی سے زیادہ خوبصورت اور حساس شاعر ہونے کے باوجود دماغی قوت سے محروم ہے۔ اس کے پاس وفورِ جذبات اور نزاکتِ احساس عالی سے کہیں زیادہ ہے لیکن عالی کی طرح وہ اپنے تجربات کو اپنی ذات سے باہر جا کر دیکھنے کی قوت

نہیں رکھتا اور نہ عالی کی طرح اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انہیں ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر یا ایک دوسرے سے ٹکرا کر دیکھ سکے۔ لیکن عالی کی یہی خوبی ایک معنی میں اس کی خرابی بھی ہے۔ وہ خود آگاہی حاصل کرنے کے لئے اپنے جذبات اور احساسات کا اتنا تجزیہ کرتا ہے کہ وہ وفور اور شدت میں تبدیل ہی نہیں ہونے پاتے۔ پھر یہ تجزیہ اسے جن نتائج پر پہنچاتا ہے وہ بھی نہ عشق کے لئے سازگار ہیں نہ شاعری کے لئے۔

تجزیہ احساس پہ ہر غم حوصلہ مجروح ملا

ہمارے زمانے کی اکثر اچھی اور خوبصورت شاعری ایک "معصوم بے خبری" سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس سے عالی قطعی طور پر محروم ہے۔ وہ ہر وقت اپنے اندر اور باہر دیکھتا رہتا ہے اور دیکھنا بھی کیسا؟ وہ جس کا اظہار اس نے اپنے گیت "آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں" میں کیا ہے۔

عالی کی زندگی اور شاعری' عشق اور غیر عشق یا "عشق میر" اور "زندگیِ غالب" کی کشمکش کی ایک المناک داستان ہے۔ اپنے اپنے رنگ میں حفیظ' ناصر اور ساقی کے یہاں بھی ہمیں یہی کشمکش ملتی ہے۔ ناصر کے یہاں کشمکش کا احساس دوسروں کی نسبت کم ہے۔ حفیظ کے یہاں ناصر سے زیادہ مگر ساقی سے کم۔ اور عالی کے یہاں سب سے زیادہ لیکن ناصر کا امتیاز یہ ہے کہ جتنی کچھ بھی کشمکش اس کے یہاں پائی جاتی ہے اس میں اس کا فیصلہ ہمیشہ عشق اور شاعری کے حق میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے دور کے اپنے سے چھوٹے اور بڑے شاعروں میں اس کی شاعری کا اعتبار بھی سب سے زیادہ ہے۔ اور یوں اپنی نسل کی شاعرانہ نمائندگی کا حق بھی اسے سب سے زیادہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ ناصر ہمارے زمانے میں شاعرانہ زندگی کی ایک چھوٹی موٹی علامت بن گیا ہے۔ ناصر کے برعکس حفیظ عالی اور ساقی دوسری طرف زیادہ ڈنڈی مارتے ہیں اور اپنے اس غیر شاعرانہ فیصلے کا عذاب اور ثواب زیادہ وصول کرتے ہیں۔ ان سب کی دنیاوی زندگی ناصر سے بہتر ہے۔ اور شاعرانہ زندگی ناصر سے کم۔ لیکن عالی' حفیظ اور ساقی سے اس لئے مختلف ہے کہ اس کے یہ دونوں سینئر اور جونیئر ساتھی "غیر عشق" کا خواب عالی سے چھوٹا دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں "زندگی غالب" کی تفسیر ایک چھوٹی موٹی افسری اور کچھ پیسہ کمانے کا معاملہ ہے۔ جب کہ عالی کنوارا جسم اور کنواری آتما سے لے کر دولت' عزت' شہرت اور اقتدار کے نئے نئے اوتار مانگتا رہتا ہے۔ ان اوتاروں کی پوجا میں عالی اپنے سارے چھوٹے بڑے رفیقوں سے زیادہ تیز اور دور تک دوڑا۔ عالی کی ابتدائی زندگی سے اس کی اب تک کی دوڑ پر نظر ڈالئے تو افلاس زدہ نواب زادگی' معمولی کلرکی' انکم ٹیکس افسری' گلڈ کی تاسیس' انجمن ترقی اردو کی معتمدیت' نیشنل پریس ٹرسٹ کی عہدہ داری' عالمی سیر و سیاحت اور نیشنل بینک کے منصب عالی تک کے کئی مرحلے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے ایوب خاں کی حمایت میں "نئی کرن" لکھی۔ قدرت اللہ شہاب کی مصاحبت کی۔ جن لوگوں کو گالیاں دیتا تھا انہیں سر کہہ کر پکارا۔ سرکاروں اور درباروں کا قصیدہ خواں مشہور ہوا۔ سازش' خوشامد اور بے ضمیری کے طعنے سہے۔ مسرور انور کے گیتوں اور نغموں پر للچایا اور ہر مرحلے پر آگے ہی بڑھتا پایا گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ حاصل طلبی کی اس دوڑ میں معراج محمد خاں تک سے بازی نہ لے جاسکا کہ وزارت اور سفارت اب تک اس کے قبضہ میں نہ آسکے۔ ایک دفعہ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو کہنے لگا۔ "سلیم خاں میرا جسم جواب دے گیا ہے۔ اب زیادہ تیز دوڑا نہیں جاتا۔ بہرحال ساری خواہشیں تو نپولین کی بھی پوری نہیں ہوئیں" بحیثیت مجموعی اسے ناکام نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تھی وہ زندگی' غالب جس کے مقابلے میں سارے شاعرا سے پیلیچر اور ساری شاعری کار لاحاصل نظر آتی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اچھا کیا یا برا۔ لیکن میں اسے ایک بات کی داد ضرور دوں گا کہ اس نے اپنی روح اور نفس کے تقاضوں کو پہچانا اور اس میں اتنی ہمت تھی کہ ان پر لبیک کہتا اور پھر یہ صلاحیت بھی کہ انہیں پورا کر سکتا۔ اس نے خود کو دھوکے میں نہیں رکھا۔ نہ دوسروں کو دھوکہ دیا۔ اور کبھی اپنی نا آسودہ انا کی دہائی دیتا۔ کبھی اپنے معصوم بچوں کا نام لیتا اور کبھی تلاش ابدیت کے جھوٹے سچے نعرے لگاتا دوڑتا چلا گیا۔ یوں اس کی خود آگہی میں بھی اضافہ ہوا۔ اور جہاں آگاہی میں بھی اور یہ انہیں دو باتوں کا فیض ہے کہ وہ اپنے نکتہ چینوں کو اتنے اطمینان سے جواب دے سکتا ہے کہ۔

او عالی پر ہنسنے والے تو عالی بن جائے

مگر کبھی طنز آمیز دکھ کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ۔

پہلے ہی کیا کچھ تھے عالی اب ٹھہرے فرزانے بھی

لاحاصل کی غزلوں اور دوہوں میں عالی کی باطنی زندگی کے دو عناصر نمایاں ہیں۔ () ضمیر کی خلش جس کے دو پہلو ہیں۔ (الف) ایک غریب اکیلا پاپی کس کس سے شرمائے۔

اور (ب) یہ تو بتا تری کوتا رانی دیس کے کیا کام آئی۔ پہلے پہلو کی تفصیلات اس کی ذاتی زندگی سے پھیل کر اس کے پورے طبقہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہاں وہ نوکر شاہی کا ایک فرد ہوتے ہوئے اس کی کھوکھلی اور بے ضمیر زندگی پر طنز کرتا نظر آتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی شاعرانہ زندگی پر افتخار اور ندامت کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس موضوع کی غزلیں اور دوہے آپ کو پاکستان کتھا اور الجیریائی میں کثرت سے ملیں گے۔ دوسرے پہلو کی جزئیات بھی لاحاصل میں ڈھونڈنے سے جابجا مل جائیں گی لیکن اس احساس کی اصل پیداوار اس کا دوسرا مجموعہ "جیوے جیوے پاکستان" ہے۔ جس میں عالی کی کوتا رانی عالی کے نزدیک دیس کے کام آتی نظر آتی ہے۔ سنا ہے کہ اس نے "جیوے جیوے پاکستان" کی منظومات کو اپنے دوسرے مجموعے "لاحاصل" میں اس لئے شامل نہیں کیا کہ وہ قومی خدمت کے اس اہم کام کو "لاحاصل" کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال ضمیر کی خلش کے علاوہ لاحاصل میں جو دوسرا عنصر ابھر کر سامنے آیا ہے وہ ایک نئی طرح کا اخلاق اور سماجی مزاج ہے جو ترقی پسندوں کی یاد دلانے کے باوجود ان سے کچھ مختلف طور پر عالی کے نئے موضوعات شاعری اور پیچیدہ تر تجربات زندگی کا سراغ دیتا ہے۔ بحیثیت مجموعی "لاحاصل" کی شاعری "غزلیں' دوہے' گیت" میں پختہ ہوتے ہوئے مزاج کی اگلی منزل معلوم

ہوتی ہے اور بعض جگہ اس میں ایک نئی خوبصورتی اور سچائی ابھر آئی ہے۔ غزلیں زیادہ تر پھیکی اور اتری ہوئی ہیں خاص طور پر وہ جو ناصر کے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن بعض غزلوں میں اسکی پرانی غزل گوئی کا رنگ نئے تجربات سے ہم آہنگ ہو کر بڑی خوبصورتی سے ابھر آیا ہے۔ اس کے علاوہ دوہوں میں عالی کے پچھلے دوہوں کی نسبت کئی نئی جہات کا اضافہ ہوا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایسی زندگی سے گزرنے اور دوست دشمن ہر ایک سے ہر طرح کی بات سننے کے باوجود عالی کا یہ ایمان ابھی تازہ ہے کہ سچا بول اور جھوٹی کوتا چھپائے سے نہیں چھپ سکتی۔ میں نے عالی کی زندگی اور شاعری دونوں کو اس مضمون میں دوست نہیں' دشمن کی نظر سے دیکھا ہے لیکن میں یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مجموعہ میں کئی مقامات ایسے آئے جہاں میں پلکوں پر آنسوؤں کی تھرتھری کو ضبط نہیں کرسکا۔ کبھی کبھی وہ احساس کے ایسے نازک تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ اس کے تجربات حساس پڑھنے والے کے پورے وجود کو ہلا دیتے ہیں۔

ذاتی شاعری' عشقیہ شاعری' نفسیاتی صداقتوں کی شاعری' وہ شاعری جس میں انسان کی ذات ہزار پردوں میں بھی چھپ کر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ عالی کے نزدیک لاحاصل ہے لیکن اپنی قومی شاعری کو کیا عالی اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ بے اختیار حالی کی یاد آتی ہے۔ حالی اور اقبال سبھی اس منزل سے گزرے اور یوں اس سوال کا جو ہم نے ابتدا میں اٹھایا تھا' سو برس میں شاعروں کی تقریباً تمام نسلوں نے (بہ استثنائے چند) ایک ہی جواب دیا کہ شاعری غم عشق کی منزل سے نکل کر غم دوراں کی منزل میں داخل ہو گئی ہے اور قومی خدمت یا سماجی افادیت کے بغیر شاعری کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ شاعری کے بھی اور زندگی کے بھی۔ عالی کا بھی یہی جواب ہے۔ لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ حالی اور اقبال کی شاعری افادی اور مقصدی ہونے کے باوجود شاعری ہے۔ اور عالی کی قومی شاعری' شاعری اور قوم دونوں کے ساتھ ایک فلمی قسم کا مذاق۔ گو عالی اس مذاق میں اتنا سنجیدہ ہے کہ حالی اور اقبال بھی نہ ہوں گے۔ خیر حالی اور اقبال تو بڑی چیز ہیں۔ عالی تو ترقی پسندوں تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ ایسا کیوں ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہمارے ساتھ عالی کے بھی سوچنے کی بات ہے۔

میں نے اس مضمون میں کئی جگہ عالی کا اس کے ہم عمروں سے تقابل کیا ہے۔ اس معاملہ میں ایک آخری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عالی اپنی زندگی کے متنوع تجربات کی کثرت کے اعتبار سے اپنے وقت کے تمام شاعروں سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی زندگی کثیرالجہات اور کثیرالواردات ہے۔ اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور بے شمار روح فرسا اور جاں گداز مرحلوں سے گزرا ہے اور اچھے برے' پست و بلند' شریف اور کمینے ہر طرح کے تجربات سے دوچار ہوا ہے۔ پھر وہ صرف احساس کا آدمی نہیں ذہن کا آدمی بھی ہے۔ وہ محسوس کرنے کے ساتھ سوچنا بھی جانتا ہے۔ زبان و بیاں کے اعتبار سے اس نے مختلف اسالیب آزمائے ہیں اور کئی طرح کے طرز کلام پر قابو پایا ہے۔ یہ سب باتیں اس کے لئے نیک فال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ چاہے تو ان سے بڑا کام

لے سکتا ہے ان معنوں میں' میں اس کو اپنے زمانہ کا سب سے خطرناک شاعر سمجھتا ہوں۔ وہ اگر اپنی شاعری میں اپنی زندگی کو سچا آئینہ دکھاسکتا تو اس کے ہم عصروں کی شہرت خطرہ میں پڑ سکتی ہے لیکن اس کے لئے شاید عالی کو اپنی زندگی ہی کے برابر شاعری کا بھی احترام کرنا پڑے گا اور مرزا جمیل الدین کے ساتھ اپنے عالی کو بھی اتنی ہی اہمیت دینی پڑے گی۔ بڑی شاعری' بڑی زندگی' تو بڑے فن کا مجموعہ ہوتی ہے اور فن اور فنی زندگی کے سچے احترام کے بغیر آدمی ادیبوں اور شاعروں کا گلدۂ تو بنا سکتا ہے بڑا ادیب اور شاعر نہیں بن سکتا۔ عالی میں اس قسم کا کوئی امکان ہے' یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ کاش وہ اپنے تجمل حسین کے ساتھ اپنے غالب کی بھی تھوڑی سی عزت کر سکے۔

(مطبوعہ "سیپ" کراچی)

(۱) ☆ عالی کا کوئی قول نہیں' ایک دوہا ہے' شعریات کو واقعاتی بیانات قرار دینا محل نظر آتا ہے۔ ناشر

(۲) ☆☆ عالی نے ایسے بیانات کی سنجیدگی سے انکار کرتے ہوئے انہیں دوستانہ مذاق قرار دیا ہے۔ ناشرین

(۳) ☆☆☆ افسری کے ساتھ تمن کرنے کا گھر ملا۔ اس سے پہلے "دیوان خانہ" تھا ہی کہاں۔ ناشرین

(۴) ☆☆☆☆ عالی کا کوئی بیان تو ایسا نہیں۔ یہ اشارہ انکے دوسرے مجموعے کے نام کی طرف ہے۔ ناشرین

مشفق خواجہ

جمیل الدین عالی کے "حرفے چند" پر مقدمہ

تحریکیں ہوں یا ادارے' ان کی روح ہمیشہ کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو ان تحریکوں یا اداروں کے مقاصد کو خود اپنی زندگی کا مقصد بنالیتی ہے۔ رسمی طور پر کسی عہدے پر فائز رہنا اور بات ہے' کسی ادارے کے لئے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں وقف کردینا دوسری بات ہے۔ یہی دوسری بات کسی ادارے اور فرد میں روح و تن کا تعلق پیدا کرتی ہے اور من و تو کا فرق مٹا دیتی ہے۔ ہمارے سامنے بے شمار مثالیں ایسی ہیں کہ کسی مرکزی شخصیت کے انتقال کے بعد کسی ادارے کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ یا تو وہ ادارہ ختم ہوگیا یا پھر وہ رسمی طور پر "زندہ" رہ کر اپنے مقاصد سے بے تعلق ہوگیا۔ مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو کے بارے میں بھی بہتوں نے سوچا تھا کہ

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

کے مصداق یہ ادارہ بھی بہت جلد اپنی زندگی کے دن پورے کرلے گا۔ ایسا سوچنا ناگزیر تھا' اس لئے کہ انجمن ترقی اردو دراصل مولوی عبدالحق ہی کا دوسرا نام تھا۔ ان کے بغیر انجمن کا تصور کرنا ایسا ہی تھا جیسے روح کے بغیر کسی جسم کا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی کے پچاس سال اس ادارے کی نذر کئے اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک ذیلی شعبے کو جس کی حیثیت صرف کاغذی تھی' برصغیر کا سب سے بڑا علمی و ادبی ادارہ بنادیا۔ کسی زبان سے محبت کی ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی مل سکے۔

خوش قسمتی سے مجھے مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس ساری مدت میں میں نے انہیں انجمن کے مستقبل کے لئے پریشان دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی صاحب کی انجمن کو ان سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل خود مولوی صاحب کے قلم سے "انجمن ترقی اردو کا المیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے' اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صدر مملکت محمد ایوب خان کے ایک مارشل لا آرڈر کے ذریعے

انجمن پر قابض گروہ کو الگ کیا گیا اور مولوی صاحب کی سربراہی میں نئی انتظامیہ نے انجمن کے معاملات ہاتھ میں لئے۔ مولوی صاحب اب بھی خوش نہیں تھے۔ پہلے انجمن مفاد پرستوں کے قبضے میں تھی تو اب کراچی کی انتظامیہ کے دفتری اہل کاروں کے قبضے میں۔ اس سے پہلے کہ یہ صورتحال مولوی صاحب کی مرضی کے مطابق تبدیل ہوتی' وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ مولوی صاحب کے بعد انجمن کلی طور پر کراچی کی انتظامیہ کا ایک غیر فعال شعبہ بن کر رہ گئی۔ انجمن کی مجلس انتظامی میں کچھ اہل علم و ادب ضرور شامل تھے لیکن انہیں انجمن کے روزمرہ معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک سال تک انجمن جسد بے جان کی حیثیت سے موجود رہی اور اس کا مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگا۔

۱۹۶۲ء میں حالات نے نئی کروٹ لی اور ایک سرکاری حکم کے تحت انجمن کی ایک نئی انتظامیہ وجود میں آئی۔ اس نئی انتظامیہ کے صدر اختر حسین تھے اور معتمد اعزازی جمیل الدین عالی۔ میں انجمن کا ایک ادنیٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا کہ دونوں کلیدی عہدوں پر ایسے اشخاص فائز ہوئے جنہیں میرے خیال میں' انجمن کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک بیوروکریٹ اور دوسرا شاعر۔ مولوی عبدالحق اس قسم کے لوگوں سے بہت گھبراتے تھے۔ ان کے آخری دنوں میں دو ریٹائرڈ اعلیٰ افسروں کو جو شاعر بھی تھے' یکے بعد دیگرے انجمن کا معتمد بنانے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے فرمایا : پھر تو انجمن کا نام تبدیل کر کے "بیت الغزل" رکھنا پڑے گا کیونکہ مشاعرہ گاہ کے لئے یہی نام موزوں ہے۔

چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ اختر حسین مرحوم صرف بیوروکریٹ نہیں تھے' اور عالی صاحب صرف شاعر نہیں ہیں اور اب پچیس سال بعد جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان دونوں نے انجمن ہی کو نہیں بابائے اردو کو بھی زندہ رکھا۔ اختر حسین مرحوم کا نام اور عالی صاحب کا کام انجمن کی حیات نو کا ضامن بن گیا۔

گزشتہ پچیس برسوں میں انجمن ترقی اردو کو زندہ فعال رکھنے اور اس کے اردو کالج کو ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ بنانے کے لئے عالی صاحب نے جس طرح تگ و دو کی ہے' وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ علمی و ادبی کاموں کی وہ روایت جسے مولوی عبدالحق نے شروع کیا تھا اور جو انجمن کا اصل کام ہے اسے عالی صاحب نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ بعض حیثیتوں سے آگے بھی بڑھایا۔ اسی کا ایک ثبوت زیر نظر کتاب ہے۔ یہ ان دیباچوں کا مجموعہ ہے جو عالی صاحب نے انجمن کی شائع کردہ کتابوں پر لکھے۔ اس مجموعے سے یہ اندازہ نہیں کرنا چاہئے کہ اس عرصے میں انجمن نے صرف اتنی ہی کتابیں شائع کیں کیونکہ کئی کتابوں پر عالی صاحب نے کسی نہ کسی وجہ سے دیباچے نہیں لکھے اور کئی دیباچے ایسے ہیں جو بہ وجوہ اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بعض کتابیں تاریخ ساز' بعض تاریخی اور بعض تاریخ کے کسی لمحے کے تقاضوں اور رجحانات کی تفہیم میں معاون ہوتی ہیں۔ عالی صاحب کی زیر نظر کتاب آخرالذکر شق سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ گزشتہ پچیس برس کے علمی ادبی اور تحقیقی رجحانات اور برصغیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے سب سے اہم اور قابل ذکر ادارے کی عملی کاوش کا آئینہ ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کو سب سے بڑا "مقدمہ باز" کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی غلط بات نہیں۔ مولوی صاحب نے کتابوں پر سیر حاصل، پر مغز اور محققانہ مقدمے لکھنے کی جس روایت کا آغاز کیا تھا، اس کے سب سے بڑے عامل بھی وہ خود ہی تھے۔ مولوی صاحب کے بعض مقدمے اردو ادب میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ "حیات النذیر" اور "معرکہ مذہب و سائنس" کے مقدمے ایسے ہیں کہ ان سے خود ان کتابوں کی اہمیت بڑھ گئی جن پر یہ لکھے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد صدر اور بعد ازاں مدیر اعزازی کی حیثیت سے مولوی صاحب نے انجمن کی مطبوعات پر مقدمے لکھے۔ ان مطبوعات میں شعراء کے تذکرے، انتخابات، تحقیقی مقالے، قدیم متون، جدید ادب سبھی کچھ شامل ہے، مولوی صاحب نے کسی کتاب پر سرسری مقدمہ نہیں لکھا۔ انہوں نے کتاب کے جملہ پہلوؤں کا تاریخی اور تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے موضوع کتاب کے بارے میں خود اپنے خیالات کو بھی قلم بند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کی کتابوں پر مولوی صاحب کے مقدمے ہر اعتبار سے دیانت دارانہ علمی جائزے ہیں جن میں ایک مرد جہاں دیدہ کی ساری زندگی کے علمی تجزیوں اور مشاہدوں کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب نے ایک طویل عمر پائی، انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو پروان چڑھتے اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے بچشم خود ملاحظہ کیا۔ سرسید احمد خاں کی چار نسلیں دیکھیں۔ دادا اور پوتے (سرسید اور سر راس مسعود) دونوں کے ساتھ کام کی سعادت حاصل کی۔ اس وجہ سے مولوی صاحب کی نظر میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی تھی اور وہ خود تاریخ بن گئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں اس خصوصیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انجمن کی تمام مطبوعات کو جو ان کے عہد میں اشاعت پذیر ہوئیں، اپنے مقدموں سے بہت وقیع بنا دیا۔

جمیل الدین عالی انجمن ترقی اردو میں مولوی صاحب کے جانشین اور ان کی قائم کردہ علمی و ادبی روایات کے امین ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ پاکستانی ادیبوں کی تنظیم اور فلاح میں صرف ہوا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں ادب کی تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تاریخ کو بنانے میں نمایاں اور مثبت کردار ادا کیا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ خود پاکستانی ادب کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ پاکستانی ادب کے رجحانات و میلانات پر ان کی دسترس محرمانہ ہے کیونکہ ان رجحانات و میلانات کو بروئے کار لانے میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں۔ اگرچہ عالی صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور اس وجہ سے ان کے طرز احساس میں شاعرانہ لطافت و نزاکت کو زیادہ دخل ہے۔ لیکن انہوں نے ہر لکھے جانے والے لفظ کی عظمت و اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اسے تحفظ فراہم کرنے میں پوری کوشش کی ہے۔

ادب، ادبی تحریکوں اور ادیبوں سے عالی صاحب کے ذاتی تعلق کی دو سطحیں ہیں، پہلی سطح تخلیقی ہے جو شاعری، سفر نگاری، کالم نویسی اور دیگر تحریروں کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ انہوں نے پاکستانی ملت کو متعدد ایسے قومی نغمے عطا کئے ہیں جو ہمارے قومی شعور کی علامت بن گئے ہیں۔ ان کی غزل قدیم و جدید کے خوبصورت امتزاج کا ایک ایسا مرقع ہے جو اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ جدید عہد میں دوہے لکھنے کی روایت انہیں کی مرہون منت ہے، اور حق تو یہ ہے کہ اس صنف کا حق صرف وہی ادا کر پائے ہیں، اگرچہ ان کی تقلید میں بہت سوں نے اس ذریعہ اظہار کو اپنایا ہے لیکن دوہا

صرف اور صرف عالی ہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

نثرنگار کی حیثیت سے عالی صاحب جن مختلف جہتوں میں نظر آتے ہیں' وہاں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کئے ہیں۔ انہوں نے کئی اچھے شخصی خاکے لکھے ہیں جن میں نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی کا خاکہ یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بدلتی ہوئی قدروں کی سفاکی اور قدیم معاشرتی وضع داری کا ایک ایسا اشاریہ ہے جو بڑے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ عالی صاحب ایک جہاں دیدہ سیاح بھی ہیں۔ انہوں نے اردو میں سفرنامے کی روایت کو از سر نو زندہ کیا ہے۔ انہوں نے سفرنامے کو سفرنامہ ہی رہنے دیا ہے' افسانہ و افسوں نہیں بنایا۔ اسے ایک معنی خیز اور فکر انگیز صنف ادب بنا دیا ہے۔

عالی صاحب پاکستان کے ان چند کالم نویسوں میں سے ہیں' جنہوں نے ربع صدی سے زیادہ عرصے سے اس دشت کی سیاحی اختیار کر رکھی ہے۔ اخباری کالم جیسی وقتی اور ہنگامی چیز کو انہوں نے دوامی اور مستقل حیثیت دے دی ہے۔ عالی صاحب کے کالم کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی ایک اپنی مستقل اہمیت ہے۔ انہوں نے کالم نویسی کو بے شمار نئے افق عطا کئے ہیں۔ پاکستان کے پہاڑوں' دریاؤں' جنگلوں' معدنی دولت' زرعی پیداوار' تہذیب و ثقافت' رسوم و رواج اور طرز معاشرت' معاشی حالات وغیرہ کے بارے میں انہوں نے جس دل سوزی کے ساتھ لکھا ہے' وہ انہیں کا حصہ ہے۔ کبھی وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر سجدہ شکر ادا کرتے ہیں' اور کبھی ان نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر اظہار افسوس۔ غلط اور نقصان دہ رسوم و رواج کے خلاف انہوں نے جس دردمندی اور خلوص کے ساتھ لکھا ہے' اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

عالی صاحب کی کالم نویسی کا دوسرا اہم موضوع فروغ دانش ہے۔ آج ساری دنیا میں علم کے فروغ کا غلغلہ ہے۔ خود ہمارے ہاں بھی اس کا چرچا کم نہیں ہے۔ کتابیں چھپتی ہیں' دانش گاہوں کو رونق دیتی ہیں' علمی ادارے سرگرم عمل رہتے ہیں' اس سب کے باوجود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ہم نے اپنی قومی دانش میں کچھ اضافہ کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب ایک افسوس ناک نفی کے سوا کچھ اور نہیں۔ خواندگی کی شرح میں معمولی اضافہ' کچھ نئی کتابوں کی اشاعت' کچھ علم و فضل کی گفتگو فروغ دانش نہیں ہے۔ علم و دانش کو جس انداز سے قومی مزاج میں سرایت کرنا چاہئے' قومی کردار کی تشکیل میں حصہ لینا چاہئے' اس کا ہمارے یہاں دور دور تک کوئی تصور نہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نئی نسل نے علم و دانش کو اپنا شعار بنانے کی بجائے جارحیت' عصبیت اور درشتی کو اختیار کیا ہے۔ عالی صاحب کو اس خطرناک صورتحال کا پورا احساس ہے' اسی لئے ان کی کالم نویسی کا ایک مقصد اس صورتحال کے خلاف ایک موثر احتجاج ہے۔

وہ اعداد و شمار کے حوالوں سے دوسری قوموں کی ترقی کے تذکرے سے' ازمنہ قدیم کی تاریخ کے تصورات سے' ہمیشہ یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کی بنیاد حصول دانش پر ہے' دانش کے فریب میں مبتلا ہونا نہیں جو ہمارا شعار اور مزاج بنتا جا رہا ہے' بلکہ دانش کی اصل روح کو اپنانا جو روزمرہ زندگی کی ترجیحات میں تبدیلی کے

بغیر ممکن نہیں۔ عالی صاحب نے اس سلسلے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل پیرا ہونے سے ہم اپنے بہت سے قومی مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

عالی صاحب کی کالم نگاری کی سب سے بڑی خوبی جرات اظہار ہے۔ آج کے دور مصلحت کوش میں بیشتر لکھنے والے آزادانہ اظہار خیال سے گریز کرتے ہیں۔ ملکی مسائل ہوں یا معاشرتی اور ثقافتی معاملات' علمی دید و دریافت ہو یا ادبی تنقید' سچی باتیں کم سننے میں آتی ہیں۔ اظہار خیال تحفظات کی چھاؤں میں ہوتا ہے۔ یہ صورتحال ایک بڑے قومی المیے کی نشاندہی کرتی ہے عالی صاحب اس صورتحال کے خلاف مسلسل جہاد کر رہے ہیں۔ انہیں سچی بات برملا کہنے میں طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ لگی لپٹی رکھنا' اعتذار کا انداز اختیار کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ وہ شمشیر برہنہ ہیں جس کی کاٹ اپنے پرائے کا لحاظ نہیں کرتی' اسی وجہ سے ان کا یہ حال ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

بہرحال کوئی نہ کوئی تو سچ بولنے والا ہونا چاہئے۔ بقول حافظ

گفت آں یار کزو گشت سردار بلند
جرمش آں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

مجھے فارسی کا یہ شعر شاید اس لئے یاد آیا کہ عالی صاحب اپنے کالموں میں اکثر برمحل فارسی شعر درج کرتے رہتے ہیں یہ بھی ہماری نثر کا ایک وصف ہے جو بڑی تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ عالی صاحب کی وجہ سے یہ روایت زندہ ہے' اگرچہ اب انہیں فارسی شعر کے نیچے اس کا مطلب اردو میں لکھنا پڑتا ہے۔

میں نے یہ ساری تفصیل اس لئے بیان کی ہے کہ عالی صاحب کی ادبی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہو سکیں۔ وہ اپنے عہد کی ایک ممتاز اور قد آور ادبی شخصیت ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کا سکہ چلتا ہے۔ مگر یہ ان کی ادبی شخصیت کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ ان کی وہ سعی مسلسل ہے جو انہوں نے پاکستان میں ادب کے فروغ اور ادیبوں کی تنظیم کے سلسلے میں انجام دی ہے۔ عالی صاحب پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں سے ہیں۔ اس ادارے کے قیام اور پھر اسے پاکستانی ادیبوں کی معتبر' مستند اور نمائندہ تنظیم بنانے میں انہوں نے جو کوششیں کی ہیں' انہیں پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔ ملک کے ہر خطے سے تعلق رکھنے والے مختلف الخیال ادیبوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور انہیں ایک مشترک طرز احساس سے روشناس کرانا معمولی کام نہیں۔ گلڈ کے تعلق سے عالی صاحب کو پاکستانی ادب کے تمام رجحانات سے گہری واقفیت حاصل ہوئی جو عام حالات میں ممکن نہ تھی۔ اس واقفیت نے ان کی تحریروں کو ہمہ رنگ اور ہمہ جہت بنا دیا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نے ادیبوں کا معاشرتی وقار تسلیم کرانے کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ ان کی تحریروں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ وہ اس کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔ مبلغ تو ہم سب ہیں مگر ہماری تبلیغ زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔ عالی صاحب نے اسے مقصد حیات اور طریق زندگی بنا لیا ہے۔ وہ ہر جگہ' ہر موقعے پر' ہر حوالے سے اس کا تذکرہ

کرتے ہیں' اور چونکہ یہ تذکرہ خلوص' ہمدردی اور محبت سے ہوتا ہے' اس لئے اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوتا ہے۔ ادیبوں کی تنظیم نے عالی صاحب کو حوصلہ ہمت' مستقل مزاجی اور ناگوار کو گوارا بنانے کے اوصاف عطا کئے۔ ان کی ادبی شخصیت نے اس تنظیمی کاوش سے جلا پاکر بڑا دلکش انداز اختیار کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے تعلق سے یہ ادبی شخصیت کچھ اور نکھر گئی۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے' عالی صاحب گزشتہ پچیس برسوں سے انجمن کے معتمد اعزازی ہیں۔ انہوں نے یہ خدمت بڑی ذمہ داری' انہماک اور توجہ سے انجام دی ہے۔ انجمن اس وقت برصغیر کا قدیم ترین غیر سرکاری ادارہ ہے جو تسلسل اور تواتر سے فروغ اردو کا کام کئے جارہا ہے۔ انجمن کو تاریخ ساز اور عہد ساز ادارہ ہونے کا افتخار حاصل ہے۔ بڑے بڑے کام ظہور میں آچکے ہیں۔ بابائے اردو نے کام کو عبادت بنانے اور سمجھنے کی جس روش کی داغ بیل ڈالی تھی اس سے اردو زبان و ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ عالی صاحب اسی روایت کے امین ہیں۔ انجمن سے وابستگی نے انہیں ادب کے نئے نئے رجحانات' تحقیق کے نئے نئے گوشوں' اہل علم کے افکار و نظریات' فروغ ادب کے نئے امکانات' سب کا مزاج شناس بنادیا ہے۔ انہیں اردو ادب ہی نہیں' تمام پاکستانی زبانوں کے ادب اور دنیا کی متعدد اہم زبانوں میں لکھی جانے والی قابل ذکر تحریروں کی معرفت حاصل ہے۔ یہ ایسا امتیاز و اختصاص ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ عالی صاحب اس اعتبار سے ہمارے عہد کی بڑی اہم شخصیت ہیں کہ انہیں ایک ایسے بزرگ علمی و ادبی ادارے کی معتمدی حاصل ہے جس سے ادبی اعتماد کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

انجمن سے وابستگی کی بناء پر عالی صاحب نے اپنے دور معتمدی میں مطبوعات انجمن پر دیباچے لکھنے کی روایت کو بھی پوری طرح برقرار رکھا۔ "حرفے چند" انہیں دیباچوں کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی شخص گزشتہ پچیس ۲۵ برس کے علمی' ادبی اور تحقیقی رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لئے "حرفے چند" ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دیباچوں میں اردو ادب کی ربع صدی کی تاریخ بڑے سلیقے اور اہتمام سے بیان ہوئی ہے۔ انجمن کی مطبوعات میں ادب کی تاریخیں' تحقیقی مقالے' ادبی تنقید' مخطوطات کی توضیحی فہرستیں' حوالے کی کتابیں' دکنیات' قدیم متون' لغات' فلسفیانہ افکار و مسائل' ثقافتی دید و دریافت' علاقائی ادب' سب کچھ شامل ہے۔ "حرفے چند" کے مشمولات انہیں مباحث کے حوالے سے قلم بند ہوئے ہیں۔ اور ان تمام موضوعات کی وضاحت کرتے ہیں۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ دیباچہ نگار کسی تصنیف یا تالیف کے بارے میں مختصر طور پر اظہار خیال کرکے دیباچہ نگاری اور تعلقات کا حق ادا کردیتا ہے۔ مولوی عبدالحق اس روش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے دیباچہ نگاری کو بھی ایک فن کی حیثیت دے دی تھی اردو دیباچے لکھنے میں وہ اتنی ہی محنت کرتے تھے جتنی علمی و تحقیقی مقالوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیباچے یادگار حیثیت رکھتے ہیں عالی صاحب نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کی پیروی کی ہے لیکن یہ پیروی تخلیقی انداز کی ہے۔ وہ ہر متعلقہ کتاب کا معروضی انداز میں تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے خیالات و افکار کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ عالی صاحب زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ

نقطہ نظران کی عام تحریروں کی طرح' ان کے دیباچوں میں بھی پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔

عالی صاحب کا مخصوص نقطہ نظر کیا ہے؟ ان کی شاعری' سفرنگاری اور کالم نویسی کے حوالے سے اس کی مختصر توضیح اوپر کی سطروں میں پیش کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ عالی صاحب قدیم و جدید کا وہ سنگم ہیں جہاں سے ادب اور زندگی دونوں کی معنویت اور ہمہ گیری کا ایک نیا احساس ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی قدیم متن کی بازیافت پر وہ اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی تخلیق کار اپنی نئی تخلیق پر۔ یہاں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا "حرفے چند" بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس دیباچے میں عالی صاحب کا تحقیقی اور تخلیقی مزاج پوری طرح نمایاں ہے۔ انہوں نے اس مثنوی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بہت سے نئے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ کام کرنے والے تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن راستہ دکھانے والے اور منزلوں کی نشاندہی کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ عالی صاحب کی دیباچہ نگاری میں راہ دکھانے کی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ کتاب "پاکستان میں اردو تحقیق" کا دیباچہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ ابن انشاءؔ سے متعلق کتاب کا دیباچہ اصل پر اضافے کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ عالی صاحب نے اس میں ابن انشاء کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ملتیں۔ "افکار عالیہ" کے دیباچے میں عالی صاحب نے بتایا ہے کہ اس کتاب میں اہل مغرب کے جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے' ان میں سے بہت سے خیالات اہل مشرق کی فکر میں پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن مرتبین نے مغرب کی برتری جتانے کے لئے مشرق کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ "مفکرین اسلام" کا حرفے چند اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں عالی صاحب نے نہایت ادب کے ساتھ کتاب کی کوتاہیوں کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عالی صاحب رسمی دیباچہ نگار نہیں ہیں' وہ جس کتاب پر دیباچہ لکھتے ہیں' اس کے مطالب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

سو (۱۰۰) سے زائد کتابوں پر دیباچے لکھنا بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور دیباچے بھی وہ جو برینائے تعلقات یا سطحی اور سرسری انداز میں نہیں لکھے گئے بلکہ ہر دیباچہ ایک علمی شان رکھتا ہے۔ عالی صاحب کا حب وطن' فروغ علم و دانش کا جذبہ' اردو زبان وادب کو ترقی دینے کی آرزو' عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مختلف علوم و فنون سے استفادہ کرنے کی خواہش' قومی یک جہتی کی نشوونما کے لئے سعی وکاوش "حرفے چند" میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

عالی صاحب ہمارے دور کے سب سے اہم اور قابل ذکر دیباچہ نگار ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بعد علمی دیباچہ نگاری کی روایت انہیں کی وجہ سے تابندہ ہوئی ہے۔ زیر نظر مجموعہ عالی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کا ایسا موثر اظہار ہے جس کے بارے میں اب تک سنجیدگی سے غور نہیں ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے ادب عالی کا ایک بالکل نیا اور بھرپور پہلو سامنے آتا ہے۔

عالی صاحب اگرچہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ان کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل نہیں ہے۔ شاعر عام طور پر نثر لکھتے ہیں تو شعر کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کرتے حالانکہ نثر کا مقصد توضیح و تشریح' تحلیل اور تجزیہ ہے' عالی صاحب کی نثر میں یہ سارے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کا نثری اسلوب سلیس' رواں دواں اور تشریحی انداز کا حامل ہے۔ بات کو

سمجھانا، خیال کو پوری طرح واضح کرنا، موثر اور دل نشیں پیرایہ اختیار کرنا، عالی صاحب کی نثر ان عناصر سے مملو ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی نثر پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک واضح، مضبوط اور مستحکم شخصیت کا حامل ہے۔ تحریر شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ عالی صاحب اپنی تحریروں میں وہی نظر آتے ہیں جو وہ ہیں۔ حق گو، حق پسند، بے خوف، بے ریا۔

"حرفے چند" اپنی فکر انگیزی اور اسلوب کی دل کشی کی وجہ سے ایک اہم کتاب ہے۔

یہ مقدمہ حرف چند کی جلد اول پر تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۹۳ میں عالی صاحب کے پنتالیس نئے مقدموں پر مشتمل دوسری اور سنہ ۱۹۹۷ میں تیسری جلد بھی شائع ہو چکی ہے۔ ناشرین

کتاب: "جمیل الدین عالی فن اور شخصیت"
مرتبہ: ایم۔ حبیب خاں
علمی مجلس، دلی ۸۸ سنہ

افتخار احمد عدنی
(۱۹۸۷ء)

"حدیث دیگراں" کا پس منظر

قیام پاکستان کے بعد ہمیں جن سنگین مسئلوں سے دوچار ہونا پڑا ان میں وسائل کی تقسیم' زرمبادلہ کے بٹوارے اور کشمیر کے تنازعے کے علاوہ ایک گمبھیر مسئلہ جمیل الدین عالی اور جناب عزیز احمد کے درمیان اختلافات کا بھی تھا لیکن مسئلہ کشمیر کے برعکس اس مسئلے کی نوعیت ہمیشہ یکطرفہ رہی۔ اس کی ابتداء جمیل الدین عالی کی شکایات سے ہوئی جن کی شدت نے ان کے حساس دل کو کئی مہینے تک ایک عجب اضطراب کے عالم میں رکھا اور اس کی انتہا اس اذیت پر ہوئی جس میں جمیل الدین عالی کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات نے بیچارے عزیز احمد کو مبتلا کردیا اور اس عمل اور ردعمل کی قیمت ادا کرنی پڑی محترم شاہد احمد دہلوی کو۔ جمیل الدین عالی کو اس وقت عزیز احمد کی شخصیت' ان کی تنقیدی صلاحیت' ادیبوں کے ساتھ انکے رویے' اور "ماہ نو" کی ادارت پر ان کی جاگیردارانہ تسلط کے خلاف سخت شکایات تھیں اور وہ ہر محفل میں برملا ان کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اپنا رسوائے زمانہ کالم "نقار خانے میں" تو انہوں نے بیس سال بعد لکھنا شروع کیا لیکن وہ تو معلوم ہوتا ہے جیسے پیدا ہی نقارے کی چوٹ پر ہوئے تھے۔ انہوں نے عزیز احمد کے خلاف اپنا اعلانِ مظلومیت اس شدومد سے کیا کہ ہر شخص ان کے درد سے بیقرار ہوگیا۔ میں نے ایک غمگسار دوست کی حیثیت سے یہ پیشکش کردی کہ چونکہ مجھے عزیز احمد سے کسی قسم کی کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے اس لئے اگر وہ مناسب سمجھیں تو ان کی شکایات کے ازالے کے لئے عزیز احمد ہی کے انداز میں ان پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں۔ اس پیشکش کو عالی نے بڑی فراخدلی سے قبول کرلیا۔

عزیز احمد سے جمیل الدین عالی کی شکایات کا پس منظر یہ تھا کہ محمد حسن عسکری نے ماہ نو کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ایک طویل نظمیے "انسان" کے کچھ حصے اشاعت کے لئے حاصل کرلئے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ایک منفرد نظم تھی' اس کے آہنگ میں بڑی توانائی تھی' وہ عالی سے کہتے تھے کہ اگر تم نے اسے مکمل کرلیا تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ جب اس نظم کے منتخب حصے ماہ نو کے زیر ترتیب شمارے کے مواد کے ساتھ عزیز احمد کے پاس گئے تو انہوں نے کچھ اور تحریروں کے علاوہ عالی کے نظمیے کو بھی قلم زد کردیا۔ عزیز احمد حکومت پاکستان کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے تمام سرکاری مطبوعات پر کڑی

نظر رکھتے تھے اور آج کل کے کم حوصلہ سرکاری ملازمین کے برعکس اپنے اختیارات کے استعمال میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ چاہے اس سے کوئی ادیب مجروح ہوتا ہو یا مدیر شاکی۔ چنانچہ جب ماہ نو کا نیا شمارہ بغیر عالی کے نظمیے کے شائع ہوا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی' وہ فوراً حسن عسکری کے پاس گئے اور اس کا سبب پوچھا۔ حسن عسکری خود مشکل میں گرفتار تھے جس نظمیے کے منفرد آہنگ سے متاثر ہو کے انہوں نے خود اس کے کچھ حصے عالی سے حاصل کئے تھے اسے ماہ نو کے نگران نے اشاعت کے قابل نہیں سمجھا۔ انہوں نے بتایا کہ عزیز احمد نے ان کے نظمیے پر بڑی سخت رائے دیتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں۔A clumsy adaptation of Romeo and Juliet یہ تنقید عالی کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ معلوم نہیں یہ سن کر انہوں نے حسن عسکری سے کیا کہا لیکن ان کے شدید ردعمل سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ وہ خود عزیز احمد کو رومیو کا ایک بے ڈھنگا چربہ بنائے بغیر دم نہیں لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے اپنے تمام ہتھیاروں سے مسلح ہو کر عزیز احمد کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ جب اس کراچی گیر مہم سے عزیز احمد سے شکایت رکھنے والے تمام ادیب دل بھر کے محظوظ ہو چکے تو شاید ان میں سے کسی ستم ظریف نے یہ سوچا کہ عزیز احمد خود کیوں اس ضیافت سے محروم رہیں اور عالی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ عزیز احمد سے جو بنیادی طور پر ایک منصف مزاج ادیب ہیں جا کر پوچھیں کہ آخر ان کے نظمیے میں کیا کمی ہے جس کی وجہ سے اسے شائع نہیں کیا گیا۔ جمیل الدین عالی اپنی ذات کے معاملے میں منصور حلاج کی طرح بہت خوش گمان واقع ہوئے ہیں' وہ ہر مقابلے کو اپنی انا کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ فوراً اس کار خیر پر آمادہ ہو گئے۔ عالی اس زمانے میں وزارت تجارت میں ایک آفس اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے لیکن اس وقت بھی ان کی حقیقت پسندی اور خود شناسی ان سے ایسے طرح دار دوہے کہلواتی تھی۔

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جیسے مہاکوی بھی بابو جی کہلائے

اپنے کسی خیر خواہ کے اکسانے پر مہاکوی عالی ایک نہایت جواب طلب انداز میں عزیز احمد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ واقعہ سن ۱۹۴۹ء کا ہے۔ عزیز احمد اس وقت محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کا ہر افسر دفتری کارکردگی کے معاملے میں اپنے آپ کو برطانوی روایات کا وارث سمجھتا تھا اور ان کے تحفظ کو اپنی سرکاری ذمہ داریوں میں بہت اہم مقام دیتا تھا اور پھر افسر بھی عزیز احمد جیسے رکھ رکھاؤ والا۔ اس تصادم میں ایک عظیم المیے کے تمام اجزاء موجود تھے۔ ایک طرف ایک ابھرتا ہوا' نوعمر' حساس شاعر اپنے فن اور اپنے مقام کے دفاع کی خاطر نتائج سے بے پروا ہو کر جبر اور احتساب کی ہر طاقت سے ٹکر لینے کے لئے تیار تھا اور دوسری طرف ایک ذمہ دار افسر اپنے آپ کو اس خدمت پر مامور سمجھتا تھا کہ وہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے لئے ان تمام سرکاری روایات کا تحفظ کرے جن کی وجہ سے برطانیہ کو اپنے دور اقتدار میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کا امتیاز حاصل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے اس پر یہ ذمے داری بھی عائد ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح ایک اہم سرکاری ماہنامے کا معیار نہ گرنے دے چنانچہ جب جمیل الدین عالی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے ارادے سے عزیز احمد کے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی آمد کو ایک

ناگواری کے طور پر برداشت کیا گیا۔ عزیز احمد نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر کچھ تجسس نظروں سے ان کا جائزہ لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کی آمد کا سبب دریافت کیا۔ جمیل الدین عالی نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے ایک مصنوعی شائستگی سے بات شروع کی۔

"جناب حسن عسکری صاحب نے میرے ایک طویل نظمیے کے کچھ حصے ماہ نو میں اشاعت کے لئے حاصل کئے تھے لیکن کافی مدت گزر جانے کے باوجود وہ ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں" عزیز احمد نے اس سوال کا جواب دینے میں تامل کیا اور غور سے عالی کی طرف تو دیکھا تو انہیں یاد آیا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو حلقہ ارباب ذوق میں بہت بڑھ بڑھ کے باتیں کیا کرتا ہے۔ انہوں نے اسے کرسی پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ عالی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر عزیز احمد نے پہلے اپنے سکوت سے اور جب سکوت کے معنی نہیں سمجھے گئے تو مختصر الفاظ میں یہ بتایا کہ ماہ نو جیسے رسالے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کو یہ بتائے کہ اس کی تحریریں کس لئے قابل اشاعت نہیں سمجھی گئی۔ یہ سنتے ہی عالی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے سرکاری آداب گفتگو کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خالص اپنے لہجے میں بات شروع کی "جناب آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ آپ میری نظم کو قابل اشاعت کیوں نہیں سمجھتے۔ آپ حسن عسکری کو ماہ نو کی ادارت کے لئے لاہور سے لے کر آئے ہیں۔ حسن عسکری کی ادارت سے اب ماہ نو صرف ایک سرکاری پرچہ نہیں رہا ہے اب وہ ایک ادبی رسالہ بن گیا ہے اور ادبی رسالے میں آپ کو اشاعت کے معیار بھی ادبی ہی رکھنے ہوں گے" عزیز احمد نے ناگواری سے پوچھا "آپ کی نظم کا موضوع کیا ہے؟" موقعہ غنیمت جانتے ہوئے عالی نے انتقام لینے کے لئے اپنی نظم "انسان" کے موضوع اور اس کے انداز پر ایک تقریر شروع کر دی' اور حسن عسکری کی رائے سے بھی انہیں مطلع کر دیا۔ جب عالی بہت کچھ بول چکے تو عزیز احمد نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کیا اور کہا آپ اس نظم کے بارے میں میری رائے سننا چاہتے ہیں۔

جی ہاں' عالی نے جواب دیا۔ عزیز احمد نے ایک قطعیت کے ساتھ بات کو ختم کرنے کے لئے اردو کو ترک کر کے بڑے فیصلہ کن انداز میں انگریزی میں کہا :

I think it is a clumsy adaptation of Romeo and Juliet

عالی تو معرکے کے لئے تیار ہو کے گئے تھے انہوں نے فوراً کہا۔

This is what i wanted to hear from you .Your insight, your ankle deep insight into literature is fully exposed

میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یا تو میری نظم آپ کی سمجھ میں نہیں آئی یا آپ نے Romeo and Juliet کو پڑھا نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ اگر آپ حکومت پاکستان کے ایک افسر ہونے کی حیثیت سے ایک فن پارے کو ماہ نو میں شائع ہونے سے روک سکتے ہیں تو میں بھی ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنی نظم کو ایک سرکاری جریدے میں شائع کرانے کا حق رکھتا ہوں خاص طور پر جب اس رسالے کا مدیر اسے شائع کرنا چاہتا ہے۔

"آپ سرکاری ملازم ہیں"۔

"جی ہاں"

"کیا کام کرتے ہیں آپ وہاں؟"

"وزارت تجارت میں اسسٹنٹ ہوں"۔

"آپ اسسٹنٹ ہیں اور آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایک افسر سے آپ کو کس طرح بات کرنی چاہیے۔ آپ جاسکتے ہیں۔ آئندہ آپ میرا وقت ضائع کرنے کی جسارت نہ کیجئے گا"۔

"جی ہاں! میں جا رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھئے گا کہ اب ہم ادب کے میدان ہی میں ملیں گے"۔

"We shall now meet only in the literary field for years and years and years together"

کوئی فیصلہ کن بات کہنے یا دھمکی دینے کے لئے انگریزی بہت موثر زبان ہے۔ عزیز احمد نے عالی کی نظم کو ٹھکانے لگانے کے لئے اور عالی نے انہیں اپنے ادبی مستقبل سے خوفزدہ کرنے کے لئے انگریزی کا سہارا لیا تھا اور یہ دھمکی دے کر عالی نے زور سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر نکل آئے اور سیدھے حسن عسکری کے کمرے میں پہنچے۔ اور وہاں جاکر جو منہ میں آیا کہنا شروع کر دیا۔ حسن عسکری نے اپنے دفتر میں اس معرکے کی روائیداد کو سننا مناسب نہیں سمجھا اور عالی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ساتھ لیا اور ایک ریستوران میں جاکر بڑی دلچسپی سے اس تصادم کی تمام تفصیلات سنیں اور ایک مہابھارت کے آغاز کی پیشن گوئی کر دی۔

ادھر عزیز احمد نے جنہیں کچھ ضروری فائل اوپر بھیجنا تھے' ایک دفتری بابو کی دھمکی کو غیر اہم سمجھ کر اور اپنی دانست میں عالی کے نظمیے "انسان" کا صحیح مقام متعین کرکے اور صاحب تصنیف کو دو ٹوک انداز میں اپنی رائے سے مطلع کرکے اس مقدمے کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا اس لئے اب ان کے ذہن میں اس لایعنی مسئلے کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا یہ یکطرفہ شکایت عالی کے دل و دماغ میں پروان چڑھتی رہی اور ان کے خون کو جو پہلے ہی گرم تھا اور دہکاتی رہی۔ یہ تھی صورتحال جب بیچارے شاہد احمد دہلوی کی شامتِ قسمت سے عزیز احمد جیسے باوقار ادیب سے بے گناہ عالی کا انتقام لینے کا کام مجھے تفویض ہوا۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ کچھ عرصے پہلے عزیز احمد کا افسانہ "درباری" شائع ہوا تھا جس میں ایک شائستہ سے آدمی کو بڑے سلیقے سے دربار داری کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر ماحول' ملازمت اور محکمے کے حوالوں سے افسانے کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ افسانہ نگار خود ایک درباری کا روپ دھار لے اور اس بے رحم عکاسی کی زد میں خود آجائے جو اس نے دوسروں کے لئے مخصوص کر رکھی تھی تو شاید عالی کے درد کا کچھ مداوا ہو جائے جب میں نے اپنی فطری کاہلی کی وجہ سے افسانہ لکھنے میں تاخیر کی تو عالی نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

تا تریاق	از عراق	آوردہ	شود
مار گزیدہ		مردہ	شود

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مار گزیدہ کے لئے زہر خود ایک تریاق تھا جس سے اس کی قوت بیانیہ میں ایک عجیب توانائی آگئی

تھی اور اس کی ہنگامہ آرائی کی صلاحیتوں کا اپنے پرائے سب لوہا ماننے لگے تھے۔ اس حقیقت کا مار گزیدہ نے اس تصادم کے کچھ عرصے بعد اپنے ایک شعر میں بڑے بانکپن سے اعتراف بھی کیا ہے۔

جب بھی بزم عالم میں فتنہ کوئی اٹھتا ہے
یا تمہاری محفل سے یا غریب خانے سے

جب جمیل الدین عالی کے تقاضوں پر افسانہ لکھ لیا گیا تو میں نے ان کے حوالے کر کے یہ تاکید کی کہ اسے میرے نام سے شائع نہ کیا جائے کیونکہ عزیز احمد نے آخر میرا کیا بگاڑا ہے جو میں بیکار ان سے لڑائی مول لوں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس حادثے میں ملوث دو بنیادی کردار یعنی عزیز احمد اور عالی اور دو قریبی تماشائی یعنی حسن عسکری اور عدنی سب کے نام میں حرف 'عین' مشترک' تھا لہٰذا میرا مشورہ یہ تھا کہ مصنف کے نام کا اشارہ صرف "عین" سے ہونا چاہئے تاکہ معتوب کو یہ پتہ چل سکے کہ یہ ضرب کس طرف سے آئی ہے اور جوابی حملے کے لئے کسی ہدف کا تعین نہ کر سکے۔ اس چھوٹی سی احتیاط نے اس واقعے کو عجب ڈرامائی رنگ دے دیا۔

جمیل الدین عالی 'ایک اور درباری' کو لے کر سیدھے حسن عسکری کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اس جوابی افسانے کو بہت مزے لے کر پڑھا اور "عین" کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی مرحوم کے حوالے کر دیا کہ "ساقی" کے آئندہ شمارے میں اسے ضرور شائع کر دیں۔ ساقی میں افسانے کا شائع ہونا تھا کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اور خاص طور پر کراچی میں ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عزیز احمد جیسے لکھنے والے پر کسی نے ان ہی کے مخصوص انداز میں ایک شدید حملہ کرنے کی جسارت کی تھی اور یہ حملہ صرف ایک ادیب پر ہی نہیں تھا' ایک ایسے موقر دانشور پر بھی تھا جسے حکومت پاکستان نے شعبۂ اشاعت میں نہایت اہم ذمے داریاں سونپی ہوئی تھیں۔ اس زمانے کا کراچی آج کے کراچی سے بہت مختلف تھا۔ اس وقت نہ بڑے تجارتی مرکز تھے' نہ دولت کی ریل پیل تھی' نہ تجارتی زندگی سے پیدا ہونے والی قدریں تھیں' لوگ اپنے ادیبوں اور رسالوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ "ساقی" جیسے رسالے کا عزیز احمد جیسے لکھنے والے کے مقابلے میں صف آراء ہو جانا معمولی بات نہیں تھی اس واقعے کا ایسا چرچہ ہوا کہ جمیل الدین عالی کے سارے گلے شکوے جاتے رہے اب وہ آرام سے بیٹھ کر عزیز احمد کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ عزیز احمد کے سامنے دو مسئلے تھے ایک طرف تو "ساقی" کو اس جسارت کی سزا دینا تھی اور دوسرے اس پراسرار دشمن کا تعین کرنا تھا جس نے "عین" کی ڈھال کے پیچھے سے ان پر وار کیا تھا۔

شاہد احمد دہلوی جب ہندوستان سے کراچی آئے تو عزیز احمد کو کچھ دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ ان کے وسیع تجربے سے فائدہ اٹھا کے انہیں "ماہ نو" جاری کرنے کے منصوبے میں شامل کیا جائے لیکن انہوں نے اس تجویز کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ "ساقی" اور اس کے مدیر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لہٰذا "ساقی" کی یہ جسارت انہیں بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ "ساقی" کو سرکاری اشتہارات دینے پر پابندی لگا دی۔ دوسرے شاہد احمد دہلوی پر ریڈیو پاکستان کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ شاہد صاحب کو کلاسیکی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ مختلف راگ راگنیاں ایس۔ احمد کے نام سے ریڈیو سے

پاکستان سے نشر کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ پروگرام بھی ختم ہو گیا۔ اس طرح شاہد احمد دہلوی اور "ساقی" دونوں پر ایک کاری مالی ضرب لگائی گئی۔ "ساقی" سے نمٹنا آسان تھا لیکن جس دشمن کا تعین نہ ہو سکے اس پر وار کرنا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں عزیز احمد جس کرب سے گزرے اس کی تفصیلات ان کے کچھ مشیروں کے ذریعے جمیل الدین عالی تک پہنچتی رہیں۔ پہلے تو ان کا خیال عالی ہی کی طرف گیا لیکن یہ سوچ کر کہ عالی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں وہ ان کے رنگ میں افسانہ کہاں لکھیں گے انہوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ پھر انہیں حسن عسکری کا خیال آیا' لیکن حسن عسکری تنقید کے آدمی تھے افسانوں میں ان کا انداز بہت مختلف تھا اور پھر وہ جس سے لڑتے تھے ڈنکے کی چوٹ اس پر حملہ کرتے تھے وہ اس قسم کی چیز نہیں لکھ سکتے پھر انہوں نے سوچا کہ کہیں عینی (قرۃ العین حیدر) نے تو ان پہ وار نہیں کیا لیکن عینی کو ان سے کیا شکایت ہو سکتی تھی جو ان پر ایسا سخت افسانہ لکھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ تینوں ان کے خلاف ایک سازش میں شریک ہوں۔ عالی کی تحریک پر عینی نے افسانہ لکھا ہو اور تلخی کا زہر اس میں عسکری نے شامل کیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اس "عین" سے مقابلہ بہت سخت ہو گا۔

اس معمے کو نہ سلجھا سکنے اور متعدد حریفوں کو اپنے خلاف صف آراء سمجھنے سے عزیز احمد کو جو ذہنی اذیت ہوئی اس کی قیمت بیچارے شاہد صاحب کو ادا کرنی پڑتی۔ وہ کم از کم ایک معلوم دشمن تھے چنانچہ ان کے خلاف انتقامی مہم تیز کر دی گئی۔ ان کو طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں لیکن شاہد صاحب دھمکیوں سے مرعوب ہونے والے آدمی نہیں تھے انہوں نے حسن عسکری کے ذریعے عالی سے فرمائش کی کہ "عین" سے ایک اور افسانہ لکھواؤ' عالی نے بہت محظوظ ہو کر یہ پیغام مجھ تک پہنچایا۔ میں نے کہا کہ رومیو اور جولیٹ کا قرض تو ادا ہو چکا۔ اب کسی اور افسانے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے کہا کہ اب تو معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ اب شاہد صاحب کی عزت اور ساقی کی ساکھ کا معاملہ ہے۔ چنانچہ ادب کی آبرو بچانے کی خاطر میں ایک پھر ایک افسانہ لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ عزیز احمد نے ایک افسانہ لکھا تھا "کٹھ پتلیاں" اس میں ایک جیتی جاگتی زندگی سے بھرپور مغربی ساحرہ کا ذکر تھا' ایک ایسی ساحرہ کا جس نے اپنی نسوانی کشش سے ہماری سیاست اور معاشرت دونوں میں اپنے لئے ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ میں نے عزیز احمد کے استعاروں' تلمیحوں اور اشاروں کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک مضحکہ خیز صورت حال میں ریاست حیدر آباد کے چار سپوتوں پر اس کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان تحریر کر کے عالی کے سپرد کر دی جو حسن عسکری کے ذریعے شاہد صاحب تک پہنچی اور ساقی میں کچھ اور کٹھ پتلیاں" کے عنوان سے شائع ہو گئی۔

معلوم نہیں ساقی میں اس افسانے کے شائع ہونے کا کیا رد عمل ہوا اس لئے کہ میں سن ۱۹۵۰ء میں مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر سی ایس پی میں لے لیا گیا تھا اور ان دنوں لاہور میں سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت تھا۔ عالی بھی اسی سال انکم ٹیکس سروس میں آ گئے تھے۔ ایک نئی زندگی کے آغاز اور اس کے اپنے تقاضوں کی وجہ سے ادب سے ہماری وابستگی کچھ واجبی سی رہ گئی تھی۔ عالی نے انکم ٹیکس سروس میں آتے ہی کراچی کی معاشرتی زندگی میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ آواز کا جادو تو وہ پہلے ہی جگاتے تھے۔ اب بال روم ڈانسنگ میں بھی انہوں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے غزلوں سے ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی تھی۔ اب وہ جس طرح کے دوہے کہہ رہے تھے انہوں نے اس شراب کو دو آتشہ کر دیا تھا اور وہ جوانی کے نشے

میں ڈوب کر اس طرح بھرپور زندگی گزار رہے تھے کہ ان کی شریک حیات کی اجازت سے یا شاید ان کے اشارے پر ان کے خاندان کی لڑکیاں بالیاں ان کے گھر میں جمع ہو کر ڈھولک پر اس طرح کے گیت گاتی تھیں۔

مہندی سے لکھ دو ری ہاتھوں پہ سکھیو' میرے سنوریا کا نام

عالی جو کنھیا کے روپ میں ہر شعر سمجھنے والی' شعر کہنے والی' ترنم سے پڑھنے والی' ڈانس کرنے والی' ان کے دوہوں پر تال دینے والی لڑکی کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے اس طرح کے دوہے کہنے میں مگن تھے۔

**کوئی پتنگ پر نام لکھا کر خوشبوؤں سے بسائے
کوئی پلو پر دوہے کاڑھے اور سب کو دکھلائے
ہر اک ناریہ پوچھے اس سے کون تھی پہلی نار
عالی کس کس سے کیا کہوے پریم بنا بیوپار

زندگی کی ان رنگینیوں نے ایک نطفیے کے شائع نہ ہونے سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو بے معنی سا بنا دیا تھا اب اس یکطرفہ مسئلے کی مار صرف عزیز احمد بیچارے پر پڑ رہی تھی اور ان کی کشمکش کی گھڑیاں سوز و ساز رومی سے زیادہ پیچ و تاب رازی کی نذر ہو رہی تھیں۔

عزیز احمد "عین" کے معمے کو سلجھانے میں جس اذیت سے گزر رہے تھے اس پر شاید قدرت کو رحم آگیا ایک روز وہ' ان کی بیگم اور میری بہن اور بہنوئی کچھ اور دوستوں کے ساتھ کسی صاحب کے ہاں مدعو تھے کھانے کے بعد جب گفتگو کے دوران عزیز احمد کو یہ معلوم ہوا کہ میری بہن شگفتہ کے خاندان سے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آپ کے عزیزوں میں تو ضرور کسی نہ کسی کو ادب سے ذوق ہو گا میری بہن نے کہا کہ ہاں میرے چھوٹے بھائی کو ادب سے کچھ لگاؤ ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ یہ ذوق صرف پڑھنے کی حد تک ہے یا وہ کچھ لکھتے بھی ہیں۔ میری بہن نے بتایا کہ کبھی کبھی کچھ لکھتے بھی ہیں۔ جب انہوں نے یہ پوچھا کہ کیا انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے تو جواب ملا کہ نہیں کتاب تو کوئی نہیں لکھی ہے' البتہ حال ہی میں آپ کے بارے میں انکے سارے گمان بے بنیاد ثابت ہوئے میرا نام معلوم ہوتے ہی "عین" کا عقدہ بھی کھل گیا کبھی کبھی انہیں خیال ہوتا تھا کہ شاید عین" کا حرف صرف انہیں گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہو گا لیکن اب تو سب بات صاف ہو گئی تھی انہوں نے بڑے اشتیاق سے میرے بارے میں سب تفصیلات حاصل کر لیں۔ میری بہن نے بدقسمتی سے وہ افسانے نہیں پڑھے تھے لہذا بہت سادگی سے انہوں نے عزیز احمد کے ہر سوال کا جواب دیا۔

چند روز بعد مجھے لاہور میں ان کا خط ملا جس کا آغاز عالی کے حافظے کے مطابق اس فقرے سے ہوتا تھا "پکڑے گئے" مجھے یہ فقرہ یاد نہیں۔ میں ایسا لاابالی ہوں کہ کسی خط کو محفوظ نہیں رکھتا۔ مجھے افسوس ہے کہ عزیز احمد کے دو خط جو چند ہفتوں کے درمیان مجھے موصول ہوئے میں نے محفوظ نہ رکھے۔ انہوں نے مختصراً یہ لکھ کر کہ کس طرح ان پر یہ راز کھلا مجھ سے سوال کیا تھا کہ آخر انہوں نے مجھے کیا تکلیف پہنچائی تھی جو میں نے اس قسم کی تحریروں سے انہیں نوازا۔ پھر مجھے یہ جتایا تھا کہ اگر ان افسانوں کے مطابق وہ مایا کی چھایا میں زندگی گزار رہے ہیں تو سرکاری ملازمت اختیار کر کے میں نے بھی تو مایا کا

جال قبول کرلیا ہے اور آخر میں یہ دھمکی دی تھی کہ جو لوگ شیشوں کے گھروں میں رہتے ہیں انہیں دوسروں کے مکانوں پر پتھر پھینکنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

اپنا جواب مجھے قدرے تفصیل سے یاد ہے جو میں نے اس خیال سے لکھا تھا کہ اس تکلیف کا کچھ مداوا ہو جائے جو میری تحریروں سے انہیں پہنچی تھی۔ میں نے کچھ اس طرح کی بات لکھی تھی کہ میں نہ آپ سے ذاتی طور پر واقف ہوں نہ مجھے آپ سے کسی قسم کا کوئی بیر ہے۔ جو کچھ ہوا اسے آپ من جانب اللہ سمجھئے' ممکن ہے قدرت کو یہ منظور ہو کہ آپ کی تحریروں سے دوسروں پر جو گزرتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ کو بھی ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ بات ان کے دل کو لگی کیونکہ ان کے دوسرے خط کا لہجہ بہت مختلف تھا آگے چل کر ان کے انداز تحریر کی تعریف کر کے میں نے یہ لکھا تھا کہ آپ سے ایک شکایت مجھے ضرور ہے وہ یہ کہ حیدر آباد کے سقوط کے بعد وہاں کے اداروں' شخصیتوں اور محفلوں کا ذکر اس بے رحمی سے کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا' حیدر آباد کا ریاستی نظام اور وہاں کا معاشرہ دتی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد برصغیر میں مسلمانوں کے بااقتدار طبقے کے زوال اور انحطاط کا آخری مظہر تھا۔ حد یہ ہے کہ قاسم رضوی جیسا آدمی جو صرف اپنے زور خطابت اور رضاکاروں کے جذبے کے بل پر بغیر کسی مادی وسائل کے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کا اعلان کر رہا تھا مسلمانوں کے زوال اور نااہلی کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ آپ جیسے ادیب کو تو اس عظیم المیئے کو اس کے تاریخی تناظر میں دیکھنا چاہئے اور اس کی عکاسی اس ہمدردی کے ساتھ کرنا چاہئے جو ایک صاحب احساس ادیب کے شایان شان ہو۔

یہ خط لکھنے کے بعد مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ میں نے دیانتداری سے عزیز احمد کو ان کے فن کے بارے میں اپنی رائے لکھ دی ہے البتہ ایک خلش یہ رہ گئی کہ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ اس پردہ زنگاری کے پیچھے کون کار فرما تھا۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ ان کے اور حالی کے درمیان کوئی نیا فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔

عزیز احمد کو خط لکھنے کے بعد کراچی سے لاہور آنے والے عزیزوں اور دوستوں نے یہ بتایا کہ میری بہن اس بات سے بہت پریشان ہیں کہ ان کی ناواقفیت کے سبب حالی کا اور میرا ایک ادبی راز افشا ہو گیا جس کے خاصے سنگین نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جاننے والوں کے ذریعے میری بہن کو اس قسم کی خبریں مل رہی تھیں کہ عزیز احمد اپنے ایک نئے معرکتہ الآرا ناول کے لئے مواد اکٹھا کرنے میں مصروف ہیں جس کا نام انہوں نے "بنی اسماعیل" تجویز کیا ہے (ہمارے والد نواب اسماعیل خان کی نسبت سے) میں نے اپنی بہن کو دلاسہ دینے کے لئے شیفتہ کا مشہور مصرعہ لکھ بھیجا۔

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

اور یہ بھی انہیں سمجھایا کہ بنی اسرائیل کے مقابلے بنی اسماعیل کی حیثیت سے متعارف ہونے میں ایک تکریم کا پہلو نکلتا ہے بہرحال ان باتوں سے میری بہن کی تسلی نہ ہوئی۔

چند دن بعد مجھے عزیز احمد مرحوم کا ایک اتنا اچھا خط ملا کہ پہلی دفعہ مجھے ان کی کشادہ قلبی کا اندازہ ہوا۔ اس خط میں کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ لہجے میں تلخی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نے حیدر آباد کے معاشرے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ان افسانوں کی ایک

عجیب وغریب تعریف بھی کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں میرے انداز کو اس طرح اپنایا ہے کہ ان کو پڑھتے ہوئے مجھے بعض وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ سب میں نے ہی تو نہیں لکھا ہے۔ آخر میں انہوں نے یہ اصرار کیا تھا کہ جب آپ کراچی آئیں تو مجھ سے ضرور ملئے گا۔ یہ خط پڑھ کر میں بہت خوش ہوا جواب میں میں نے ان کی کشادہ دلی کی داد دے کر یہ وعدہ کرلیا کہ کراچی آکر آپ سے ضرور ملوں گا۔

لاہور میں جب ہماری تربیت ختم ہوگئی تو ڈھاکہ جاتے ہوئے میں کراچی میں اپنے بھائی مدنی صاحب کے ہاں چند دن ٹھہرا۔ آتے ہی میں جمیل الدین عالی سے ملا انہوں نے چھوٹتے ہی ساقی کے لئے ایک اور افسانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا اب یہ ممکن نہیں رہا اور عزیز احمد سے اپنی خط وکتابت کا پورا پس منظر بتایا۔ بلکہ الٹی ان سے یہ فرمائش کی کہ وہ بھی عزیز احمد سے ملنے کے لئے میرے ساتھ چلیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے دفتر میں تو میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ گھر چلنا ہو تو چلئے۔ چنانچہ دوسرے دن مغرب کے بعد ہم عزیز احمد کے گھر پہنچے۔ اس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر بجلی کی گھنٹیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ہم نے گھر کے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ عزیز احمد نے دروازہ کھول کر پوچھا کون ہے' جمیل الدین عالی نے بڑے فاتحانہ انداز میں ہم دونوں کی آمد کا اعلان کیا۔ انہوں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کہا۔ زہے نصیب' اس زہے نصیب کا رخ عالی کی طرف تھا۔ مجھے تھوڑی ہی دیر میں یہ اندازہ ہوگیا کہ انہیں معلوم تھا کہ پردہ زنگاری کے پیچھے کون کار فرما تھا۔ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرکے انہوں نے عالی سے کہا کہ "ہم سے بھی زیادتی ہوئی' اس کے جواب میں آپ نے بھی زیادتی کی۔ اب تو آپ کے خفگی دور ہو گئی ہوگی" عالی نے اپنی خفگی کے دور ہونے کا کوئی واضح اعلان نہیں کیا۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ اس طرح کی گفتگو سے فضا کچھ بوجھل سی ہورہی ہے تو میں نے کہا "عزیز احمد صاحب' عالی آج کل غضب کے دوہے کہہ رہے ہیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو ان سے کچھ دوہے سنیں" انہوں نے کہا "جی ہاں۔ اب تو ان کی بڑی شہرت ہوگئی ہے" تھوڑے سے اصرار کے بعد عالی بے چارے عزیز احمد کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے تیار ہوگئے اور انہوں نے ایسی گرجدار آواز میں لہک لہک کر اپنے دوہے سنائے کہ راہ چلتے ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے اور بچیاں حیران ہو کر گھر کے شیشوں سے جھانکنے لگیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اس ملاقات کو طول دینے میں خیر سے زیادہ خطرے کا امکان ہے۔ کہیں عالی کے نطفیے کا قصہ نہ زیر بحث آجائے' چنانچہ کچھ دیر رسمی سی گفتگو کے بعد ہم نے اجازت لی۔ ہمارے روانہ ہونے سے پہلے عزیز احمد نے پوچھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ مدنی بھائی کا پتہ بتا کہ ہم لوگ رخصت ہوئے۔

جمیل الدین عالی اپنی کامیابی پر ایسے خوش تھے جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کرکے لوٹے ہوں۔ جس شخص کے دفتر میں ان کے لئے کرسی نہیں تھی آج وہ اس کے گھر میں ایک موقر مہمان کی طرح براجمان ہوئے تھے۔ جس ناقد کی نظر میں ان کی نظم رومیو اور جیولٹ کا ایک بے ڈھنگا چربہ تھی' آج وہ ایک گربہ مسکین کی طرح بیٹھا کہ ان کے دوہوں کی داد دینے پر مجبور تھا۔ عالی خوش تھے لیکن میں یہ سوچ کر کچھ افسردہ تھا کہ اس بیچارے پر ایک اور ستم ٹوٹا۔

دوسرے دن اپنے دفتر جانے سے پہلے عزیز احمد مجھ سے ملنے کے لئے مدنی بھائی کے ہاں آگئے۔ وہ اس وقت ایک بالکل ہی مختلف شخص نظر آرہے تھے۔ عالی کی موجودگی میں جو انہوں نے ایک دفاعی انداز اختیار کرلیا تھا وہ یکسر غائب تھا وہ ایک کھلے دل

سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی شگفتگی تھی آواز میں گرمی اور انداز میں اخلاص تھا۔ وہ بڑے انہماک سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس بات میں وہ مجھ سے متفق ہیں کہ حیدر آباد کے سقوط' وہاں کے معاشرت اور وہاں کی بے اساس سیاسی منصوبہ بندی کو برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے فلسفہ تاریخ پر لکھنے والے تمام اہم مصنفوں کا گہرا مطالعہ شروع کردیا ہے اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ کہا کہ اب جب کہ ایک اتفاق نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کردیا ہے تو ہم دونوں کو مل کر حیدر آباد کی زندگی پر ایک تاریخی نوعیت کا بھرپور ناول لکھنا چاہئے۔ ان کی اس پیشکش پر میں حیران رہ گیا ان کے جیسے مانے ہوئے لکھنے والے کا مجھ جیسے مبتدی کے اشتراک سے ایک تاریخی ناول لکھنا مجھے بہت عجیب سا خیال معلوم ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا جواب دوں اس لئے کہ تاریخی تناظر میں حیدر آباد کے سقوط پر لکھنے کی تجویز تو میں نے ہی دی تھی۔ میں نے اس فراخدلانہ پیشکش پر ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور یہ معذرت پیش کی کہ مجھے تو تربیت کے سلسلے میں چھ مہینے کے لئے مشرقی پاکستان جانا ہے اور وہاں سے مزید تربیت کے لئے کسی مغربی ملک جانا ہوگا۔ اگر وہاں سے واپسی پر میرا تقرر صوبہ سندھ میں ہوگیا تو میں ان سے ضرور ہر قسم کا تعاون کروں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس بات کا بڑا معترف ہوں کہ انہوں نے میری رائے کو در خور اعتنا سمجھا اور مجھے ایک بہت بڑی پیشکش سے نوازا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے 'ادب' تاریخ اور فلسفے پر بہت کھل کر گفتگو کر کے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے رخصت ہوئے۔ میں حیران تھا کہ عالی کا یہ مخالف جس سے دشمنی کرنے میں' میں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کیسے میرا اتنا اچھا دوست بن گیا۔

عزیز احمد سے میری تو دوستی ہو گئی لیکن ان کے اور شاہد صاحب کے تعلقات میں کشیدگی اسی طرح برقرار رہی۔ جب جمیل الدین عالی نے میری طرف سے مزید افسانے لکھنے کے سلسلے میں قطعی طور پر معذرت کردی تو افسانوی یلغار کو جاری رکھنے کے لئے انہوں نے انور عنایت اللہ کا انتخاب کرلیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کے نام کا بھی ایک حصہ "عین" سے ہی شروع ہوتا ہے اگر خدانخواستہ شاہد صاحب نے عنایت اللہ کی رعایت سے یہ سلسلہ "عین" ہی کے نام سے جاری رکھا ہوتا تو میری لئے عزیز احمد کی غلط فہمی دور کرنا بہت مشکل ہوجاتا لیکن شاہد صاحب بڑے شریف' اور وضعدار آدمی تھے۔ انہوں نے انور عنایت اللہ کے افسانوں کو غین کے نام سے شائع کیا۔

شاہد احمد صاحب کو میدان کارزار میں چھوڑ کر الگ ہوجانا مجھے گراں گزرا۔ لیکن جب "غین" کی تحریروں سے انہوں نے ایک نیا مورچہ بنالیا تو میں نے محاذ جنگ سے اپنی واپسی کے کفارے کے طور پر مشرقی پاکستان سے ایک روایتی کہانی افسانوی روپ میں لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجی جو سفر وسیلہ ظفر کے عنوان سے سن ۱۹۵۲ء میں ساقی میں شائع ہوئی۔

ان افسانوں کی اشاعت کی بات جب عالی سے ہوئی تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں پس منظر میں یہ ضرور لکھ دوں کہ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا' ہم دونوں نوعمری کی لاابالی سی زندگی گزار رہے تھے باقاعدہ ملازمت کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔ غیر ذمے دارانہ حرکتیں کر گزرتے تھے (یہ کمزوری تو شاید ہم دونوں میں اب تک باقی ہے) اپنے جوش جہاد میں ہر ایک سے بھڑ جاتے تھے۔ ایک غیر ذمہ دارانہ ہنگامہ آرائی میں ہم عزیز احمد جیسے لکھنے والے کا احترام برقرار نہ رکھ سکے۔ اور اس کا ہمیں

افسوس ہے مجھے تو پہلے ہی سے افسوس تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اب عالی بھی اس میں شریک ہو گئے ہیں ایک اور بات جو انہوں نے زور دے کر کہی وہ یہ تھی کہ گو وہ پچیس سال سے مسلسل نثر لکھ رہے ہیں مگر انہوں نے کبھی بھی عزیز احمد کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ چلئے یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری ہزار سالہ جنگ کی طرح کارزار ادب میں برسوں چلنے والا وہ معرکہ جس کی دھمکی عالی نے عزیز احمد کو ان کے دفتر میں دی تھی بخیر و خوبی بہت جلد طے ہو گیا۔

میرے ایک دوست کو جب یہ معلوم ہوا کہ عزیز احمد کے افسانوں پر لکھے جانے والے افسانے کتابی شکل میں چھپ رہے ہیں تو انہوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ ان کے اصل محرک عالی تھے' تو وہ ان کے نام معنون ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا کہ عالی جیسے شکار کو صرف دو افسانوں پر کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ ان افسانوں کا انتساب تو ایک معذرت اور ہدیے کی صورت میں شاہد احمد صاحب کے نام کیا جا رہا ہے کیونکہ انہوں نے ان افسانوں کو شائع کر کے بڑی تکلیف اٹھائی تھی۔ رہے جمیل الدین عالی تو وہ میرے عزیز دوست ہونے کے علاوہ میرا محبوب موضوع بھی ہیں ان پر تو ممکن ہے میں کوئی کتاب ہی لکھوں' یا کم از کم کوئی ایسی کتاب ان کے نام معنون کروں جس میں ان کی نظم یا نثر پر Parody شامل ہو۔ میں نے جب انہیں یہ بتایا کہ عالی کے بارہ دوہوں پر میں نے اس طرح کے دوہے کہہ لئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اسی کتاب میں ایک حصہ نظم کا اضافہ کر کے انہیں بھی شائع کر دو۔ میں نے سوچا واقعی عمر کا کیا بھروسہ معلوم نہیں کسی اور کتاب کے شائع کرنے کی نوبت آئے یا نہ آئے اور اگر زندگی نے موقع دیا بھی تو نہ جانے کاہلی اس راہ میں کیا کیا مشکلیں ڈالے۔ لہذا مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر عالی کے دو دوہوں پر پیروڈی کے طور پر کہے ہوئے دو دوہے شامل کر رہا ہوں تاکہ عزیز احمد مرحوم کی روح سے یہ تو کہہ سکوں کہ جس ظالم نے مجھے آپ کی خلاف لکھنے پر اکسایا تھا اس سے میں نے آپ کی طرف سے ایک معمولی سا انتقام تو لے لیا ہے۔

عالی کا دوہا

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تیوہار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

"ایک اور درباری" کی طرز پر "ایک اور دوہا"

ایسی چپّا ٹوٹی اب کے ہولی کے تیوہار
عالی جیسے مہارشی سے بچی نہ کوئی نار

عالی کا دوہا

عالی ڈوبا ڈوبتا (؟) تھا رکھے بوجھ ہزار
ایک ذرا سی کشتی کتنے بوجھ اٹھاتی یار

ایک اور دوہا

عالی ڈوبے ڈوب ہی جا رکھے بوجھ ہزار
اک کاندھے پر بیوی بچے دوجے نار پہ نار

جمالی جی کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پیروڈی کے قدردان ہیں چاہے وہ ان کے اپنے کلام ہی کی کیوں نہ ہو "توبہ! توبہ! توبہ!" کہتے ہوئے احتجاج کرتے ہیں لیکن ایک زیرِ لب تبسم سے داد بھی دیتے جاتے ہیں۔
عالی نے ایک نظم لکھی۔ حسن عسکری نے اسے اشاعت کے لئے حاصل کیا عزیز احمد نے اسے رد کیا' میں نے عالی کی طرف سے جواباً کچھ لکھا' شاہد احمد دہلوی نے اسے شائع کیا' ان پانچ کرداروں میں سے صرف ہم دو خطاکار باقی رہ گئے ہیں۔
عزیز احمد نے فلسفہ تاریخ کو اپنی فکر اور فن دونوں میں سمو کر برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ بھی لیا اور تاریخی کرداروں سے ڈھلے ہوئے فن پارے بھی تخلیق کئے۔ حسن عسکری نے دنیائے ادب میں اپنی انا کے جھنڈے گاڑ دیئے اور جب آب و گل کے ہنگاموں میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہ رہی تو انہوں نے اپنے لئے ایک بہت خاص منزل کا انتخاب کرلیا اور پھر اس کی لگن میں دبے پاؤں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ شاہد احمد دہلوی نے ادب کی خاموش اور بے لوث خدمت میں ایک عمر گزاری' مخالفتوں کے طوفان میں' ناساعد حالات میں وہ ایک عجیب بے غرضی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ ان تینوں نے ہمارے ادب میں اپنے بڑے منفرد نقوش چھوڑے ہیں۔ میں حافظ کے ایک شعر پر اس پس منظر کو ختم کرتا ہوں جو انہوں نے اپنے چند عزیز دوستوں کے اٹھ جانے پر کہا تھا۔

نذیرِ خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند
خدائے عزوجل جملہ را بیامرزاد

از "محشر خیال"
مصنف افتخار احمد عدنی۔ مطبوعہ
پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی
لاہور۔ کراچی

☆۔ پس نوشت۔ عالی نے سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔
☆☆۔ مگر یہ دوہے بعد کی تخلیق ہیں۔
☆☆☆۔ اب انہیں یہ نثر لکھتے پینتیس سال ہوئے۔ ابتک عزیز احمد مرحوم کے خلاف اشارتاً" بھی کچھ نہیں لکھا۔ وہ کہتے ہیں غم و غصہ اس وقت کی سچائی تھا۔ ناشرین

شہزاد احمد

عالی جی کا نیا مجموعہ کلام

ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ ہم باوجود کوشش کے نہ ہی اس کی تیز رفتاری کا اندازہ کر پاتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں ہم ایک ایسے کھولتے ہوئے کنویں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی سطح پر ہمارے پاؤں ٹکتے ہی نہیں اوپر آنے کے لئے دیواریں بالکل سیدھی ہیں کہیں کہیں کوئی اینٹ باہر کی طرف ابھری ہوئی ہے اور کہیں کہیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی ہے' بس یہی وہ سہارے ہیں جن پر مضبوط گرفت ڈال کر ہمیں قدم بہ قدم اور شاید چیونٹی کی رفتار سے اوپر آنا ہے ہم بار بار گرتے ہیں سنبھلنے کی گنجائش بہت کم ہے نہ ہونے کے برابر مگر کوشش بہر حال کر رہے ہیں کہ اس تگ و دو کو کسی نہ کسی حد تک جاری رکھ سکیں ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کھولتے ہوئے کنوئیں سے باہر آ کر جو منظر ہم دیکھیں گے وہ کیا ہوگا' ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو محض تاریکی ہو زمین آسمان نیلے رنگ کا نظر آتا ہے مگر جب زمین کی فضا سے باہر نکل کر جائیں تو ہماری ساری تصویر بلیک اینڈ وائٹ ہو جاتی ہے یعنی ہم کلر ٹیلیویژن کی دنیا سے باہر نکل کر اس ٹیلویژن کی دنیا میں چلے جاتے ہیں جب یہ نیا نیا ایجاد ہوا تھا یہ ضروری نہیں ہے کہ جو سفر ہم کریں وہ مستقبل کی طرف ہی ہو اس سفر کا رخ ماضی کی طرف بھی ہو سکتا ہے ممکن ہے ہم پتھر کے زمانے کی طرف جا رہے ہوں اور پھر ایک اوقت ایسا بھی آئے کہ جب ہم اس زمین کو جہاں ہم رہتے پہچان ہی نہ سکیں ہر طرف ڈائنا سورز کی بادشاہت ہو اور انسان کہیں ہو بھی تو کسی غار میں چھپا ہوا بیٹھا ہو اور کبھی کبھی شکار کے لئے نکلتا ہو تاکہ وہ روح اور جسم کے رشتے کو کسی طرح قائم رکھ سکے۔

اگر ہم اس سے بھی آگے سفر کریں تو پھر ایسے مناظر دیکھنے کو ملیں گے جن کا ابھی ہمیں اندازہ نہیں ہے یہاں روشنی بھی بہت کم ہے اور دھواں اور دھند بھی موجود ہیں یوں سمجھیے کہ ہمیں اسی دھوئیں اور دھند میں کان سے گرتی ہوئی بالی تلاش کرنی ہے ممکن ہے اس بالی میں لگا ہوا موتی چمک اٹھے اور ہماری مشکل آسان ہو جائے مجھے لگتا ہے کہ عالی صاحب کی کتاب "اے مرے دشت سخن" کچھ اسی طرح کے مناظر کو پیش کرتی ہے یہ وہ حقائق ہیں جن سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں بلکہ یہ کتنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ممکن ہے ہم کبھی ان حقائق کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کی بھی کوشش کریں اگرچہ فی الحال اس کا امکان انتہائی کم ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں دس بار بھی اس کتاب کو پڑھ لوں تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی بھی پہلو میری آنکھ سے اوجھل نہ رہے اور پھر یہ بھی کہاں ممکن ہے کہ میں اس مضمون کو آج ہی مکمل کر لوں اس مضمون کو لکھنے میں جو دن لگیں گے ان میں بھی تو یہ مضمون مجھ پر کچھ نہ کچھ واضح ہوتا رہے گا' اور علم کے سلسلے میں جلدی کا قائل نہیں ہوں جن لوگوں نے

جلدی کی وہ تحویلیت (Reductionism) کا شکار ہوئے اور ان لوگوں میں دو بہت اہم نام بھی شامل ہیں یعنی آئن سٹائن اور اوپن ہائیمر۔ خود آئن سٹائن نے عمومی نظریہ اضافیت (Theory of Genera Relativitv) کی بنیاد پر حاصل ہونے والے نتائج سے انکار کیا آئن سٹائن کا یہ نظریہ ،بجذب یا کشش ثقل (Gravity) کے بارے میں ہے' خود اس نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر کوئی ستارہ مردہ ہو جائے اور اپنے خود اندر گرنے لگے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیونکہ اس عمل کے باعث اس کے اندر موجود ستارے کی کجانیت (Density) بڑھتی چلی جائے گی۔ اس سوال کا جواب خود اس نظریے کے اندر موجود نہیں تھا؟ اوپن ہائیمر (Open Heimer) اور سنڈر (Synder) نے آئن سٹائن (Einstein) ہی کے نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے بلیک ہول (Black Hole) کو دریافت کر لیا مگر اپنے نظریے کی اس توسیع کو آئن سٹائن کیوں قبول نہ کر سکا؟ اس کا خیال تھا کہ اس نظریے میں کچھ خرابی ضرور ہے مگر وہ خرابی کیا ہے؟ یہ وہ اپنی زندگی کے آخری دو تین سالوں میں ڈھونڈ نہ پایا' اوپن ہائیمر اس امریکی پراجیکٹ کا سربراہ تھا جس میں ایٹم بم بنایا گیا۔ چنانچہ وہ نظریاتی اور عملی دونوں سطحوں پر کام کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ مگر چند برس کے بعد اس نے بھی بلیک ہول کی دریافت کو معمولی سمجھنا شروع کر دیا اس کا خیال تھا کہ اہم سائنس دان کو صرف ریاضی کے ایسی فارمولے دریافت کرنے چاہیں جن کی وساطت سے بڑے بڑے سوالوں کا جواب دیا جا سکتا ہے زندگی کے آخری کئی برس اس نے بھی ضائع کر دیئے اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ بلیک ہول کیا بلا ہے۔ میں یہ کہانی اس لئے سنا رہا ہوں کہ میرے خیال میں عالی صاحب کے موجودہ مجموعہ کلام کو سمجھنے کے لئے یہ کہانی مددگار ثابت ہو سکتی ہے اس سلسلے میں خاص طور پر میں ان کی نظم " تجی " کا حوالہ دوں گا۔ ابھی میں نے بلیک ہول کا ذکر کیا تھا' تاحال حتمی طور پر ثابت تو نہیں کیا جا سکتا کہ بلیک ہول واقعی موجود ہے مگر اس نظریے کی وجہ سے ہمیں بہت سے اکائی عوامل کو سمجھنے میں مدد ملی ہے عالی صاحب کہتے ہیں۔

سینگولے ریٹی' یکتائی سینگولے ریٹی
وہ اک نقطہ بے انداز کیت کا جس کا اسم ثانی
جسم جانی
کر دیا ثابت توانائی
وہ کیا شے تھی
وہ کیا تھی کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے
کیا کبھی واپس بھی آئے گی
جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہوگی

اس کے بعد عالی صاحب نے فٹ نوٹ میں Sigularity لکھا ہوا ہے بلیک ہول اور سینگولے ریٹی ایک معنی میں استعمال ہونے والی دو اصطلاحات ہیں بلیک ہول تو معلوم نہیں دریافت ہوگا یا نہیں ہوگا مگر سینگولیریٹی کا اصول دریافت ہو چکا ہے یہ کجانیت (Densisty) کی ایک ایسی حالت ہے جس میں کوئی بھی شے واپس لوٹائی نہیں جاتی۔ بلکہ کے حوالے سے آپ اسے شائی لاک سمجھ لیں۔ جو دنیا سے سبھی کچھ وصول تو کرتا ہے مگر لوٹاتا کچھ نہیں ہے صرف بھی کچھ نہیں کرتا حال ہی

میں سٹیفن ہاکنگ نے خود بلیک ہول کے اندر ایک وائٹ ہول کا مژدہ سنایا ہے جو وصول تو کچھ نہیں کرتا بس خارج ہی کرتا چلا جاتا ہے ایک ایسے بگڑے ہوئے رئیس کی طرح جو اتنی تیزی سے خرچ کرتا ہی کہ اپنے باپ دادا کی کمائی ہوئی ساری دولت صرف کر کے دیوالیہ ہو جاتا ہے مگر عالی صاحب کی نظم میں بلیک ہول کا جو حوالہ ہے وہ اس بلیک ہول کا ہے جو راہ جاتی کرنوں کو بھی پکڑ لیتا ہے۔

وہ کہتے ہیں یہ مردہ ثابت وسیار ہیں ایسے کشش آثار
جن کے سامنے سے روشنی گزرے تو وہ اس کو بھی اندر کھینچ لاتے ہیں

اس نظریے کے مطابق چونکہ گنجائیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے لہٰذا اس پر ان اصولوں کا اطلاق ہوتا ہی نہیں جو طبیعات (Physics) کے بنیادی اصول ہیں جس طرح نیوٹن کے دریافت کئے ہوئے طبیعی قوانین ایٹم اور جہان صغیر (Microcosm) کے اندر بیکار ہو جاتے ہیں اسی طرح جہان کبیر (Macrocosm) اور جہان صغیر دونوں کے قوانین بلیک ہول پر اطلاق نہیں پاسکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ ہی بلیک ہول میں زمان (Time) ہے اور نہ ہی مکان (Space) لہٰذا سائنس کا عام خیال یہ ہے کہ سارے کاسموس کا آغاز بھی اسی سینگولیریٹی سے ہوا تھا اور جو بڑا دھماکہ ہوا تھا Big Bang اس وقت صرف سینگولیریٹی ہی موجود تھی اور کائنات کا انجام بھی شاید یہ ہی ہوگا کہ سب ستارے اپنی توانائی ختم کرنے کے بعد سکڑ جائیں گے اور بلیک ہول کی شکل میں سینگولیریٹی ہی کی صورت اختیار کریں گے۔

اگر تم واقعی جل ہی رہے ہو تو پھر ان شعلوں کو بھی دیکھو
جو نسلوں بعد نسلوں میں جگر گاہ تجسس کو جلاتے ہیں
نہ جانے کیسے کیسے قاعدے اور کلیے صدیوں فروزاں
حکمرانانِ جہاں
کس بے بسی سے اور خوشی سے
نو معارف انکشاف و تجربہ کے ایک ہی جھٹکے سے گر کر
لمحہ بھر میں ٹوٹ جاتے ہیں

اور اب اس دور کی اس تیزی یلغار پر بھی کس قدر آزاد و خود مختار و خلوت کار افکار و مسائل ہیں کوئی بھی اب نہیں کہتا کہ دنیا بھر کی اس بزم حکیماں مثل افواج سلیمان پاس ان پر فتح کامل کے وسائل ہیں پرانی گتھیوں میں نئے نشانے اس زمانے کی وہ قانونوں سے مستثنیٰ ضوابط بے روابط کے مراحل ہیں جو گا ہے نظم سے آزاد گاہے اُسے میں شامل ہیں۔

مثلاً "انتشار
اور اس کے سب آثار"

اس سنگولیریٹی کے بعد نیا بگ بینگ ہوگا یا نہیں ہوگا اس بارے میں اتفاق رائے سے کچھ کہا نہیں جاسکتا اور جو سنگولیریٹی بگ بینگ بنی کیا وہ بھی اسی عمل سے گزر چکی تھی؟ اصل مشکل یہ ہے کہ وقت اور سپیس یعنی زماں و مکاں کا آغاز ہی بگ بینگ سے ہوتا ہے یعنی بگ بینگ ہمارا ازل ہے اور سنگولیریٹی ہمارا ابد ہے دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیں کہ ازل اور ابد دونوں ہی

بلیک ہول ہیں اور سٹیفن ہاکنگ کی وقت کی ایک مختصر تاریخ (A Brief History of Time) ان دونوں کے درمیان ہے ایسی صورت حال سپیس کی بھی ہے سائنس دانوں کے نزدیک مکان بھی کوئی قائم بالذات شے نہیں ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آئن سٹائن کے نزدیک زمان مکان ہی کی چوتھی جہت (Dimension) ہے۔

کاش آئن سٹائن اور اوپن ہائمر کو اس بات کا اندازہ ہوتا کہ بلیک ہول جو سب امکانات کو ختم کر دیتا ہے خود کیسے کیسے امکانات رکھتا ہے آئن سٹائن نے تو اس لئے انکار کیا کہ وہ ذہنی طور پر انیسویں صدی کی کلاسیکی فضا سے باہر نہ نکل سکا اوپن ہائمر کی طرح وہ بھی یہ سوچتا رہا کہ کوئی ریاضیاتی مساوات (Equation) دریافت کرنا زیادہ بڑی بات ہے اوپن ہائمر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بلیک ہول وغیرہ تلاش کرنا دوسرے درجہ کے ماہرین طبیعات یا پھر پی ایچ ڈی کرنے والے طلبا کا کام ہے شاید اوپن ہائمر کو اندازہ نہیں تھا کہ ایٹم بم بنانا بھی دوسرے درجے کے کاموں میں شمار ہونا چاہیے۔ اب تک میں نے جو گفتگو کی ہے کسی بھی ادبی مضمون کے حوالے سے قدرے نامانوس گفتگو ہے مگر اس وجہ سے یہ گفتگو کرنا ضروری تھا کہ عالی صاحب کی موجودہ کتاب کو اس حوالے کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کی روایت کو سمجھنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے کہا یہ جاتا ہے کہ اردو نظم کا تو ترجمہ کسی نہ کسی طرح انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں ہو سکتا ہے مگر غزل کا نہیں۔ نظم کے سلسلے میں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ اسے ہم نے انگریزی ہی کی وساطت سے حاصل کیا ہے لہٰذا اسی حوالے سے اسے سمجھنا بھی مشکل نہیں ہے اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ نظم میں یا تو ذاتی حوالے ہوتے ہیں یا ایسے معاشرتی اور ثقافتی حوالے جو یورپ کے لئے اجنبی نہیں ہیں مگر غزل اپنا ایک الگ جہاں گفتگو (of discourse Universe) رکھتی ہے اس کا الگ ایک معاشرتی اور مابعد الطبیعاتی حوالہ ہے بلکہ پورا ایک نظام اقدار ہے اگر ایسا نہ ہو تو غزل کے محض دو مصرعے ایک شعر کی صورت میں اپنا مطلب کس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ پھر اس میں استعمال ہونے والی تلمیحات بھی مخصوص ہیں مثال کے طور پر غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شعر اتنی دیر تک آپ پر کھل نہیں سکتا جب تک آپ ان تصورات اور اس کہانی کو نہ جانتے ہوں جس کی طرف اس شعر میں اشارے کئے گئے ہیں۔ عالی صاحب کی موجودہ کتاب "اے میرے دشت سخن" دو طرح کے جہان گفتگو سے آشنائی کی متقاضی ہے ایک تو اردو کلاسیکی شعری اور ثقافتی روایت ہے اور دوسری جدید سائنس اور خاص طور پر نظریاتی طبیعات ہے پھر عالی صاحب نے شعر کا روپ دیتے وقت ان دونوں کو ملا بھی دیا ہے اور ملایا بھی اس طرح ہی کہ معنی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جو شعری سطح پر ہی نہیں خیال کی سطح پر بھی خاصی پیچیدہ ہے۔ وہ جمیل الدین عالی جس نے غزلیں دوہے گیت لکھے تھے یا جو "لاحاصل" کا خالق ہے اس میں کم کم نظر آتا ہے۔ عالی صاحب نے پچھلے چند برس میں خیالات و افکار کی جو تبدیلیاں دیکھیں ہیں ان سے اردو کے تخلیق کار اور قاری کو کم ہی واسطہ پڑا ہے' دنیا جس طرف جا رہی ہے ہم شعوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس طرف نہ جائیں مگر یہ بات دھیان میں رکھنا پڑے گی کہ تیسرے وقت دریا کے الٹی طرف سفر کرنا خاصہ مشکل ہوتا ہے اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری منزل آگے کی طرف ہے گزرے ہوئے کل کی طرف نہیں۔ خاص

طور پر عالی صاحب کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ مشاعرہ لوٹنے والے شاعر ہیں اور کبھی وہ ایسا نہ کر پائیں تو ان کے اندر ایک محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ "آج کوئی واقعہ ہونا چاہیے تھا جو نہیں ہوا" مقبول شاعر کے لیے وہ لمحہ بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے جب اس کے سامعین اس کی شاعری پر اسے داد نہ دیں مگر عالی صاحب کا "اے مرے دشت سخن" ایسا مجموعہ نہیں ہے جو مشاعرے میں سنا سنایا جا سکے برٹرنڈ رسل کی طرح انہوں نے بھی غیر مقبول مضامین (Unpopular Essay) لکھنے کی کوشش کی ہے اس کے لئے غیر مقبول مضامین لکھنا آسان تھا کیونکہ مضمون لکھتے وقت اس کے قاری یا ناظرین اس کے سامنے نہیں ہوتے تھے مگر عالی صاحب کا رشتہ قارئین اور سامعین سے بالواسطہ ہے' ڈرامے کی زبان میں سٹیج پلے ہے فلمی یا ٹی وی ڈرامہ نہیں ہے یہاں ہر ایکٹ کے لیے اداکار کا خود موجود ہونا ضروری ہے۔

اتنی بار بلایا مجھ کو سننے میرا کلام
اب تو کراچی پڑ جائے گا ٹورانٹو کا نام

مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ رقص کے بارے میں ان کے چند دوہے سن کر بھارت کی عظیم رقاصہ اور اداکارہ **وجینتی مالا** نے اپنی نہایت قیمتی کشمیری شاتوس کی چادر ان کی طرف انعام کے طور پر پھینک دی' اس پر عالی صاحب نے سخت برا مانا اور اس تحفے کو واپس پھینک دیا اس پر وجینتی مالا نے کہا یہ تو ہماری ریت ہے میں آپ کو سن کر حیران ہو گئی تھی اور خوشی میں یہ پھینک دی۔ عالی جی نے کہا مہربانی مگر چند منٹ کے بعد کچھ دوہے پڑھے ان میں سے ایک دوہا ہے۔

آپ وجینتی آپ ہیں مالا آپ کلا کی جان
لیکن کہاں یہ اتم بھاؤ کہاں کوی کا مان

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ عالی جی کی مقبولیت کس سطح کی ہے آج کی شام☆ بھی شاید ان کی مقبولیت ہی کے نام ہے مگر عالی جی کو کیا سوجھی کہ انہوں نے ان مسائل کو اٹھایا جو ہم سب کے لئے غیر مانوس ہیں خاص طور پر اردو سے محبت رکھنے والے لوگوں کے لئے تو یہ شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر عالی صاحب نے وجینتی مالا کی دی ہوئی قیمتی شال واپس پھینک دی ہے مگر اب کی بار انہوں نے کوئی معذرت نہیں کی اور اپنے قاری کو آگاہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی البتہ ان کی گفتگو میں جملوں کے درمیان یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کو دوسری کتابوں سے زیادہ پسند ہے عالی صاحب کی شخصیت کے کئی رخ ہیں شاعری کے علاوہ انہوں نے کالم نویسی بھی کی اور کالم نویسی میں بھی عمومی روایت کو توڑا ہے وہاں بھی انہوں نے مقبولیت کے عام معیار کو نہیں اپنایا' اپنا ایک راستہ نکالنے کی کوشش ہے اور بعض یار لوگوں کی نعرے بازیوں کے باوجود ان کا کالم اب تک چھپتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں غزل کی روایت کی پوری پاسداری کے ساتھ ساتھ نئی نظم کے لوازمات بھی موجود ہیں اور ان کے دوہے شاید ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب ہیں' خدا نے آواز بھی ایسی عطا کی ہے کہ سب کو اپنی طرف کھینچنے پر تلی رہتی ہے مگر اس کے باوجود اب کے ایسی سب نظمیں لکھی ہیں جو اس دنیا کو تیاگ دینے کے برابر ہیں' جس کے ساتھ آسائش دنیا کی ہماہمی منسلک ہے' یہ تو ایسی بات ہوگی کہ کوئی تخت اور تاج چھوڑ کر بن باس لے لے اور ایسا کرتے ہوئے وہ بزرگوں کی کوئی قسم بھی نہ نبھا رہا ہو یہ تو اپنے جسم پر خود گھاؤ لگانے کا عمل ہے جو شعراء اپنے آپ کو مشاعرے تک محدود کر دیتے ہیں اپنے اچھے برے شعر کا فیصلہ بھی خود نہیں کرتے یہ کام بھی

مشاعرہ کرتا ہے اور یہ انتخاب کی ایسی سطح ہے جو ہموار نہیں ہے مگر اس ناہمواری کے باوجود اس میں کوئی بلند مقام بھی نہیں آتا۔ اگر اس بات کو نظر انداز کر دیا جائے کہ موجود سامع کیا چاہتا ہے تو پھر امکانات کے کئی جہاں روشن ہو سکتے ہیں کئی شاعر تو مقبولیت کی پروا کیے بغیر لکھتے چلے جاتے ہیں' اگرچہ تمام تر ناساعد حالات کے باوجود ان کے بھی کچھ قاری کبھی نہ کبھی موجود ہوتے ہیں' اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے دل کے کسی گوشے میں جانے اور پہچانے جانے کی خواہش جاگزیں بھی ہوتی ہے لہٰذا وہ بھی نہ کبھی مقبولیت کی طرف آنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر مقبولیت سے نایافت کی طرف جانا تو ہمارے معاشرے میں تقریباً" ناپید ہے' اس کا ایک چھوٹا سا مظہر میں نے پروین شاکر میں دیکھا تھا اس کی کتاب افکار میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو اس کی باطنی ذات کو اجاگر تو ضرور کرتی ہیں مگر ان میں یہ امکان موجود نہیں ہے کہ فی زمانہ مقبول ہو سکیں' شاعر اگر واقعی شاعر ہے تو اپنے آپ کو محض مقبولیت کے زندان میں قید نہیں رکھ سکتا ژونگ کا یہ خیال درست تھا کہ تخلیقی اُپج انسان سے بھی زیادہ طاقتور ہوتی ہے لہٰذا، تخلیقی موضوعات کا انتخاب بظاہر شعوری فعل محسوس تو ہوتا ہے مگر اس کے محرکات دور تک شخصیت کے اندر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں تخلیقی عمل اس قدر زیادہ پیچیدہ عمل ہے کہ اس کے بارے میں ہمارا علم ابھی تک نہایت محدود ہے مگر اس کے باوجو اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والے کا حاصل کردہ علم خود تخلیقی عمل کی راہ متعین کرنے میں خاصہ محدود معاون ثابت ہوتا ہی مگر یہ علم اپنا اظہار بلاواسطہ طور پر نہیں کرتا بلکہ شعر کے روپ میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ پورے نامیاتی کل کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ ابھی تک میں نے واضح اشارے عالی صاحب کی ایک نظم کے حوالے ہی سے کئے ہیں اس مجموعے میں ان کی کئی نظمیں اور بھی ہیں جن کے پس منظر کو بیان کرنا شاید مناسب ہو مگر طوالت کے ڈر سے میں ان کو بیان نہیں کرونگا صرف یہ عرض کروں گا کہ ان نظموں کے مطالعے کے لئے سائنسی پس منظر کو جاننا مستحسن ضرور ہے مگر یہ لازمی امر نہیں ہے یہ نظمیں ان حوالوں کے بغیر بھی قاری تک اپنی روح کو پہنچا سکتی ہیں۔ عالی صاحب کی اس کتاب میں ساری علمی دلچسپی محض نظریاتی طبیعات کے موضوعات تک محدود نہیں ہے انہوں نے بعض حیاتیاتی موضوعات کو بھی بیان کیا ہے مثال کے طور پر میں چھپکلی کا دماغ کا حوالہ دوں گا آج کل دماغ کو سمجھنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں اس کے کئی رخ ہیں مگر دو کوششیں ایسی ہیں جو انسانی دماغ کے افعال کو مجموعی طور پر بیان کرتی ہیں اور ان میں پوری انسانی شخصیت اور اس کے لوازمات کا احاطہ کیا گیا ہے یہ کوششیں تین دماغی نظریہ اور دو دماغی نظریہ کہلاتی ہیں ان کو دماغ کا عمومی نظریہ اور افقی نظریہ بھی کہا جاتا ہے عالی صاحب نے چھپکلی کے دماغ والی نظم میں "تین دماغی نظریے" کو اپنا موضوع بنایا ہے چونکہ اس نظریے کے تحت یہ دماغ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے ہیں لہٰذا اسے دماغ کا عمودی نظریہ (Concept Of Brain Vertical) کہا جاتا ہے' سائنسی حلقے میں اسے پاپیز میکلین (Papez-Maclean) تھیوری کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ کیا چیز ہے خود میکلین کے الفاظ یہ ہیں۔

"انسان اپنے آپ کو اس حالت میں پاتا ہے کہ قدرت نے اس کو بنیادی طور پر تین دماغ عطا کئے ہیں۔ جو اپنے ساختی اختلافات کے باوجود اس امر پر مجبور ہیں کہ مشترک افعال کریں اور ایک دوسرے سے فہم و تفہیم کا رشتہ استوار کریں' اس میں سے سب سے قدیم دماغ چھپکلی یا خزندہ (Reptilion) ہے دوسرا دماغ نچلی سطح کے پستانی جانوروں (Mammals) سے وراثت میں ملا ہے اور تیسرا دماغ حیوان پستانیہ میں ہونے والی بعد کی پیش قدمی ہے۔۔۔۔ اگر دماغ کے اندر دماغ کی تمثیل کو بیان

رنا ہو تو ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ جب کوئی نفسیاتی معالج دماغی مریض کو صوفے پر لیٹنے کے لئے کہتا ہے تو وہ اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنے اندر کے گھوڑے اور مگرمچھ کو بروئے کار لائے۔

نیچے کے دونوں دماغ یعنی خزندہ (رینگنے والا جانور) اور قدیم پستانی دماغ آپس میں پوری طرح مربوط ہیں اس لئے فرائیڈ کی زبان میں اڈ (Id) جو خواہشات کی ابلتی ہوئی کڑاہی ہے پوری انسانیت کے لئے ایک جیسی ہے۔ یہاں زیادہ تر تشدد اور جنس کی خواہشات ہیں۔ اوپر کا دماغ جو ان دو دماغوں پر ٹوپی کی طرح رکھا ہوا ہے نیو کارٹیکس (Neocortex) ہے یہی اصل میں اضافی انسانی دماغ ہے مگر یہ نیچے کے دماغوں سے پوری طرح مربوط نہیں ہے اور اس کی نشو نما بھی بہت جلدی میں ہوئی ہے کہتے ہیں کہ یہ ناسور کی طرح بڑھا ہے اور صرف پانچ لاکھ برس میں نمو پذیر ہوا ہے۔ یہ مدت ارتقاء کی گھڑی میں چند سیکنڈ کی شمار کی جا سکتی ہے ربط کی اس کمی کی وجہ سے انسان کے اندر بہت مسائل پیدا ہوں گے اس کی پہلی علامت تو آدم خوری ہے (جو ابھی تک معدوم نہیں ہوئی) دوسری انسانوں کی آپس ہی میں قتل و غارت ہے جو دوسرے جانوروں میں اس شدت سے نہیں پائی جاتی۔ تیسری علامت جنگ و جدل کا اجتماعی رجحان ہے چوتھی علامت انسان کے اندر جذبات اور دانش کا تصادم ہے اب اس تشریح کے بعد آپ نظم کو دیکھیں تو اس کے معنی آپ پر زیادہ بہتر انداز سے کھلنا شروع ہو جائیں گے۔

".......

ہے میرا آج کا موضوع چھپکلی کا دماغ
کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت و وحشت کی آندھیوں سے فراغ
یہ جارحیت وسطی مرکبات کا ایک زندہ و عجیب قفس
یہ ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا
یہ ملکیت کی ہوس

....

اس نظم کا آغاز ان مصرعوں سے ہوتا ہے
"ہمارے سر میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ
شرار بولہبی
بہت قدیم دماغ
وہ کہتے ہیں کہ وہ جو رینگنے والے تھے ان کا ورثہ ہے
مگر کچھ ایسے کہ اب بھی ہمارے ذہن کا ایک ناگزیر حصہ ہے

میں قافیوں کا پجاری نہیں
جو خوف و عقیدت سے کھینچ کھانچ کے کچھ یوں کہہ کہ قصہ ہے
وہی کہوں گا جو کہتے ہیں یعنی ورثہ ہے
خواتین و حضرات میرے مضمون سے شاید یہ تاثر ملتا ہو کہ میں کسی سائنسی کتاب کی تشریح کر رہا ہوں مگر آپ تو جانتے ہی

ہیں کہ غالب اور میر کے شعروں کی تشریح ہمارے یہاں ایک رواج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ حالانکہ وہ ایک ایسی ثقافتی اور مابعد الطبیعات کی فضا میں زندگی گزارتے تھے جو ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے مگر لفظوں کے درمیان جو معنی چھپے ہوئے ہوتے ہیں ان کو سامنے لانے کے لئے تشریح کرنے والے شعر کو کئی زاویوں سے بیان کرتے ہیں کبھی کبھی ان کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ کچھ معلومات آپ تک پہنچائیں' مثلاً غالب کے دیوان کا پہلا شعر اور اس میں کاغذی پیرہن کی ترکیب کچھ نہ کچھ شرح کی متقاضی تو ہے اس لئے اسے بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے عالی صاحب کی دو نظمیں جن کا میں نے حوالہ دیا ہے ایسا پس منظر رکھتی ہیں جو عام قاری کے لئے بہت اجنبی ہے لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ میں کچھ ایسی باتیں بیان کروں جو صرف اردو پڑھنی والوں کے لئے ہی نہیں انگریزی دانوں کے لئے بھی معلومات کا درجہ رکھتی ہیں مگر یہ دھیان میں رکھئے گا کہ اگلے چند برس میں اگر یہ نظریات ہمارے روزمرہ کا حصہ نہ بنیں تو ہم پسماندگی کے ایسے گڑھے میں گر سکتے ہیں جہاں سے واپسی ممکن ہی نہ ہو۔ پاکستان کی وزیراعظم کچھ روز پہلے کہہ چکی ہیں کہ اگلی صدی کے آغاز ہی سے ایسا ہو گا کہ جو شخص کمپیوٹر نہ جانتا ہو ان پڑھ شمار کیا جائے گا جو راہ عالی صاحب نے دکھائی ہے دوسرے لکھنے والوں کو وہ راہ اپنے اپنے انداز میں اختیار کرنا ہو گی۔ یہ بات خود ان کی بقا کے لے بھی ضروری ہے آئندہ صدی کے مسائل کیا ہوں گے ان کے بارے میں ابھی سے اندازے لگانے شروع کر دیئے گئے ہیں۔ مگر یقین جانیے ان میں شاعری کی وہ اقسام کم کم ہی شامل ہیں جن کے ساتھ سٹیج Performance کی شرط لگی ہوئی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ عالی صاحب اس زمانے کے پہلے جدید شاعروں میں شمار ہوں گے یا آخری کلاسیکی شاعروں میں۔

یہ مضمون دبئی (۱۹۹۶ء) میں "اے مرے دشت سخن" کی تقریب اجرائی کے لئے لکھا گیا تھا۔ ناشرین

ڈاکٹر سید قدرت نقوی

دوہا
(تاریخی جائزہ اور عالی)

اردو کے لسانیاتی جائزے میں ابتدائی آثار کے طور پر اولیائے کرام و صوفیائے عظام کے کچھ اقوال اور دوہوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ گویا ابتدائی تحریری آثار ان کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔ انہی کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ عوامی زبان ہے جسے اولیاء و صوفیا نے ذریعہ ابلاغ بنایا اور اپنے محبت بھرے پیغام سے عوام کے دلوں کو مسخر کیا۔ یہ عوامی زبان مختلف ناموں سے موسوم ہوتی رہی جو اب اردو اور ہندی کے نام سے الگ الگ پہچانی جاتی ہے ایک ہی سوتے سے نکلنے والی دھاریں ایک ہوتے ہوئے بھی جدا جدا ہیں۔ ملاپ کے بہت سے رشتے اور اشتراک کی بہت سی قدریں بھی ان کو ایک مرکز پر نہیں لاتیں۔

ہمارے بزرگوں نے عوامی زبان کی جن اصناف کو اپنایا ان میں سب سے زیادہ مقبولیت دوہے کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد چوپئی کا چلن رہا۔ باقی اصناف کو بہت کم اختیار کیا گیا۔ چوپئی متعارف مثنوی کی ہم قبیل ہے۔ اس میں پند و موعظت اور قصہ کہانیاں نظم کی جاتی ہیں ساتھ ہی رزمیہ نظم جسے آلہا اودل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انیسویں اور بیسویں صدی میں نہایت مقبول ہوئی آلہا اودل کی طرح بہت سی رزمیہ نظمیں لکھی گئیں۔

"دوہا" ایسی مقبول صنف ہے جو شیخ فرید الدین گنج شکر سے لے کر جمیل الدین عالی تک بالتواتر و بالتسلسل چلی آ رہی ہے اور آئندہ بھی اس کو فروغ حاصل ہوتا رہے گا۔ دوہا اپنی انفرادی حیثیت کے علاوہ دوسری اصناف کے ساتھ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چوپئی وغیرہ میں تو یہ ٹیپ کے شعر کا کام دیتا ہے۔ بہت سے چوپئی ایسی ہیں جن میں یہ ایک حصے کو ختم کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ انتہا یہ کہ امیر مینائی نے ایک نعتیہ مسدس میں ہر ٹیپ کا شعر

کسی معروف دوہے کو بنا کر نعت اور مسدس میں جدت پیدا کی ہے۔

زمانے کی قدر ناشناسی کہئیے یا ہمارا تجاہل عارفانہ کہ ہم نے آج بھی ان تمام اصناف کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی جو ہمارے بزرگوں نے اپنائیں اور جن میں سے بعض آج تک اپنائی جا رہی ہیں۔ ان میں سے بعض اصناف موضوعی ہیں اور بعض ہیئتی یا راوزانی' چوپائی' دوہا' چوپئی' چوبولا' جھولا' ٹھمری' داورا' لاوَنی' کہروایہ' سویہ' ناو' چھپہ' اٹ' کبت' پڑھت' رہاؤ' رولا' ارلا' سری' گیتکا' تربھنگی' بروا' سورٹھ' بھجن' گیت وغیرہ اور ان سب اصناف کے ساتھ سب تہواروں اور راگوں کے نام سے بھی نظمیں لکھی گئی ہیں یہ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قواعد اور عروض و بلاغت کی کتابوں میں ان اصناف و اوزان کا ذکر تک نہیں۔ غزل میں ابتداء سے لے کر ناصر کاظمی تک' گیتوں میں ابن انشاء تک اور دوہوں میں جمیل الدین عالی تک ان اصناف و اوزان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سودا بلکہ ان سے بھی پہلے کے شعراء نے مرثیہ میں ان اصناف کو اپنایا اور آج بھی لکھ رہے ہیں۔ یہی حال نعت و منقبت کا ہے سودا کا واقعہ کربلا سے متعلق ایک دوہا ہے :

قید ہوئیں سب بی بیاں' پیا سے سب اطفال
کہاں رسول اللہ ہیں' دیکھیں جو یہ حال

اور کسی کے مرثیے کا یہ شعر :

دیس عرب کا بیوپاری بھرا پرا بنجارہ رہے
شام نگر کے راہزنوں نے گھیر کے جس کو مارا رہے

ردپ کماری کے نوحے کے یہ شعر :

ڈوبی ہوئی دکھ کے ساگر میں سورج کی سنہری تھالی تھی
عاشور کی صبح سے سانجھ تلک شبیر سے دنیا خالی تھی
وہ کھیت پہ سے جل بہتا تھا اور پھول ادھر کملاتے تھے
بے نیر ہی سوکھے جاتے تھے اور چاروں طرف ہریالی تھی
سرور پہ حسنؓ کی و دھوانے وہ چاند سے ٹکڑے وار دیئے
بچے تو جیالے تھے ہی مگر ماتا بھی بڑی دل والی تھی
جب لٹ کے چلے ہم کربل سے اور آئیں سکھیاں ملنے کو
جس مانگ کو دیکھا اجڑی تھی جس گود کو دیکھا خالی تھی

کتنے پر درد' پر سوز اور رقت انگیز ہیں۔ کیا یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اردو ادب کے طالب علم ان سے فنی اور روایتی طور پر نابلد و ناآشنا رہیں اور بہرہ ور نہ ہوں؟ آج مذکورہ اصناف اور ان کے اوزان سے اردو کے طالب علموں کی رہنما... سے ہمارے ادبی' علمی اور تنقیدی سرمائے میں بجز چند ادھورے مضامین کے اور کچھ نہیں ملتا۔ کیوں؟ اس کا

سبب صرف یہ ہے کہ ہم نے ان اصناف کو وہ درجہ نہیں دیا جس کی یہ مستحق تھیں۔ ہمارے محققوں اور نقادوں نے ان اصناف کو اس لئے درخور اعتنا نہ گردانا کہ ان کا تعلق عوام سے رہا ہے اس عظیم اور بیش بہا ادب کو صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل نہیں ہوئی کہ امراء و شرفا نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور اس کی سرپرستی نہیں کی۔ ان کے ہاں فارسی کا طوطی بولتا تھا اور اسی کے تتبع میں اردو غزل مثنوی وغیرہ اصناف پروان چڑھ رہی تھیں۔

قدیم اردو سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو اس میں عوامی زبان کی بہت سی اصناف ملتی ہیں جنہیں اردو کا قیمتی سرمایہ صرف اس لئے قرار دیا گیا کہ ان سے لسانی استواری و ارتقاء کے تعین میں مدد ملتی ہے اردو نے جب فارسی کے زیر اثر فروغ حاصل کیا اور ایک علمی و ادبی زبان بننے لگی تو ان عوامی اصناف کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ مثنوی سے زیادہ چوپئی یا چوپائی میں چلت یعنی روانی پائی جاتی ہے۔ رباعی سے زیادہ چوپائی میں اظہار کی صلاحیت ملتی ہے چوپئی میں ماتراؤں کی گنتی ایک شعر میں اٹھائیس سے بتیس تک ہوتی ہے۔ چوپائی میں ماتراؤں کی تعداد تیس ہوا کرتی ہے چوپئی میں شعروں کی تعداد متعین نہیں، چوپائی میں صرف دو شعر ہوتے ہیں دونوں شعر الگ الگ قافیے کے ہوتے ہیں مگر ہر شعر کے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا لازمی ہے ان دونوں کے نمونے درج ذیل ہیں۔

چوپئی : ہر مصرعہ : ۱۶ + ۱۶ : ۳۲ ماترات از محمد نوشہ گنج بخش متوفی ۱۶۵۴ء گنج شریف ۱۶۵ (منتخب اشعار)

چار راہ موں مرشد بسے	راہ راہ اکی سنگ رسے
راہ شریعت راہ طریقت	مرشد کی سب مانہہ حقیقت
جو تن من مرشد پروارے	اسے معرفت ہوئے پیارے
چار مقام موں مرشد دیکھا	چاروں میں دیکھا ایک لیکھا
جو مرشد ناسوت میں سمجھا	سو مرشد جبروت میں لبھا ؟
وہ مرشد ملکوت میں پایا	وہ مرشد لاہوت سمایا
باطن کا ظاہر ناسوت	ظاہر کا باطن جبروت
باطن کا باطن ملکوت	ظاہر باطن ایک لاہوت
ایک اروپ روپ روپ دکھائے	روپ روپ اروپ سمائے

دیکھئے کتنے دقیق مسائل کیسی روانی سے بیان کر دیئے گئے ہیں اسی طرح تاریخ غریبی ایک ضخیم کتاب ہے اس میں تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں یہ واقعات آفرینش نور محمدی سے لے کر تمام انبیاء کے حالات قصص تا حضرت مصطفیٰ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی چوپئی کے وزن میں ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۷۵۶ء ہے اس کے چند شعر بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں :
(مقالات شیرانی، جلد دوم ص ۳۵۰)

کہا نبی نیں کہہ رے بھائی	کون بھانت یہ دولت آئی
کہا نبی نیں وہی گھیارا	بن موں لکڑیاں لیا ون ہارا

جب تم گئے کری میں زاری — اے کریم تو خالق باری
کری نبی نیں مجھے دلاسا — تین لال بخشے تے خاصا
لیکن وے سب تجھے نہ بھائے — تینیں تینوں لال گنوائے
اب میں تیری کروں جو آسا — تو کر میری خوب دلاسا
اتنا بول نبی میں آیا — ایک جھاڑ پر نظر چلایا
چیل گھونسلے میں تھیاں لکڑیاں — میں نیں وے ہی جا کر پکڑیاں
تینوں لال اسی میں پائے — جب میں نیں اے ناتھ بنائے
سدا کروں حق کا شکرانا — پڑھوں نمازاں اور دوگانا
ہے خدا ہی سب باتوں جوگا — ایسا کوئی ہوا نہ ہوگا

اس تاریخ غریبی کی ایک اور خصوصیت ہے کہ ہر واقعہ قصہ یا باب کسی دوہرے اور سورٹھ پر ختم ہوتا ہے۔

چوپائی : اس کے متعلق ہم نے پہلے بتایا کہ یہ رباعی سے مماثل ہے۔ اس کا وزن ۱۵ + ۱۵ = ۳۰ ماتراؤں کا ایک شعر جس کے دونوں مصرع مقفیٰ ہوتے ہیں اور صرف دو شعر ہوا کرتے ہیں جو چوپائیاں ہم (مقالات شیرانی جلد دوم ص ۳۰۸ تا ۳۱۲) پیش کر رہے ہیں' ان میں مضامین سلوک و معرفت' پند و نصائح وغیرہ نظم کئے گئے ہیں مگر ان کی یہ خصوصیت قابل لحاظ ہے کہ ہر چوپائی کا آخری مصرعہ کسی نہ کسی معروف کہاوت پر مبنی ہے۔

ایسے جگ کو کو پتیاوے — جب ڈھونڈے تب کچھ نہ پاوے
دیکھن کا پرنت ہے اوت — ٹیسو پھولے سدا نہ پوت
کرلے جو کچھ کرنا ہو — پھر ترا پچھتانا ہو
یہ جگ تیرا چھن چھن چھنے — کولہو کٹے اور موگری بنے
بھلی کرے تو سرگ بساوے — پونجی میری نرگ مے جاوے
جیسا بووے ویسا لے — دھری بجے اور پالی جھٹے
جب پریم نگر کی اجڑی پینٹھ — سگرے بنئے ہوگئے سیٹھ

اونچی پونچی ہوا بناؤ — اندھوں بھیتر کا ناراؤ
آپ چلے تو بھلا چلے — اندھا دوڑے گر گر پڑے
بھول بھٹک کے گرو سنوار — گاڈی ٹوٹی کھاتی دوار
ناؤ رکھا کر گرو کماوے — چیلے پکڑے اور بہکاوے
جوگ کا مارگ باتوں کیلے — اناڑی نائی سر کو چھیلے

جب لگ گرو سے بھینٹ نہو — دن رات سکھ سے مت سو
کچھ تو کر میرے جیا پیارے — نھالا بنیا باٹ ہی ہارے
جب لگ نہو گرو کا ساتھ — کیسے پاوے ہر کی بات
گر پاوے اور ہو سیلا — کم بختی کا آٹا گیلا
گر کے بیں جی سے سن — ہر دے چھن چھن پورا گن
اس کے کتنے رنگ لے کیس — جیسا دیس ویسا بھیس
ایک رنگ ہوہی کن چلے — دھیرے دھیرے ہر سے ملے
دبدھا میں من جاوے پھاٹ — دھوبی کا کتا گھر نہ گھاٹ
ہر کو بھجے اور مانگے سرگ — ہر ہی جانے اس کو ترگ
چوڑے دنبہ لیوے مینڈھا — ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا
جب دھن لاگی پی کے سنگ — تا سیلا ایک ہی رنگ
پھر کیا سوجھے ایسا ویسا — ناچن نکلی گھونگٹ کیسا

ان عوامی اصناف کو ذرا تفصیل سے اس لئے پیش کیا گیا کہ ان کا رچاؤ ذہن نشین ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان میں کتنی وسعت، دلکشی، روانی، تاثیر اور اثر انگیزی پائی جاتی ہے۔ ہم نے ان کو صرف نظر کر کے اردو کے ارتقائی پہلو کو کمزور بنایا۔ ان کو اختیار کرنے سے زبان میں وسعت ہوتی اور اس کا پھیلاؤ نہ صرف پاک و ہند میں بڑھتا بلکہ لسانی تفریق و تمیز کی تحریکات بھی سر نہ اٹھاتیں زندہ زبان، عوامی زبان ہی ہوا کرتی ہے۔ زبان کو عوام سے جتنا دور کرتے ہیں اجنبی بناتے جاؤ گے وہ دم توڑتی نظر آئے گی آج اس بات کی ضرورت ہے کہ زبان کو سہل بنایا جائے تاکہ عوام سمجھ سکیں اور اس میں ایسی چیزیں لکھی جائیں کہ زبان زد عام و خاص ہو جائیں۔ یہ خدمت ہم بآسانی دوہے سے لے سکتے ہیں کہ اس صنف سخن میں مقبول خاص و عام ہونے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت وہ دوہے ہیں جو آج بھی مکمل طور پر یا ان کا کوئی ایک مصرعہ بطور ضرب المثل ہر زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً

منہ لگائی ڈومنی گائے تال بے تال
چار دنوں کی چاندنی، پھر اندھیرا پاکھ
باپ نہ ماری پودنی، بیٹا تیر انداز
بہن گھر بھائی کتا، ساس کے گھر جنوائی
بیٹی کے گھر باپ کتا، جس نے ذات گنوائی
بیٹا چڑھ جا سولی پہ، رام بھلی کرے گا

آئی موج فقیر کی دیا جھونپڑا پھونک
سونا لاون پی گئے، سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے روپا ہو گئے کیس

☆

نئی شبر ساونہ اور برسے گنجن نیر
سب کنتھ ہوڑ کے، لے گئے عالم گیر

☆

تو بھی رنئی میں بھی رانی کون بھرے گا پانی

☆

تال سوکھ لیو بھو، ہنسا کہیں نہ جائے
مرے پرائی پیٹ کو، چن چن کنکر کھائے

☆

اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "کہاوتی دوہے" جس میں ہر دوہے یا مصرعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور پس منظر بھی بیان کردیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ضرور ہے کہ ہمارا موضوع اردو دوہا ہے خالص ہندی دوہا نہیں اردو دوہا وہ کہلائے گا جس کو باآسانی ہر پڑھا لکھا سمجھ سکے اور جو سہل و آسان اردو میں لکھا گیا ہو جس کی مثالیں بابا فرید سے لے کر آج تک کے شعراء میں ملتی ہیں۔

دوہا یا دوہڑہ، وہ صنف سخن ہے جو ایک ہی شعر پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ہر مصرع کے دو حصے (بھاگ) ہوتے ہیں جن کے بیچ میں وقفہ یا ٹھہراؤ (بسرام) لازمی ہے۔ اس طرح پورے شعر کے چار ٹکڑے اور دو درمیانی ٹھہراؤ قرار پاتے ہیں۔ اس کو اردو میں بیت کا مترادف کہہ سکتے ہیں اور بلحاظ حصص رباعی کا ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں۔ گویا یہ چار ٹکڑوں پر مبنی ایک شعر ہوتا ہے جس میں مکمل مفہوم یا مطلب ادا کیا جاسکتا ہے۔

دوہے کا ہر مصرعہ چوبیس ماتراؤں کا ہوتا ہے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا تیرہ ماتراؤں کا، اس کے بعد ٹھہراؤ، دوسرا ٹکڑا گیارہ ماتراؤں کا ہوتا ہے۔ ٹھہراؤ کا مطلب یہ ہے کہ بات، جملہ یا ترکیب تیرہ ماتراؤں میں پوری ہوجائے تاکہ رکا جاسکے اس طرح پورا شعر اڑتالیس ماتراؤں کا ہوتا ہے۔

ماتراؤں کے حساب سے دوہے کا پہلا اور تیسرا حصہ تیرہ تیرہ ماتراؤں کا ہوتا ہے اسی طرح دوسرا اور چوتھا ٹکڑا گیارہ گیارہ ماتراؤں کا۔ ان کی تقسیم اس طرح قرار پاتی ہے :

۱۳ ماترائیں وقفہ ۱۱ ماترائیں : ۲۴ + ۱۳ ماترائیں وقفہ ۱۱ ماترائیں = ۴۸

مذکورہ امور کی روشنی میں دوہے کے لئے ضروری ہوا کہ

(۱) دوہے کے چار ٹکڑے ہوں

(۲) پہلا اور تیسرا ٹکڑا تیرہ تیرہ ماتراؤں کا ہو

(۳) پہلے اور تیسرے ٹکڑے کے بعد ٹھہراؤ ہو

(۴) دوسرا اور چوتھا ٹکڑا گیارہ گیارہ ماتراؤں کا ہو

(۵) پورا دوہا اڑتالیس ماتراؤں کا ہو

دوہے کی یہی ہیئت مروج ہے لیکن خالص ہندی کے ماتراؤں اور مروج ماتراؤں میں کافی فرق ہے اس لئے ماتراؤں کی حقیقت کی تفہیم پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حرکت و علت 'سر' ماترا صوتی اکائی کا نام ہے۔ خالص ہندی اور مروج ہندی کا عروضی نظام اسی پر قائم ہے۔ ان کی درجہ بندی بلحاظ مفرد و مرکب کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے :

۱۔ ایک ماترائی سر : ا'ا'ا یا : بَ'بِ'بُ۔ انہیں لگھو کہتے ہیں۔

۲۔ دو ماترائی سر : آ'او'ای یا : ٓ(ممدودہ) وٗ'یٖ (معروف) انہیں گرو کہتے ہیں۔

۳۔(الف) مرکب سر : او'اے یا : وٗ'یٖ (مجہول) انہیں دیر گھ کہتے ہیں

(ب) مرکب سربھاری : او'اے یا : وٗ'یٖ (لین) سادہ انہیں بھی دیر گھ کہتے ہیں

(ج) او'ائی یا : وی (پسند مرکب) یا تین ماترائی سر' یہ بھی دیر گھ ہیں

یہ دس مصوتے ہیں جو ایک گا تزے سے تین ماتراؤں تک پر جی ہے دراصل ماترا وہ صوتی اکائی ہے جو کسی سر کے ادا ہونے کا وقت یا مدت متعین کرتی ہے اور یہ حرکت مطلق ہی کا دوسرا نام ہے خالص ہندی میں باقی تمام حروف، ساکن نہیں بلکہ متحرک بالفتح ہیں خالص ہندی میں سکون کا کوئی مقام ہی نہیں۔ صرف ساکن کو آدھا لکھتے یا اس کے نیچے ایک چھوٹی سے ٹیڑھی لکیر کھینچ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ حیثیت موجودہ ہندی (کھڑی) اور اردو کے مزاج و منہاج کے مطابق نہیں اسی لئے ان پر عمل بھی نہیں ہوتا۔

خالص ہندی پنگل (عروض) میں ماتراؤں کا ایک نظام قائم کیا گیا ہے جسے "گن" کہتے ہیں۔ اس میں ماتراؤں کی تعداد اور ان کے ملاپ کی صورتوں کو مدنظر رکھ کر حسب ذیل آٹھ شکلیں قائم کی گئیں جن میں لگھو اور گرو کے ملاپ کو دکھایا گیا ہے۔ لگھو کی ترسیم کے لئے ایک کھڑی لکیر (۱) اور گرو کے لئے انگریزی (S) کے مشابہ علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ گن حسب ذیل ہیں :

۱۔ یگن : SSI : جماتا (ج ما تا) : فعولن

۲۔ مگن : SSS : جاماتا (جا ما تا) : مفعولن فعلن فع

۳۔ بھگن : IIS : جامت (جا م ت) : مفعل

۴۔ نگن : III : جمت(ج م ت) : فعل

۵۔ جگن : ISI : جمات(ج مات) : فعول

۶۔ رگن : SIS : جامتا(جام تا) : فاعلن

۷۔ سگن : SII : جمتا(ج م تا) : فعلن

۸۔ تگن : ISS : جامات(جامات) : فعلان، مفعول

غور فرمایئے کہ یہ گن اردو تو در کنار عوامی ہندی (کھڑی) کے مزاج سے بھی ہم آہنگ نہیں ہیں کھڑی کے مزاج میں یہ ہے کہ ساکن الاول کو برداشت نہیں کرتی قدیم ہندی اور سنسکرت کے تمام ساکن الاول لفظوں کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا مثلاً "شور" کو "سر" بنا کر ایک سریلا روپ دیا اور رواں لفظ بنالیا۔

دوہے میں منجملہ اور شرائط کے ان گنوں کے متعلق بھی شرطیں ہیں کہ ابتداء میں یہ گن ہو تو اس کے ساتھ فلاں فلاں گن آئیں گے لیکن عوامی ہندی یا کھڑی اور اردو کے دوہا نگاروں نے ان شرائط پر عمل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گن وزن کی تشکیل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے یعنی وزن ان کے ذریعے سے قائم نہیں ہوتا' البتہ لگھو اور گرو کو ماتروں کی گنتی کے لئے ضرور پیش نظر رکھا۔ ان دوہا نگاروں نے صرف تیرہ اور گیارہ ماتراؤں کی گنتی کو پورا کرنے ہی کو ضروری خیال کیا۔ اور اس میں بھی حرکتوں کی تخفیف اشباع سے کام لیا۔ قصیر کو طویل اور طویل کو قصیر بنالیا۔ جہاں چاہا حرف کو دبادیا اور جہاں چاہا حرف و حرکت کو ساقط کردیا۔ یہ دوہا دیکھئے۔

سیکھ دیجیو واکو' جاکو سیکھ سہائے = ۱۱ = ۲۴

سیکھ نہ دیجو باندرا' جو گھر بے کا دھائے = ۱۱ = ۲۴

اس کا ماترائی تجزیہ اس طرح کیا جائے گا۔

سی کھ دی جی یو وا کو = ۱۳

جا کو سی کھ س ماء = ۱۱

سی کھ ن دی جو باں درا = ۱۳

جو گھر ب ئے ک دھاء = ۱۱

اس تجزیے سے معلوم ہوگا کہ "سمائے" کے آخر سے "ے" گر گئی اور اس جگہ کسرے نے لے لی اسی طرح "دھائے" میں بھی یہ عمل ہوا۔ "دیکھو" دوسرے مصرع میں "دیجئو" ہو گیا دو ماترے کم ہوئے۔ "نہ باندا" میں سے بھی ایک ماترا گرا صرف "ن" اور "کا" میں سے گر کر "ک" رہ گیا ہے۔ گویا اصولاً چھ ماترے کم ہو گئے اگر پورے ماترے شمار کریں تو پھر گنتی پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے ضروری ہوا کہ دوہے کے ماتروں کو گنتے وقت سقوط' تخفیف و اشباع کے عمل پر بھی نظر رکھی جائے

دوہے کی مذکورہ ہیئت کے بعد اس کی اطلاقی نوعیت کا جائزہ لیں تو بابا فرید الدین گنج شکر کے عہد سے آج تک اس میں ایک ارتقائی عمل نظر آتا ہے جس میں ماتروں کی کمی بیشی بھی ملتی ہے اور ٹکڑوں کی گنتی بھی پانچ تک پائی جاتی ہے گویا مستزاد کی طرح یہاں بھی ایک ٹکڑا زیادہ ملتا ہے۔ اس ٹکڑے کو "منڈک" کہا جاتا ہے اس کی مثال میں شیخ شرف الدین کا یہ دوہا پیش کیا جاسکتا ہے:

کالا ہنسا تر ملا' بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بکھ ہرے نرمل کرے سریر
درد رہے نہ پیڑ

(مقالات شیرانی جلد اول ۱۳۵)

میں نے بھی کچھ دوہے کہے ہیں جس میں مستزاد کی اچھی خاصی تعداد ہے چند منڈک پانچ کھنبا دوہے ملاحظہ فرمایئے !

نازک لب پھولوں جیسے' آنکھیں رس برسائیں
جو بن ابلا پڑتا ہے' جو دیکھیں للچائیں
پاس نہ جانے پائیں

☆

پیڑ گھنیرے دودم دور' جگ میں جن کی دھوم
پھل پائیں باگ بگھورے' انساں ہیں محروم
کتنے ہیں مظلوم

☆

دشمن ہے یاں ہر کوئی' اپنا بھی ہے غیر
ہے کتنا ابتر حال' مانگو سب کی خیر
چھوڑو بیر بیر

☆

عالی جی دوہے لکھو' انشا جی تم گیت
جس میں سب کی چاہت ہو' اپناؤ وہ ریت
میت بناؤ میت

☆

ہم سید پچا مارے' جگ میں بے آرام
تن من دھن حق پہ واریں' تیغ تلے بسرام
یہ پائیں انعام

☆

باغ گھنیرے کوسوں دور' میووں سے معمور
موج میں ہیں بندر ریچھ' منھ دیکھیں مزدور
تھک کے چورم چور

اب ہم ابتدائی دوہے سے لے کر اب تک کے دوہوں کا جائزہ لیتے ہیں کہ ان کی کیا نوعیت رہی ہے۔ پہلے ہم وہ دوہے پیش کرتے ہیں جن میں ماترائیں مقررہ گنتی کے مطابق پائی جاتی ہیں۔

سائیں سیوت گل گئی' ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیو ساں جب لگ ہوسوں کیہہ

☆

شیخ فریدالدین گنج شکر :

فرید ادھر سولی پنجرو' تلیاں تھوکن کاگ
رب اجیون باہورے' تو دھن ہمارے بھاگ

بو علی شاہ قلندر :

ساجرے نہ مانوں' پیو کے نہیں تھا تو
کنبھہ نہ بوجھی بات روی' دھن سہاگن ناتو

☆

سجن سکارے جائیں گے' نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر' بھور کدھی نہ ہوئے

امیر خسرو :

گوری سوئے سیج پر' مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو دیس
پنکھا ہو کر میں ڈولی' ساتھی تیری چاؤ
منہ جلتے جنم گیا' تیرے لیکھن باؤ

شیخ احمد عبدالحق

کنواں ہوئے تو پاؤں، سمند کہ پاٹن جائے
بارا ہوئے تو برجوں، جھیل کہ برجن جائے

شیخ بہاءالدین باجن

گور اندھیاری ڈر بڑا، باجن کمڑا مفلس
ہیرا کانپے جیو ڈرے، یہ دکھ آکھوں کس

حاجی محمد نوشہ

ڈنکا بجا توحید کا، وحدت کیو ظہور
نوشہ مرشد قدم لگ، پایا راہ حضور
مرشد پاک رسول ہے، مومن ہے سچہار
نوشہ کلمہ پاک پڑھ، پایا پاک دیدار
نبی محمد مصطفےٰ، بھیجا پاک سبحان
پاک رسول کا بھیجا، نوشہ مرشد جان
مرشد روپ دکھایا، جیسے علی امیر
نیزہ ہاتھ گھوڑا تلے، نوشہ کے فقیر
شاہ علی مولا علی، مرشد علی امیر
میاں علی خاوند علی، نوشہ کے فقیر

آدھین : (اہل دائرہ کا ایک شاعر) : ۱۷۷۱ء

کرن ہار جو کچھ کرے، دھرن گگن میں کاج
سزاوار واکو بجے، تین لوک میں راج

☆

ایک ہزار ایک سو برس، ستر اوپر پانچہ
یہ وفات نامہ لکھا روز جمعہ تھا سانچہ

تاریخ غریبی : (اہل دائرہ) ۱۷۵۶ء :

چار نبی ہیں جیوتے، کہیں لوگ یوں خاص
عیسیٰ اور ادریس، ہے اور خضر الیاس

ساتھی :

چاہے سو ہی کرے، و اسان کوؤ ناتھ
رائی سو پر بت کرے، پر بت رائی ماتھ

مرزا محمد رفیع سودا :

کاری رین ڈراونی، گھرتے ہوئے نراس
جنگل میں جاسوئے رہے، کوؤ آس نہ پاس
کھو بیٹھیں نے تیہن، پی کے من کو چین
جالم تیرے ہاتھ سو، پیا سا گیو حسین

نظیر اکبر آبادی :

پریم نگر کی ریت ہے، تن من دیہو کھوئے
پیت ڈگر جب پگ راکھا، ہونی ہو سو ہوئے
برہ آگ تن میں لاگی، چرن لگے سب گات
ناڑی چھووت بید کے، پڑے پھپھولے ہات

حباب (ڈرامہ نگار) ۱۸۸۱ء :

لاگی آگ لگن کی تن میں، لب پر آہ سرد
یہی نشانی ہے عاشق کی چہرہ ہووے زرد

کریم الدین مراد (ڈرامہ نگار) ۱۸۹۰ء :

ہاتھ چرن لگو بید کو، دیکھت ناڑی ہائے
کہو چڑھی تپ عشق کی، کیسے اتاری جائے

رونق (ڈرامہ نگار) :

دو تن اک جان ہوگئے، میں اور میرا یار
خوش نہیں آیا یہ تجھے، اے چرخ کج رفتار

تن جھگیا سو پیارہا، جب جیو ابھیا اداس ۲۷
جیسا مرنا تخت تپے تیسا اوپر گھاس ۳۳

محبوب عالم (مقالات شیرانی جلد دوم ص ۲۸۲)

یہ آنچ دوزخ میں نہیں، جو آنچ میرے تن لگی ۲۸
غلمان و حوراں جنتی، دکھ دیکھ میرا رودئے ۲۸

ہر بات ماں لو ہو بکے' ہر حال میں چھاتی وبے ۱
جنگل پہاڑا باغ بن' دکھ دیکھ میرا رووے ۲۸
سب دین روواں اکلی' سکھ چین سوواں نا بھلی ۲۸
سورج ستارے چاند بھی' دیکھ دیکھ میرا روے ۲۸
محبوب عالم فاطمہ' دکھ اپنے میں یوں کہا ۲۸
سب انبیا و اولیا' دکھ دیکھ میرا رووے ۲۸

مصنف نے اس مرثیہ کو 'دوہرہ' لکھا ہے۔ جس کے ہر ٹکڑے میں ۳۲ ماترائیں ہیں اور جو جناب فاطمہؑ کی زبانی وفات نبی اکرمؐ پر پیش کیا گیا ہے اس کا انداز قدیم ہوے کا انداز ہے۔ جس میں ایک ہی جملہ ہر شعر کا آخری ٹکڑا ہوا کرتا تھا۔

شیخ پیارا (مقالات شیرانی جلد اول ص ۲۹۶)

بھٹ بودے یہ جاتوں' دھک جیون تیرا ۳۲
سائیں تمیں توں کہ پیرا' دیکھ کتب گھنیرا ۳۱
ایکو کام نہ آوے گی' جب پڑسی بیڑا ۳۲
چھوڑ پیارا سائیاں' تو جا نس کیرا ۳۲

حباب (ڈرامہ نگار)

۵ مایوسی تھی مجھ کو پھراتی' جنگل میں ویران ۲۸
دست ستم لیں اک تاجر کے' میری پھنسی تھی جان ۲۸
بدکاری کو کہتی تھی مجھ سے' وہ نائکہ بے ایمان ۳۲
مال و جواہر دے کے اس کو' اپنی چھڑائی جان ۲۹

طالب بنارسی (ڈرامہ نگار) ۱۸۹۳ء :

گورے گورے ہاتھ میں' کنگن کی ہے آب
جیون چندن کی ڈاریہ' تازہ پھول گلاب
جس تن کو تو مل مل دھوئے' چندن عطر لگائے
ہے ہے اک دن یہ سندر تن' ماٹی میں مل جائے

خواجہ دل محمد دل :

گئی غلامی بول اب' آزادی کے بول
پلڑے میں انصاف کے' حق کو حق سے تول
نغمے سوئیں ساز میں' چپ گپ ہیں سب تار
چتم ہاتھ بڑھائیو' جاگ اٹھے سنسار
جیون کی ہر بوند میں' کال بھنور چکرائے
اس چکر کی پیٹھ پر' آسن کون جمائے

جمیل الدین عالی :

آپ بنا بنجارہ میں' اور آپ بنائی باٹ
سچ کہیو رے دیکھنے والے' ایسے کس کے ٹھاٹ
بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی' ناگن کی پھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا' اور دوجا امرت دھار
اگنی پوجیں سورج پوجیں' پوجیں جل اور ناگ
عالی اپنی نار کو پوجیں' یہ عالی کے بھاگ
عالی جی اک کڑی رسیلے' دھنک سے جن کو پیار
پہنچ گئے اک گاؤں بھی' جو دھنک کے ہے اس پار
ایک تو یہ گھنگور بدریا' پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے' جیسے لگے کٹار

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھینچے ہے تن کی چیتے' مدرا کرے اتار

یہ ہم نے وہ منتخب دوہے پیش کئے جن میں ماتراؤں کی گنتی پوری ہے یعنی تیرہ اور گیارہ کے ٹکڑے ہیں۔ یہ گویا قدیم روایت ہے جو تقریباً آٹھ سو سال سے چلی آرہی ہے۔ اور اسی روایت کی بدولت اردو کی لسانی تاریخ کے آغاز کا سراغ ملتا ہے۔ دوہے سے زیادہ اور کوئی صنف سخن اردو میں قدامت کا درجہ نہیں رکھتی۔

مندرجہ بالا روایت کے ساتھ ساتھ ایک اور روایت بھی ملتی ہے جس میں ایسے دوہے بھی سامنے آتے ہیں جن میں ماتراؤں کی گنتی تیرہ اور گیارہ سے زیادہ کم ہے۔ لیکن ٹکڑے اور وقفے کا التزام برقرار رکھا گیا ہے۔ بیشتر میں صرف پہلے اور تیسرے ٹکڑے میں کمی بیشی کا عمل پایا جاتا ہے اور دوسرا اور چوتھا ٹکڑا گیارہ گیارہ ماتراؤں ہی کا ہے۔ یہ روایت

بھی ابتدا ہی سے چلی آ رہی ہے۔ ایسے چند دوہے ملاحظہ فرمایئے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر :

فریدا کالے مینڈھے کپڑے' کالا میرا دیش ۲۹
گنہی بھریا میں پھراں' لوگ کہیں درویش ۲۴
فریدا میں جانیا دکھ مجھ کوں' بسائے جگ ۳۰
اونچے چڑھ کے دیکھیاں تاں تاں گھر گھر ایہا اگ ۲۶

نامعلوم : (مقالات شیرانی' جلد دوم' ص ۳۴۰)

آگے کے دن پاچھے گئے' کیا نہ ہرسوں ہیت ۲۶
اب پچھتائے کیا ہوت ہے' جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۲۹

شیخ بہاء الدین باجن (مقالات شیرانی' جلد اول ص ۱۷۰ تا ۱۷۴)

باجن وہ کسی سریکھا نہیں' اور اس سریکھا نہیں ہوئے ۳۳
جیسا کوئی من مہ چیت دے' ویسا بھی نہوے ۲۸
تجھ ایک روپ اور بھانت بہت' دیکھ عاشق شیدا ہوئے ۳۲
باجن اکی ایک سریکھانا ہیں' سبھ گئے جوئے جوئے ۳۱
روزے دھر دھر نماز گزاری' دبی فرض زکوٰۃ ۲۸
بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں' آگیں بکھن بات ۲۸
باجن کوئی نجانے وہ کدھا' اوکدتھے پرگت ہووا ۳۳
وہی جانے آپ کوں' جب تے پرگت ہووا ۲۵
سبھ رس بیچے پائی' جیون جاے سبھ کوئے ۲۳
جس رس بیچے پائی' وہ رس کیسا ہوئے ۲۳

حاجی محمد نوشہ (گنج شریف ص ۲۶۷ تا ص ۲۷۷)

دنیا کے سادات سخی' عقبی کے سادات فقیر ۲۹
نوشہ کے ستو سمجھاروں' یوں فرمایا شاہ امیر ۳۱
نوشہ قدرت حق کی' چاہے کرے سو ہوئے ۲۳
پر جو عادت حق کی' نت نت ہووے سوئے ۲۳
پیارے تن من دوئیو جلادیئے' بے صبری کی آگ ۳۱
صبر صبوری وا کریں' مستک جن کے بھاگ ۲۳

تن جگیا سے پیاریا، جب جیو ابھیا اداس ۲۷
جیسا مرنا تخت تپے تیسا اوپر گھاس ۲۳

طالب بنارسی (ڈرامہ نگار)

ہم طرح طرح کے، نت بدل کے ڈھنگ ۲۰
کرسدا رہا جفا، وفا سے تنگ ۱۹
جا بجائیں بیٹھے، سر میں مورچنگ ۲۱
کیا امنگ کیا ترنگ، رنگ ہی رنگ ۲۰

حافظ عبداللہ (ڈرامہ نگار)

راجہ اندر کہتے ہیں، مجھ کو خاص و عام ۲۵
عشق و طرب سے روز و شب، رکھتا ہوں میں کام ۲۶

حالی :

دوہے کبت کہہ کہہ کر حالی، من کی آگ بجھائے ۲۸
من کی آگ بجھی نہ کسی سے، اسے یہ کون بتائے ۲۸
عمر گنوا کر پیت میں ہم کو، اتنی ہوئی پہچان ۳۰
چڑھی ندی اور اتر گئی، پر گھر ہوگئے ویران ۳۰
نا مرے سر کوئی طرہ کلغی، نا کیسے میں چھدام ۳۱
ساتھ میں ہے اک نابی سانوری، اور اللہ کا نام ۲۸
نا تری ایسی بالی عمریا، نا ایسی نادان ۲۹
پر جب ہم کوئی بات کہیں، تو سنے یہ ہو انجان ۳۰

ہم نے فرید الدین گنج شکر سے لے کر حالی تک کے دوہوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ اردو دوہے میں فنی نوعیت کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ بالخصوص بحر میں مخصوص بحر یعنی تیرہ گیارہ چوبیس ماتراؤں کی پابندی بھی پائی جاتی ہے اور ان کی تعداد میں کمی و بیشی کا عمل بھی ملتا ہے۔ لہٰذا دوہے پر بحث کرتے وقت ان دونوں رخوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں دوہے کو وزن میں لانے کے لئے علتوں کے سقوط و اشباع کو بھی مد نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ علتوں کے گرانے کے عمل کو سمجھنے کے لئے ان مصرعوں پر غور فرمایئے۔

۱۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی : کوئی = فعلن یا چار ماترے

۲۔ رہا گر کوئی تاقیامت سلامت : کوئی = کئی = فعو یا تین ماترے

۳۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے : کوئی = کوء = فاع یا تین ماترے

۴۔ دو خور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا : کوئی = ک ء = فع یا دو ماترے

اس مثال کو سامنے رکھ کر اگر دوہوں کی لکھائی کو پڑھا جائے تو پھر بہت سے دوہے جن میں زیادہ ماترائیں نظر آتی ہیں صحیح وزن میں پڑھے جاسکیں گے۔ گویا کشیدہ علت میں تخفیف کا عمل کرنا پڑے گا۔ اس طرح دو ماترائیں یعنی گرو ایک ماترا یعنی لگھو ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہندی قواعد نویس بھی اس کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔ ہر ہندی قواعد جس میں نظم کا حصہ ہو اس میں یہ اصول مل جائے گا۔

"دبا ہوا تلفظ ادا ہونے سے گرو بھی لگھوی مانا جاتا ہے۔"[۹] اس لئے ماتراؤں کی کمی بیشی جتانے سے پہلے علتوں کے سقوط و اشباع کے عمل سے بھی جانچ پڑتال ضروری ہے۔

دوہا ابتداء سے ایک عوامی صنف ہے۔ اس کا چلن رہسوں ناٹکوں' اندر سبھاؤں' سوانگوں اور تھیٹروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے خواص میں اس کو بار ضرور حاصل رہا مگر بحیثیت صنف سخن نہیں بلکہ کہاوتوں کے روپ میں یا پھر مجروں کی محفلوں میں' کسی گیت سے پہلے اس گیت کے سنگیت کو سارنے یا گیت کا حسن یا روپ ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ یہی حال قوالی کی محفلوں کا ہے کہ رباعی یا قطعہ کی طرح آغاز دوہے سے کرلیتے ہیں۔

دوہے کو بحیثیت صنف سخن رواج دینے یا روشناس کرانے کا عمل ہمارے ادب میں مفقود ہے۔ لسانیات میں آغاز زبان کا پرتو دکھانے کے لئے اس کے کچھ نمونے زیر بحث آجاتے ہیں۔ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ لسانی نظریئے کے مطابق ہوتا ہے۔ ادبی یا فنی حیثیت سے اب تک صرف گنے چنے دو چار ادھورے مضمون پائے جاتے ہیں۔ اور بس۔ انتہا یہ ہے کہ ہمارے مشاعروں میں غزل' رباعی' قطعہ اور نظم پیش ہوتی رہی ہیں۔ مذہبی حیثیت کی اصناف سخن مرثیہ' سلام' نوحہ' قصائد' حمد و نعت و منقبت اور موجودہ نعتوں کی مجلسیں اور محفلیں ہوتی ہیں۔ دوہے کا یہاں دور دور تک سراغ نہیں پایا جاتا یہی حال اردو ادب کی تاریخ و تنقید کا ہے کہ اس قسم کی تمام کتابیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان معرض وجود میں آیا تو یہاں مشاعروں کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ان مشاعروں میں رسمی اصناف سخن کے علاوہ عالی کے دوہے کی بھی آواز گونجی اور اس نے حاضرین مشاعرہ کو گرمایا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دوہے کو ادبی دربار میں بار حاصل ہوا۔ خواص و عوام میں اس کو مقبولیت کا شرف بھی ملا اب یہ حال ہوا کہ مشاعرے میں دوہے کی فرمائشیں ہونے لگیں' اور بہ اصرار دوہا پڑھوایا جاتا اور شوق سے سنا جاتا۔ بھرپور داد دی جاتی اور محظوظ ہوتے۔ دوہے کو اس منزل پر پہنچانے والا شاعر جمیل الدین عالی کھڑی بولی کے دیس کا باسی ہے۔ عالی نے مشاعروں میں لہک لہک کر دوہے پیش کرکے ایک وسیع مقام و مرتبہ دوہوں کو دلایا۔ یہ اس لحاظ سے بھی بہت اچھا ہوا کہ یہ اردو کے لوک ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ گیت' ٹھمری وغیرہ کو بھی اردو کا لوک ادب کہا جاسکتا ہے لیکن ان میں اتنی گیرائی اور گہرائی نہیں

جتنی دوہے میں ہے۔ گیت وغیرہ صرف ایک قسم کے مخصوص جذبات پیش کرسکتے ہیں اور بس' جب کہ دوہے میں ہر قسم کے جذبات و مضامین ادا کئے جاسکتے ہیں۔

یہاں ہم حالی کے ذہنی پس منظر کا جائزہ لینا اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ حالی جو غزل کا شاعر ہے دوہوں کی طرف کیوں متوجہ ہوا اور جب متوجہ ہوا تو اس کے تحت الشعور میں کیا تھا' لاشعوری یلغار نے شعور میں کیا کیا گل کھلائے اور کیسے کیسے روپ دھارے۔

حالی کا وطن کھڑی بولی کا علاقہ ہے جس کے دو روپ ہیں ایک اردو اور دوسرا ہندی' دونوں کا مشترک سرمایہ دراصل کھڑی بولی ہے۔ عربی وفارسی الفاظ کی آمیزش سے اردو تعبیر ہے سنسکرت کے الفاظ کے ملاپ سے بننے والی زبان شدھ ہندی یا آکاش وانی ہے۔ ان دونوں میں واضح فرق صرف رسم الخط کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ عربی' فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریر اردو کہلاتی ہے اور ناگری حروف میں لکھی جانے والی ہندی کہلاتی ہے۔ یہ امتیاز بھی دراصل برہنائے عصبیت ہے۔ ورنہ بنیادی حیثیت میں زبان ایک ہی ہے۔

کھڑی بولی کا علاقہ جملہ فنون لطیفہ کے فروغ کا علاقہ ہے' یہاں کے جیالوں کی رزمیہ داستانیں تاریخ میں محفوظ اور زبانوں پر جاری و ساری ہیں۔ یہاں کی بزم آرائیاں مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تہذیب وتمدن کئے عروج وارتقاء کا ایک عظیم مرکز ہے ہر دور کی تہذیب و ثقافت کے آثار یہاں ملتے ہیں۔ مختلف اقوام کے ملاپ سے یہاں کی تہذیب ہر دور میں سنورتی اور نکھرتی رہی۔ اسی طرح مختلف ثقافتوں کے امتزاج سے یہاں کی ثقافت بہت بلند پایہ ثقافت ہے۔ ذہنی' علمی و ادبی تفوق اس خطے کی قسمت رہا ہے۔ ہر تحریک نے یہاں سے جنم پایا اور پورے برصغیر کی رہنمائی و قیادت اسی خطے کے رہنے والوں نے کی۔

کھڑی کا علاقہ وہ خطہ ہے جہاں کی عوامی تہذیب و ثقافت بھی اپنا ایک روپ رکھتی ہے۔ اس میں رہس' ناٹک' سوانگ کا بہت رواج ہے بالخصوص ہندو تہواروں پر تو ان کی بہتات ہوتی ہے چوپالوں پر آلہا اودل یا اسی طرح کی اور رزمیہ نظمیں الاپی جاتی ہیں جھولوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ دوہے اور چوبولے اونچی تانوں میں الاپے جاتے ہیں۔ بھانڈوں کی نقلیں اور فی البدیہہ شعروں کے مقابلے تفریح و تفنن طبع کا اچھا مشغلہ بن جاتی ہیں۔ رہسوں' ناٹکوں اور سوانگوں کا انداز ڈرامائی انداز ہے ان میں گیت' دوہے' چوبولے' بھجن' ہولی' پد کہروا وغیرہ اپنے اپنے انداز میں ادا ہوتے ہیں۔ جن سے عوام محظوظ ہوتے ہیں۔ عموماً تقریبات کے مواقع پر مذکورہ مشاغل کے علاوہ طوائفوں کے مجرے' بھانڈوں' نقالوں' ڈوموں کی منڈلیاں اپنے اپنے کرتب پیش کرتی ہیں۔ بھاٹوں کا شعری سرمایہ دوہوں اور چوبولوں کے علاوہ رزمیہ داستانیں ہوتی ہیں جن کے اوزان ماترائی ہوتے ہیں اور ان میں سولہ ماتراؤں کے شعر سے لے کر عموماً بتیس ماتراؤں تک کے شعر ہوا کرتے ہیں۔ جن جن حضرات کی شعوری زندگی وہاں بسر ہوئی ہے ان کے تحت الشعور میں یہ تمام باتیں جاگزیں ہیں حالی بھی ایسے ہی حضرات میں شامل ہیں۔

اس علاقے میں ایک عوامی صنف "جھولا" ہے جو گوالوں' کھیتوں کے مزدوروں' کسانوں اور دوسرے محنت کش

طبقوں کی مقبول صنف ہے یہ صنف مبارزانہ انداز کی ہوتی ہے۔ پہلا شخص اپنے جذبات' کارنامے' صفات یا جوہر بیان کرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی انداز میں اس کے بیان کی کاٹ کرتا ہے چولا فی البدیہہ ہوتا ہے۔ اونچی لے میں ادا کیا جاتا ہے۔ وزن مخصوص نہیں ایک شعر جس کا ہر مصرعہ دو برابر ٹکڑوں کا ہو اور درمیان میں وقفہ ہو وہ چولا کہلاتا ہے۔ مد مقابل بھی جواب اسی انداز میں دیا کرتا ہے۔ اس کا کہنے والا طبقہ ان پڑھ ہوتا ہے' اس لئے یہ ضبط تحریر میں نہیں آیا جنہوں نے اس کو سنا اور اس کے مقابلے دیکھے وہی اس سے آشنا ہیں۔ سننے والوں کو بھی اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ لکھ لیں۔ اس لئے اس کی مثال قدیم یا جدید زمانے سے دینی بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ میں نے جو چولے سنے ہیں ان کے ٹکڑوں میں سولہ ماترائیں تک ہوتی ہیں لیکن لے ایک ہی ہوتی ہے یہاں ہم بطور نمونہ شنید کے اندازے پر مبنی چند چولے اپنے ہی کہے ہوئے پیش کرتے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ چولا کیسا ہوتا ہے۔

چولا :

گوری گھونگھٹ کاڑھے' پنگھٹ پہ اٹھلائے
دیکھ کے گورا پنڈا' من میرا للچائے

جواب :

پاگل من ہے تیرا' کیوں تجھ کو کلپائے
وہ تو ستونتی ہے' ہاتھ نہ تیرے آئے

چولا :

میں چھیل چھبیلا گبرو' ڈھونڈھوں سندر ناری
نین کنول گال گلابی' روپ سہانا لجاری

جواب :

تو مت مارا پاگل ہے' ڈھونڈھے ملے نہ ناری
کس بل ہو' نین رسیلے' خود کھنچ آئے لجاری

چولا :

میں سندر گبرو جیوٹ ہوں' جاؤں جدھر سب اٹھ اٹھ تاکیں
لاج کی ماری سندر نائیں بھی' پٹ کی اوٹ کھڑی ہیں جھانکیں

جواب :

تو سندر گبرو جیوٹ ہے' بانکپن تو کبھی نہ بڑ ہانکیں
روپ کے بل پہ اتراتا ہے' دیکھو ڈھول ٹھنڈی پھانکیں

دیکھئے ان کی لے دوہوں سے کتنی قریب ہے۔ اس کو اگر اردو میں اپنا کر ذرا سی زبان کی تبدیلی کر لی جائے تو ہر طرح کے مضامین اس میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اور موسیقی کا رچاؤ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

دوہے کے ساتھ ایک اور صنف بھی شامل کی جاتی ہے۔ جسے "چوبولا" کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل دوہے کے مفہوم کو واضح کرنے کے واسطے بھی استعمال ہوتی ہے چوبولے میں دوہے کے وزن میں چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی دوہا اور چوبولا ہم قافیہ ہی ہوتا ہے۔ چوبولوں کی مثال آریہ سنگیت رامائن سے ملاحظہ فرمایئے۔

بہت دنوں سے رشی جی' لگی ہوئی تھی آس
درشن کرکے آپ کے' مٹا سکل دکھ تراس

چوبولا :

مٹا سکل تراس منی جی' دھن دھن بھاگ ہمارے
دشرتھ کا گھر ہوا پوتر' جب سے آپ پدھارے
دو کر جوڑ نمستے کرتا' چرنوں پڑوں تمہارے
بہت ہوئی تکلیف آپ' کشٹ اٹھائے سارے

دوہا :

کیوں اتنی تکلیف کی' کیا ہے اصل مراد
کس کارن ہم کو کیا' راجن تم نے یاد

چوبولا :

راجن تم نے یاد کیو کیا' اتنا کام تمہارا
بپت پڑی تم پر بھاری یہ کے قیاس ہمارا
ہم سنیاسی بن باسی کیا دیویں تمہیں سہارا
میرے لائق کام جو ہووے کیجئے ذرا اشارہ

ان دوہوں اور چوبولوں کی زبان قابل لحاظ ہے۔ اسی زبان کو ذرا اور سنوار لیا جائے تو یہ کھڑی کا بہت اچھا روپ ہے کہ اس میں اردو اور ہندی دونوں کا سنگم نظر آتا ہے اور اختلافات و افتراق ختم نظر آتا ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم انگریزی کے الفاظ موقع بے موقع بے دریغ استعمال کرنے میں نہایت بے باک ہیں۔ لیکن مقامی و علاقائی زبانوں کے الفاظ سے چھوت چھات برتتے ہیں۔ ان کے استعمال کو نہ صرف خلاف شان، بلکہ ایک طرح کی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ ایک دوہا اور چوبولا ہمارا بھی ملاحظہ فرمایئے :

دوہا :

ہم سید چنا دارے' جگ میں بے آرام
تن من دھن حق پر واریں تیغ تلے بسرام

چوبولا :

تیغ تلے بسرام 'بنا' کوئی نہ پوچھے بات
ہم سے دنیا پھل پائے' ہم نا پائیں پات
شکر ہے اللہ تیرا غنی' اونچی تیری ذات
ہم کو بخشی وہ نعمت' مکتی اپنے ہات

ان چھولوں' چوبولوں کے علاوہ متعدد اقسام کے گیت بالخصوص شادی بیاہ سے متعلق عوامی گیت' جن کی نسبت امیر خسرو سے مشہور ہے۔ اگر شادیوں کے موقع پر کچھ دن پہلے رات کو گیت گانے کی تقریب ہوا کرتی ہے جو کم از کم پانچ دن اور زیادہ سے زیادہ چالیس دن جاری رہتی ہے۔ رات کو برادری کی عورتیں جمع ہو کر گیت گایا کرتی ہیں ان گیتوں میں باہمی محبت و خدمت' احترام و اکرام کے جذبے دولہا دلہن کے دلوں میں ابھارے جاتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کو شوہر کی خدمت کرنے کی تلقین اس طرح دی جاتی ہے:

سونے کی تھالی میں بھوجن پروسوں

یا امیر خسرو ہی سے منسوب یہ گیت :

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

اور اس قسم کے تمام گیت جن کا تعلق عوام سے زیادہ ہے اور یہ اصطلاحاً اردو لوک گیت کہلانے کے مستحق ہیں جن کی تدوین بہت ضروری ہے۔

ان گیتوں' چھولوں' چوبولوں اور تھیٹریکل کمپنیوں کے ڈراموں میں مستعمل جملہ اقسام کے گانوں' ناٹکوں' سوانگوں کی منڈلیوں کے گیت اور ہندو عبادت گاہوں کے عوامی بھجنوں نے کھڑی کے علاقے کے رہنے والوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہے جو ان کے تحت الشعور میں محفوظ ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر صورت اظہار اختیار کر لیتے ہیں۔

عالی کم کم دوہے کہتے جب پاکستان آیا تو اس نے سرزمین کے بسنے والوں کے عوامی گیت سنے جنہیں وہ اپنا لوک ورثہ تصور کرتے ہیں۔ ملتانی کافی سندھی وائی اور دوسری اصناف سخن کا ذکر یہاں نہایت والہانہ انداز میں کیا جاتا ہے۔ عالی نے ایسی ہی چیز اردو میں پیش کرنی چاہی تو اس کی نگاہ انتخاب دوہے پر پڑی اس نے دوہے پر طبع آزمائی شروع کی تو اس کے ذہن کو ان تمام اصناف سخن نے متاثر کیا جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ عالی نے دوہے بھی لکھے اور گیت بھی۔ لیکن اسی ذہنی پس منظر کے تاثر کی ایک اور بھی دین ہے جس نے عالی سے قومی و ملی نغمے لکھوائے۔ ان نغمات میں وہی کھڑی کے علاقے

میں مروج اصناف سخن کا پرتو ہے۔ جو لاشعوری طور پر عالی نے اپنایا : گویا ان نغموں کی مقبولیت اور عروج میں اس ذہنی پس منظر کا بہت زیادہ دخل ہے۔ عالی کے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ دوسرے شعراء بھی اسی کے نغموں کی تقلید کررہے ہیں۔

آیئے اب ہم دوہے کی ہیئت اور عالی کے دوہوں پر ایک نظر ڈال کر اس کا جائزہ لیں۔ عموماً دوہا ۲۴ + ۲۴ ماتراؤں، اور چار بڑے چھوٹے ٹکڑوں پر مبنی ایک شعر کہلاتا ہے دو دوہوں کو ملا کر چوبولا بنتا ہے۔ اور اگر دوہے کے چھوٹے ٹکڑوں کو مقدم اور بڑے ٹکڑوں کو موخر کردیں یعنی دوہے کو الٹ دیں تو سورٹھ ہوجاتا ہے اور قافیہ مصرعوں کے درمیان آجاتا ہے۔ عالی نے دوہے لکھے' چوبولے اور سورٹھ نہیں۔ اور ان دوہوں میں بھی قدیم روایت کے مطابق پورے ماتراؤں والے دوہے بھی لکھے اور کم و بیش ماتراؤں والے بھی جو ہم پہلے دکھا چکے ہیں۔ اس طرح ہیئت اور وزن میں عالی نے قدیم روایت کی پابندی کی ہے۔ جس کی تقلید دوسرے شاعروں نے بھی کی۔

دوہے کی ایک قدیم ہیئت اور بھی ہے جس میں تمام لوازمات دوہے کے ہوتے ہیں لیکن بیان مسلسل ہوتا ہے اور کتنے ہی دوہوں میں مفہوم مکمل ہوتا ہے اس کے بھی دو روپ ہیں ایک تو یہ کہ ہر شعر کا قافیہ جداگانہ ہوتا ہے اور دوسرے ہر شعر کا آخری ٹکڑا ایک ہی رہتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے محبوب عالم کا لکھا ہوا مرثیہ منجانب حضرت فاطمہ علیہا اسلام پیش کیا ہے۔ جداگانہ قافیوں والی نظم کا ایک نمونہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے شکنتلا سے پیش کیا جاتا ہے۔

راجہ اندر کہتے ہیں مجھ کو خاص و عام
عیش و طرب سے روز و شب رکھتا ہوں میں کام
لیکن بسوا متر کا جب سے جانا حال
دل میں کھٹکا ہے میرے ہر دم خار ملال
راج چھوڑ کر ہوگیا جوگی وہ انسان
جپ تپ سے اس کے ہوئے دیوتا سب حیران
اس کی ریاضت سے مجھے ہے اندیشہ سخت
چھینے گا وہ ایک دن میرا تاج و تخت
دل سے میرے تب لئے یہ کھٹکا اور سوگ
توڑے جب کوئی پری اس کا اب جوگ
سو تو ہے اے منیکا پریوں کی سرتاج
باغ ریاضت جلا کر اس کا اب تاراج

اور دوسری مثال طالب بنارسی کے ڈرامے راجا گوپی چند سے ملاحظہ فرمایئے :

ہار گلے میں ڈال کے دونی شوبھا پائے
جیون نرمل آکاش پہ چھائی چاندنی آئے
سوہے باندھ بند کی شوبھا کہی نہ جائے
جیسے سندر کنول پہ بھونرا گونج لبھائے
گورے گورے ہاتھ میں کنگن کی ہے آب
جیون چندن کی ڈار پہ تازہ پھول گلاب
کانن کنڈل سا جے گورے مکھ کے پاس
شکر بہ بسپت آگئے جیون سورج واس
کنٹھا موتی کار ہے گلے بیچ پہنائے
چپل چاند کے چو طرف جیسے تارے چھائے

اس قسم کی مسلسل دوہیا نظموں کی بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن بخوف طوالت انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایسی دوہیا نظمیں عالی نے بھی لکھی ہیں لیکن ان کو کوئی نام نہیں دیا بس مسلسل بیان و مفہوم سے ان کی تعین ہوتی ہے۔ عالی کے ہاں ایسی چھوٹی بڑی تقریباً نو نظمیں ہیں یہ نظم ملاحظہ فرمایئے :

چھنن چھنن خود باجے مجیرا آپ مرلیا گائے
ہائے یہ کیا سنگیت ہے جو بن کا تنک ابھرا آئے
ایک ہی دھن یوں تھرائی ہے سوتے دکھ گئے جاگ
ایک ہی لے یوں لہرائی جیسے ناچیں ناگ
دھندلی دھندلی کمر کے پیچھے کرنوں کی جھنکار
اتھلا جل اور گہری کائی ناچیں ہار سنگار
ایک ایک تال کھرچ لے من کو اک اک سر پہ پیاس
اک اک ٹھرکی بدن جلائے جیسے آگ پہ گھاس
گت میں چندن باس کا جھونکا توڑ میں کندن روپ
نیچے سر میں چھاؤں بھری ہے اونچے سر میں دھوپ
سات سروں کے سات ستارے سات ہی جن کے رنگ
سب جھلکیں اک سرگم میں پر اپنے اپنے ڈھنگ

جا کوئی کہہ دے عالی سے بس گائے جی بہلائے
جو سنگیت کا بھید کریدے خود بے سر ہو جائے

عالی چاہتا تو اس نظم کو عنوان بھی دے سکتا تھا مثلاً سنگیت بھید' سنگیت رس یا سر سنگیت وغیرہ وغیرہ اس نے عنوان قائم نہ کر کے اس کی معنویت و تعین قاری پر چھوڑ دی۔ اسی طرح کی ایک اور نظم ملاحظہ فرمایئے :

ایک بدیسی نار کی موہنی صورت ہم کو بھائی
اور وہ چنچل نار تھی بھیا ہو نکلی ہرجائی
کیسے کیسے وقت گزارے ہم نے اس کے سنگ
کیسے کیسے ناچ رہے اور کیسے کیسے رنگ
مدرا پی کر بہکے گوری بہک بہک لہرائے
اور اپنا یہ حال کہ جیسے نس نس دل بن جائے
اس کا رمبا سمبا ٹنگویاں ٹھمری کھماج
کیا کیا جھٹکے کیا کیا لرزیں کیا گانے کیا ناچ
ہم بھی تازہ پھول سے چھیلا وہ بھی روپ بہار
لیکن پریم سے بڑھ کر پیارے پیسے کی ہے مار

عالی کے ہاں تین نظمیں چوبولی انداز کی بھی ہیں یعنی وہ دوہوں پر مبنی مگر ان کو چوبولا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ساتھ کا دوہا نہیں ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کر لیجئے :

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جی جیسے مہا کوی بھی "بابو جی" کہلائے
اے بھین یہ بابو گیری کیا کیا کھیل کھلائے
یوں تنخواہ کی راہ تکیں کہ سجنی یاد نہ آئے

اسی مفہوم کو دو دوہوں میں دوسرے انداز سے ادا کیا ہے جن کے قافیے جداگانہ ہیں :

بابو گیری کرتے ہو گئے عالی کو دو سال
مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑ گئے بال
دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ
چپکے چپکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ
اک گہرا سنسان سمندر جس کے لاکھ بہاؤ
تڑپ رہی ہے اس کی اک اک موج پہ جیون ناؤ

کیا جانے یہ چلی کہاں سے اور کہاں تک جائے
کون کنارہ چھوڑ آئی ہے کون کنارہ پائے

یہ سب عالی سے لاشعوری طور پر ہوا اگر شعوری طور پر وہ لکھتا تو ان کو بڑی آسانی سے چوبولے کا روپ دے سکتا تھا۔ عالی کا دراصل یہ تجرباتی دور تھا۔ اس نے دوہے کو بطور صنف سخن اپنا کر روشناس کرنے کا تجربہ کیا جو کامیاب رہا اور اتنا کامیاب کہ اس کا دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی دوہے لکھے اور عالی ہی کی تقلید کی۔ اسلوب و انداز میں عالی کے اجتہاد پر دوسرے شعراء نے کوئی اضافہ نہیں کیا حالانکہ اس تجربے کو آگے بڑھایا جاسکتا تھا۔ یہ شعرا عالی کے دوہوں کی مقبولیت سے متاثر ہوئے اور لکھنا شروع کر دیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عالی کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اس صنف سخن میں نئے نئے تجربات کئے جائیں۔ زبان و مفہوم میں وسعت پیدا کی جائے۔ باہمی رقابت کے جذبے کو ختم کرکے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

عالی کو احساس ہے کہ اس کی شاعری کیا ہے؟ پہلے ہی دوہے کو لیجئے جس میں عالی نے اپنی دوہا نگاری کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس شاعری کے ذریعے اپنے جذبات بیان کرتا ہے۔

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

اور یہ بھید کی بات بھی دیکھئے :

عالی جی کی کویتا میں کچھ جھوٹے سچے بھاؤ
نا تو کوئی گمبھیرتا اس میں نا کوئی اس میں رچاؤ

لیکن اس کے باوجود وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ :

بول ہزاروں روپ بھرے پر دھرم ہے میرا میت
نا مری بانی غزل ہے پیارے نا دوہے نا گیت

عالی کو اس امر کا احساس ہے کہ اس نے جو طرز اپنائی ہے وہ سب سے جدا اور نرالی ہے جسے دیکھ کر اور سن کر ہر کوئی ناک بھوں چڑھاتا اور ہنسی اڑاتا ہے۔ لیکن اس کو اطمینان ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ دیکھئے کہتا ہے

کیا بحر مر کیا شربھ بیو دھر کیا کھچ کیا بیال
اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

سور کبیر بہاری میراں رحیمن تلسی داس
سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس

اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

یہ دل والوں کی بھاشا اور طرز ادا ہے جو من کی پیاس بجھانے کا ایک ذریعہ ہے اور عالی اس میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اس کی کامیابی کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ دوسرے شعراء نے بھی عالی کی بھاشا اور طرز ادا اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بات اب تک سب تسلیم کرتے آئے ہیں۔ دوہا نگاری پر جس نے بھی لکھنے کی کوشش کی اس کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ پاکستان بننے کے بعد عالی نے دوہا نگاری کو فروغ دیا اور دوسرے شعراء نے اس کی تقلید میں دوہے لکھے۔ اوزان' انداز بیاں اور ذخیرہ الفاظ بھی عالی ہی کا اختیار کیا۔

ہم نے دوہا نگاری کی تاریخ اور اس کی ہیئت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ابھی غائرانہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے جو وقت اور فرصت کی متقاضی ہے اس طائرانہ نظر میں عالی کا ذکر از خود در آیا کہ وہ دوہا نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے قدما نے اس صنف سخن کو متعارف کرایا اور مقبول بنایا گویا اس صنف کو اس کا صحیح بلکہ بلند مقام دلانے میں عالی کا زبردست دخل ہے۔ اس لئے وہ برصغیر پاک و ہند میں دوہے کے احیاء کا علمبردار اور دور جدید کا بانی ہے۔ اس نے اس آواز اور لے کو بلند کر کے تحریص و تشویق' تحسد و تحقیر' مسابقت و مقابلہ اور تحقیق و تنقید کے جذبات ابھارے۔ جس سے دوہے کے فروغ کی راہیں ہموار ہوئیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو اس کے بالمقابل نفسیاتی رد عمل بھی جنم پاتا ہے اس رد عمل کے دو رخ ہوتے ہیں ایک قبولیت کا اور دوسرا مخالفت کا اور دونوں میں جذبہ مسابقت مشترک ہوا کرتا ہے۔ اور ایسا تب ہوتا ہے کہ قبولیت و مخالفت اس نئی چیز کو اپنانے کی غرض سے ہو۔ اگر اپنانا شامل نہیں تو جذبہ مسابقت پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف تعریف و تنقیص تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ یا اس میں تمدیح و تہدید کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات تحسین و تضحیک کا روپ بھی یہی نفسیاتی رد عمل دھار لیا کرتا ہے۔ عالی کو اس نفسیاتی رد عمل کے ہر پہلو کا سامنا کرنا پڑا ہے اور وہ اس تبرد آزمائی میں اس لئے کامیاب رہا کہ وہ اپنے فن کے ساتھ لگاؤ اور خلوص رکھتا ہے۔ جیسا ہے ویسا پیش کرتا ہے اس میں کھوٹ نہیں ملاتا اور ناقدوں کو جواب دے دیتا ہے۔

وہ جذبات کے اظہار کو ہیئت کا پابند قرار نہیں دیتا بلکہ وہ محبت کی زبان کو اولیت دیتا ہے :

بول ہزاروں روپ بھرے پر دھرم ہے میرا پیت
نا مری بانی غزل ہے پیارے نا دوہے نا گیت

جس طرح دوہا ایک منفرد صنف سخن ہے اسی طرح اس کی گائیکی بھی انفرادی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ یہ اونچے سروں میں گایا جاتا ہے اس لئے اسے گانا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اگر دوہے کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا جائے گا تو اس کے تاثر میں کمی ہو جائے گی اردو دوہا نگاروں میں صرف عالی کو یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ اس نے دوہوں کو

اپنے مخصوص ترنم سے پیش کرکے ان کے تاثر کو بڑھایا اور خاطر خواہ داد حاصل کی۔

ہم نے اوپر جس نفسیاتی ردعمل کا ذکر کیا ہے اس نے دوہا نگاری کے فروغ کے ساتھ ساتھ دوہے سے متعلق تحقیق و تنقید کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی۔ یہ میدان ابھی مزید توجہ کی دعوت دے رہا ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟

اور شعراء کو نئے تجربات کرنے کی تلقین کر رہا ہے نئے تجربوں کے سلسلے میں موضوعی ارتقا اور ہیئتی جدت پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جدید زمانے کے مسائل کو سامنے رکھ کر دوہوں میں موضوعی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ نئے موضوعات اپنے اظہار کے لئے جدید ذخیرہ الفاظ و تراکیب کا خود سامان مہیا کریں گے۔ اس طرح قدیم و جدید کے اشتراک سے ایک نیا اسلوب اور جدید لسانی سرمائے میں اضافہ کریں۔ ہمارے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات موضوعات کی تبدیلی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ہم اس تبدیلی زبان کی وضاحت کے لئے چند اپنے دوہے پیش کرتے ہیں۔

مردے برسوں کے کھودیں' ڈھونڈھیں نام نشان
اک وہم کی گلکاری ہے' کیا اپنی پہچان
انسانوں کے سمندر میں' ہیں گوہر نایاب
اوجھل ہوں ور یتیم' ساحل ہے پایاب
ہم مر کر بھی زندہ ہیں' تم زندہ درگور
زور ہمارا ذہنوں پر' غور کرو کچھ غور
طے کرکے فضا اور خلا' سیاروں پر پہنچے
انساں دکھیارے کیوں ہیں؟ یہ کوئی نا سوچے
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن' رنگ میں ڈوبا عالم
باد بہاری تن پھونکے' چشم ہے میری پرنم
ساون رت کا بادل ہوں' گاؤں میگھ ملہار
دنیا کے دکھ دور کروں' لاؤں موج بہار
برکت سوز الفت کی' دل میرا پر تاب
میں قطرہ قطرہ ٹپکوں' دنیا ہو سیراب
پالا حیواں مرجائے' رنج سے ہووے بے جان
خون بہا کر بھائی کا' کیونکر خوش ہے انسان؟

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر ہم چاہیں تو دوہے کو قدیم روایتی زبان سے بآسانی جدید زبان میں ادا کر کے حسن و خوبی پیدا کرسکتے ہیں اور یہ ایک امتیازی حیثیت شمار کی جائے گی۔ لہٰذا دوہا نگاروں کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہیئتی لحاظ سے دوہے وزن میں کے غزل' نعت' نوحہ وغیرہ لکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یعنی غزل کی طرح قافیہ اور ردیف کا التزام رکھا جائے یہ ایک اچھا تجربہ ہوگا۔ چوتھا ٹکڑا ردیف و قافیے پر مبنی ہو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی طرح دوہے بطور قطعہ بھی لکھے جاسکتے ہیں اور بطور نظم بھی۔ نظم کا نمونہ تو ہم نے عالی کے دوہیا نظموں کے سلسلے میں پیش بھی کیا ہے۔ دوہے کے وزن میں نظم مقفی اور نظم معری کی تو گنجائش ہے مگر آزاد نظم کی گنجائش نہیں۔ البتہ آزاد نظم میں ادا کئے جانے والے تمام جذبات و خیالات دوہے میں اس لئے بآسانی ادا کئے جاسکتے ہیں کہ اس کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو اوپر نیچے ترتیب دیا جائے تو خود بخود آزاد نظم کی ہیئت پیدا ہو جائے گی جس کے لئے کسی تکلف کی ضرورت ہی نہیں۔

ہمارا یہ جائزہ بابا فرید الدین گنج شکر سے لے کر عالی کے دور تک محیط ہے۔ ہم نے عالی تک اس لئے محدود رکھا کہ اس سے دوہا نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تجرباتی دور ہے۔ آئندہ جو بھی اردو کی ادبی تاریخ لکھے گا وہ جدید دوہے کا بانی عالی ہی کو قرار دے گا۔ اب بھی بعض ناقدین نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلے عالی نے دوہے لکھے اور دوسروں نے اس کی انداز' اسلوب' مفہوم اور زبان کو اپنایا۔ دوہا نگاری میں یہ عالی کی عظمت کا کھلا اعتراف ہے۔ ہم اس میں صرف اتنا اضافہ اور کریں گے کہ دوہے کو بحیثیت صنف سخن ایک خاص مقام بھی عالی ہی کی بدولت ملا۔

کتاب "جمیل الدین عالی فن اور شخصیت"

مرتبہ ایم حبیب خاں

علمی مجلس دلی سنہ ۸۸

احمد ہمدانی

عالی کہ ایک قلب سراپا کہیں جسے

جمیل الدین عالی اپنے پورے وجود کے ساتھ شاعر ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ بہت سے لوگ ہمارے اس خیال و بیاں پر بھوئیں چڑھائیں گے لیکن سچائی کا اظہار کسی کی خوشی ناخوشی کا پابند نہیں ہوتا۔ عالی کی شاعری دراصل حسن پرستی، حسن کاری اور حسن آفرینی کے انتھک عمل پر مبنی ہے۔ حسن کی تلاش اور پھر حسن کے سحر میں خود کو کھو دینا اس کا وظیفہ حیات ہے۔ وہ خود کو حسن کے سحر میں کھو ضرور دیتا ہے لیکن اس کی خود رفتگی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو کچھ اس طرح نکھارتی اور ابھارتی ہے کہ وہ اپنے اشعار کی صورت میں خود کو از سرِ نو دریافت کرتا نظر آتا ہے۔ خود کو حسن کے سحر میں گم کرنا اور پھر اس سحر زدگی کے عالم میں اپنی بازیافت ایک سچے فنکار کی پہچان ہے۔ ہم عالی کو پورے وجود کے ساتھ شاعر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر لحہ حسن کے سحر میں گم ہو کر از سرِ نو خود کو پانے کے عمل میں مصروف رہتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہر اک مقام میسر ہے یادِ جاناں میں
اسی میں باخبری ہے اسی میں بے خبری

عمر بھر کے لئے کافی ہے وہی ایک جھلک
تم پہ لازم نہیں ہر شے سے نمایاں ہونا

سوائے اس کے یہاں دعویٰ بہار نہیں
کہ ایک میں بھی ہوں اپنا چمن سجائے ہوئے

غزل کا ورد غزل کا گداز لایا ہوں
ترے لئے تری تصویر ناز لایا ہوں
تنگ ہے نسبت معنی ادا سے ربط کلام
وہی گداز وہی سوز وساز لایا ہوں
بیاں میں شہد وترنم اثر میں کرب تمام
تری ہی اصل ترا ہی مجاز لایا ہوں
یہ طرز عطف و اضافت نہیں مری ایجاد
وہی تسلسل زلف دراز لایا ہوں

وقت نے مٹا ڈالے وہ گلاب سے رخسار
اب تو زرد چہروں کی دلکشی غنیمت ہے
حسن وعشق کا مفہوم کیوں سمجھ کے ہوں مغموم
ایسے چند لفظوں کی نغمگی غنیمت ہے

یوں بھی وہ مہر و ماہ سے کچھ کم نہیں مگر
میری نظر میں ان کا سراپا ہی اور ہے

مندرجہ بالا اشعار میں پہلا شعر دیکھیے جس سے ہمارے خیال کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی ہے کہ عالی حسن کے سحر میں خود کو کھو کر از سر نو خود کو دریافت کرنے کے عمل میں مصروف ہے۔

ہر اک مقام میسر ہے یاد جاناں میں
اسی میں باخبری ہے اسی میں بے خبری

اسی بات کو وہ دوسرے اشعار میں دوسری طرح کہتا ہے مثلاً "شورش دل کی چارہ گری بھی دل ہی کرے گا" "غزل کا ورد غزل کا گداز محبوب کی تصویر ناز کا حلیہ ہے" یا "تنگ ہے نسبت معنی ادا سے ربط کلام" وغیرہ تمام ایسے اشارے ہیں جو عالی کی تلاش حسن اور اس کی حسن کاری و آفرینی کے چلن کو واضح کرتے ہیں۔

اس کے تصور حسن میں دوسرے عناصر کے علاوہ نغمگی و ترنم یا موسیقیت کو خاص اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے نزدیک لفظوں کی موسیقیت' ان کا آہنگ اور ان کے درمیان ایک مبہم سا ربط لفظوں کے عام مفہوم ومعنی سے زیادہ اہم ہے۔ وہ الفاظ کے ترنم کو ان کے معنی کی قطعیت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ اس رمز سے پوری طرح واقف ہے کہ لفظوں کی موسیقیت احساس کی صورت گری زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہے۔ لفظوں کے

آہنگ اور ان کی موسیقیت پر توجہ دیے بغیر اگر ان کو عام معنی میں استعمال کیا جائے تو وہ شاعری نہیں بلکہ بیان واقعہ کہلائے گا۔ شاید اسی نزاکت کے پیش نظر ملارمے نے کہا تھا to suggest is to Create , To name is to destory یعنی کسی احساس کو دو ٹوک انداز میں کہہ دینا اسے برباد کر دینے کے مترادف ہے جب کہ اس کی طرف اشارہ کرنا تخلیقی عمل ہے۔ لفظوں کی موسیقی دراصل اشاریت کی زبان ہے اور عالی اشاریت کی اس زبان سے کماحقہ واقف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جہاں وہ لفظوں کے آہنگ سے اپنے احساس کی صورت گری بڑے موثر انداز سے کرتا ہے۔

ذہن پر چھا گئی موت کی بے حسی نیند آنے لگی
ڈھونڈتا ہوں اندھیروں میں آسودگی نیند آنے لگی

ہیں اسی عہد میں سو تصور حسیں کوئی اپنا نہیں
تھک گئی ہے مرے شوق کی سادگی نیند آنے لگی

ختم ہیں روز و شب کی پریشانیاں اور حیرانیاں
تھی وہ کیا شے جو اب تک نہیں مل سکی نیند آنے لگی

حیرت انگیز رنگوں میں لپٹی ہوئی مضطرب تشنگی
آج تک اپنی لے میں نہیں ڈھل سکی نیند آنے لگی

حوصلوں ہی کا انجام ہیں تجربے، تجربے بس بھرے
آشتی، آشتی، آشتی، آشتی نیند آنے لگی

کیا ملا نغمہ و رنگ کے شوق سے شعر کے ذوق سے
اک جلن، اک گھٹن، ایک واماندگی نیند آنے لگی

یہ پوری غزل لفظوں کے آہنگ اور ان کی موسیقیت کے جادو کے بہت دلاویز نمونے ہیں۔ اس میں الفاظ اپنے متعین معنی سے ہٹ کر اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ شاعر کا احساس قارئین کے دلوں میں دبے پاؤں اتر کر ان کو اپنا شریک سفر بنا لیتا ہے اور شاید شاعری کا مقصد بھی حال دل بیان کرنا نہیں بلکہ حال دل میں دوسروں کو شریک کرنا ہوتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا
کب یہ در و دیوار سجیں گے کب یہ چمن لہرائے گا

سوکھ چلے وہ غنچے جن سے کیا کیا پھول ابھرنے تھے
اب بھی نہ ان کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا

سمجھا ہے اپنے آپ سے چھٹ کر سارا زمانہ دیکھ لیا
دیکھنا اپنے آپ میں آکر یہ کیا کیا شرمائے گا
رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سوتا نرم خیالوں کا
دن ہوتے ہوئے یہ کس کس دھارے سے مل جائے گا

کیا ہے وہ اک غم دروں جس کے جلو میں سو جتوں
کیا ہے وہ آگ اور کیوں جس کا رکھا ہے عشق نام

یہ تمام اشعار بھی تلاش حسن میں خود کو کھو کر از سرِ نو خود کو دریافت کرنے کے عمل کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ عالی نے یہ عمل لفظوں کے تمام مفہوم سے ہٹ کر ان کے آہنگ کو ابھار کر انجام دیا ہے۔ مثلاً گھر واپس آنے سے مراد اینٹ پتھروں کے درودیوار والا گھر نہیں۔ بلکہ اپنے وجود اور اپنی شخصیت کے خدوخال ہیں۔ دوسرے شعر میں بھی خود رفتگی کے عالم کی تصویر کشی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگر یہ خود رفتگی از سرِ نو اپنی دریافت نہ کر سکی تو وجود کا چمن صحرا ہو کر رہ جائے گا تیسرے شعر میں تو نہایت واضح انداز میں بتایا دیا گیا ہے کہ از سرِ نو اپنی دریافت کے بعد خود سے بے خبر رہنے پر سخت ندامت کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ سب اشعار عالی کی فکر' اس کے رویے اور اس کی تلاش حسن کے نہایت اثر انگیز واثر آفریں مرقعے ہیں۔ آخری دونوں شعر بھی اسی احساس کے ترجمان ہیں۔

ملارمے ایک ایسا شاعر ہے جس نے لفظوں کے آہنگ سے اعجاز بیانی کا کام لیا ہے۔ وہ آہنگ کی کارفرمائی کا اس درجہ قائل تھا کہ اگر اس کو اپنے احساس کی صورت گری کے لئے لغت میں کوئی لفظ نہیں ملتا تھا تو وہ صوتیات کی مدد سے نئے لفظ ایجاد کر کے لغت میں اضافہ کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ عالی صوتیات کی مدد سے اپنے الفاظ تو ایجاد نہیں کرتا ہے لیکن موسیقیت' نغمگی اور ترنم کا رس اس کے لہو میں شامل ہے جس سے وہ پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے بلکہ اس کے لہو میں رچی ہوئی موسیقی ہی اس کا بیش قیمت سرمایہ ہے جو اس کی شاعری کو ایک عجیب ذائقہ سے آراستہ کرتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے۔

ہائے یہ سیل رنگ و نور' ہائے یہ لذت حضور
کچھ ترے نام کا سرور' کچھ مری گرئ کلام
ذہن تمام بے بسی' روح تمام تشنگی
سو یہ ہے اپنی زندگی ' جس کے تھے اتنے انتظام

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دمساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز
کبھی طلسم غرور اور کبھی فسون نیاز
ادائے سادگی دوست تری عمر دراز
خزاں میں منظر گل درد ناک ہے لیکن
یہیں سے ہے مری روداد شوق کا آغاز
بہ ایں فسردہ دلی کیا غضب ہے اے عالی
مجھے دیے چلی جاتی ہے زندگی آواز

مری نوائے محبت کبھی نہ پست نہ تیز
بس اک رہی ہوئی کیفیت الم انگیز

ہمیں سے تذکرہ قصہ عاشقاں توبہ
ہمیں تو کل ترے کوچے سے یار گزرے ہیں

عمر بھر تہمت وحشت سے نبھائی ہم نے
گو ہمیں رنج گراں باری زنجیر بھی تھا

لیا نہ وعدہ دیدار جان کر ورنہ
پھر انتظار کا یارا ہمیں کہاں ہوتا

ہائے وہ مشغلہ طنز و تمسخر مجھ سے
جو بنا تذکرہ صدق و صفا میرے بعد
اتنی بے مہری و بے گانہ مزاجی کا سبب
یوں کہا اس نے کہ بس کچھ نہ کہا میرے بعد

اب این و آں کا کس لیے رہنے لگا خیال
اس لذت تصور جاناں کو کیا ہوا

وہ فکر اور وہ حوصلہ مندی کہاں گئی
راتوں کے سوز صبح کے ارماں کو کیا ہوا

وہ تری یاد جو اب تک سکونِ قلبِ تپاں تھی
تری قسم ہے کہ اب وہ بھی ناگوار ہے، آجا
ہزار طرح کے افکار دل کو روند رہے ہیں
مقابلے میں ترے رنجِ روزگار ہے، آجا

کیا کیا رہی نشاطِ نظارہ اور آج کل
یہ بھی نہیں خبر وہ ملے تھے کہاں مجھے
جانکاہ تھی کبھی جو تری کم توجہی
کیا بات ہے کہ آج نہ گزری گراں مجھے
کیا کیجیے ان سے تذکرۂ کاوشِ فراق
کہہ دیں گے وہ اسیرِ زمان و مکاں مجھے
اچھا مجھے قبول عذابِ رہ و مقام
اب تم بتا بھی دو کہ ملو گے کہاں مجھے

عالی تیری یاد رہی اک عرصے تک دیوانوں میں
ایسے وحشی کم دیکھے جو رہ نہ سکیں ویرانوں میں
کیفیت کی بات الگ ہے چاہو جس پہ دل رکھو
ہم کو بھی تو پیار سے دیکھو ہم بھی ہیں انسانوں میں

نگاہِ دوست کوئی خاص بات ہے ورنہ
تو بے قرار کرے اور مجھے قرار آئے

ہم مٹ گئے اس فطرتِ آشفتہ کی خاطر
حالانکہ وہ غارت گرِ جاں کچھ بھی نہیں ہے

تم کو آزردگی دل کا مزا کیا معلوم
کاش تم سے بھی کوئی کام بتائے نہ بنے

دل آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے
جب ترا ذکر چھڑا نام کئی یاد آئے

مندرجہ بالا اشعار ہی میں نہیں بلکہ عالی کے پورے کلام کے دوران میں ہمیں جی ایس فریزر کی یاد بار بار آتی ہے جس نے اپنی مشہور تصنیف "جدید ادیب اور اس کی دنیا" میں ایک عجیب نکتہ ابھارا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "بظاہر تو یہ بات الٹی نظر آئے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت خود اپنی خاطر ماضی سے زندہ اور خیال افروز دلچسپی کا نام ہے۔ جدیدیت کی تحریک کا نہایت اہم اور نمایاں پہلو ماضی کا بالکل نئے انداز سے احترام کرنا ہے"۔ فریزر کا یہ خیال بیمار سوچ کے حامل بزعم خوش جدیدیت کے علمبردار حضرات سے بالکل مختلف اور ٹی ایس ایلیٹ کے روایت وجدت کے تصور سے زیادہ قریب ہے۔ اگر ہم فریزر کے اس خیال کی روشنی میں عالی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس نتیجہ تک پہونچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ وہ صحیح معنی میں صحت مند جدیدیت کا نمائندہ شاعر ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا اشعار میں آپ کو کئی اشعار غالب کی زمینوں میں ملیں گے جو ماضی سے عالی کے تعلق اور اس کے دل میں موجود ماضی کے زندہ امور خیالی اور احترام کا اشاریہ ہیں۔ ان اشعار میں عالی نے غالب سے ہٹ کر اپنی جدید حسیت کو ابھارا ہے اور کبھی غالب اور دوسرے اساتذہ کے اشعار کو سامنے رکھ کر مضمون آفرینی کا وہ کرشمہ دکھایا ہے جسے ایذرا پونڈ نے اپنی شناخت بنایا تھا اور مضمون آفرینی کی دھن میں ماضی کا طویل سفر طے کرکے چین و یونان کے قدیم ادب کو چھانا اور پھر قدیم ادب میں بیان کردہ موضوعات کو اپنے طور پر چمکایا بلکہ انہیں عہد حاضر کے لئے قابل قبول بھی بنایا ہے۔ عالی نے مضمون آفرینی کی لگن میں ایذرا پونڈ کی طرح ماضی کا طویل سفر تو طے نہیں کیا البتہ اردو کے کلاسیکی ادب سے خیال اور تعلق استوار کرکے مضمون آفرینی کے جوہر اپنے دکھائے ہیں۔ مثلاً اس کے یہ اشعار:

ہائے وہ مشغلہ طنز و تمسخر مجھ سے
جو بنا تذکرہ صدق وصفا میرے بعد
اتنی بے مہری و بے گانہ مزاجی کا سبب
یوں کہا اس نے کہ بس کچھ نہ کہا میرے بعد

یہ دونوں شعر غالب کی ایک مشہور غزل کی فضا کو اپنے طور پر ابھارنے کی نہایت خوبصورت مثال ہیں۔ یا پھر غالب کا یہ شعر دیکھئے۔

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

حالی نے اس شعر کو سامنے رکھ کر مضمون آفرینی کا نہایت دلکش نمونہ پیش کیا ہے۔

ہزار طرح کے افکار دل کو روند رہے ہیں
مقابلے میں ترے رنج روزگار ہے آج

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کا شعر آیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس نے اس شعر میں دنیائے عشق کی ایک بہت بڑی حقیقت کو انوکھے انداز میں بیان کیا ہے لیکن حالی نے غالب کے برخلاف صنعتی معاشرہ کے اسلوب حیات کو سامنے رکھ کر روزگار کو غم محبوب کے مقابلہ میں دکھایا ہے اور اس طرح محبوب کو اپنے پاس بلانے کا بہانہ تلاش کیا ہے جو روایتی تصور عشق سے بالکل مختلف رویہ کا مظہر اور مضمون آفرینی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

مندرجہ بالا اشعار میں آپ کو کئی شعر ایسے ملیں گے جو ہماری روایتی اقدار کی نفی کرتے ہیں تاہم اگر ہم اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر یقین کریں تو حالی کا روایتی اقدار سے نفی کا عمل درست نظر آئے گا۔ مثلاً روایتی اقدار کے تصور وفا کے مطابق ایک سے زیادہ افراد سے پیمان وفا باندھنا محبت نہیں بلکہ ہوس کہلائے گا جب کہ عملی زندگی میں مختلف افراد سے پیمان وفا باندھنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ حالی کا یہ شعر دیکھئے۔

دل آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے
جب ترا ذکر چھڑا نام کئی یاد آئے

حسن کے مختلف پیکروں پر تلاش حسن کے مسافر کی نظریں جم جانا اس کے جذبہ کی سچائی کی علامت ہے جسے ہوس سے تعبیر کرنا درست نہیں البتہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ حسن سے رابطہ پیدا کرنے کے عمل میں کوئی کھوٹ تو نہیں ہے۔ حالی کو جب ذکر محبوب پر کئی دوسرے نام یاد آتے ہیں تو حسن سے اس کے ربط میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا حسن کا اندازہ دل آشفتہ پہ کئی الزام یاد آنے سے ہوتا ہے۔ الزام کا لفظ حالی کے جذبہ کی صفائی کو واضح کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حسن سے تعلق پیدا کرنا کوئی جرم نہیں۔ اس کے اس رویہ پر تنقید کی حیثیت الزام تراشی سے زیادہ نہیں۔ اگر حسن پرستی کوئی گناہ ہے تو حالی سے یہ گناہ نیکیوں کی طرح سرزد ہوتے ہیں جس کا اظہار وہ بلا جھجک کھل کر کرتا ہے مضمون آفرینی کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

حالی نے اسے خاص عشقیہ فضا سے نکال کر انسانی سطح پر پیش کیا ہے وہ کیا ہے

کیفیت کی بات الگ ہے چاہو جس پہ دل رکھو
ہم کو بھی تو پیار سے دیکھو ہم بھی ہیں انسانوں میں

یا پھر جگر کا یہ شعر دیکھیے۔

شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

عالی کہتا ہے۔

نگاہ دوست کوئی خاص بات ہے ورنہ
تو بے قرار کرے اور مجھے قرار آئے

مضمون آفرینی کو فن شاعری کا قابل قدر کمال تصور کیا جاتا تھا لیکن اردو شاعری میں کچھ دنوں سے اس کمال فن سے مجرمانہ حد تک غفلت برتی جا رہی ہے۔ جس کا سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے بہت سے بزعم خویش جدید شاعر تن آسانی کے شکار اور بر خود غلط خیالات کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے اساتذہ تو اکثر اپنے اسلاف کے شعر سامنے رکھ کر شعر کہتے اور اسلاف کے مضامین سے کوئی نیا رخ نکالتے تھے بیدل کا یہ شعر دیکھیے

زندگی در گردنم افتادہ بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

شاید اسی شعر کو سامنے رکھ کر غالب نے کہا ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر میں "در گردنم افتادہ" کو "غم ہستی" سے بدل کر غالب نے یاس وحرماں کی جگہ زندگی کے مثبت پہلو کو جس طرح ابھارا ہے وہ مضمون آفرینی کا قابل تحسین کارنامہ ہے اسی طرح نظیری کا ایک لاجواب شعر ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس شعر کو سامنے رکھ کر میر صاحب کہتے ہیں۔

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر ساری بسر کیجیے

میر صاحب نے "کرشمہ دامن دل می کشد" کو "وہیں عمر ساری بسر کیجیے" سے بدل کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

عالی کے ہاں مضمون آفرینی کا عمل خالص تخلیقی عمل ہے۔ وہ "جادۂ نو" کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن وہ دیکھتا ہے کہ وہ جو بھی نیا راستہ تلاش کرتا ہے وہاں اسے کوئی نہ کوئی کارواں مل جاتا ہے۔ وہ اس کارواں میں گم ہونے کی بجائے اپنی شناخت اور اپنی انفرادیت کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے جو موقع بموقع مضمون آفرینی پر منتج

ہوتی ہے اس طرح اس کی مضمون آفرینی ماضی سے زندہ اور خیال افروز رشتہ برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ اس کے اس رویہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تصور روایت حرکی ہے جو ہر لحظہ بدلتی اور ارتقائی مراحل طے کرتی زندگی کے ساتھ آگے بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ وہ غالب کی طرح اس حقیقت کا قائل "ہر کس کہ شد' صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد"۔ لیکن دین بزرگان خوش نہ کرد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جادۂ نو کی تلاش میں دین بزرگان کی اہمیت کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ اس کے برعکس شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ نیا راستہ دین بزرگان میں موجود تضادات کے شعور ہی سے متعین ہوتا ہے یعنی جب کوئی ایک نظام اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے تضادات ابھرنے لگتے ہیں اور ان تضادات کے شعور سے نئے نظام کی راہ ہموار ہوتی ہے گویا عالی کے ہاں روایت کا عمل اپنی نوعیت میں جدلیاتی عمل ہے اور عالی اس جدلیاتی انداز فکر کو اپنی تخلیقی خلیت کی اساس بنائے ہوئے ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ عالی کے لہو میں رچی ہوئی نغمگی اس کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس کے اس بیش قیمت سرمائے کی کارفرمائیاں آپ نے اس کی غزلوں میں ملاحظہ فرمائیں لیکن اس نے اپنے اس بیش قیمت سرمایہ کے بل پر ایک نئی صنف سخن بھی ایجاد کی ہے جسے "اردو دوہا" کہنا چاہیے۔ "اردو دوہا" اس لئے کہ دوہے کے نام سے ہندی زبان میں ایک صنف پہلے سے موجود تھی جس کا وزن' اور جس کے فنی قواعد وضوابط حتیٰ کہ موضوعات تک متعین ہیں۔ ہندی دوہوں سے متعلق ہمارا مطالعہ نہایت ناقص ہے چنانچہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کہنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے البتہ اپنے تھوڑے بہت علم کی روشنی بھی ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندی دوہوں کی موسیقیت ماتراؤں کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔ اس میں ہر مصرعہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں بالعموم ۱۳ ماترائیں اور دوسرے حصہ میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں اور ان دونوں حصوں کے درمیان وقفہ رکھا جاتا ہے لیکن اردو کا مزاج مختلف ہے۔ اس میں موسیقیت کی بنیاد ماترائیں نہیں بلکہ اسباب واوتاد کی ترتیب و تعداد ہوتی ہے۔ اردو کے ارکان کا تعین اسباب واوتاد سے کیا جاتا ہے۔ عالی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندی اور اردو بحروں کے مزاجوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے دوہے کو اردو کے مزاج میں ڈھال دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے دوہے کو اردو کے مزاج میں ڈھالنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی ہو کہ ہمارے ہاں اردو کے کئی شاعروں نے ہندی دوہوں کے وزن اور اس کے قواعد وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے دوہے لکھے لیکن ان کے دوہوں کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس سلسلے میں ہم ماضی قریب میں خواجہ دل محمد اور اپنے عہد میں الیاس عشقی کے دوہوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان حضرات نے ہندی دوہوں کے وزن اور ان کی ساخت کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر دوہے لکھے لیکن وہ عوام وخواص میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں عالی کے لہو میں رچی ہوئی موسیقیت نے اسے اردو دوہے لکھنے کے لئے ایک نیا راستہ دکھایا اور اس کی ہندی وزن کے اردو کی بحر متدارک میں فعلن فعلن کے ساڑھے سات ارکان پر مشتمل دوہے لکھے جن کی موسیقی اردو کے مزاج کے عین مطابق تھی چنانچہ اس کے

دوہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایسی مقبولیت حاصل کرلی کہ اردو ہی نہیں ہندی کے شاعروں نے بھی عالی کا اتباع کرتے ہوئے بحر متدارک ہی میں دوہے لکھنے شروع کردیے۔ یہ اس کا ایک حیرت انگیز رجحان ساز کارنامہ ہے۔

وزن اور ساخت سے قطع نظر عالی کے دوہوں کے موضوعات بھی بیشتر پرانے ہندی دوہوں سے مختلف ہیں۔ اس نے اپنے دوہوں میں بھی اپنی تلاش حسن اور اپنی حسن پرستی کے جذبے ہی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کی حسن پرستی اس کے جنسی جذبہ سے خالی نہیں ہے لیکن جنسی جذبہ بھی اپنی جگہ کوئی حقیر یا غیر اخلاقی جذبہ نہیں ہے بشرطیکہ اس جذبے میں کوئی کھوٹ شامل نہ ہو۔ اگر اس جذبہ میں کوئی کھوٹ شامل ہو جاتا ہے تو یہ جذبہ بلاشبہ حقیر اور کثیف ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اگر جنسی روابط میں فریقین میں سے کسی کے ہاں بھی جنسی جذبہ سے الگ کسی طرح کی بھی مصلحتیں شامل ہوں تو ان کا رویہ پاکیزہ کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی فریق کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہے' اپنے جذبہ ملکیت کو آسودہ کرنا چاہیے یا کسی پر غالب آکر اپنی انا کو تسکین دینا چاہے تو یہ نام نہاد جذبہ نہایت مکروہ صورت اختیار کرلیتا ہے۔ عالی کے ہاں جنسی جذبہ خالص جنسی جذبہ ہے جو دراصل اس کی حسن پرستی کی بنیاد ہے۔ شاید عالی کے اس جنسی جذبہ کی پاکیزگی اور معصومیت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر عسکری نے کہا تھا کہ "وہ ہرے بھرے اور جیتے جاگتے احساسات جو عالی کے دوہوں میں ملتے ہیں وہ ان کی غزلوں میں بھی نہیں۔ اپنی جمالیاتی حس کے آزادانہ اظہار کے لئے عالی نے چنا ہی اس صنف کو ہے"۔ عالی کی جذباتی معصومیت جو غزلوں میں بھی نمایاں ہے یہاں آکے دوچند ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ دوہے ہمارے زمانے کی اردو شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یوں کہنے کو دوہے اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی کہے ہیں لیکن عالی کا سا رچاؤ اور بے ساختگی کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہ دراصل عالی کے جذبات کا ہرا بھرا اور جیتا جاگتا ہونا اور ان میں رچاؤ' بے ساختگی اور معصومیت کا پایا جانا اس کے جنسی جذبے کا مصلحتوں کے کھوٹ سے پاک ہونے کی داخلی شہادت ہے۔ چند دوہے ملاحظہ ہوں۔

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھینچے تن کی جیسے مدرا کرے اتار

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

ٹھنڈی چاندنی، اجلا بستر، بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں جن کو ترس گئے مرے نین

روپ بھرا مرے سپنوں نے پا آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نا کوئی دکھ نا سوگ
وہ ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

کہو چندر ماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری ناری کو دیکھ آئے

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

نا مرے سر کوئی طرۂ کلغی نا کیسے میں چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری ساںوری اور اللہ کا نام

آخری دوہا عالی کے خالص جذبہ کا پوری طرح مظہر ہے۔ اس کا جنسی جذبہ اقتدار و دولت سے الگ اپنی محبوبہ اور اللہ کے نام ہی کو اپنے لئے کافی سمجھتا ہے اسی لئے عالی اپنے جنسی جذبے کے اظہار میں نہایت بے باک ہے ایک دور میں اس نے مختلف مقامات کی عورتوں کو دیکھا اور شاید برتا بھی ہے جس کے بعد اس نے ان کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کی ہے۔

یہ گدرایا بدن ترا یہ جوبن رس یہ چال
اری مراٹھن ہم پردیسی سن تو ہمارا حال

گھاٹن نرم بدن کی جیسے دودھ اور شہد کی دھار
دیہاتن سخت بدن کی جس پہ کند پڑے تلوار

واہ کی کنواری جس کے اک اک انگ میں کیا کیا لوچ
جس پر آنکھ کا اک پل پڑنا جیون بھر کی سوچ

برقعہ پوش پٹھانی جس کی لاج میں سوسوروپ
کھل کے نہ دیکھی پھر بھی دیکھی ہم نے چھاؤں میں دھوپ

بیر بہوٹی رنگت والی اک ناری انگریز
بات میں کتنی سیدھی سنبھلی گھات میں کتنی تیز

جرمن کی کیا ٹھوس جوانی کیا رنگت کیا ہاڑ
اس کے بوجھ سے دل پھٹ جائیں چیز ہی کیا ہے پہاڑ

ایک فرانسیسی ابلا تھی الگ تھلگ چپ چاپ
ایسے پیارے لوگ دکھی ہوں ہائے رے یہ کیا پاپ

پورب کی ابلا دکن کی ابلا یا پنجاب کی نار
عالی اپنے من پر سب کے گہرے گہرے وار

ان دوہوں کا بے ساختہ پن اور بھرپور اظہار عالی کے حسین جذبے کے خلوص' اسکی حسن پرستی' حسن کاری اور حسن آفرینی کے عمل کا عطیہ نہیں تو کیا ہے؟

عالی کی تلاش میں جس کا دائرہ صرف اشیاء مناظر اور افراد کے حسن تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے کے حالات میں بھی حسن تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے کبھی جب اسے معاشرے میں قدم قدم پر بدصورتی نظر آتی ہے تو وہ شدید دکھ محسوس کرتا ہے اس کے اس دکھ کی جھلک اس کی غزلوں' دوہوں اور نظموں میں جگہ جگہ محسوس کی جاسکتی ہے۔ چند دوہے ملاحظہ فرمایئے۔

کوئی بھی سندر نار کسی بدصورت کے گھر جائے
نیائے کہو یا لالچ سمجھو میرے من کو نا بھائے

کیسے کیسے دیپ جلے پر رہا وہی اندھیر
بڑے بڑے وہی ڈوری پکڑے چھوٹوں کے وہی پھیر

گاؤں کی سب سے سندر ابلا مار گئے سرکار
گاؤں کی نمبر اول گیا لے گیا تھانے دار

بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ
ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ

آلہا اودل گانے والے پیادے سے گھبرائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے ڈر جائیں

کھیت کٹا تو لے گئے ٹھاکر منشی ساہوکار
گھر پہنچے تو بھوکی بہو اک برچھی سی دے مار

معاشرہ کی بد صورتی عالی کو سخت دکھ پہنچاتی ہے لیکن وہ اس بد صورتی سے نجات حاصل کرنے کے لئے عملی جدوجہد کے حوصلے سے خود کو محروم پاتا ہے اور اپنی اس کمی کا اظہار بھی کھل کر کرتا ہے شاید خود حوالے سے یہ ایک علامتی بیان بھی ہے جو ایک پورے طبقے پر محیط ہے۔

اپنا تو جیون ہے عالی سادھو کا بیوپار
اپنے ایسے ڈھنگ کہاں جو کرتے دیش سدھار

اپنی کمی اور کمزوری کا اس طرح کھل کر اظہار عالی کی ذات میں سرایت ذاتی یا سماجی سچائی کی گواہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے جنسی تجربات کے سلسلہ میں بھی اس سچائی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ کسی مغربی عورت سے اس کی جنسی وابستگی کی تصویر ملاحظہ ہو۔

ایک بدیسی نار کی موہنی صورت ہم کو بھائی
اور وہ پہلی نار تھی بھیا جو نکلی ہرجائی
کیسے کیسے وقت گزارے ہم نے اس کے سنگ
کیسے کیسے ناچ رچے اور کیسے کیسے رنگ

مدرا پی کر بہکے گوری بہک بہک لہرائے
اور اپنا یہ حال کہ جیسے تس تس دل بن جائے
اس کا رمبا "سمبا" ٹینگو یاں ٹھمری، کھماج
کیا کیا جھٹکے کیا کیا لہریں کیا گانے کیا ناچ
ہم بھی تازہ پھول سے چھیلا وہ بھی روپ بہار
لیکن پریم سے بڑھ کر پیارے پیسے کی ہے مار

ان دوہوں میں اپنے تجربے کے سچے اظہار کے ساتھ اس نے دوہے کی صنف کو ایک نئے ذائقہ سے بھی آشنا کیا ہے بالعموم دوہا اپنی جگہ ایک کل ہوتا ہے جو دوسرے دوہوں سے کسی طرح کا موضوعاتی رابطہ و تسلسل نہیں رکھتا لیکن مندرجہ بالا دوہوں اور ان کے علاوہ دوسرے کئی دوہوں میں عالی نے موضوع کا تسلسل برقرار رکھ کر دوہوں میں نظم کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔ اگر ہم اس کے دوہوں کی ان تمام خصوصیات پر نظر رکھیں تو ہمیں اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اس نے ہندی دوہے کی قدیم صنف کو بالکل بدل کر دوہے کو ایک نئی صورت عطا کی ہے جس کا وزن، موسیقیت 'لفظیات' اور موضوعات کے علاوہ مختلف دوہوں کے درمیان معنوی رابطہ و تسلسل کو شامل کرنا اس کے تخلیقی عمل کے ایسے کارنامے ہیں جو اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھے جائیں گے۔ آیئے اب اس کے چند دوہے اور سن لیجیے۔

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو ہوئی اتنی پہچان
چڑھی ندی اور اتر گئی پر گھر ہوگئے ویران

آپ بنا بنجارہ میں اور آپ بنائی باٹ
سچ کہیو رے دیکھنے والے ایسے کس کے ٹھاٹ

ناری ایسی بالی عمر یا نا ایسی نادان
پر جب ہم کوئی بات کہیں تو بنے سدا انجان

چال پہ تیری گج جھومیں اور نیناں مرگ رجھائے
پر گوری وہ روپ ہی کیا جو اپنے کام نہ آئے

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

یہ ہر سندر نار کو تکنا یہ جھک جھک پرنام
عالی تو تو گیانی دھیانی یہاں ترا کیا کام

دکھا تو آخر چولی سے کیا چیز یہ ابھری آئے
گوری ہم تو چنگی بابو ہم سے کیوں شرمائے

یہی کیا اس کے تمام دوہے کلام منتخب کی حیثیت رکھتے ہیں جو اثر و تاثیر اور لطف اور انبساط کا یکساں جادو جگاتے نظر آتے ہیں دوہوں کے علاوہ عالی نے گیت بھی لکھے ہیں جن میں ننگی کی تو کوئی کمی نظر نہیں آتی البتہ ان میں آرزو لکھنوی کے گیتوں جیسی فکر کی گہرائی یا میراجی کے گیتوں جیسی جنسی و نفساتی باریکیاں نہیں ملتیں۔ ہمارے خیال میں اس کے گیت اس کی شاعری میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

ہم نے اب تک جو عالی کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے وہ سب اس کے پہلے مجموعہ "غزلیں دوہے گیت" تک محدود ہے اس کا دوسرا مجموعہ "لا حاصل" بھی اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ سب سے پہلے تو اس کے نام ہی کو لے لیجئے۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ عالی نے اپنے مجموعہ کا نام "لاحاصل" رکھ کر دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے جبکہ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ عالی نے اپنی شاعری کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور اسے لا حاصل ہی سمجھتا رہا ہے حالانکہ اس کی شاعری ایسی فرومایہ بھی نہیں ہے کہ اسے لاحاصل کہا جائے۔ ہمارے خیال میں اس مجموعہ کا نام "لاحاصل" رکھنے کے دو سبب ہیں ایک شعوری اور ایک لاشعوری۔ شعوری سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ عالی فن کی جن بلندیوں تک پہنچنا چاہتا ہے وہ اپنے خیال میں ان بلندیوں کو ابھی تک نہیں پہنچ سکا ہے اس کا خیال دراصل اس کے خوب سے خوب تر انداز اظہار کا غماز ہے جو اس کے اچھے اور سچے فنکار ہونے کی مظہر ہے۔ ظ ہے کہ اگر فنکار میں یہ احساس باقی نہ رہے تو اسکی تخلیقی فعلیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے خود ہمارے عہد کے نہایت وقیع اور معتبر شاعر فیض صاحب بھی ساری عمر یہی لکھتے رہے کہ "ہم جو لکھنا چاہتے ہیں اب تک نہیں لکھ سکے ہیں لوگوں نے ہماری قدر ہماری فنی کارناموں سے بہت بڑھ کر کی ہے" عالی کو بھی شاید یہی احساس ہے کہ وہ جو لکھنا چاہتا ہے اب تک نہیں لکھ سکا بصورت دیگر اگر وہ سچ مچ اپنے کلام کو لاحاصل سمجھتا تو اسے اس کو چھپوانے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرا سبب غیر شعوری ہے جس کا اندازہ اس مجموعہ میں شامل کلام سے بہ آسانی ہوتا ہے اس مجموعہ میں شامل اس کے کلام میں اس کا نمایاں احساس یہ ہے کہ نوع انسانی ہزاروں سال سے جس تہذیبی' اخلاقی اور سائنسی ترقی کا سفر طے کر رہی ہے وہ نوع انسانی کو لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں دے سکا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ

ہر طرح کی ترقی کے باوجود انسان آج بھی ان دکھوں سے دوچار ہے جن دکھوں کا سامنا اسے روز اول سے تھا البتہ اب ان دکھوں کی صورت ضرور بدل گئی ہے لا حاصلی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

آج بھی مرے خیال بے حصول و بے مال
آج بھی مرے سوال نا قبول و بے جواب

ہر صدی کے موڑ سے راستے وہی کھلے
لوگ دیکھتے رہے چھپی حقیقتوں کے خواب

مے بھی جب کبھی ملی ساتھ تشنگی ملی
ایک زندگی ملی وہ یونہی رہی عذاب

سرِّ حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی
پہلے ہی کیا کچھ تھے عالی اب ٹھہرے فرزانے بھی
کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں
کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی

صدیاں کہتی ہیں کہ بس دیر ہے اب قرنوں کی
اس قدر رنج سہا ہے . تو ذرا اور سہی

صدیاں تو کٹیں معرکہ عقل و جنوں میں
جو بات بتانی ہے بتا کیوں نہیں دیتے
ناقابل درماں ہوں ازل سے تو ابد تک
اک گوشہ دامن میں چھپا کیوں نہیں دیتے

یا پھر اس کا یہ نظم نما نغمہ۔

کتنے دن سے چاند ستارے انسانوں کو دیکھ رہے ہیں
انسانوں کے خوابوں کو اور ارمانوں کو دیکھ رہے ہیں
اندھیاروں پر' روشنیوں کا ہلکے ہلکے چھا جانا

مظلوموں کا 'رفتہ رفتہ' ظلم پر غالب آجانا
خوابوں کو اور ارمانوں کو
چاند ستارے انسانوں کو
دیکھ رہے ہیں
دیکھ رہے ہیں
ایک سفر ہے
شام و سحر ہے
ایک سفر ہے جس کی منزل آپ سفر ہے
ایک سفر ہے جس کا مطلب راہگزر ہے

غرضیکہ انسان ترقی کا سفر مسلسل طے کر رہا ہے لیکن اب تک اسے منزل نہیں مل سکی ہے اور مستقبل میں بھی اس کی توقع نہیں ہے۔ انسان کی زندگی ایک سفر ہے جس کی منزل آپ سفر ہے۔ نوع انسانی کے حوالے سے عالی کے ہاں لاحاصلی کا احساس کر ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں ہے تاہم اسے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ کچھ اقوام عقل و شعور سے کام لے . قومی سطح پر عمل کی ایسی راہیں متعین کرتی ہیں جو مخصوص حالات میں ان کے لئے امن و سلامتی اور خوشحالی کا سبب بن جاتی ہیں لیکن پاکستان ابھی تک قومی سطح پر عمل کی صحیح راہیں متعین نہیں کر سکا ہے جس کی وجہ سے یہاں ہر طر ، کی افراتفری اور معیشی و معاشرتی بحران کا سامنا ہے۔

عالی کا جذبہ حب الوطنی ایسے حالات میں اس کو سخت بے چین رکھتا ہے۔ اس نے اپنی اس بے چینی کا اظہار بڑے موثر انداز سے اپنی شاعری میں کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خواب غفلت سے بیدار کرے لیکن اس کو دکھ ہے کہ تمام کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا جس نے قومی سطح پر بھی اسے لاحاصلی کے دکھ میں مبتلا کر دیا ہے۔ ملک و قوم کے تقاضوں سے بے تعلق ذاتی مفادات کے پیچھے بھاگنے والے شاعروں' ادیبوں اور دانشوروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے (پاکستان کتھا "لاحاصل")

عالی اپنے دیس کی لکھیں اور لوڈی کہلائیں
سورما لوگ بدیسی پیسے کمائیں اور اترائیں
پیسہ کھانے کی ترکیبیں نقد وظیفہ سیر
اب جو کوئی جس کا کھائے مانگے اسی کی خیر
کوئی کھل کر جاپان دکھائے اور کوئی چھپ کر چین
کہیں بدیسی ڈھلی باجے کہیں بدیسی بین

جذبہ حب الوطنی کے آئینہ دار چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عالی تونے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو بتا تری کویتا رانی دیس کے کیا کام آئی

دھوئیں بھرے ہیں دلوں میں دماغ جلتے ہیں
چمن کے جسم پہ گل بن کے داغ جلتے ہیں
کوئی سبب کوئی اس کا علاج بھی ہوگا
کہ ہم بہار بساتے ہیں باغ جلتے ہیں
نہ بجھ سکا دل سوزاں جو آندھیوں میں تو آج
اس اک چراغ سے کیا کیا چراغ جلتے ہیں

عالی اپنے خون سے سینچیں جس کی اک اک کیاری
روندنے والے روند رہے ہیں وہ تازہ پھلواری
اب عالی پھر سینچ رہے ہیں ایک نیا گلزار
اک گلزار کو دھیان سے رکھنا جان سمجھنا یار
اس گلزار کو جان سمجھنا اس پہ آنچ نہ آئے
پھر کوئی تجھ سا پھر کوئی مجھ سا اس کو روند نہ پائے

ان انسانی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ عالی نے اپنے ذاتی مسائل اور اپنی واردات کو بھی نہایت اچھوتے اور اثر آفرین انداز سے بیان کیا ہے۔ یوں تو اس نے پہلے مجموعہ کلام میں بھی مسلسل دوہے لکھ کر دوہوں کو نظم کی کیفیت سے مزین کیا تھا لیکن اس نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام "لاحاصل" میں مسلسل دوہوں کو ایک مستقل صنف کی حیثیت دے دی ہے۔ اس کے ان مسلسل دوہوں میں کہیں نظم اور کہیں مسلسل غزل کی سی صورت نظر آتی ہے ہم اسے بجا طور پر اردو شاعری میں ایک اضافہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایسے چند دوہے ملاحظہ ہوں۔

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ لاکھا گال پہ لالی آنکھیں بہت اداس
تیس روپے میں تیس ہیں اس کے دس لیوے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں اتنا سستا مال
اے رانی اب دل پہ رکھ کر کھینچ نہ لینا ہاتھ
اے راجہ میں آج تری کل اور کسی کے ساتھ

اے رانی میں سرساگر ہوں اور کوی انمول
اے سرساگر کوی بس اپنے بھید نہ مجھ پر کھول
سرساگر کی ریت بنی تھی اک اک سر سے پیار
تیرے سر کی تال میں نکلی پیسے کی جھنکار
نا ہمیں جانے با ہمیں سمجھے نا سمجھے کوئی بات
یوں گزری تو کیا گزرے گی اتنی لمبی رات
اے راجہ جب میں پل بھر میں ہوئی تجھے جنجال
مجھ سے پوچھ کہ میں نے کیسے کاٹے اتنے سال

دوہوں کے تانے بانے سے بنی ہوئی اس کہانی کے علاوہ پنڈی (۱۹۵۷ء میں) میں شعراء کی ناقدری 'بنگلہ نار کی کہانی' 'پاکستان کتھا' اور الجیریا بانی ایسے مسلسل دوہے ہیں جو اپنے اپنے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں اور قارئین کو وجد اور نغمگی سے بھرپور نظموں کی کیفیت سے محظوظ کرتے ہیں۔ اب چند ایسے شعر بھی ملاحظہ ہوں جو موضوع کے اعتبار سے نظم اور اسلوب کے لحاظ سے مسلسل غزل کا مزا دیتے ہیں۔

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے
قدرِ سخن ہم کیا جانیں ہاں رنگِ سخن کچھ ایسا تھا
اچھے اچھے کہنے والے اپنے پاس بٹھاتے تھے
سامنے بیٹھی سندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پردوں میں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے
فیشن تھا یا خوش آوازی یا کچھ سحر جوانی تھا
کبھی کبھی تو ان پر گھر کے گھر عاشق ہوجاتے تھے
عشق تو ان سے کیا ہوتا ہاں پیار میں جیسی کچھ گزرے
جس انداز سے جن لفظوں میں آجائے کہہ جاتے تھے

دراصل عالی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ واردات اور صرف واردات لکھنے کا قائل نہیں البتہ واردات میں تخیل کی رنگ آمیزی سے شعریت کا کچھ ایسا جادو جگاتا ہے کہ قارئین اس کے احساس کی دنیا میں گم ہو کر ایک کیفیت اور وجد سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ وہ مسلمہ اقدار اور مروجہ خیالات سے الگ صرف اپنے تجربہ پر بھروسا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شاعری ایک طرح اس کی اپنی سوانح عمری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں جدیدیت کی بنیاد تجربہ ہوتا ہے جب کہ روایتی شعراء کا طرزِ احساس مسلمہ اقدار کے تناظر میں تشکیل

پا تا تھا۔ جدیدیت کی اس خصوصیت کا اظہار سب سے پہلے غالب نے کیا تھا۔ وہ کہتا ہے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عالی بھی اپنی ہستی اور اپنے تجربہ کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کی اساس بنائے ہوئے قارئین یا ناقدین کے رد عمل سے بے نیاز وہی کچھ لکھتا ہے جو کچھ وہ ہے۔

عالی کے ہاں جدیدیت کے نام سے کی جانے والی اہمال پر استوار شاعری کے خلاف واضح رد عمل ملتا ہے۔ ہم نے اس کی غزلوں اور دوہوں کا تجزیہ کرتے وقت دیکھا کہ وہ ماضی سے زندہ اور خیالی رشتہ برقرار رکھتے ہوئے جادۂ نو کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کے سچے اظہار کو شعریت میں ڈھالنے کے لیے ان کی تنظیم نو سے بھی کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اس کی شاعری اپنی نوعیت میں عشقیہ شاعری ہے لیکن وہ اپنی اس عشقیہ شاعری میں اپنے جذبات واحساسات کے تناظر میں انسان اور زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اور انصاف کی حقیقت کو محبت کے حوالے سے سمجھنا منطقی اور فلسفیانہ تعبیروں سے بالکل مختلف بات ہے۔ محبت کے حوالے سے حقیقت کو سمجھنے کی بنیاد ذاتی تجربہ ہوتا ہے جس کی صداقت سے انکار صاحب تجربہ کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی جب بھی ذاتی تجربے کو شعر کا جامہ پہنایا جاتا ہے تو اس میں بلا کی تاثیر آجاتی ہے جو اچھی اور سچی شاعری کی شرط اولیٰ ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں گوئٹے جیسے عظیم شاعر کی یاد آتی ہے جس نے ابتداً نہایت نفیس ونازک اور اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کی اور جو ہمیشہ محبت کا وسیلہ رہا۔ اس کا جذبہ محبت ہی اس کی شاعری اور اس کی دوسری تخلیقی سرگرمیوں کا محرک تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جذبہ محبت ہی کے وسیلے سے اس شعور حیات سے بہرہ ور ہوا جو اس کی تصانیف کا طرہ امتیاز ہے۔ گوئٹے تو خیر پھر بھی دور کی مثال ہے۔ محبت کی اہمیت کو خود ہمارے میر صاحب نے نہایت بلیغ انداز سے ابھارتے ہوئے اسے وجہ ظہور کائنات بتایا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عالی بھی اپنے جذبہ حسن پرستی کے ہاتھوں مذہب عشق ہی کا گھائل نظر آتا ہے جس کا کچھ اندازہ تو ہمیں اس کی غزلوں اور دوہوں کے مطالعے سے ہوا ہے لیکن حال ہی میں اس کے کلام کا چوتھا مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں کچھ غزلوں اور بہت سے دوہوں کے علاوہ بیشتر اس کی نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں اس نے جہاں بعض عہد حاضر کے سائنسی انکشافات اور تکنیکی پیش رفت کو اپنا موضوع بنایا ہے وہاں ہمیں اس کا انسان اور زندگی سے محبت کا جذبہ بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ سائنسی انکشافات اور تکنیکی پیش رفت کو ذہن انسانی کا قابل فخر کارنامہ تسلیم کرنے کے ساتھ اس حقیقت پر سخت تکلیف محسوس کرتا ہے کہ یہ ترقی اپنے تمام تر روشن پہلوؤں

کے باوجود تباہی و بربادی کا ہولناک ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی اس بربادی کی حد درجہ تکلیف دہ مثالیں ہیں۔ عالی کا انسان اور زندگی سے محبت کا جذبہ سائنسی ترقی کے غلط استعمال کے سبب آنے والی بربادیوں پر اسے بری طرح بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ جس کا تجزیہ ہم اس کی مختلف نظموں کے حوالے سے پیش کریں گے لیکن پہلے ہم اس کی نظم ""انسان"" کے تین ابواب تک محدود رہ کر (جو اس مجموعے میں بھی شامل ہیں) اس کے تصور حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس نے اس نظم میں کسی عزیز دوست یا محبوبہ کی موت کے صدمہ کو حقیقت زندگی کی تفہیم کا وسیلہ بنایا ہے۔

اس نظم میں عالی نے اپنے جذبہ محبت کے تناظر میں حقیقت انسان وحقیقت حیات کی تفہیم کے عمل میں اپنے مخصوص پیرائیہ اظہار سے بڑا کام لیا ہے۔ اس کے اس مخصوص پیرایہ اظہار میں اس کے مصرعوں کی نحوی ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف فنی آرائشوں تک محدود ہوجانے کے ""خطرے"" سے اپنا دامن بچائے رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے وہ روزمرہ کی عام گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ کو شعری سیاق وسباق سے آراستہ کر کے پیش کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ٹھوس احساسات کو تجریدی صورت میں ڈھال کر ایسی فضا ابھار سکے جو حقیقت انسان وحقیقت حیات کے ساتھ خود اس کے اپنے وجود کی ماہیت دریافت کرنے کے سلسلہ میں اس کے رویہ کو روشن کرنے کے لئے مناسب ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظم میں وہ اپنی ذات کے اندر موج زن طوفان احتجاج کا کائنات کی دوسری پرسکون اشیاء اور معاشرہ کے مطمئن افراد سے موازنہ کرکے اپنے جذبہ تجسس کا نہایت موثر انداز سے اظہار کرتا ہے اور اس اظہار ہی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ ہم اس کے اس اظہار کو اس کی شناخت بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی اس نظم کے یہ چند مصرعے دیکھئے جو اس کی عزیز دوست کے سانحہ ارتحال پر اس کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

میں کیسی الجھن میں مبتلا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور حکایتوں کے سنپولے اندر سے ڈس گئے ہیں
یہ میری کم مائیگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے لاؤ لشکر
مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں

ان مصرعوں میں عالی نے اسلاف کی اہانت کئے بغیر اپنے منفرد جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی جذباتی شخصیت کو ابھارا ہے۔ یہاں اس نے خود کو کم مایہ کہتے ہوئے بزرگوں کو لاؤ لشکر سے تعبیر کیا ہے جو بزرگوں کی بتائی ہوئی لفظیات واقدار پر یقین کی وجہ سے اپنی انفرادیت سے محروم ہوجانے کے دکھ کا نہایت مہذب اور بلیغ اشارہ ہے۔ دراصل عالی کا مسئلہ اس کے اپنے ذاتی تجربات ہیں جو بزرگوں کی بتائی ہوئی مسلمہ اقدار سے کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں ہوپاتے۔ وہ بزرگوں کے علاوہ اپنے عہد کے اکثر لوگوں سے بھی اپنے احساسات کو مختلف پاتا ہے۔ جس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ اس کا دوست اسرار جب اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنے مرحوم

دوست کی قبر سے اٹھ کر اپنے گھر چلے اور گھر چلنے کے سلسلہ میں کچھ دلائل بھی پیش کرتا ہے تو عالی کہتا ہے

مری محبت کو اپنی نامہربان میزان پر نہ تولو
تمہاری یہ فلسفہ طرازی
یہ تجزیے' نظریے' یہ نشتر
مری رگوں میں بھی چبھ رہے ہیں
فضا میں بھی پھیل پھیل کر اس کو او مسموم کر رہے ہیں
ہٹاؤ اپنی تسلیوں کے یہ بد نما خار خار تحفے
یہ مجھ کو مغموم کر رہے ہیں

ان مصرعوں میں اپنی کلیت کے ساتھ بہ ظاہر اسرار ایک سماجی ٹھیکہ دار کا کردار ادا کر رہا ہے اور اس تجربے اور اس نازک احساس سے عاری ہے جو عالی کا سرمایہ ہے اور اسے زندگی کے بارے میں غور و فکر پر مسلسل مائل رکھتا ہے۔ ان مصرعوں میں تحسین کے جذبہ سے محروم سماجی انصاف کی تسلیوں کی باتوں کو "بدنما خار خار تحفوں" سے تعبیر کرنا بتاتا ہے کہ عالی رسمی باتوں سے کس قدر دل برداشتہ ہوتا ہے۔ ایسی رسمی باتیں اس کی رگوں میں نشتر کی طرح چبھتی اور پوری فضا کو مسموم کرتی محسوس ہوتی ہیں۔

اس نظم میں عالی نے اپنے احساسات و تصورات کو کیسی جمالی اور کیسی ہیولوں کی زبانی بیان کیا ہے گویا اس کے اپنے احساسات و تصورات خود اس سے کلام کرتے ہیں۔ اپنے احساسات کو خود سے الگ کر کے دکھانے کی تکنیک اس کے کلام کو نہایت موثر بنا رہی ہے۔ اسی طرح اس کی وہ دوست جس کی موت کا صدمہ اس پر بری طرح سے طاری ہے کوئی فرد نہیں بلکہ حقیقی انصاف ہے جو ہمارے صنعتی دور میں مر گیا ہے اور ہمارا آج کا معاشرہ مصنوعی انسانوں کی بھیڑ میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

اب اس کی نظم "چھپکلی کا دماغ" پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں۔ اس نظم میں عالی نے انسانی دماغ میں شیطنت کے عنصر سے نجات حاصل کرنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے۔

ہمارے مغز میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ
شرار بولہبی
بہت قدیم دماغ
وہ کہتے ہیں کہ وہ جو رینگنے والے تھے ان کا ورثہ ہے
مگر کچھ ایسے کہ اب بھی ہمارے ذہن کا ایک حصہ ناگزیر حصہ ہے

سبھی طبیب اسے 'پینگلی ان کا پلیکس' کہتے ہیں
اگرچہ اس میں مقید بہت سے دوسرے کچھ مرکزے بھی رہتے ہیں
مگر وہ اور طلسمات ارتقاء کے وہ جال
کہ جن کے پھندوں میں پھنس کر نکلنا آج محال
چلو ہزار نہیں لاکھ یا کروڑ برس بعد کھلے گا سب ان کا بھی احوال

ہے میرا آج کا موضوع چھپکلی کا دماغ
کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت و دہشت کی آندھیوں سے فراغ
یہ جارحیت و سفلی مرکبات کا اک زندہ و عجیب قفس
یہ ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا
یہ ملکیت کی ہوس

یہ جینیات کے حیرت فزا حقائق نو
یہ صد جہات فتوحات کی ہر لحہ پھیلتی ہوئی رو
یہ تخم و بیضہ میں پیوند صد صفات کے امکان
جن کی تیز ہے لو
تو کیا ان اگلے کروڑوں برس میں ہم کو نہیں مل سکے گا کوئی سراغ
کہ اپنے مغز میں مفلوج یا لخروج ہی کردیں یہ چھپکلی کا دماغ
اور اس کے بعد جلیں فکر و عشق وجد و عمل سے سعادت ابدی کے وہ رنگ رنگ چراغ
جو ختم کردیں ازل کی ستیزہ کاری و تاب شرار بولہبی
جو آدمی کو دیں انسان کی بھی خوش نصیبی

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارتقاء کی تیز رفتاری اور سائنسی علوم کے نت نئے انکشافات سے بالخصوص جینیات کے شعبہ میں حیرت انگیز حقائق کی دریافت کے باوجود سائنس داں انسان کے ذہن سے شیطنیت کے اس عنصر کو ختم نہیں کرپائے جو اس کو جانوروں کے ذہن سے ورثہ میں ملا ہے اور جو جارحیت و سفلی مرکبت کا ایک زندہ قفس ہے جسے ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا اور ملکیت کی ہوس سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح عالی کا انسان اور زندگی سے محبت کا جذبہ سائنسی علوم کی ترقی کے بل پر ہزار طرح کی فتوحات کو بے حاصلی سے تعبیر کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر یہ ترقی انسان کو شیطنیت کی ہولناکیوں سے چھٹکارہ دلانے میں ممد معاون نہیں ہے تو ارتقاء کا

سارا عمل ایک کار عبث ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر شاید وہ پرامید ہے، وہ مستقبل کو چیلنج دے رہا ہے۔ اس کی نظم "امکان" میں بھی وہ سائنس کے اس انکشاف سے کہ

خلا خالی نہیں ہے
اس خلا میں ایسے ایسے عنصرِ بے ظہور اس طرح رہتے ہیں
کہ جیسے بعض شاعرِ بے لکھے بس ذہن ہی میں دل کے انگارے ملا کر شعر کہتے ہیں
وہ کہتے ہیں وہ عنصرِ بے محرک، بے قوانینِ طبیعیات، ایک شوقِ خود وجودی میں ابھر کر رقص کرتے ہیں۔
خلا میں اپنے اپنے ماورائے ہر نظارہ رنگ بھرتے ہیں
گہے یک ثانیہ گاہے ہزاروں سال یونہی لطف اٹھاتے ہیں
پھر اک کیفیتِ بالائے اوہام فنا میں ڈوب جاتے ہیں

(یہ بھی منتخب پیراگراف ہیں) سائنس کے اس تا حال ایک مفروضے سے عالی کے دل میں خیال آتا کہ اس دنیا کے مصائب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خلا ہی میں چل کر اپنے لئے ایک مکان حاصل کر لیں لیکن افسوس اسے آخر میں خلا میں مکان لینے کا امکان بھی بے امکان ہی دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اس احساس کو وہ کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

تو آؤ ہم بجائے این و آں ہر جہاں
لے لیں خلا میں جا کے اپنے واسطے اک اک مکاں
یہاں جبرِ قوانینِ حیات و موت ایسا ہے کہ بعدِ وصل بھی اک دن جدائی ہے
وہاں وصلِ مسلسل گو یقینی تو نہیں لیکن بہرحال اک بڑا امکانِ قسمت آزمائی ہے
یہ ممکن ہے کبھی تو خود وجودی میں ابھر کر گھومنے لگے
یہ ممکن ہے کہ عین اس وقت میرا شوق بھی تیرے لبوں کو چومنے لگے
اور اس کے بعد یا جب چاہیں ہم اک ساتھ ہی چھپ جائیں
دوبارہ کوئی قالب لیں نہ واپس آئیں
یہ ممکن ہے وہی وصلِ مسلسل ہو
ہماری نامکمل زندگی یعنی یہ بعدِ اختلاطِ جسم آغاز و نشاطِ تشنگی شاید وہاں جا کر مکمل ہو
نہیں ہو گی

نہ ہو
اب بھی تو وہ خوفِ جدائی ہے
کہ جس کے کرب نے ایسے تصور میں بدل کر

یہ رہا امکان بے امکاں دکھائی ہے

خلا میں مکان لینے کا تصور بتاتا ہے کہ عالی کو اس دنیا میں قوانین فطرت کی بالادستی کا پوری طرح شعور ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عہد حاضر کی سائنسی ترقی اپنی نوعیت میں قوانین فطرت پر غالب آنے والی فطرت کو مسخر کرنے کا حصہ ہے لیکن انسان کی تسخیر فطرت کا یہ عمل آج تک انسان کو قوانین فطرت کی بالادستی اور جبریات سے چھٹکارہ نہیں دلا سکا ہے جب کہ عالی کا نوع انسانی سے محبت کا جذبہ اسے اس دن کے خواب دکھاتا رہتا ہے جب انسان قوانین فطرت کی بالادستی سے نجات حاصل کر سکے گا۔ قوانین فطرت کی بالادستی اور جبریات سے آزادی ہی انسان کی زندگی کو صحیح معنوں میں حسین بنا سکتی ہے۔ عالی ایسی ہی حسین زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

اس کی نظم "تجی" انسان کے ہزاروں سال کے فکری سفر کی نہایت موثر تصویر ہے۔ اس نے اس سفر کو حقیقت کی دریافت کے سلسلے میں صرف "الف بے" سے تعبیر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک انسان کی یہ تمام کوششیں لاحاصل ثابت ہوئیں یعنی نوع انسانی نہ اب تک اپنی حقیقت دریافت کر سکی اور نہ حقیقت کائنات کا سراغ لگا سکی ہے۔ اس نظم کا اسلوب بھی بالکل منفرد ہے جس کا اظہار نظم کے آغاز میں اس طرح کیا گیا ہے۔

خداوندا مرے عجز بیاں کی معذرت
گنج کہائے بزرگاں محترم ہیں
وہ سب مخصوص لہجے بھی جو میرے دور پر چھائے ہوئے بادل، پناہ پیروانِ تازہ دم
اور خوب اونچے اونچے پرچم ہیں
دبستانِ مراتب، صد مناقب، سجدہ و تعظیم کے ارکانِ واجب، اپنا اپنا ایک عالم ہیں
میں ان کی خوشہ چینی سے نہیں تقلید میں امکان گستاخی سے ڈرتا ہوں
جو ان سے فیض اٹھا کر اونچے جائیں، وہ بڑے ہی خوش قلم، مقبول عالم، اور عجب تقدیر والے ہیں
مگر وہ صاحبان طرز خود بھی تو بڑی توقیر والے ہیں
کہاں ان کے ترانے اور کہاں میرے یہ بے رس، بے تراوش، کشتگانِ جہل اور محرومِ ایمائیت افسانے
جمال و فن سے بے گانے
مودب ان نقوشِ پا سے اک لمسِ جبیں کو بھی غنیمت جان کر تنہا گزرتا ہوں
اور اپنی آرزو اس کمزوری اور بے روایت یعنی اپنی ہی زباں میں عرض کرتا ہوں

اپنی انفرادیت کا اعلان کرتے ہوئے عالی نے آج کل کے نام نہاد جدیدیت پرستوں کی طرح بڑبولے پن سے کام بالکل نہیں لیا ہے بلکہ تہذیب و شائستگی کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے اپنے اسلوب کی انفرادیت کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ ہر چند کہ اپنے معروف انکسار کی روایت میں اس نے اپنے اسلوب کو بے رس بتایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع کے اعتبار اس کا یہ اسلوب نہایت اثر آفریں ہے اور ہم یہ بات بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظم موضوع اور اسلوب ہر اعتبار سے ایک انوکھی تخلیق ہے۔

عالی تلاش حسن اور تلاشِ حقیقت کا ایک انتھک مسافر ہے۔ اس کی شاعری اپنے موضوعات اور تکنیک دونوں سطحوں پر اپنے ہمعصروں سے مخاطب ہے یہ بھی ہے کہ کم شاعر ایسے ہوں گے جنہوں نے عالی کی طرح کھل کر اپنی اچھائیوں اور برائیوں کا اظہار کیا ہو۔ بلاشبہ وہ اپنی شخصیت کو پوری طرح قبول کرتا اور اپنے فن میں سمو کر بے جھجک پیش کرتا ہے۔

(۱۹۹۵ء۔ غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

جمیل الدین عالی کی شاعری کا اہم موڑ۔ ''انسان''

جمیل الدین عالی بلاشبہ ایک ہفت پہلو ادیب ہیں۔ ادیب ' شاعر ' بینکار ' ادیبوں کے ٹریڈ یونینسٹ ماہر معاشیات و مستقبلیات اور اب سیاستدان ' پاکستان کے بالائی ایوان کے رکن ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ قبل عالی کی شاعری پر اپنے مضمون (مشمول مضامین) میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ محمد حسن عسکری نے ''غزلیں دوہے گیت'' پر لکھتے وقت عالی جی کو اس وقت کے شعری افق پر جلوہ افروز دو ڈھائی شعراء میں سے ایک شاعر قرار دیا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی شاعری پر ایک بہت اچھی رائے تھی اس وقت کے شعراء نے جو اب کسی صورت سے بھی خود کو اپنے وقت کے واحد شاعر سے کم کسی تعریف سے کم سزاوار نہیں سمجھتے تھے عالی پر رشک کیا تھا۔

پھر ۱۹۶۵ء میں پاک و ہند جنگ کے دوران عالی نے ملک کی سرفرازی کے لئے قومی نغمے لکھے جب سیاسی حالات نے ۱۹۷۱ء کے بحران کی جانب رخ کیا عالی نے پاکستانی قوم کے جذبہ حب الوطنی کے فروغ کے لئے اس قدر نغمات تحریر کئے کہ ان دو جنگوں کے دوران لکھے گئے نغمات کا مجموعہ ''جیوے جیوے پاکستان'' کہلایا اور ''غزلیں دوہے گیت'' کے انداز کی مدھر شاعری کے مجموعہ کا نام ''لاحاصل'' ٹھہرا۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ موقف اختیار کیا کہ وہ جس کلام کو لاحاصل قرار دے رہے ہیں وہی ان کا حاصل ہے بلکہ ان کی پہچان ہے۔ عالی جی سے میری نیاز مندی کے رشتہ کی عمر تیس سال سے متجاوز ہے۔ عالی جی کی بڑائی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری اور گیت پر ہندوستان میں شائع ہونے والی کتاب میں اس مضمون کو شائع ہونے دیا۔ ہرچند کہ وہ اس مضمون کو اپنے حق میں زیادہ السب نہ سمجھتے تھے۔

عالی اس عرصہ میں اپنی طویل نظم ''انسان'' پر کام کرتے رہے جو اب ہزاروں سطروں پر مشتمل ہے۔ مختلف رسائل میں اس نظم کے حصے شائع ہوتے رہے ان کے تازہ ترین مجموعے ''اے میرے دشت سخن'' میں اس نظم کا کافی حصہ شائع ہو چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ عالی نے اس نظم میں تغزل کے ساتھ ساتھ روایتی اسلوب کے اسٹرکچر کو شعوری طور پر اس لئے خیرباد کہا ہے کہ وہ اپنے دوہوں کے ترنم کی (جو مجھے واقعتاً بہت پسند ہے) Irrelevont غیر ضروری بیساکھی کے بغیر اپنے استوانہ پر

بن کر کھڑے رہنے کا نظارہ کر سکیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس نظم میں عالی کے اندر پوشیدہ ایک "ڈرامہ نگار" نے آزاد منظوم ڈرامہ کی مغربی روایت کے صوتی آہنگ سے مواد Content اور ہیئت (Form) کا ایک ایسا Landscape تراشا ہے جس کے ہر حصے پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس طویل نظم میں عالی نے اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدات کے ساتھ انسان کے ارتقاء پر شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ ایک سوالیہ نظر ڈالی ہے۔ وہی شاعر اپنی بصیرت کو شاعری بنا سکتا ہے جو ناممکن کی جستجو کر سکے۔ صرف اسی طرح وجدان اور فکر کا ایک ایسا سنجوگ مہیا ہو سکتا ہے جس میں فکر و فہم کا سرمایہ محض خام مواد بن جائے اور فکر رسا کی نغمگی شاعری کا روپ دھار لے۔ "انسان" عالی کی ذاتی زندگی کے کرب کی داستان ہے جسے "غیر ذاتی" رنگ دیا گیا ہے وہ اپنی شخصیت کی اوعایت پر نفی ذات کا Mask اوڑھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ وزیر آغا نے "اردو شاعری کے مزاج" میں گیت غزل اور نظم کی جس ارتقائی Hierarchy کا ذکر کیا تھا اور جو ہر ادبی روایت پر صادق آتا ہے۔ عالی کے دوہوں اور (انسان) میں وہی فرق ہے جو محبت کے لطیف جذبات سے چور نوجوان کی ترنگ اور انسان و کائنات کے مابین Ontological رشتہ کی کشاکش میں ہو سکتا ہے۔ "انسان" صرف نظم ہی نہیں بلکہ متعدد نظموں کا مجموعہ ہے ہر نظم دوسری نظم کو جنم دیتی ہے منظر سے دور ہٹ جاتی ہے لیکن اس طرح یہ احساس کہ "بے شک انسان خسارہ میں ہے۔" بذات خود انسان کی عظمت کی دلیل ہے اگر خالق کے ذہن میں یہ خیال ابھرے تو پھر مخلوق واقعتاً "اشرف المخلوقات ہو جاتی ہے۔ اور سجدہ کرنے کے حکم پر شیطان کی برہمی سمجھ میں آجاتی ہے۔

کائنات کا متحیر کن پہلو یہ ہے کہ قطع نظر اس سے کہ وہ ایک لمحہ میں پیدا ہوئی یا لاکھوں سال میں تخیل کی سطح پر حقیقت اولیٰ تک رسائی جہاں چشم زدن میں ممکن ہے وہاں اس آگہی کے لئے درجنوں جنم کی سعی غور و فکر بھی کم نظر آتی ہے۔ شاعری کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس میں تخیل کی سطح پر جو کچھ ممکن ہو پاتا ہے وہ باذوق قارئین کے ذہنوں کو نئے زمانہ کے نئے مفاہم اور ان مفاہم کو عملی شکل دینے کے لئے مہمیز کرتا ہے انسانوں نے ناممکن کی جستجو ہی سے ممکن کے دائرہ میں بامعنی اضافہ کیا ہے اور جس طرح ہر دور کا علم الکلام اس دور کی زبان اور محاورہ میں ہونا چاہئے اسی طرح ہر دور کی شاعری اس دور کے حاصلات کی بنیاد پر حاصل ہونے والے Perception پر ہونی چاہیے۔ انسانی سماج کا رشتہ صرف اسی شاعری سے بن سکتا ہے جو اپنے دور کے اقرار اور انکار کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ لے جیسے یہ سب حالتیں اس کی اپنی ہوں۔

عالی کے تازہ ترین مجموعہ "اے مرے دشت سخن" میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی ہیں اور دوہے بھی۔ اس مجموعہ کی نظموں میں محبت کی ترنگ کے بجائے وجود و عدم 'امکان و یقین' جبر و اختیار اور کائنات سے متعلق سائنسی مباحث کے لئے زیادہ شیفتگی پائی جاتی ہے۔

مثلاً عالی اپنی نظم "چھپکلی کا دماغ" میں ایک جگہ کہتے ہیں:

جب ارتقاء نے ہمیں احسن تقویم کا مقام ہزار احترام دلوایا
تو کیا یہ طے ہے کہ آئندہ صدیوں میں بھی رہے گا ہمارے مغز کا
یہ جینیات کے حیرت فزا حقائق تو
یہ صد جہات فتوحات کی ہر لحہ پھیلتی ہوئی رو
یہ تخم و بیضہ میں پیوستہ صد صفات کے امکان
جن کی تیز ہے لو
تو کیا ان اگلے کروڑ برس میں ہم کو نہیں مل سکے گا کوئی سراغ
کہ اپنے مغز میں مفلوج و بالخروج ہی کر دیں یہ چھپکلی کا دماغ

اس نظم کا خاتمہ سائنسی فکر کے بعض دعووں پر لطیف طنز پر ہوتا ہے لیکن عالی کے سامنے محققین نوی کے مباحث مستحضر ہیں۔ نئے مباحث کا ادراک اور ان مباحث کے بارے میں اپنی سوچی سمجھی آراء کا بیک وقت سنجوگ عالی کو ایک وسیع المطالعہ شاعر کے طور پر پیش کرتا ہے اب میں عالی کی تازہ شاعری کے ایک ایسے رخ کی طرف آتا ہوں جس کے بارے میں مبصرین اور ناقدین نے قرار واقعی توجہ نہیں دی۔ مری مراد عالی کی نظم "انسان" سے ہے۔

اس طویل نظم کے کچھ حصے "اے مرے دشت سخن" (مطبوعہ مارچ ۱۹۹۵ء) میں شامل ہیں اردو نظم نگاری کی تاریخ میں تاحال ایک منفرد نوعیت کی نظم۔ اگر اس نظم کے شائع شدہ حصہ کو کائنات اصغر اور کائنات اکبر کی جستجو کا نام دیا جائے اور اسے عالی کی نظم "تجی" کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر اسے "روایت" کے مقابلہ میں "درایت" کی مناد نظم قرار دیا جائے گا۔ "تجی" کی مندرجہ سطریں ملاحظہ کیجئے۔ عالی کہتے ہیں کہ وہ بزرگوں کی "تقلید" کے خوف سے مقبول عالم ہونا پسند نہیں کرتے۔

مرے عجز بیاں کی معذرت
سمجھ کہہائے 'بزرگاں محترم ہیں
وہ سب مخصوص لہجے بھی جو میرے دور پر چھائے ہوئے بادل
پناہ پیروان تازہ دم اور خوب اونچے اونچے پرچم ہیں
دبستان مراتب 'صد مناقب 'سجدہ تعظیم کے ارکان واجب اپنا اپنا ایک عالم ہیں
میں ان کی خوشہ چینی سے نہیں تقلید میں امکان گستاخی سے ڈرتا ہوں۔
جو ان سے فیض اٹھا کر اونچے جائیں وہ بڑے ہی خوش قلم 'مقبول عالم اور عجب تقدیر والے ہیں۔
اور وہ کے جواز اس طرح پیش کرتے ہیں۔"

مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آ جائیں
انہی سے اک زباں' تعبیر ہر کون و مکاں اپنی بناتی ہے۔
مجھے سب ہوشمندان زرافشاں' جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی
مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں مقید ہے۔
دوانی ہے
مگر اس کا دوانہ پن تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے۔
یہ صدیاں تو الف بے تھیں..........
ہماری ہستی سے کھیلتا ہے
تجھے خبر ہے کہ تیری تخلیق کا یہ تیرے بقول تیری مثال پر منفرد نمونہ
وجوب ہستی کو کون عذابوں سے جھیلتا ہے
اقبال کا "شکوہ" ایک نقطہ نظر تھا تا آنکہ جواب شکوہ نے اسے احتذار بنا دیا۔
عالی کا شکوہ محض "سخن کا پردہ" ہے
وہ اسی شکوے کے ایک بند میں کہتے ہیں:

الٰہی مجھ پر کرم مری زندگی اجیرن سی ہو گئی ہے
اگر تو موجود ہے خدایا تو مجھ کو اپنی پناہ دے دے
میں کچھ سہی پھر بھی آدمی ہوں
اگر تو موجود ہے خدایا تو..........
تو تو خدا ہے
میں آدمی ہوں

اس نظم میں کائنات کے بارے میں بعض تعینات اور نفیات سے بحث ہے زندگی کیا ہے' جبر و اختیار کیا ہے' روح اور بدن کی dichotomy کیا ہے۔ آواگون اور Recycling غرضیکہ ہر ہر زاویے سے انسان اور کائنات کی اصل کے بارے میں تلاش و جستجو کو شاعری کا زیادہ متمول اور پائیدار طرز احساس عطا کرتا ہے۔ مرا خیال ہے کہ عالی نے اپنی نظم "انسان" کے ذریعہ انسان اور کائنات کے بارے میں اپنی فکر کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ شستہ اور نفیس گفتگو کے انداز میں جس میں عام زبان کی بے ساختگی کا وفور ہے اور علمی متانت بھی وہ سب کچھ کہہ سکتے ہیں جو صرف مغربی فلسفہ کا وجودی ہی کہہ سکتا ہے' تصوف کا وجودی نہیں۔

عالی جیسے دانشوروں کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ ہستی اور نیستی کی Dichotomy اور کشمکش میں ایک ایسا فعال ذہن ہے جو ممکنات کی ہر صورت کو خارج از امکان سمجھنا نہیں چاہتا۔

ایسا شخص کرب و آگہی میں سلگتا رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے دور میں ممولے بھی دوسروں کی ممیز اور شہہ پر شہباز بن بیٹھے اور اسی اتفاق ناروا کو "حق" بھی سمجھتے ہیں۔ عالی کے سارے عذاب و ثواب اپنے ہیں۔

"انسان" عالی کی شاعری کا نقطہ عروج ہے جب یہ نظم اپنی مکمل صورت میں شائع ہوگی یہ نظم اردو کی عظیم شاعری میں جگہ پائے گی لیکن یہ نظم اس وقت بھی اردو کی چند اہم نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

ہاں، یہ اور بات ہے اگر محمد حسن عسکری زندہ ہوتے تو اپنی کتاب "جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کا خاکہ" کے مطابق عالی کے موجودہ افکار پر مغربی جدیدیت کی پرچھائیں ضرور تلاش کرتے اور شاید وہ انہیں اردو کے دو ڈھائی شعراء کی اپنی فہرست سے خارج کر دیتے۔ اسی نظم کی بدولت عالی کو جدید اردو شعراء کی مختصر فہرست کا بھی اہم خیال کرتے ہوں اور وہ اس لئے کہ عالی نے "انسان" کے ذریعے جس انسان دوستی کو اپنا شعار یا محور بنایا ہے۔ وہی شعار عذاب زندگی کے لئے بہشت امید کا نسخہ ہے یہی وہ نسخہ ہے جو ناساعد سے ناساعد حالات میں تیز گامی تجویز کرتا ہے۔ تاکہ زندگی کے کٹھن شعر میں ایک ایسی طاقت میسر آسکے جس کے بغیر "انسان" اپنے استوانہ پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔

عالی اپنے استوانہ پر ایستادہ مطمئن نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق

عالی جی اور دشت سخن

عالی جی ہمارے ادب کی ایسی شخصیت ہیں کہ جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا رہے ہیں اور کل بھی محسوس کیے جائیں گے۔ "اے مرے دشت سخن" ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے دو مجموعے "غزلیں دوہے گیت" او "لاحاصل" شائع ہو چکے ہیں۔ قومی نظموں کے مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی قومی نظموں اور گیتوں کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ عالی جی کو کئی حیثیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ محفلوں میں مجلسی گفتگو کے ماہر اور بڑے جلسوں کے مقرر ہیں۔ ان کی ذات سے ادبی نشستوں کی رونق ہے۔ انجمن ترقی اردو' اردو کالجوں اور رائٹرس گلڈ کے لئے ان کی خدمت اہم رہی ہیں۔ اردو ان کی پہچان ہے' لیکن رائٹرس گلڈ کے حوالے سے کثیرا لجہات تہذیبی مفاہمت کو فروغ دینے میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ سفر نامے' اظہاریے' مقدمے اور دیباچے لکھتے رہے ہیں۔ اردو ادب میں سفرناموں کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔ انجمن ترقی اردو کے مخطوطات' علمی اور تحقیقی اشاعتوں پر ان کے مقدمات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے وہ کوئی چونتیس برس سے روزنامہ "جنگ" میں کالم "کو بقول خود اظہاریے' لکھ رہے ہیں۔ ان اظہاریوں کے موثر ہونے میں کبھی کبھی خود انہیں شک ہوتا ہے۔ لیکن ہماری قومی زندگی سے تعلق رکھنے والے متعدد لوگوں کے بیانات اور فیصلوں میں ان کی بازگشت ملتی ہے۔ ان اظہاریوں کا علمی پس منظر بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔ عالی جی سماجی خدمات میں پیش پیش' خاطرداری میں آگے آگے اور دوسروں کی مدد کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ اب سینیٹ کے رکن کی حیثیت سے وہ قومی زندگی کے وسیع دھارے میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس سے ان کی پاکستان سے محبت اور قومی دردمندی کو نئے امکانات اظہار ملے ہیں۔ پاکستان شعور اور مقامی ضروریات کے احساس کے ساتھ' قومی زندگی بالخصوص تعلیمی و تہذیبی امور میں ان کے تجربات اور خیالات فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ لیکن ان کی ذات کا سب سے اہم حوالہ شاعری ہی ہے۔

شاعری میں عالی جی کا سلسلہ تعلق وسیع ہے۔ غالب سے ان کا رشتے اور درد سے انہیں نسبت رہی ہے۔ یہ نسبت اور رشتہ معنوی ہی نہیں خاندانی حیثیتوں کے بھی حامل ہیں۔ پھر خاندان لوہارو میں جہاں مسائل دہلوی' جیسے یادگار چراغ تھے' وہاں سید

مطلبی فرید آبادی پاکستان کے سب دکھیاروں کے دل بادل بننے کا پیغام بھی دیتے رہے وہ عالی جی کے سگے پھوپھی زاد بھائی تھے عالی جی نے اپنے شاعرانہ اظہار کے لئے دلی کی بھاشا اختیار کی' لیکن ان کی شاعری کا وسیع متنوع روایات سے رابطہ رہا ہے۔ اس نے موجودہ دور کی پیچیدہ زندگی اور اجتماعی مسائل کے نقوش بھی جذب کئے ہیں۔ خود ان کے شاعرانہ مزاج میں بڑی رنگارنگی ہے۔ انہوں نے غزلیں' دوہے' گیت' نظمیں اور قومی ترانے لکھے۔ ان سب میں خوابوں کے پیکروں' جذباتی صورتوں' ذہنی رویوں اور اظہار کے پیرایوں میں رومانیت حقیقت پسندی' اور روشن خیالی کے متعدد رنگ ملتے ہیں۔ کہیں کہیں رنگوں میں فرق داری کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن جو مجموعی تصویر بنتی ہے وہ زندگی کی برگزیدگی اور پیش روی کو پیش کرتی ہے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرح وہ بھی لوگوں کی غلط فہمیوں سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ ہر شاعر کی طرح جہاں بعض بدلتی ہوئی کیفیتیں ان کے کلام میں موجود ہیں' وہاں بعض غلط باتیں بھی ان کی ذات اور شاعری سے منسوب کردی گئی ہیں۔ وہ اپنے ایک دوہے میں کہتے ہیں کہ ۔

عالی جی اک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام

جیون بھر نروش رہیں اور جیون بھر بدنام

متضادات کی پیدا کردہ بعض غلط فہمیوں سے قطع نظر' عالی جی کی شاعری اور شخصیت میں جو تہذیبی ثروت ملتی ہے' وہ ایک دوسرے کو مستحکم کرتی ہے۔

عالی جی کے پہلے شعری مجموعے "غزلیں دوہے گیت" سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا روایت سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس روایت میں غزلوں کی مورجہ' مقبول روایت کے علاوہ' دوہوں اور گیتوں کی قدیم مگر کم مستعمل روایت بھی شامل ہے۔ عالی جی نے گیتوں کی ترتیب' تنظیم اور تشکیل میں نئے تقاضوں کو پیش نظر رکھا اور دوہے ایسے لکھے کہ ان سے اردو میں دوہا نگاری کا ایک نیا سلسلہ قائم ہوگیا۔ ان کی غزلوں میں خواہش زندگی اور کاہش زندگی کے رنگ ساتھ ساتھ ملتے ہیں اور جذبہ و فکر کی حسی آمیزش کا احساس ہوتا ہے۔ گیتوں اور قومی ترانوں میں خیالوں اور سروں کی بندش اور احساس موسیقی نے نئے گوشے نکالے اور دلچسپی پیدا کی ہے۔ دوسرے مجموعے "لاحاصل" میں روایت اظہار پر پورے دسترس کے ساتھ فکر کے نقوش زیادہ واضح ہوگئے ہیں۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے تقریباً دس سال بعد ان کا تازہ مجموعہ "اے مرے دشت سخن" شائع ہوا ہے جس میں ان کا قدم دانش حاضر کی جانب اٹھا ہے۔ ان کی شاعرانہ شعور کو سائنسی آگہی نے متاثر کیا ہے اور اس شعور نے سائنسی ترقیوں کے پس منظر میں احوال انسان کا جائزہ لیا ہے۔ پھر اس مجموعے میں عالی جی نے جمالیاتی تجربے کو سائنس تک پہنچانے کی جو کوشش کی ہے وہ پر نتیجہ ہے۔ چنانچہ جذبے' تخیل اور دانش کے امتزاج سے نئی شاعرانہ شکلیں وجود میں آئی ہیں۔ "اے مرے دشت سخن" ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں عالی جی نے نظموں کی طرف خاص توجہ کی ہے اور سائنسی معاشرے کے تناظر میں شاعرانہ ذہن کی کشمکش کو پیش کیا ہے' آگے کی جانب قدم اٹھایا ہے اور آگے کی دنیا کو ضبط تحریر میں لائے ہیں۔

"اے مرے دشت سخن" میں بھی عالی جی کی روایت سے وابستگی باقی رہی ہے۔ لیکن یہ مجموعہ روایت اور غیر روایت کے

رسیان ایک نئے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد نے لکھنے والے کو الفاظ کے مترسے طلسمات کے کارخانے تیار کرنے والے جادوگر کہا تھا۔ لیکن بعض اوقات یہ جادوگری حقیقت بیانی میں مانع ہوتی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ نہ صرف حقیقت کو آرائش کے بغیر پیش کیا جائے بلکہ اظہار کے روایتی سانچے بھی رد کردیئے جائیں۔ عظمت اللہ خان نے شاید اسی لئے غزل کی گردن بے تکلف ماردینے کا مشورہ دیا تھا اور بودلیر (Charles Baudlaire) نے طلاقت لسانی (Eloquence) کو کشتنی کہا تھا۔ عالی جی بھی اس مجموعے میں ایک جگہ اپنی آرزو کو اس کمروری اور بے روایت یعنی اپنی ہی زبان میں پیش کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ روایت سے گہرے تعلق کے باوجود جدید شاعرانہ اظہار کے لئے نئے سانچوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ وہ رنگین بیانی کے بجائے اگلوں کے "سہل" میں "ممتنع" پرونے کے قائل ہیں اور آج کے لئے بھی وہ "سادہ بیانی خوش معانی" کی بے پکارتے ہیں۔ لیکن سادہ بیانی کی بھی مختلف سطحیں ہوسکتی ہیں اور خوش معانی' سائنس اور تہذیب کے نئے آمیزوں کو پیش کرسکتے ہیں۔ چنانچہ عالی جی نے اپنی نظموں کے تقاضے سے بول چال کے لہجے' بول چال ٹکڑے بھی پیش کئے ہیں اور سائنس کی دنیا کے الفاظ استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ اس مجموعے میں بیان کی نئی شکیلات اور اظہار کے نئے پیرائے بھی ملتے ہیں۔ "اے مرے دشت سخن" سے عالی جی کی دلکش روایت کی حامل شاعری میں ایک نیا طرز اظہار آیا ہے۔

شاعرانہ شعور اور سائنسی آگہی کا تعلق نیا نہیں' اقبال' جوش' مجاز' احمد ندیم قاسمی' علی سردار جعفری' فیض' مخدوم' جاں نثار اختر' اختر الایمان' اور عزیز حامد مدنی سب کے یہاں اس تعلق کا کسی نہ کسی صورت سے اظہار ہوتا ہے۔ لیکن عالی جی کا بجہ اظہار' صورت اظہار اور دائرہ اظہار مختلف ہیں۔ دراصل سائنسی شعور کی مختلف سمتیں اور مرحلے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے معاشرتی اقدار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس نے فلسفہ اور ادب دونوں کو متاثر کیا ہے' پھر سائنس نے جس تحقیق' تجسس اور تجزیے کے رویے کو فروغ دیا اس کی الگ اہمیت ہے۔ اپنے دور کے حالات پر معروضی نظر ڈالنا بھی سائنسی شعور کا وصف ہے۔ مستقبل کا تصور' خیالی بھی ہوسکتا ہے اور خارجی عوامل کی بے لاگ تحلیل پر مبنی راہ حل بھی۔ ایسا حل جس میں خود زندگی کی حرکت اور انسانی تاریخ کی پیش روی شامل ہو۔ اس لحاظ سے سائنس اور سماجی علوم کی حدیں مل جاتی ہیں۔ یہ الگ میدان ہے جس پر سماجی علوم کے ماہرین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ادبی فکر کے دائرے میں ادب سے سائنس کے تعلق پر میسیو آرنالڈ' آئی اے رچرڈز اور بعض دوسرے اہم نقادوں نے بحث کی ہے۔ اردو میں حالی سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے۔ ہربرٹ ریڈ کے خیال کے مطابق سائنس اور شاعری کا اجتماع ذہانت کا کرشمہ ہے۔ البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) نے سائنس کی ترقی کے لئے فاشزم کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سچائی کی آرزو کو تمام آرزوؤں سے برتر ہونا چاہئے۔ صرف یہ بنیاد تھی جس پر ہماری تہذیب نے یونان سے آغاز کیا تھا" وہ مزید کہتا ہے کہ "جہاں سائنسی جستجو شل کردی جاتی ہے' وہاں قوم کی ذہنی زندگی خشک ہوجاتی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ مستقبل کی ترقی کے تمام امکانات محدود ہوجاتے ہیں"

(The World as I see it) اگرچہ گہرے لاشعوری محرکات کی وجہ سے شاعری کو حقیقت کا سائنسی توجیہات

سے زیادہ بہتر اظہار بھی کہا گیا تھا لیکن جیروم برنر (Jerome Burner) نے ان محرکات کو فن کار' انسان دوست اور سائنس داں کے روابط میں اضافہ آگہی کا سبب بھی بتایا ہے۔ آج فاشزم کا پرانا خطرہ ٹل جانے کے بعد بھی فاشزم نئی صورتوں میں موجود ہے۔ سائنسی ترقی کو مخدوم کرنے کی جگہ محکوم بنالیا گیا ہے اور انسانی آگہی کو خانوں میں بانٹ کر مجموعی تصور انسانیت پر ضرب لگائی گئی ہے۔ مشینوں کے دھویں سے سیہ پوش معاشرے کا منظرنامہ مختلف ہو گیا ہے۔ خلاؤں کا سفر جاری ہے لیکن زمین پر چلنا مشکل بنتا جا رہا ہے۔ سائنس سے جو نیک تمنائیں وابستہ کی گئی تھیں' وہ پوری نہیں ہوئی ہیں۔ آج کی صورت حال سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ صرف سائنسی ترقی کافی نہیں' معاشی انصاف' تہذیبی وسعت' ذہنی ترقی اور انسانی اقدار بھی ضروری ہیں۔ لیکن ان وجوہ سے سائنس کو رد کرنے کی جگہ اس کی نئی انسانی تطبیق لازم آتی ہے۔ پھر آج کی صورت حال بھی مستقل نہیں۔ انسانی تاریخ دو قدم پیچھے ہٹنے کے بعد پھر آگے بڑھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج اقدار تہ وبالا ہو رہی ہیں۔ جدید صنعتی دور میں بڑے شہر تنہائی کا آسیب بن گئے ہیں۔ امیدوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہے اور انسان بڑی تحریکات کے نہ ہونے سے روحانی اور جذباتی سہاروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ڈایلان تھامس (Dylon Thomas) کے بول تاریکی دیواروں پر سانپوں کی ٹوکریوں کے ساتھ آویزاں ہے۔ ان حالات میں انسان دوستی عالی جی کی شاعری کا ایک روشن نقش ہے۔ اشیاء اور رشتے ان کے کلام میں انسان سے وابستہ ہیں۔ سائنسی معلومات کا اظہار ان کے یہاں اپنے تہذیبی پس منظر سے منسلک ہو کر ہوا ہے۔ اس تہذیبی پس منظر میں جہاں حال و قال کی حدود میں تصوف نے اپنا رنگ قائم کیا تھا وہاں "نقش دگر طرز دہ' آدم پختہ تر بیار" اور "لا ہے زہرہ کا دم از کعبہ بہ بتخانہ" کی صدا بھی گونج رہی تھی۔ ایک مختلف تناظر میں عالی جی انسان کے موضوع پر تقریباً دس ہزار مصرعے لکھ چکے ہیں۔ اس طویل نظم کے کچھ حصے اس شعری مجموعے میں موجود ہیں ان حصوں میں کلام و خود کلامی نے بہت سے عصری تغیرات کو سمیٹ لیا ہے' سائنس کے مظاہرے نظر آتے ہیں اور موضوعات کے تنوع کے ساتھ انسان کے عقلی و جذباتی اضطراب کی متعدد صورتیں پیش کی گئی ہیں۔

مسلم تاریخ میں زوال آدم کے ساتھ خلافت الٰہیہ کے تصور نے خیالات کے نئے دروازے کھولے تھے۔ پھر افکار تصوف نے جس طرح بار امانت کے تفکر کو جلا بخشی اس نے نئے ذہنی گوشے سجائے تھے۔ صنعتی دور تک انسان اور فطرت کی دو بڑی اکائیوں کو معاشرتی استبداد بھی رد نہ کر سکا تھا۔ شاعروں نے مظاہر فطرت میں سکون بھی ڈھونڈا تھا اور اپنے دور کے آلام و مصائب کو آسمان یا فطرت کے جور و تعدی سے بھی موسوم کیا تھا۔ صنعتی دور نے بڑے پیمانے پر فطرت کی تسخیر کے ساتھ ساتھ ماحول کی آلودگی اور انسانی وجود کی شکست و ریخت کا سامان کیا۔ فوق الانسان کا تصور' پھر انسان کی فتح کی خواہش پر مبنی تھا۔ لیکن سماجی و معاشرتی حالات اور جذباتی و حسی تجربات اسے ٹوٹا پھوٹا آدمی بنا رہے تھے۔ کارل یونگ (Carl Jung) نے جدید انسان کو اپنی روح کی دریافت کرتے ہوئے اکیلا پایا تھا۔ ریلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے یونگ کے اجتماعی لاشعور سے زیادہ حال کے اضطراب سے واسطہ رکھا تھا۔ لیکن انسان کی روحانی اور فکری زندگی کو ماضی سے حال کے تعلق کے باوجود ویران اور ناآسودہ پایا تھا۔

انسانی وجود کے بارے میں یہ اضطراب خود اس کی دلیل ہے کہ وجود اور معنی کا رشتہ منقطع نہیں ہو سکتا۔ کچھ جبلت کے

ذریعے، کچھ اساطیر کی مدد سے، کچھ ماضی کی بازیافت، کچھ نئی اخلاقیات کی تلاش، کچھ تعقل، کچھ نا۔عقلیت اور کچھ خود انسانی کی صورت حال کے تاثر سے اس رشتے کی جستجو کرنا چاہتے ہیں۔ ایسٹ نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ "صرف وقت کے ذریعے وقت مفتوح ہوتا ہے" یوں تو ہر راہ وقت کی گواہی دیتی ہے، لیکن اقبال نے عشق کو وقت سے بالاتر قوت بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اقبال نے عصر رواں کے سوا دوسرے زمانوں کا ذکر کرتے ہوئے، عشق کی جس بالاتر قوت کو دوسرے زمانوں کا حامل بتایا ہے اس کی بنیادیں انھیں ہمارے تہذیبی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات نے فراہم کی تھیں۔ ایسٹ کی شاعری اقبال کی طرح جدید صنعتی معاشرے کا پس منظر رکھتی ہے، لیکن اسے فکر کی تحریک یونان کی آغاز کردہ تہذیب کی خصوصیات دور حاضر اور مسیحی اقدار نے فراہم کی ہیں۔ ایک نظم میں وہ کہتا ہے کہ "وقت حاضر اور وقت گذشتہ، شاید دونوں وقت مستقبل میں موجود ہیں اور وقت مستقبل، وقت گذشتہ میں مشتمل ہے" جدید اردو شاعروں نے بھی اسی صنعتی پس منظر میں اپنے اپنے طور پر وقت کے نقوش ابھارے ہیں۔ ضیا جالندھری نے سحر و شب اور رتوں کے سارے قافلوں کو گردشی بتاتے ہوئے کہا تھا کہ

مگر یہ تکرار آمد و رفت ایک تسلی سے بیشتر خاک بھی نہیں ہے
کہ وقت تو ایک جادۂ نارسا کی مانند جاوداں ہے

اختر الایمان نے ذات کے حوالے سے گردش ادوار کے درمیان صنعتی دور کے اضطراب کی ترجمانی کی ہے، لیکن بنیادی احساس مایوسی کا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

غرض اک دور آتا ہے، کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں

ان کے مقابلے میں فراق کی آواز زیادہ توانا اور رجائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

آج دو جگ مل رہے ہیں، کانپتی ہیں چپے چپے
پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں

عالی جی کی شاعری مسلم تہذیب کے ورثے سے منسلک رہتی ہے لیکن عالی جی کے لئے مستقبلیات ایک اہم موضوع دل چسپی رہا ہے۔ ان کا فکری رویہ نہ صرف دور حاضر کی فراہم کردہ سائنسی معلومات کو جذب کرتا بلکہ بسیار صدیوں کی طے کردہ حدوں کے ساتھ بسیار صدیوں کے تصور کردہ امکانات پر بھی غور کرتا ہے۔ ان کے اظہار میں اس کشمکش کی جھلک ملتی ہے جو حال مستقبل کے درمیان جاری ہے۔ اسی لئے ان کا لہجہ دوسرے شاعروں سے مختلف ہوگیا ہے۔ خصوصاً ان کی جدید انداز کی

نظمیں ایک جدید آہنگ (Distion) کی حامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

خلا خالی نہیں ہے
خلا سائنس دانوں کی لغت والا خلا خالی نہیں ہے (امکان)
کیا ہیں صدیاں وقت کی پرچھائیاں
ان سے کیوں منسوب ہوں، انسان کی گہرائیاں گہرائیاں (حد ادب)
اگلی نسلوں کو مبارک ہوں وہ فردوس زمانے جو اگر آئیں مگر اس کو یہ
جیتے جی میرے کھلے گا نہ ذرا گلشن ویرانہ من
بعد آزادی ہماری جی نی اس پر کیسے بادل چھا گئے
کیا تمہارے ارتقاء کے فلسفے میں شاونیت کے عناصر آگئے (تیرا)
آگے جاناں ہے تو رہوار بدلنے ہوں گے
ہم کو معیاروں کے معیار بدلنے ہوں گے

عالی جی کی نظم "تجی" ایک اہم نظم ہے اس کا دائرہ ذات سے تکوینیات (Cosmology) تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ذات خود انسان کا اشارہ بن گئی ہے اور اس خیال کے بجائے کہ دھماکہ سے پیدا ہونے والی یہ کائنات ہلکی نحیف آواز سے ختم ہوگی، اسے دھماکہ سے ختم ہونے والا بتایا گیا ہے۔ یہ دھماکہ انتشار ہو یا قیامت اس سے پہلے صدیوں کے کارنامے اور کارناموں کی آرزو جستجو ہے کہ اب تک کی صدیاں تو زندگی کی اس روانی میں الف بے ہیں اور بس۔ اس نظم میں نئے دور کی پیدا کردہ تکنیک اور قدیم روایت کے احساس کے ساتھ ادعائے کار انساں کی کارگری بھی ملتی ہے وہ کہتے ہیں کہ :

یہ صدیاں تو الف بے تھیں
رہی وہ عشق کی تقویم
شاید کوئی کیفیت جو ہو نا قابل تقسیم
کبھی آجائے گی ادراک میں بھی یا سدا ہی ماسوا ہوگی

صدیوں کے مزید وقت کی آرزو کے ساتھ، وقت کی گزری ہوئی منزلوں کے احساس میں یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ انسان کے تجسس کا سفر غیر مختتم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

مگر گزری ہوئی سب منزلیں خود ہی بتاتی ہیں
اگر مڑ جاؤ اور پھر آؤ تو اک اک راہ کے ہر ذرے پر لکھا دکھاتی ہیں
کہ جتنے مرحلے طے کرتے جاؤ، سامنے اک مرحلہ ہوگا

"تجی" جاننے کی جس تڑپ کو پیش کرتی ہے، اس تڑپ کے لئے صدیاں بھی ناکافی ہیں۔ سوالات بے شمار ہیں اور کبھی جوابات بقول سرار جعفری مجرم کی طرح ان سے گریزاں رہتے ہیں،

دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

اور کبھی جو جوابات ملتے ہیں' وہ خود نئے سوالوں کو جنم دیتے ہیں۔ یہی نہیں سوالوں اور دیئے ہوئے جوابوں کو خواہ وہ اس وقت کیسے ہی قابل یقین کیوں نہ ہوں' نہ صرف اس دور تاریخ بلکہ بدلتی ہوئی تاریخ کے سیاق و سباق میں دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے فرد کے افکار کو معاشرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور خود معاشرے کو زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں بلکہ زندگی کی بہتری کی انقلابی جدوجہد سے منقطع کرلیں' تو ہم ان سچائیوں تک نہیں پہنچ سکتے' جو خود وقت کی طرح متغیر رہتی ہیں' ایک کتاب "اے ماڈرن سمپوزیم" (A Modern symposium) میں جی' ایل' ڈکسن (G L Dickinson) نے بعض سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کے مذاکراتی مکالمے جمع کر دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا بیان قابل توجہ ہے کہ "اگر افلاطون کے لئے قابل آبادی کرہ زمین پر اپنے فلسفیانہ شہروں کے ذریں کو نصب کر دیتا' سائنس اور ایجاد کے چشموں کے منبع پر مہر لگا دیتا اور سلطنت کی اس پر قوت خطابت کو جو تھا اس ارتقا پذیر مخلوق "انسان" کے سرکش اور خود سر جذبے کو اجتماعی اور فائدہ رساں مقصد کے لئے مربوط و ہم آہنگ کر سکتی ہے۔ "دائمی طور پر اسیر ناتوانی بنا دیا۔" عالی جی نے "حجی" میں جو سوال اٹھائے یا جو جواب دیئے ہیں وہ ان کے انداز فکر کا حصہ ہیں۔ ان کی فکر اور انداز فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی استفہامی فکر کا خاکہ غیر رسمی' وسیع اور جدید ہے۔

عالی جی نے اپنی نظم "ایک سادہ سے تقریب" میں کہا ہے کہ

رہا یہ قصہ کہ کب' کون' کس کو' کیا مانے
یہ کون جانے ازل جانے یا ابد جانے

غالب نے اپنے سفر میں ہر قدم دوری منزل کو نمایاں پایا تھا۔ عالی جی ارتقائے آگہی کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ "بہت سے تشنگان بے زبان و خوش بیاں آئے ہیں' آئیں گے"۔

آشوب گاہ جستجو میں جلوہ معنی کی تلاش ایک فرد نہیں' نسلوں کے بعد نسلوں تک جاری رہنے والی خواہش کا سلسلہ ہے' جس کے لئے اب تک کی صدیاں صرف ابتدائی حیثیت رکھتی ہیں اور "حجی" میں یہ کاوش و تلاش اپنے مفاہیم کے لئے جگر کاہ تجسس' روح مادہ' جسم توانائی' سندھ لے ریلی' امواج بے حساب اور بحر خلا کے رکن بے آداب جیسے لفظوں کو آئینہ اظہار بناتی ہے۔

عالی جی کی طویل نامکمل نظم "انسان" کے جو حصے اس کتاب میں شامل ہیں' وہ ایک وسیع دائرے میں ان کے شاعرانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ "انسان" کا شمار ان کی اہم نظموں میں ہو گا اس کا موضوع بظاہر عاشقانہ ہے' لیکن اس طویل نظم میں جو دوسرے موضوعات لائے گئے ہیں ان کے پیش نظر اس کی معنویت بدل جاتی ہے۔ یہ ایک ڈرامائی نظم ہے جس میں جمالی' اسرار' کئی ہیولے' آواز' ایک نسوانی آواز' چند نوجوان' حسینہ' معینہ اور خود سیمایا سیما کی خیال / روحانی تجسیم اپنے اپنے حصے کے ذہنی رویوں کو پیش کرتے ہیں۔ لان جائنس (LONGINUS) کے بقول "کسی حد تک روحانی برگزیدگی کی

پرورش، رفعت بخشنے والے ذہنوں اور خیالوں کی غذا سے بھی ہو سکتی ہے۔" چنانچہ اس نظم میں برگزیدہ خیالات اور خیالات کو رفعت بخشنے والے کئی مفکروں کے حوالے ملتے ہیں۔ لیکن جمالی کا ذہنی اضطراب اور تصوراتی کش مکش ایک ڈرامائی صورت حال کی حامل ہے اور یہی نظم کی اساس ہے۔ یہ محض بیانیہ نظم نہیں۔ اگرچہ ایک منظم ڈرامائی پلاٹ کی صورت اور سلسلہ واقعات سے رونما ہونے والے ایسے تزکیے کا نقش جو وحشت اور ترحم کو بروئے کار لا کر اخراج جذبات کا سامان کرے اس میں اس طرح نہیں ابھرتے جسے ہم ڈرامے کی خصوصیت کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ ڈرامانہیں ایک ڈرامائی نظم ہے اور یہ نظم بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود ڈرامے کی تنقید میں ارسطو سے لے کر اب تک تصورات کی بڑی تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ ارسطو نے پلاٹ کو اولیت دی اور اسے پہلا اصول قرار دیا تھا لیکن اب بعض جدید نقاد اجزاء کے جاری رہنے، بڑھنے، بدلنے اور شروع سے آخر تک کے جوڑنے کے نظام کو بھی پلاٹ کے وجدانی تصور میں شمر کرتے ہیں۔ یہی نہیں بعض تو مختصر نظموں میں طرز کلام، تمثال سازی مرتب کا آہنگ کو بھی اس کی حدود میں کھینچ لاتی ہیں۔ اسی طرح تزکیے کے لئے بھی اب پلاٹ سے زیادہ زندگی میں رحم اور خوف کے ناقابل مطابقت جذبوں کی فن میں یک جائی کو اہم سمجھا جانے لگا ہے۔ مختصر یہ کہ اس نظم کے اجزاء کی تنظیم کے بارے میں تجزیے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن اس پر سب متفق ہوں گے کہ اس میں افراد کی بجائے انسان اور انسانی صورتحال کے نشانات ملتے ہیں اسی لئے اس کا عنوان "انسان" رکھا گیا ہے۔ اس انسان کی حیثیت کا جیسے اس کائنات میں آزاد یا بے بس چھوڑ دیا گیا ہے تعین کیسے کیا جائے؟ آزادی یا بے بسی کی توجیہیں مختلف ہو سکتی ہیں، اس میں کسی کی منشاء کو دخل ہے یا یہ خود پیش آنے والی ایک صورت ہے؟ ایک فکر کے مطابق انسان اپنے وجود کے تمام امکانات کو اپنے ارادے اور عمل کی قوت سے بروئے کار لا سکتا ہے اور لا رہا ہے۔ دوسری فکر اس کے وجود ہی کو خواہ اس کی کوئی بھی توجیہہ کی جائے لاحاصل سمجھتی ہے۔ ہستی اور عدم کے درمیان خیالات کے جو متعدد سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض صوفیوں کی طرح انسان کے لئے "زہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم" کہہ کر بھی ایک معلوم نامعلوم کو مانتے ہیں اور بعض اپنی ہستی کو مانتے ہوئے ان معلوم معلوم کو روم کو معدوم سمجھ لیتے ہیں۔ ان دو رویوں کے بیچ میں بھی بہت سے راستے ہیں اور ہر راستے کے مناظر الگ الگ ہیں۔ عالی جی نے بزبان جمالی "کہ ہم تو باغ وجود میں جیسے کچھ پرندے ہیں، صرف بندے ہیں، تو خدا ہے" کہلانے کے بعد بھی وجود کی صورت حال پر اپنے شک اور اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ لیکن پھر وہ خدا سے رحم کی درخواست کے ساتھ آدمیت اور عبدیت کو منسلک کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

کہ میں ترا محمد تیرا بندہ ہوں

آدمی ہوں

دراصل عالی جی کے یہاں مظاہر جدید اور سائنس کی لائی ہوئی تجدیدیت کے باوجود روایت سے انقطاع کی صورت نہیں ملتی، اس نظم میں مسلم روایات کے حوالے کے علاوہ دوسرے حوالے بھی ملتے ہیں، اگرچہ جمالی اپنے شک، اضطراب اور نارضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

میں کیسی الجھن میں مبتلا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور حکایتوں کے سپنولے اندر سے ڈس رہے ہیں
یہ میری کم مائیگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے ڈنشر
مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں

چلے گئے تو چلے جاؤ اور دوبارہ کبھی آؤ نہ آؤ
بس آسماں کے حوالوں سے مسئلے نہ اٹھاؤ

جمالی کا مسئلہ ہیما کی موت کا مسئلہ ہے کہ گلابوں کو اشک آنے والا تازہ دم وجود "ہزاروں صدیوں کی منجمد کالی کالی مٹی میں دب گیا ہے۔" لیکن جو آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ ان کا یہ استفسار جاری ہے کہ:

کبھی کسی نے جو ویدوں میں ہے بتایا ہے

کبھی مہاتما بدھ سے بھی دل لگایا ہے
جناب جین کا مسلک سمجھ میں آیا ہے

کسی نے آتش زردشت میں تپایا ہے

کبھی ہماری اناجیل دیکھ پایا ہے

کبھی کسی نے تجھے لاوزے پڑھایا ہے
کبھی پیا جو غم تاؤ نے پلایا ہے

یہ سب حوالے اپنی جگہ اہم ہیں، مگر ان سے اہم یہ نتیجہ ہے کہ انسانی تاریخ کا مستقبل ماضی سے منقطع نہیں ہوتا اور تاریخ کے سفر میں ماضی کے نشانات راہ سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ یہی حال انسانی علوم اور تہذیبی ترقی کا بھی ہے۔ اس نظم میں عالی جی کہتے ہیں کہ:

جو بے الف کے پڑھے میم تو کرتے ہیں
وہ صرف و نحو و معانی کا خون کرتے ہیں

عالی جی کی اس نظم اور بعض دوسری نظموں میں بھی کہیں آشکارا اور کہیں پنہاں ایک ہر طرح کی بھی ملتی ہے۔ طنز خفی، طنز عیاں، استہزا اور بعض دوسرے اقسام طنز و ظرافت کو ڈرامے میں اہم مقام حاصل ہے کہ ان کے ذریعے صورتحال کی

ناہمواریوں کو زیادہ تیکھے انداز میں ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سقراطی طنز تجاہل عارفانہ پر مبنی تھا۔ فن اور دانش کے تمام شعبوں کا مقصد مطالعہ انسان ہے۔ پوپ نے نوع انساں کے لئے انسان کے مطالعے ہی کو صحیح و مناسب قرار دیا تھا اور خود انسان کو بے شمار غلطیوں کے درمیان سچائی کا تنہا منصف اور دنیا کے لئے شان مذاق اور معما بتایا تھا۔ اگر انسان کا یہ حال ہے تو اس کے حاصل کردہ اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں علم کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک زاویہ نظر الیٹ کا ہے جو اس کے مندرجہ ذیل اشعار (کے ترجمے) سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارا سارا علم ہمیں جہالت کے زیادہ قریب لاتا ہے
ہماری ساری جہالت ہمیں موت کے زیادہ قریب لے جاتی ہے
لیکن موت کا قرب خدا سے زیادہ قربت نہیں
وہ زندگی کہاں ہے جسے ہم نے جینے میں گنوا دیا ہے
وہ دانائی کہاں ہے جسے ہم نے علم میں کھو دیا ہے
وہ علم کہاں ہے جس سے ہمیں اطلاع نے محروم کردیا ہے

انسانی آگہی کے حزن تضادات لارنس نے سابقہ مختصر سنجیدگی سے بیان کردیا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کی المناکی فرحیہ طور پر بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ حالی جی نے انسان میں غم انگیز کیفیتوں کو سنجیدگی سے بھی بیان کیا ہے لیکن انسان کے سرمایہ دانش ایک بڑے نشے پر اس کا یہ طنز بھی قابل مطالعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ جو ہزار ان سے
یہ تالاب
ناواقفیت سے لبریز لیکن تمہارے تصور میں آب بقا کے
تمہارے لئے حوض خاص شہاں ہیں

جاننے کے لئے آدمی کو فلسفہ طرازیاں کی ہیں، سائنسی آگہی کو فروغ دیا ہے اور سماجی علوم کے دروازے کھولے ہیں۔ لیکن آدمی کے انسان بننے کی منزل ابھی نہیں آئی ہے۔ اس نظم میں آواگون کے قدیم عقیدے اور ری سائیکلنگ کے جدید طریقے کا ایک ساتھ ذکر کر کے ماضی و حال ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ عالی جی کہتے ہیں کہ :

اگر یقین ہو ری سائیکلنگ پہ تم کو
کوئی مصر ہو تو آواگون اسے کہہ دو

پھر اسی آدمی کا ایک رخ عورت بھی ہے۔ چنانچہ عالی جی نے تحریک نسائیت کو فراموش نہیں کیا ہے اور عصر نسائیت کی ایک مغربی مثل بیان کرتے ہوئے کہ :

شاخ اخروٹ، عورتیں، کتے
جتنا پیٹا انہیں وہ ٹھیک رہے

انہوں نے مغرب کی نسائی تحریک کی مغربی خواتین رہنماؤں کا نام لیا ہے۔ لیکن جمیلہ بوپاری، بیگم سن یات سن، مادام فاؤ، عصمت چغتائی، ادا جعفری اور مادر ملت کو نہیں بھولے ہیں۔ معینہ تحریک آزادی نسواں کی ترجمان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ :

ہم بچن، کمیسوں، کتابوں سے
مل کے نکلیں نہ کیوں عذابوں سے

اسی طرح عالی جی یونگ، فرائڈ اور ڈارون کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ آٹھویں ہیولے کی زبان سے کہلاتے ہیں کہ :

جو آج مارکس اور اینگلز سے ہوں بیگانے
وہ کچھ بھی جان لیں، جانو کہ کچھ نہیں جانے

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان متعدد و مختلف بلکہ اکثر متضاد فکری دھاروں میں وہ کیسے وحدت پیدا کرتے، کسے مانتے اور کیوں قابل ترجیح سمجھتے ہیں؟ شاید اس نظم کا مقصد انسانی افکار کا تنقیدی تجزیہ نہیں انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش پیش کر دینا ہے۔ نظم کا اصل تصادم بڑے تصورات اور انہیں پیچ در پیچ بنانے کی کوشش میں ملتا ہے، جسے عالی جی کی اس نظم نے طنزیہ پیرائے میں جگہ جگہ نمایاں کیا ہے۔ ایک وہ تاویل تھی کہ جس کا ہماری ادبی تاریخ میں کہیں ذکر مل جاتا ہے، جو الجھی کی زبان میں انگیا کی توڑا موڑی کو بھی جسم کی منزل روحانی تک پہنچنے کی کوشش بتاتی تھی اور ایک انگریزی ادب میں ہارٹن کا وہ طنز تھا کہ بعض افراد کے خیال میں بیٹرس (BEATRICE) سے مراد محبوبہ نہیں، الہیات تھی۔ عالی جی کی اس نظم میں انسان کے تصورات و اعمال کو بعض زاویوں سے مضحک اور ہزیمت زدہ قرار دیا گیا ہے لیکن اس شکست اور ہزیمت زدگی میں امتیاز بشری اور اندوہناکی بھی مضمر ہے۔ چنانچہ "اسرار" اگر طنز و تضحیک کو راہ دیتا ہے تو جمالی جذباتی اور ذہنی غم و اضطراب کی ترجمانی کرتا ہے۔ پھر ایک بوڑھے کی گفتار کیفیتوں کے جنگل میں اور دلیلوں کے انبار میں وارد ہوئے صبر روشن ضمیر میں مسلسل عمل اور توفیق ربانی کی تلقین کرتی ہے۔ عرفی نے سخن پیر مغاں کو اپنی روشن دلی کا باعث بتایا تھا۔

گشتہ ایم از سخن پیر مغاں روشن دل

بفروغ نقش جام جم افروختہ ایم

عالی جی کا جام جم آج کی دنیا ہے اور جمالی آج کے اضطراب کی ترجمانی کرتا ہے۔ آج کا انسان اپنی کیفیات میں منقطع، اپنی نجات میں تکمیلی اور اپنے انجام میں منقود نہیں۔ اس کی جستجو کے مراحل پیچیدہ اور غیر مختتم ہیں کیونکہ وہ تہذیبی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے سلسلوں سے وابستہ ہے۔ ایسے سلسلے جن میں انسانی زندگی اور افکار دونوں انقلاب اور تبدیلیوں کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان تبدیلیوں سے بدلتی ہوئی اقدار کا تعین ہوتا ہے۔ ان ہی سے ذات کی اثر پذیری اور اثر اندازی کے حدود قائم ہوتے ہیں۔ ہر تغیر ارتقاء اور ہر بڑے انقلاب کے بعد یہ حدود زیادہ جامع اور زیادہ وسیع ہوتے رہتے ہیں۔

کرۂ ارض کے بحران اور عاملیت انسان کے موضوع پر لکھتے ہوئے آر ہگنس (R.HIGGINS) نے کہا تھا کہ "سائنس اب جیسے ایک خودکار قوت بن گئی ہے جو خود اپنی محرک منطق رکھتی ہے۔" یہ صورتحال اس انسانی شعور ارتقاء کے لئے جو انسان کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے' انسان اور فطرت میں ہم آہنگی قائم کرنا چاہتا ہے' ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ عالی جی کی نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے لائے ہوئے انقلاب کے دور میں انسانی زندگی کے پھیلے ہوئے تضادات کو پیش کیا ہے اور تاریخ کی راہ میں سرگرم سفر آدمی کے ذہنی کرب و اضطرار کی ترجمانی کی ہے۔ خرد پسندی کی وسیع تحریک کے ساتھ تعقل کو بلند درجہ حاصل ہوا ہے۔ سائنس نے اپنے علم سے فلسفیانہ افکار کو بھی متاثر کیا ہے۔ اضافیت محض ایک سائنسی اصول نہیں رہی' زندگی کو پرکھنے کا وسیلہ بھی بن گئی ہے۔ لیکن کیا آج صرف سائنس کی پروردہ دانش کافی ہے یا اس دانش کو معاشرے کے ارتقائی تصورات سے منسلک کرنا ضروری ہے؟ وجودیت اور جدیدیت کی بغاوتیں یا انحرافات اگر انسانی رشتوں کو نظر انداز کردیں تو ان رفاقتوں کی ترجمانی سے قاصر رہتے ہیں جو بین الاقوامی تہذیب کی بنیاد بن رہی ہیں۔ عالی جی کی اس نظم میں انسانی سوچ کے متعدد رخ پیش کئے گئے اس میں استدلال اور رد استدلال کی فضاء ملتی ہے عالی جی کے پیش نظر وہ نشانات بھی ہیں جو انسان کی دروں زندگی اور روحانی میلان نے قائم کئے ہیں۔ مسلم تاریخ متکلمین اور عمومی طور پر متکلمین دونوں نے آوردن دلیل اور قطع برہان سے کام لیا ہے۔ عالی جی نے ان دونوں ذریعوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن اس نظم میں بعض اوقات بذلہ سنجی اور دیگر عناصر طنز و ظرافت کی جو آمیزش ہوئی ہے وہ خود اپنی جگہ لطف انگیز ہے۔ آذری کا مشہور شعر ہے کہ:

زہول روز جزا آذری چہ می ترسی

تو کیستی کہ وہاں روز در شمار آئی

اس شعر میں "تو کیستی" اور "در شمار آئی" نے معانی کو کیسی جہتیں دی ہیں۔ فضل کریم فضلی نے اس شعر کا ترجمہ یوں کیا تھا کہ۔

پرسش روز حشر اور مجھ سے

کوئی دیکھے مغالطہ میر

اس شعر میں "مغالطہ" کے لفظ میں دونوں کیفیتوں کو شامل کرنے کی سعی ملتی ہے۔ عالی جی نے اپنی اس نظم میں آزری یا نفسی سے غیر متعلق ایک مختلف سیاق و سباق اور مجموعی انسانی زندگی کے پس منظر میں فرد کی پرسش اعمال کا سوال اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ:

اگر سمجھتے ہو حشر بھی بپا ہوگا
تو صرف تم سے حساب و کتاب کیا ہوگا

یہاں غزل کے شعر اور نظم کے فکری جزو میں جو پورے موضوع سے جڑا ہوا ہے۔ فرق ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ میاں غیب و حضور کی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے البتہ یہ اضافہ کہ "وہاں بڑے سے بڑا بھی لرز رہا ہوگا" میلان یقین کو پیش کرتا ہے لیکن اس پوری نظم میں تصورات کی کشمکش کا پیدا کردہ اضطراب ملتا ہے اس کے ساتھ یہ سوال جو جبر و قدر کے تمام افکار میں سنگ میل بن گیا تھا اٹھایا گیا ہے کہ:

جو جبر وجود سے نہ لڑ پائے
کیا صاحب اختیار کہلائے

یہ سوال آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں جب انسان مشینوں کی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے، ایک نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کا جواب جو بھی ہو اور اس جواب سے اتفاق یا اختلاف کی جو صورتیں بھی نکلیں، خود اس سوال کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ صنعتی دور کی بدصورتی، کارخانوں کے شور اور شہروں کی کشاکش کو اکثر شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ عالی جی نے اس نظم میں انسان کی ازلی طلب محبت کے پس منظر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے نظام میں کارفرما حقائق مضمرات کے درمیان انسانی وجود کا اثبات چاہا ہے۔

عالی جی نے شاعرانہ احساس اور جمالیاتی اظہار کو سائنس تک پہنچانے کی جو پر نتیجہ کوشش کی ہے، اس میں کئی پہلو قابل توجہ ہیں۔ اس شاعری کو پڑھنے اور ہضم کرنے میں کچھ وقت لگے گا کیونکہ سائنسی واقفیت، تخیل اور جذبے کو یکجا کیا گیا ہے، وہاں کہیں کہیں تشبیہات ہی نہیں خود موضوع شاعری میں غیر رسمیت آگئی ہے۔ ایسی غیر رسمیت جس میں نامانوسیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ جمالیات کے بیان میں اکثر کہا گیا ہے کہ چھپکلی فی نفسہ کریہہ ہے لیکن اس کی تصویر جمالیاتی حسن کی حامل ہو سکتی ہے۔ لیکن عالی جی اس کے ساتھ ہی ہمارے مغز میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ بتانے پر مصر ہیں۔ اس کا ارتقائے آدمی سے سائنسی تعلق کچھ بھی ہو، مگر اس ریپٹائلی ان کمپلیکس کو شرار بولہبی اور شیطنت مایہ کہہ کر اسے احسن تقویم اور نصوص محکم کے تصورات کے مقابل لانا، ان کے شاعرانہ تخیل کی صورت گری ہے۔ اس تخیل میں جو آدمی کو دیں انسان کی بھی خوش قسمتی کی عنایت شامل ہے۔ ان کے مشاہدے اور تجربے میں اس کیفیت نے بھی رنگ بھرا ہے "کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت اور وحشت کی آندھیوں سے فراغ"۔ گویا ایک نامانوس موضوع، سائنس کی پیش کردہ معلومات کے ساتھ عافیت خیز، ترجیحی تصورات اور وقت کے مشاہدات کو سمیٹ لیتا ہے۔ البتہ اس کا نیاپن موضوع کے علاوہ مرکزے، سفلی مرکبات، اور جینیات جیسی لفظیات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں "آشوب" اور "امکان" بھی

حال کے ایسے آئینے ہیں' جن میں ماضی و آئندہ کے نقوش ابھرتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک اعتبار سے عالی جی کی نہایت قابل ذکر نظم "تھنگرو" ہے جسے اپنی نوعیت میں منفرد اور اظہار میں الگ طریق کار حامل کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم ایک مخصوص ابعادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک لہر کی نظم نہیں۔ اس میں بیان و تاثر کی کئی لہریں مستی سازی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں قاری اور ناقدفن کا بھی خیال رہا ہے۔ گذشتہ تہذیب کے عکاس ایک شعر سے پچاس برس پہلے کے ایک قصے کو تازہ کرتے ہوئے' اس نظم میں حال کے نقوش جاگتے اور انفرادی و اجتماعی المیے کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ اس میں شعری بیان' افسانوی اثرانگیزی اور تنقید حال کے ساتھ جو تہذیبی جھلک ملتی اور تاریخی فسادات کی غمناک صورت حال سامنے آتی ہے' وہ نہ صرف اس کا دائرہ وسیع کرتی بلکہ نہایت موثر بنادیتی ہے۔ نثر میں تو فسادات کے متعلق کئی اہم فن پارے مل جاتے ہیں' لیکن نظم میں اس نظم کا حوالہ فسادات تاریخی دستاویزیت سے الگ' ذاتی کیفیتوں کے بیان کے اعتبار سے دوررس حیثیت رکھتا ہے۔ اس یک پارۂ خود نوشت میں صد دفتر آلام پوشیدہ ہیں اور شاعر کے غیر جذباتی بیان میں کہ وہ یہ قصہ لکھتے ہوئے نقاد اور قاری کو بھی ذہن میں رکھتا ہے' حزن آوری کے سو پہلو موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم اپنی کیفیاتی اور واقعاتی سطحوں میں پیچیدہ اور پر اسرار حسن رکھتی ہے۔ عالی جی کہتے ہیں کہ :

تب سے مری روح میں وہ تھنگرو
کبھی بجتے ہیں' کبھی روتے ہیں

عالی جی کی شاعری میں موسیقی کے احساس اور لفظوں کی صوتی خصوصیت کے ادراک کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ عالی جی کی سب نظموں' غزلوں' گیتوں اور دوہوں کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کلام میں موسیقیت فراواں کی تان گونجتی ہے۔ وہ کئی معنوں میں غالب سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی تخلیقی جہات نے خسرو سے زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ ان کے الفاظ کی نرمی' غنائیت اور ترتیب سے آہنگ خسرو کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ "نذر امیر خسرو" اور "یہ خسرو کی ایجاد" میں عالی جی نے فیضان خسرو کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ :

سر اور شبد اور دھیان کی اگنی شعلے جن کے لاکھ
خسرو پر چلیں جو جلیں پتنگیں' عالی ان کی راکھ

اسی احساس موسیقی نے ان سے "جے جے ونتی" اور "سر کیے بنا" لکھوائے۔ "نذر شاہ لطیف" میں راگنی محبت کا راگ بن جاتی ہے۔

عالی جی نے اس مجموعے میں نظموں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ لیکن ان کی کم تعداد کی غزلوں میں غزل کے روایتی حسن کے ساتھ ساتھ واردات تازہ اور دانش حاضر کے عکس ملتے ہیں۔ جذبی نے سیاسیات عالم میں خاص طور پر اینگلو امریکن بلاک کو سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا کہ :

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھئے
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

عالی جی نے زیادہ وسیع پیمانے پر کہکشاں کی پیمائشوں میں ارض و سما کے انتشار دیکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

جو کہکشاؤں کی پیمائشیں ہیں ان میں بھی
ہم انتشار ان ہی ارض و سما کے دیکھتے ہیں

ان کی غزلوں کے اشعار ان کے تخیل اور ترنم کے شاعرانہ اوصاف کے حامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

ایک عجب راگنی ہے، ایک عجیب گفتگو
سات سروں کی آگ ہے، آٹھویں سر کی جستجو

بکھیرتے رہو صحرا میں بیج الفت کے
کہ بیج ہی تو ابھر کر شجر بناتے ہیں

نہ ترے سوا کوئی لکھ سکے نہ مرے سوا کوئی پڑھ سکے
یہ حرف بے ورق و سبق ہمیں کیا زبان سکھا گئے

عالی جی نے دوسروں کی بڑائی کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس میں خود ان کی بڑائی جھلکتی ہے۔ عالی جی کی اس نوع کی نظموں میں "نذر بابائے اردو، مولوی عبدالحق" "نذر مشفق خواجہ" "حبیب جالب" اور "میرا جی صاحب" محض اعتراف کمال ہوتے ہوئے بھی ادبی اور علمی صورت حال کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مشفق خواجہ (مشفق، خواجہ) سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ :

مجھ کو یاد کرلینا
مختصر ہی کہہ دینا

جس قدر بھی دیکھی ہے
وہ جو مجھ پہ گزری ہے

کیونکہ وہ بہت سے دوسروں کے مقابلے میں مشفق خواجہ کو اپنا رازداں و ہم عناں پاتے ہیں۔ عالی جی نے میرا جی پر جو نظم لکھی ہے اور اسے جس طرح میرا جی صاحب کا عنوان دیا ہے، وہ ان کی انصاف پسندی کا تقاضا ہے کیونکہ ایسے میرا جی کو ان کی کارکردگی کے حوالے سے محسوس نہ کیے جانے کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ حبیب جالب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے عالی جی نے خوب کہا ہے کہ :

وہ تھا رفیق عوام اور انہی کی زباں میں کہتا تھا
وہ ان ہونٹوں پہ رقصاں دلوں میں رہتا تھا

حبیب جالب پر عالی جی کی نظم ان کی فطرت کے ایک رخ کو پیش کرتی ہے۔ وہ بھی بہت اہم ہے لیکن ان کی فطرت کا

دوسرا رخ بھی ہے' جس میں انھوں نے میرا جی کا نہایت عزت واحترام سے تذکرہ کیا ہے۔ جو نظم بابائے اردو کی نذر کی گئی ہے' اس میں اردو کالجوں کا ذکر نمایاں ہے۔ دراصل ان کالجوں کی ترقی میں خود عالی جی کا اہم حصہ رہا ہے' جس کا انھوں نے ذکر نہیں کیا۔

سائنس' حقیقت پسندی' روشن خیالی' مستقبلیت' قدیم روایات ورسوم وعادات اور نمایاں فردا' غرض یہ کہ آج کے تخلیق ذہن کے متعدد محرکات ہیں۔ تاریخ کے بارے میں الیٹ نے کہا تھا کہ یہ غلامی بھی ہو سکتی ہے اور آزادی بھی۔ ہیگل نے اسے روح آفاق کی توسیع سے تعبیر کیا تھا اور مارکس نے اسے انسان کے بہتر مستقبل کی جدوجہد کا امین پایا تھا لیکن ان کے ساتھ تاریخ ایک پل کا بیان بھی ہو سکتی ہے اور مقامی حالات وکوائف سے ذہن کو روشن کر سکتی ہے۔ عالی جی کراچی کی صورتحال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ۔

عدو ہواؤ کراچی کے لوگ ہارے نہیں
جو گھر گراؤ وہ بار دگر بناتے ہیں

ہماری قدیم تہذیب کو توہمات اور خرافات کا انبار بھی کہا گیا ہے اور مغرب کے اضطراب نے ہائنے ہوکے' ایلیٹ اور بودلیر جیسے شاعروں کو مشرقی تہذیب کے سرچشموں کی طرف مائل بھی کیا ہے۔ جدید دور میں مغرب کے بعض اہم مفکرین بھی مشرق سے متاثر ہوئے ہیں۔ عالی جی کے اس مجموعے میں توازن کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں بعض مغربی مفکرین کے افکار واقوال کا حوالہ ملتا ہے' وہاں ہماری علمی تاریخ اور تہذیب کی روایات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

تخلیقی سطح پر ایک قدیم صنف دوہے سے عالی جی نے بڑا کام لیا ہے اور اسے اردو کی مقبول صنف بنادیا ہے۔ ہندی میں بھی اس کے ماتراؤں کی تعداد کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے یعنی کئی نمونے ملتے ہیں۔ اردو کے نظام بحور میں بسرام سے ماتراؤں کی پابندی اکثر اظہار کی آزادی میں مانع آئی ہے۔ عالی جی نے اظہار کے دوران وسیلہ اظہار کے بدل جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

میرے ماترے گننے والے تو سچا پربار
جب خسرو کے ہاتھ سے گزری وینا ہوئی ستار

ماتراؤں کی تعداد کے تعین سے زیادہ اہم یہ ہے کہ شعری تجربے کو پیش نظر رکھا جائے اور یہ جانا جائے کہ ہمارے تہذیبی ورثے' اخلاقی روایات اور انسان دوستی کے تصورات کے پیش نظر منافع پرستی کے موجودہ پرتنازع دور میں عالی جی کی ترجیحات کیا ہیں! شاید اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ۔

بڑا ہے وہ بھی جو جیون سے جو مانگے وہ پائے
سب سے بڑا وہی جو اپنا سب کچھ ہی دے جائے

جب تک ہمارے شاعروں کی نواؤں میں انسانیت کی یہ آواز گونجتی رہے گی' اردو شاعری کا مستقبل بھی روشن رہے گا۔

پروفیسر نظیر صدیقی

جمیل الدین عالی

تقسیم ہند کے بعد فیض کے علاوہ جو شاعر اردو شاعروں کی نئی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے وہ عالی ہیں۔ فیض ہی کی طرح وہ شعراء اور سامعین دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہوئے ہیں۔ پاکستان سے ہندوستان تک نئی نسل کے متعدد شعراء ان کی تقلید میں دوہے لکھ رہے ہیں اور مشاعروں کے سامعین ان سے دوہوں کے سوا کچھ سننا نہیں چاہتے۔ کم از کم ڈھاکے کے سامعین نے ایسا ہی کیا تھا۔ عالی جب پہلی مرتبہ یہاں کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے اور انہوں نے غزل سنانی چاہی تو سامعین نے غزل سننے سے انکار کر دیا اور صرف دوہے سننے پر مصر رہے۔ آج عالی کا نام لیتے ہی ذہن دوہوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور دوہوں کا ذکر آتے ہی عالی یاد آجاتے ہیں۔

دوہا نام ہے ہندی عروض کی ایک بحر کا۔ ہیئت کے اعتبار سے دوہا ہندی شاعری کی وہ صنف ہے جس میں صرف دو مصرعے ہوتے ہیں اور وہ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ دوہے میں ہر خیال یا ہر مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ایک غزل کے تمام اشعار یا بیشتر اشعار حسن و عشق سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوتے اسی طرح اگر ایک موضوع سے متعلق بہت سے دوہے کہے جائیں۔ جب بھی ان میں باہمی [illegible] تسلسل نہیں ہونا چاہئے۔ غزل کے شعر کی طرح مفہوم کے اعتبار سے ہر دوہے کا مکمل اور مستقل بالذات ہونا ضروری ہے۔ دوہا غزل کے مطلع سے مشابہ ہے نہ کہ مثنوی کے شعر سے۔

ہندی دوہے کی اصل بحر ایک ہی ہے لیکن اس میں کئی زحافات آتے ہیں۔ ہندی میں دوہے کی بحر کے جو ارکان ہیں انہیں اگر عربی بحروں کے ارکان میں تبدیل کیا جائے تو عربی کی مسلمہ و مروجہ بحروں میں سے کوئی بحر نہیں بن سکتی۔ مثلاً ہندی کا ایک مشہور دوہا ہے :۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

اگر عربی بحر کے ارکان کے مطابق اس دوہے کی تقطیع کی جائے تو پہلے مصرع کے ارکان یہ ہوں گے۔ فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع۔ اور زحاف کی وجہ سے دوسرے مصرع کے ارکان یہ ہوں گے۔ فعلن فعلن فاعلن فعل فعولن فاع۔ ان ارکان سے عربی کی کوئی مسلمہ بحر نہیں بنتی لیکن اگر ان ارکان کے مطابق اردو میں دوہے کہے جائیں تو وہ ہندی دوہے کی بحر کے مطابق ہوں گے۔ ہندی دوہے ہمیشہ چھ رکنی (۱) ہوتے ہیں مگر عالی کے تقریباً تمام دوہے سات رکنی ہیں۔ اب اگر اس بات پر اصرار کیا جائے کہ کسی دوسری زبان کی شاعری سے کوئی صنف مستعار لیتے وقت حتی الامکان اس کی مقررہ بحر کو ضرور اپنایا جائے (جیسا کہ اردو شعرا نے رباعی کے معاملے میں کیا ہے اور ہندی اصناف سخن کے معاملے میں بھی کیا جاسکتا ہے) تو عالی کے دوہے عروضی نقطۂ نظر سے دوہے نہیں کہے جاسکتے۔ بالفاظ دیگر ان کے دوہے (اور اسی طرح اردو کے اور کئی شاعروں کے دوہے) اصطلاح کے غلط استعمال (Misnomer) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عالی کے پاس اس عروضی انحراف کا کوئی جواز ہے تو یہ :-

کیا بھرمر کیا شرکھ بیو دھر کیا کھپ کیا بیال
اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

اس عالی چال (جو تقریباً بھیڑ چال سے مختلف ہے) اور ہندی دوہے میں ایک بنیادی فرق تو وہی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ یعنی ہندی دوہے چھ رکنی ہوتے ہیں اور عالی کے دوہے سات رکنی ہیں۔ اس کے علاوہ عالی کے دوہوں اور ہندی دوہوں میں ایک فرق اور بھی ہے۔ دوہے کی بنیادی خصوصیتیں دو ہیں۔ ایک تو اس کا ایک مخصوص بحر پر مبنی ہونا جو زحافات کے باوجود ہر حال میں چھ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے، دوسرے ہر دوہے کا مستقل بالذات ہونا۔ عالی نے اپنے دوہوں میں ہر جگہ دوسری شرط کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔ ان کے بہت سے دوہے مسلسل اشعار یا نظم کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ بہر حال اب یہ نام نہاد دوہا عالی کے نام سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے وہ اس صنف کے موجد نہیں لیکن چونکہ اردو میں دوہے کی شاعری انہیں کی بدولت مقبول ہوئی اور عام لوگوں تک پہنچی اس لئے اس صنف کے معاملے میں ان کی حیثیت موجد سے کم بھی نہیں۔

اس وقت تک اردو میں سب سے اچھے دوہے عالی ہی نے کہے ہیں۔ ان کی شاعرانہ انفرادیت جس قدر دوہوں میں نمایاں ہے اتنی دوسری صنفوں میں نہیں۔ عالی نے دوہے کہہ کر اپنے آپ کو پالیا۔ ان کے معاصرین دوہے کہہ کر اپنے آپ کو عالی کی ذات میں کھو رہے ہیں۔ عالی کے دوہوں کی زبان، اسلوب اور موضوعات سبھی کچھ ان کی اختراعی صلاحیت کے نتائج ہیں۔ ان کے معاصرین کے یہاں یہ چیزیں ان سے مستعار و ماخوذ ہیں۔

والہانہ جذبات اور اخلاقی نکات ہندی دوہوں کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ عالی کے دوہے صرف والہانہ

جذبات اور اخلاقی نکات تک محدود نہیں۔ انہوں نے دوہوں کو دور حاضر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ترجمان بنادیا ہے۔ ان کے دوہوں میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ ان کی آپ بیتی بڑی حد تک ان کے جنسی تجربات (۲) سے عبارت ہے جن کے بیان میں انہوں نے اس معصومیت اور بے تکلفی سے کام لیا ہے جو ان کی شخصیت کے نمایاں عناصر ہیں۔ فراق نے داغ کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ داغ نے اوباشی کو جینیئس (Genius) بنادیا۔ عالی نے اوباشی کو حقیقی شاعری میں منتقل کردیا ہے۔ ان کی اوباشی اور عیاشی بھی دل کی اس دھکن اور روح کی اس چبھن سے خالی نہیں جو عشق سے منسوب کی جاتی ہے۔ ان کے دوہوں میں روح سے زیادہ جسم کی باتیں ملتی ہیں۔ لیکن جسم کی طرف ان کا انداز نظر صرف جنسی نہیں جمالیاتی بھی ہے۔ اسی انداز نظر کے باعث وہ داغ سے نہ صرف مختلف نظر آتے ہیں بلکہ ممتاز بھی۔ لیکن اس انداز نظر کے باوجود وہ فراق کے مدمقابل نہیں بن پاتے کیونکہ ان کے دوہے فراق کی شاعری کی جمالیاتی لطافتوں کو نہیں پہنچتے۔ عالی کے یہاں جنسی جذبہ جمالیاتی ذوق پر غالب ہے۔ وہ جسم یا حسن کے پرستار کم' طلب گار زیادہ ہیں۔

عالی کے دوہوں میں ان کی ذاتی زندگی کے علاوہ ان کے دور کی سماجی اور سیاسی زندگی کے بھی متعدد پہلو جلوہ گر ہیں۔ ان کے دوہے ذاتی اور معاصرانہ زندگی پر کہیں گہری تنقید اور کہیں سرسری تبصرے (Running commentary) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ انہیں زندگی کے خارجی پہلوؤں سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی داخلی پہلوؤں سے ہے لیکن ان کا فنکارانہ خلوص دونوں کے بیان میں یکساں طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ عالی نے خارجی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو اپنے دوہوں کا موضوع بنایا ہے جن سے فی الواقع وہ متاثر یا مشتعل ہوئے ہیں۔ انہوں نے سماجی ناانصافی' سیاسی بربریت' اقتصادی استحصال' جاگیردارانہ مظالم' دفتری ریاکاری اور ادبی دھاندلی کے خلاف کوئی نعرہ نہیں لگایا لیکن ان کے دوہے قارئین کو ان چیزوں کے نفرت انگیز وجود کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔

عالی نے اپنے دوہوں کے لئے جو زبان ایجاد یا اختیار کی ہے وہ ہندی اور اردو کا ایسا امتزاج ہے جسے سمجھنے کے لئے نہ تو ہندی والوں کو اردو سیکھنے کی ضرورت ہے نہ اردو والوں کو ہندی سیکھنے کی۔ ان کے دوہوں میں ہندی الفاظ کی مقدار یقیناً زیادہ ہے لیکن وہ الفاظ وہی ہیں جن سے اردو والے ناآشنا نہیں۔ البتہ بعض دوہوں میں عالی ایسے الفاظ بھی استعمال کرگئے ہیں جو اردو والوں کے لئے اجنبی اور نامانوس ہیں۔ ذاتی طور پر میں ان کے اس میلان کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے جب انہوں نے ایک مرتبہ میری موجودگی میں یہ خیال ظاہر کیا کہ میرے پاس ہندی الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں کچھ اور اضافہ کروں' تو میں نے کہا تھا کہ آپ جتنے ہندی الفاظ جانتے ہیں ان میں سے کچھ بھول جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ عالی کے دوہوں کی مقبولیت میں ان کی دوسری خوبیوں کے علاوہ ان کی عام فہم زبان کو بڑا دخل ہے۔ ہندی شاعری کی جو صنفیں اردو میں آرہی ہیں ان کو زبان کے اعتبار سے

اردو ہی سے قریب ہونا چاہئے نہ کہ ہندی سے۔ بصورت دیگر اردو میں ہندی اصناف سخن اختیار کرنے کی بجائے ہندی شاعری کے بہترین حصے کو اردو رسم الخط میں لکھ ڈالنا کہیں زیادہ مفید ہوگا۔

عالی کے دوہوں میں جو رس اور رچاؤ ہے اور ان کے دوہوں کی زبان میں جو لوچ اور لچک پائی جاتی ہے وہ ان کی غزلوں میں یقیناً موجود نہیں لیکن اس کی کی ذمہ داری عالی سے زیادہ خود غزل پر عائد ہوتی ہے۔ غزل اس قدر نازک مزاج صنف ہے کہ وہ ہر قسم کے الفاظ اور مضامین (یہ بات بڑے وسیع معنی میں کہی جارہی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ غزل میں زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کی گئی ہے) کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی اور جب اس کے مزاج کے خلاف کسی لفظ یا مضمون سے کام لیا جاتا ہے تو شعریت اور گھلاوٹ ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ اگر آپ کو میرے اس خیال کی صحت میں شبہ ہو تو عالی کے اس دوہے کو غزل کے شعر میں منتقل کر دیکھئے :۔

ٹھل ٹھل کر اب تو دیکھی جائے نہ ان کی باٹ

چل رے عالی دوار کے باہر ڈالیں اپنی کھاٹ

یہ بات یقیناً غور طلب ہے کہ عالی کے سامعین ان کے دوہوں کو ان کی غزلوں پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں یہ کہنا کافی نہیں کہ ان کی غزلوں میں وہ دلکشی نہیں جو ان کے دوہوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ جواب غلط نہ ہونے کے باوجود سطحی ضرور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالی کے دوہوں کے سامنے نہ صرف ان کی غزلیں ماند پڑجاتی ہیں بلکہ دوسروں کی بھی غزلیں کیفیت کے اعتبار سے کمتر درجے کی چیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ آخر اس کا سبب؟ شاید یہ مسئلہ دوہے اور غزل کا نہیں بلکہ ہندی شاعری اور اردو شاعری کا ہے۔ میں نے کئی پڑھے لکھے باذوق لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ہندی شاعری میں جو رس ہے وہ فارسی اور اردو شاعری میں نہیں۔ ذاتی طور پر میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا رہا ہوں۔ ہندی شاعری کی جڑیں اس سرزمین میں پیوست ہیں جس کی خاک سے ہم اردو والوں کا خمیر اٹھا ہے۔ ہندی شاعری کا اپنے وطن کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن سے جتنا گہرا تعلق ہے اتنا اردو شاعری کا نہیں۔ اردو شاعری ہماری زندگی کی ترجمان ہونے کے باوجود ایسی روایات سے گرانبار ہے جن سے ہم صرف ذہنی طور پر (نہ کہ جذباتی اور عملی طور پر) وابستہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری خود ہماری آواز ہونے کے باوجود ہمارے دل کے تاروں کو اس طرح مرتعش نہیں کرپاتی جس طرح ہندی شاعری کرتی ہے۔ ہندی شاعری بڑی حد تک ہماری خاک اور خون سے تعلق رکھتی ہے اور اردو شاعری ہمارے ذہن اور ذوق سے جن کی تعمیر و تربیت میں بیرونی اثرات کو بڑا دخل ہے۔ میرا یہ کلیہ خطرے سے خالی نہیں لیکن شاید مجموعی طور پر یہ نظریہ قریب صحت ہو۔

دوہے کا فن غزل کے مطلع کے فن سے مشابہ ہے۔ اچھے شعر کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کے دونوں مصرعے برابر کے ہوں۔ لیکن آپ اچھے مطلعوں میں یہ دیکھیں گے کہ ان کے دوسرے مصرعے عموماً قوی تر ہوتے ہیں اور مطلع کی تاثیر و توانائی دوسرے ہی مصرعے پر منحصر ہوتی ہے۔ مطلع کی طرح دوہے کا بھی دوسرا مصرع

بڑی توجہ اور قدرت چاہتا ہے۔ عالی کے دوہوں میں فنی چستی اور فنکارانہ چابکدستی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اپنے دوہوں میں نہ صرف مانوس وملائم الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ اس کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ ایک بھی لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ الفاظ کی طرح افعال کے استعمال میں بھی وہ بڑے کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جس جملے یا مصرعے میں فعل کا استعمال کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا وہ جملہ یا مصرع بہت خوبصورت اور پرزور ہوتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ضمنی (Corollary) صحیح نہیں۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ عالی اپنی ضرورت کے مطابق ہندی میں عام فہم اور خوش گوار ترکیبیں وضع کرلیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ Embassies کے لئے انھوں نے "دوت گھروں" کی ترکیب ایجاد کی ہے۔ دوہے میں عالی کے انداز بیان کو Epigrammatic کہنا غلط نہ ہوگا۔ ان کا اسلوب عام طور پر سیدھا سادہ اور براہ راست ہے۔ اس میں اشارے کنایے اور بالواسطہ اظہار کا استعمال بہت کم ہے۔ روانی اور موسیقی جس قدر عالی کے دوہوں میں ہے اتنی ان کے معاصرین یا مقلدین کے دوہوں میں نہیں۔ انھیں لفظوں کے صوتی اثر سے کام لینے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ کلاسیکی دوہوں کا بڑا لطف ان کی تشبیہات میں ہے۔ اگرچہ عالی کے یہاں بھی خوبصورت اور نادر تشبیہیں ملتی ہیں لیکن ان کے یہاں تشبیہات کا استعمال بہت کم ہے۔ غزل کی طرح دوہے کی تکنیک میں نئے تجربے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن عالی اپنی غزلوں کے ساتھ اپنے دوہوں میں بھی چھوٹے موٹے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے بعض مسلسل دوہوں (یہ ایک متناقض بالذات اصطلاح ضرور ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ عالی کے یہاں ایسے دوہے موجود ہیں) میں یہ تکنیک استعمال کی ہے کہ پہلے دوہے کے بعد ہر دوہے کو پچھلے دوہے کے آخری لفظ یا الفاظ سے شروع کیا ہے۔ عالی کی یہ جدت بھی ان کے بعض خوشہ چینوں کو بہت پسند آئی اور وہ اسے لے اڑے۔ عالی کے دوہے فن اور فنکار دونوں کے وسیع امکانات کا احساس دلاتے ہیں لیکن اس خیال سے جی ڈرتا ہے کہ اردو میں دوہے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اردو نظم کے حق میں غزل کے بعد دوسرا بڑا خطرہ نہ بن جائے۔

عالی کے دوہوں کو ان کی غزلوں پر ترجیح دینے کے باوجود ان کی غزلوں سے روگردانی نہ ممکن ہے نہ مناسب لیکن سردست میں ان کی غزلوں پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کی بجائے چند ایسی باتیں کہنے پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق ان کی پوری شاعری سے ہے۔

غالب اور یگانہ کی طرح عالی کی شاعری شخصیت کی شاعری ہے۔ اس جملے سے میرا مطلب اتنا ہی ہے کہ ان کی شاعری میں سب سے پہلے جو چیز پڑھنے والے کو متوجہ اور متاثر کرتی ہے وہ ان کی شخصیت ہے۔ عالی کی شخصیت اور شاعری کے درمیان جو رشتہ ہے اسے عالی کی کتاب 'غزلیں دوہے گیت' کے دیباچہ نگار حسن عسکری صاحب نے بڑی خوبصورتی سے واضح کردیا ہے۔ یہ بات عالی سے ملنے کے بعد ہی میری سمجھ میں آسکی کہ عسکری صاحب نے

عالی کی شخصیت اور شاعری کے باہمی تعلق کو اتنی اہمیت کیوں دی کہ اس پر دو صفحے لکھنا ضروری ہی سمجھا۔ عالی کی شخصیت سے ان کی شاعری میں جو خوبیاں پیدا ہوگی ہیں اور ان کی شاعری کو جو خطرے درپیش ہیں ان دونوں کی نشاندہی میں عسکری صاحب نے حسب معمول بڑی خوبصورتی اور بلاغت کا ثبوت دیا ہے۔ البتہ جس بات کی طرف انہوں نے اشارہ نہیں کیا وہ یہ ہے کہ عالی کی شخصیت تناؤ اور جھکاؤ' ناز اور نیاز' افتخار اور انکسار' بے خودی اور ہوشیاری' سنجیدگی اور شوخی' اضطراب اور سکون کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ یہاں میں عالی کی شاعرانہ شخصیت پر اظہار خیال کر رہا ہوں۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ عملی زندگی میں ان کا کردار یا کار منصبی (ROLE) کیا رہا ہے۔ جس طرح غالب کے یہاں اپنی انا کا احساس ان کے عشق کو محبوب پر ایک احسان بنا دیتا ہے اسی طرح عالی کو اپنی شخصیت پر اتنا ناز ہے کہ ان کی محبت محبوب پر ایک نوازش بن کر رہ جاتی ہے۔ غالب کی طرح عالی بھی اپنی شخصیت کے جمال و کمال کو محبت کے معاملے میں زر مبادلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس باب میں ان کا بھی انجام وہی ہوتا ہے جو غالب کا ہوا تھا۔ یعنی دونوں کو اپنے اپنے پندار کا صنم کدہ ویران کرتے ہی بنی۔ غالب اور عالی کی شخصیتوں کے یہ مشترک پہلو عالی کی غالب پرستی کا نتیجہ نہیں۔ ویسے عالی غالب پرست ضرور ہیں۔ نئے شاعروں میں شاید ہی کسی نے غالب کی غزلوں پر اتنی غزلیں کہی ہوں جتنی عالی نے کہی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے وحشت کلکتوی کی طرح "غالب دوراں" بننے کی کوشش نہیں کی پھر بھی ان کی غزلوں پر غالب کے اثرات واضح ہیں۔ بعض دوسرے شعراء مثلاً جگر اور فراق کے اثرات بھی کم نہیں' لیکن عالی پر دوسرے شاعروں کے اثرات کہیں بھی ان کی انفرادیت کی تعمیر میں حائل نظر نہیں آتے۔ دوسرے شعراء کی غزلوں پر جو غزلیں عالی نے کہی ہیں ان میں بھی عالی کی شخصیت صاف بولتی سنائی دیتی ہے۔ انکی شخصیت میں جو دلکشی' بے تکلفی' بے ساختگی اور معصومانہ صاف گوئی ہے وہ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ وہ جو بات جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح کہہ دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی شاعری میں فکر و تامل کو کوئی دخل نہیں۔ ان کی شاعری میں جذباتی شدت کے ساتھ کہیں کہیں فکری اور نفسیاتی گہرائی بھی ملتی ہے۔ لیکن گہری سے گہری بات کہتے وقت بھی وہ بے ساختگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بصیرت اور بے ساختگی کا جیسا امتزاج عالی کے یہاں ملتا ہے اس کی مثال ان کے معاصرین کے یہاں کم ملے گی۔ عالی ان شاعروں میں سے ہیں جو انسانی جذبات و تجربات کی گہرائی میں جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس صلاحیت کو ابھی تک پورے طور پر بروئے کار نہیں لائے لیکن کہیں کہیں وہ اس صلاحیت کا ایسا ثبوت دے گئے ہیں جسے اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ میں نے اب تک مثالیں دینے سے احتراز کیا ہے لیکن اب مثالیں دیئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ عالی کی غزلوں کے چند اشعار اور ان کے چند دوہے ملاحظہ ہوں۔

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

ہائے وہ عمر اوبیوں کا یہ اندازِ بیاں
اپنے مکتوب ترے نام کئی یاد آئے

سوائے اس کے یہاں دعویٔ بہار نہیں
کہ ایک میں بھی ہوں اپنا چمن سجائے ہوئے

ہر ایک بات پہ اہلِ نظر کی رائے نہ مانگ
جو لوگ اہلِ نظر ہیں، جدا نہیں ہم سے

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں، ناامید بھی نہ رہوں

یہ عمر عمر کے رشتے جو ٹوٹ جاتے ہیں
گلہ ہی کیا ہے کہ عالم ہے وقت کا دھارا

وہ آئے حضرتِ عالی بہ جیب و دامنِ چاک
بزعمِ خود بڑے باہوش و صاحبِ ادراک

اور دعوے تو جدا اس کے لئے اے عالی
آپ نے بارِ تمنا ہی اٹھایا ہوتا

اس ہجوم میں تجھ کو کیا خبر ہوئی ہوگی
کس کو کیا تعلق تھا تیرے آستانے سے

کسے خبر کہ یہ سرگرم رہروانِ حیات
رواں دواں ہیں تو کیا کیا فریب کھائے ہوئے

یہ کچھ دن سے دیوانوں کی حالت جو سنبھلی جاتی ہے
یا منزل نزدیک آپہنچی یا راہ بدلتی جاتی ہے

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے نگہِ غلط خرام
یا کوئی منزلِ سکوں یا کوئی راہ بے مقام

ذہن تمام بے بسی، روح تمام تشنگی
سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

میں نے کہا کبھی سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی
اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

جنم مرن کا ساتھ تھا جن کا انہیں بھی ہم سے بیر
واپس لے چل اب تو عالی ہو گئی جگ کی سیر

کون ہے جس سے ملے بنا بھی اسی کا ہر دم دھیان
کون ہے جس کے بدن کی دوری کھینچ رہی ہے جان

ہر اک ناری پوچھے اس سے کون تھی پہلی نار
عالی کس کس سے کیا کھوئے پریم بنا بیوپار

نہ تو جھوٹا میل رکھے ہے، نہ رو رو مسکائے
عالی تو ہی بتا کوئی تجھ کو کا ہے میت بنائے

اس جگ نے دل والوں سے جو جو بوجھ اٹھوائے
ایک بھی جس پربت پر رکھ دیں، وہ پربت پھٹ جائے

رت کے ساتھی، سب کے سنگی، بے دھرے، بے ذات
جو جس دم ہو ان کا افسر، اونچی اس کی ذات

نہ یہ جیون بھید کی روگی، نہ انہیں ہر دم سوچ
نہ انہیں دن کی تختی کھائے، نہ انہیں رات کا لوچ

[illegible]ی تین دوہے عالی کے ان دوہوں سے لیے گئے ہیں جو باہمی ربط و تسلسل کے اعتبار سے ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن میں عالی کے فن کارانہ کمال کا ایک نیا پہلو اپنی پوری قوت و شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میری مراد ان کی طنز نگاری سے ہے۔ طنز ان کی غزلوں اور دوہوں کا نمایاں عنصر نہیں لیکن متذکرہ مسلسل دوہے ان کے زبردست طنز نگار ہونے کا بھی پتا دیتے ہیں۔ ان دوہوں کے نصف آخری حصے میں ان کے طنز کی تلخی ان کے لہجے کی ایک دردمندی میں مکمل مل گئی ہے جو ان کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ بظاہر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ عالی کی شاعری ان کی شخصیت کی تمام تر شوخی اور شگفتگی بلکہ بانکپن اور چھبیلے پن (ع ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار) کے باوجود اداسی اور دردمندی سے خالی نہیں۔ لیکن کم از کم ان لوگوں کو اس تضاد

پر کوئی حیرت نہ ہوگی جو شاعری اور شخصیت کے پیچیدہ رشتوں اور ان رشتوں کی خلاف توقع کار فرمائی سے واقف ہیں۔

عالی نے اب تک اپنے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس میں ان کی شاعری کی اٹھان بڑی امید افزا نظر آتی ہے۔ انھیں اپنے آپ تک پہنچنے میں زیادہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن اپنے آپ کو پالینا ایک چیز ہے اور اپنے امکانات کو تکمیل تک پہنچانا دوسری چیز۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے مرحلے کو کس طرح طے کرتے ہیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء

(پروفیسر نظیر صدیقی کی کتاب۔ "تاثرات و تعصبات" سے)

(۱) یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ نیاز فتح پوری صاحب نے اپنی کتاب "جذبات بھاشا" میں بعض ایسے دوہے بھی درج کئے ہیں جو سات رکنی ہیں۔ لیکن دراصل یہ غلطی نیاز صاحب کی ہے کہ انہوں نے دوہے نقل کرتے وقت تحقیق سے کام نہیں لیا اور جو دوہا جس صورت میں ملا اسے نقل کردیا۔ غالباً "وہ دو متفے مصرعوں کو دوہا کہتے ہیں چاہے ان میں ارکان سات ہوں یا چار۔ اسی بناء پر وہ دوہے اور چوپئی (جو دوہے کی طرح ہندی شاعری کی ایک الگ صنف ہے اور رامائن کا زیادہ تر حصہ اسی صنف میں ہے) میں تمیز نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں چوپئی کے لئے بھی دوہے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (نظیر صدیقی)

(۲) جب یہ مضمون چھپا عالی صاحب کے بیان کے مطابق پروفیسر مذکور کی ان سے کوئی تفصیلی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب کا یہ علم یا توقیاسی ہے یا انہوں نے بعض دوہوں کو از قسم سوانح عمری قرار دیکر یہ نتیجہ اخذ کیا۔ گو تعبیری روایات کے مطابق یہ بھی جائز ہے۔ ناشرین

جمال پانی پتی

اردو کا پہلا دوہا نگار

میں جمیل الدین عالی کو اردو کا پہلا دوہا نگار مانتا ہوں۔ مگر ان معنوں میں نہیں کہ عالی سے پہلے کسی نے اردو میں دوہے لکھے ہی نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ عالی سے پہلے جو دوہے اردو میں لکھے گئے ان میں سے اکثر پر "اردو دوہے" کا اطلاق مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ دوہے اپنے مضامین و موضوعات اور اپنی بحر، تکنیک، لب ولہجہ اور طرزِ احساس وغیرہ کے اعتبار سے زیادہ تر ہندی دوہوں کی روایت اور بنیادی مزاج سے قریب تر ہیں اور دوسرے اس لئے کہ ان کی زبان بھی ہندی دوہوں کی زبان سے کچھ ایسی زیادہ مختلف نہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے زبان کے معمولی سے فرق کے ان میں اور کوئی بات ایسی نہیں جو انہیں ہندی دوہوں کے بنیادی مزاج سے الگ کر کے ان کی پہچان اردو کی ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے واضح طور پر کرا سکے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں دوہے کی صنف اگرچہ عالی سے پہلے ناپید نہیں تھی مگر رائج اور مقبول عالی ہی کی بدولت ہوئی، اور عالی ہی کے دوہوں کے ذریعہ اس صنف نے اپنی شناخت کے خدوخال اردو میں پہلی بار ہندی دوہے سے الگ ہو کر واضح کئے۔ پھر جب ایک بار عالی کا دوہا اردو میں چل نکلا تو اس کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے شعراء نے بھی اسی انداز کے دوہے اردو میں لکھنے شروع کئے۔ تاج سعید، نگار صہبائی، جلیل حشمی، صبا اختر، کشور ناہید، شمی فاروقی، جمیل عظیم آبادی، احمد شریف، عالم تاب تشنہ اور پرتو روہیلہ سے لے کر راقم الحروف تک کتنے ہی شعراء ایسے ہیں جنہوں نے دوہا نگاری میں عالی کے اسلوب و انداز کو اپنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ عالی کی سی شہرت اور مقبولیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ خیر عالی تو اب محض ایک دوہا نگار ہی کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ دوہے کی شاعری اب آہستہ آہستہ اردو میں اپنے لئے جگہ بنا رہی ہے۔ بہرحال یوں تو دوہوں سے قطع نظر عالی اپنی غزل کے حوالے سے بھی جانے

پہچانے جاتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شہرت اور مقبولیت زیادہ تر ان کے دوہوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دوہے کی شاعری کو اردو میں رائج کرنے اور فروغ دینے کا کریڈٹ بھی انہیں کو جاتا ہے۔

اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں دوہے تو چونکہ عالی سے پہلے بھی لکھے گئے ہیں، لہٰذا اس باب میں انہیں اولیت کا درجہ دینا مناسب نہیں۔ لیکن ایک تو عالی سے پہلے جن شاعروں نے دوہے لکھے ہیں، ان میں سوائے خواجہ دل محمد کے غالباً کسی اور نے دوہے کو بحیثیت ایک مستقل صنف سخن کے نہیں اپنایا۔ اور دوسرے اگر کسی نے اپنایا بھی ہے تو اس کے ہاں دوہوں کی پہچان بطور اردو دوہے کے ہندی روایت سے الگ ہٹ کر واضح نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ عالی سے پہلے کے دوہا نگار اکثر و بیشتر ہندی روایت کی قلم، ردو میں لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کی بجائے عالی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے دوہوں کی پہچان ہندی روایت سے الگ ہٹ کر بطور اردو دوہے کے کرانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس نے دوہے کی صنف میں ہندی روایت کا تتبع نہیں کیا۔ بلکہ اس صنف کو ہندی سے اٹھا کر اردو میں Transform کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالی کی بدولت اردو میں ایک نئے انداز کے دوہوں کی روایت کا آغاز ہوتا ہے، اور اسی لئے اسے اردو میں دوہے کے دور جدید کا بانی کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے عالی سے پہلے اردو میں دوہے لکھے، ان میں سے بیشتر نے بالعموم ہندی روایت ہی کا تتبع کرتے ہوئے گویا دوہے کو ہندی سے اٹھا کر جوں کا توں اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے ان دوہوں اور ہندی دوہوں میں سوائے زبان کے فرق کے اور کوئی خاص فرق نہیں۔ وہی اکھڑی اکھڑی سی بحر جو ہندی میں دوہے کے لئے مخصوص ہے اور جو اپنی مختلف صورتوں میں ماتراؤں کے اختلاف کے باوجود اپنے اکھڑے اکھڑے پن کے سبب اردو کے شعری مزاج اور عروضی نظام سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور خیالات واحساسات کی کم وبیش وہی بندھی ٹکی روایت جس کا سلسلہ ہندی میں سورداس، کبیرداس اور تلسی داس وغیرہ سے ملتا ہے، شعراء نے اکثر و بیشتر اسی کا تتبع اپنے دوہوں میں کیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ دوہا اردو میں نہ چل سکا۔ اس کے برعکس عالی کے دوہوں میں دوہے کے نام اور ہیئت کے سوا مشکل ہی سے کوئی چیز ایسی ملے گی جسے ہندی روایت سے منسوب کیا جاسکے۔ رہا اس کا نام اور ہیئت، تو ان چیزوں پر ہندی کا کوئی اجارہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں تو ہماری بعض علاقائی زبانوں میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ چنانچہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ عالی کے دوہے اور ہندی دوہے میں ایک بنیادی اور جوہری فرق ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا اور بنیادی فرق تو یہی ہے کہ عالی نے ہندی دوہے کی مخصوص بحر کو چھوڑ کر اپنے دوہوں کے لئے ایک ایسی بحر اختراع کی جو "ماترا" کی بجائے اپنا سنگ بنیاد "رکن" کو بنانے کی وجہ سے اردو کے عروضی نظم اور مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ عالی نے جہاں اپنے ایک دوہے میں اس بحر کو "عالی چال" کا نام دیا ہے، وہاں ڈاکٹر سمیع اللہ

اشرفی کے نام ایک خط میں اس بحر کے ارکان کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ "میرا تو سیدھا سادھا

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل

ہے۔ کبھی ایک یا نصف رکن بڑھ بھی جاتا ہے۔" اس کے برعکس ہندی میں دوہے کے لئے جو بحر بالعموم کثرت سے استعمال ہوتی ہے' چھند شاستر کے پنڈتوں نے اسے چوبیس ماتراؤں کے ایسے یونٹ پر مشتمل بتایا ہے جس میں دوہے کا ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلے حصہ میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ اور دونوں کے درمیان وشرام (وقفہ) ضروری ہوا ہے۔ لیکن یہاں ہم ایک بات واضح کرتے چلیں تو اچھا ہے۔ یہ درست ہے کہ مذکورہ چوبیس ماترائی بحر کو ہندی میں دوہے کی معیاری بحر مانا گیا ہے' اور اسی لئے ہندی دوہوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس بحر میں ملتی ہے' لیکن اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ دوہے کی اس معیاری بحر کی پابندی خود ہندی میں بھی ہمیشہ برقرار نہیں رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ کبیرداس' تلسی داس اور جائسی وغیرہ بہت سے ہندی دوہا نگاروں کے ہاں چوبیس سے کم یا زیادہ ماتراؤں کے دوہے بھی ملتے ہیں۔ اور ہندی کے چھند شاستری انہیں دوہا ہی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس بات سے قطع نظر جس طرح ہندی کے دوہا نگاروں نے اپنی دوہا نگاری کے لئے اکثر و بیشتر اس معیاری بحر کو پسند کیا' اسی طرح اردو میں بھی بابا فرید گنج شکر اور شمس العشاق میرانجی سے لے کر خواجہ دل محمد تک جن لوگوں نے دوہے لکھے' انہوں نے بھی گاہے گاہے اس بحر سے انحراف کے باوجود اکثر و بیشتر ہندی دوہے کی اسی بحر کو اپنایا۔ جبکہ عالی نے ہندی دوہے کی ماترائی کے بجائے اپنے دوہوں کے لئے رکن کی بنیاد پر ایک مختلف بحر اختراع کی جسے وہ ہندی کے دوہا چھند اور اس کی مختلف اقسام سے بالکل الگ کرتے ہوئے "عالی چال" کا نام دیتے ہیں۔

کیا بھرمر کیا شربھ پیودھر کیا مکٹ کیا بیل
اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

عالی کا ہندی دوہے کی مخصوص ماترائی بحر سے انحراف ڈاکٹر عنوان چشتی کے نزدیک اتنا بنیادی ہے کہ انہوں نے اسی بناء پر عالی کے دوہوں کو دوہا ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی طرح کچھ اور لوگ بھی یہی کہتے نظر آئے کہ ہندی شاعری میں دوہے کا جو ایک مخصوص ماترائی وزن متعین ہے' اس وزن کے سوا کسی اور وزن میں کہے ہوئے دو ایسے مصرعوں کو جن کے آخر میں قافیہ لایا گیا ہو' دوہا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات اس لئے درست نہیں کہ عالی کا دوہا' ہندی کا نہیں' اردو کا دوہا ہے۔ اور اردو دوہے کو ہندی کی ماترائی بحر کی بنیاد پر جانچنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ بلکہ ایک اردو ہی کیا برصغیر ہندوپاک کی جن دوسری زبانوں' مثلاً سندھی' گجراتی' مراٹھی' دکنی' راجستھانی اور پنجابی وغیرہ میں دوہے ملتے ہیں' ان میں سے کسی بھی زبان کا دوہا' ہندی دوہے کی چوبیس ماترائی بحر کے وزن و آہنگ کا پابند نہیں۔ ہاں' یہ تو درست ہے کہ عالی نے دوہے کی صنف ہندی سے

مستعار لے کر اسے اردو میں Trasnform کیا ہے۔ لیکن آپ یہ پابندی اردو یا دنیا کی کسی بھی زبان پر عائد نہیں کرسکتے کہ وہ کسی دوسری زبان سے کوئی صنف سخن اپنے ہاں اس وقت تک در آمد نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ اس صنف سخن کے سلسلے میں اصل زبان کے مقرر کردہ تمام حدود وقیود اور شرائط کی پابندی کو اپنے لئے لازم قرار نہ دے لے اور اس صنف کے ساتھ عروضی آہنگ یا بحر کا وہ پیمانہ بھی اپنی زبان میں در آمد نہ کرلے جو اس صنف سخن کے لئے اصل زبان میں موجود اور متعین ہے۔ عالی کے دوہوں کو دوہا ماننے سے انکار کرتے وقت ڈاکٹر عنوان چشتی شاید اپنے ہی بیان کردہ اس اصول کو بھول گئے جس کا بیان انہوں نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" کے صفحہ نمبر ۱۹۶ پر اس طرح کیا ہے۔

> "اردو شاعری نے اپنی زبان کی ساخت اور قومی موسیقی کا یہاں تک احترام کیا کہ دوسری زبانوں سے آنے والی ہیئتوں اور ان کے آہنگوں کو بھی اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو میں ۱۹۵۷ء کے بعد نظم معریٰ، سانیٹ، آزاد نظم اور ہائیکو وغیرہ کئی ہیئتیں آئیں۔ ان کی ساخت اور آہنگ کے اپنے مخصوص اصول ہیں۔ اردو شاعروں نے انہیں جوں کا توں قبول نہیں کیا، بلکہ اپنے مزاج زبان و آہنگ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی (۱)........ اس مختصر سے پس منظر کا حاصل یہ ہے کہ اردو میں اوزان و بحور کا سنگ بنیاد "رکن" ہے۔ روایتی بحروں میں ہر مصرع میں ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں سے اردو میں آنے والے آہنگ اسی بنیادی اصول کے تابع ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس عبارت میں ایک بنیادی اور بچی بات یہ کہی ہے کہ اردو میں اوزان و بحور کا سنگ بنیاد "رکن" ہے اور دوسری زبانوں سے اردو میں آنے والے آہنگ اس بنیادی اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ اب ہم ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر ان کے نزدیک یہ اصول بلینک ورس، سانیٹ اور آزاد نظم وغیرہ کے سلسلے میں درست ہے تو دوہے کے سلسلے میں درست کیوں نہیں ہوسکتا۔ آخر دوہے کی بحر کے سلسلے میں "رکن" کو سنگ بنیاد بنانے کی بجائے "ماترا" کو سنگ بنیاد بنانا کیوں ضروری ہے۔ خیر، ڈاکٹر صاحب تو چاہے اس سوال کا جو بھی جواب دیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ دوہے کو اردو کی صنف کے طور پر رواج دینے اور ہندی دوہے کے مقابلے میں اس کے امتیازی خدوخال واضح کرنے کے لئے ضروری تھا کہ زبان وغیرہ کے علاوہ اس کی ہندی بحر میں بھی حسب ضرورت تصرف کرکے اسے اردو کے عروضی آہنگ کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ بالفاظ دیگر اس کی بنیاد ماترے کی بجائے "رکن" کے اصول پر رکھی جائے۔ چنانچہ عالی نے بھی اس اصول پر عمل کرکے دوہے کو خالصتاً اردو کی ایک صنف بنانے کی کوشش کی ہے۔

مگر ایک دلچسپ بات اس سلسلہ میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر عنوان چشتی نے عالی کے دوہوں کو ہندی

دوہوں کی روایت کی زد سے تو دوہا ماننے سے انکار کردیا لیکن وہ انہیں دوہوں کے بجائے "سرسی چھند" کے مطلعے قرار دیتے ہیں جو ان کے بقول ہندی کے چھند شاستر میں ستائیس ماتراؤں کا ایک چھند ہے' اور جس کے ہر مصرے کے پہلے حصے میں سولہ اور دوسرے حصہ میں گیارہ ماترائیں آتی ہیں اور دونوں کے درمیان وشرام (وقفہ) ضروری ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب عالی کے دوہوں کو اردو دوہے میں ڈھال کر دیکھنے کی بجائے کسی نہ کسی طور پر ہندی روایت ہی کے سانچوں میں ڈھال کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ ان کے دوہوں کو کسی طور پر بھی "اردو دوہا" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے باوجود "سرسی چھند" کے عروضی وزن کو اردو میں اس طور پر ظاہر بھی کرتے ہیں۔

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ عالی نے بھی تو اپنی اختراع کردہ۔ بحر "عالی چال" کے ارکان یہی بتائے ہیں (اس نے آخر میں "فاع" کی بجائے "فعل" لکھا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں) پھر آپ اس کے بتائے ہوئے وزن کو اس کے دوہوں کی بنیاد سمجھنے کی بجائے اس کے ماترے گننے پر کیوں مصر ہیں اور کان الٹی طرف سے پکڑنے کی بجائے سیدھی طرف سے کیوں نہیں پکڑتے۔ بہرحال یہ تو ممکن ہے کہ ہندی کے "سرسی چھند" کا وزن و آہنگ عالی کے دوہوں کے وزن و آہنگ (عالی چال) سے قریبی مماثلت رکھتا ہو' لیکن اس کے دوہے سرسی چھند کے ماترائی آہنگ کی جملہ شرائط پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ یہ بات خاصی غور طلب ہے۔ اس کے قطعی فیصلے کے لئے ہمیں ہندی چھند شاستر کے کسی پنڈت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں' ایک سوال یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی کے "سرسی چھند" کو اردو کی جس بحر کے ارکان سے ظاہر کیا ہے اس میں وشرام (یا وقفہ) کا وہ تصور بھی موجود ہے یا نہیں جو "سرسی چھند" یا ہندی کے دوسرے ماترائی چھندوں کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ بہرحال عالی کے دوہوں کو "سرسی چھند" کے مطلعوں پر منطبق کیا جاسکے یا نہ کیا جاسکے' یہ ایک الگ بحث ہے۔ مگر اس سے قطع نظر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کے دوہے ہندی دوہوں کی مخصوص چوبیس ماترائی بحر میں ہرگز نہیں لکھے گئے۔ یوں بھی جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ "دوہا چھند" کی یہ اکڑی اکڑی بحر اردو کے شعری مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا آہنگ شروع سے لے کر خواجہ دل محمد تک' ساری کوششوں کے باوجود اردو کے شعری آہنگ کا حصہ نہیں بن سکا۔ اس کے برعکس عالی نے اپنے دوہوں کے لئے جس بحر (عالی چال) کو منتخب کیا' اس کا آہنگ اردو' فارسی۔ بحروں کے ارکان کی مطابقت میں ہونے کی وجہ سے اردو کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عالی کے بعد اردو دوہے لکھنے والے دوسرے شعراء یعنی تاج سعید سے لے کر پرتو روہیلہ تک سبھی دوہا نگاروں نے اس "عالی چال" والی بحر کی بنا پر اپنے وزن اور آہنگ میں ہندی دوہے سے مختلف لکھے ہیں اور دوسرا بڑا فرق دونوں میں یہ ہے کہ ہندی کا ہر دوہا

اپنی جگہ ایک مستقل اکائی ہوتا ہے اور سوائے ان دوہوں کے جو جوڑوں کی شکل میں یا سوال جواب کے انداز میں کہیں کہیں مل جاتے ہیں' مختلف دوہوں میں باہمی طور پر کوئی معنوی ربط یا داخلی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ لیکن عالی نے اپنے ہاں ہندی دوہے کی اس بنیادی خصوصیت کو بھی برقرار نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے دوہوں کو مسلسل اشعار یا نظم کی صورت دے دیتا ہے۔ ایسے مسلسل دوہے یوں تو اس کے دونوں ہی مجموعوں میں موجود ہیں مگر "لاحاصل" میں اس نے مسلسل دوہوں پر خصوصیت سے زیادہ توجہ دی ہے۔ مسلسل دوہوں کی اس تکنیک کو عالی کے بعد دوسرے دوہانگاروں میں پرتو روہیلہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ تیسرا بڑا فرق یہ ہے کہ عالی نے تلسی داس اور کبیرداس کی زبان کے پھیر میں پڑنے کی بجائے اپنے دوہوں کے لئے ایک ایسی ہلکی پھلکی زبان اختراع کی جو عام فہم اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لطف اور لوچ بھی رکھتی ہے۔ یہ زبان اردو میں ہندی کے چند آسان الفاظ ملا کر بنائی گئی ہے' مگر اس پر ہندی کی بجائے اردو کی فضا غالب ہے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری نے بھی اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک اور اہم فرق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عالی نہ تو تلسی داس اور کبیرداس کی زبان کے پھیر میں پڑا' اور "نہ ہی اس نے ہندی شاعری کے خیالات اور احساسات کی روایت کا تتبع کیا۔" یہی وجہ ہے کہ اس کا دوہا اپنے رنگ ڈھنگ' اپنی خوبو اور ذائقہ کے اعتبار سے بھی ہندی دوہے سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ ہندی کے چند آسان الفاظ کا استعمال تو بے شک اس کے ہاں ملتا ہے لیکن اس کا دوہا بحیثیت مجموعی اپنے طرز احساس میں ہندی دوہے سے بالکل مختلف اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس کے دوہوں کو اگر تلسی داس' کبیرداس اور بہاری کے دوہوں میں ملا دیا جائے اور انہیں میں اردو کے ان دوہانگاروں کے دوہے بھی شامل کر دیئے جائیں جو شروع سے لے کر خواجہ دل محمد تک گزرے ہیں تو عالی کے تمام دوہے بہت آسانی کے ساتھ اس ملے جلے ڈھیر سے چھانٹ کر الگ کئے جا سکتے ہیں۔ گویا بحر کا معاملہ ہو یا زبان کا' اسلوب کی بات ہو یا تکنیک اور طرز احساس کی' عالی کے ہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کا کوئی تعلق ہندی شاعری کی روایت سے ظاہر ہو سکے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عالی نے ہندی سے بالکل مختلف اردو میں دوہے کی ایک نئی شکل کو رواج دیا۔ چنانچہ وہ اپنے دوہے کو ہندی شاعری کی روایت سے بالکل الگ کرتے ہوئے اس کے بارے میں وضاحت کرتا ہے ☆ کہ "بات صرف اتنی ہے کہ آسان اردو کے ان دو مصرعوں کے مجموعہ کو میں نے دوہا کہہ دیا اور بس۔ نہ مجھے ہندی کے چوبیس چھندوں سے کوئی تعلق ہے نہ مجھے نا کہ بھید آتا ہے۔۔۔۔۔ غزل کا نام بدنام نہ ہوتا اور یہ پابندیاں نہ ہوتیں کہ ایک قافیہ یا ایک ردیف ہو وغیرہ وغیرہ تو میں ان دوہوں کو شعر ہی کہتا۔" چنانچہ جب اس کے دوہوں کو ہندی روایت کی کسوٹی پر کس کے دیکھنے والے معترضین اسے دوہا ماننے سے انکار کرتے ہیں تو اسے ہرگز یہ اصرار نہیں ہوتا کہ اس کے دوہوں کو لازمی طور پر دوہا ہی کہا جائے۔ وہ ایسے معترضین کو بڑے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

تم کو دوہا تم کو بیت اور تم کو سرسی چھند
نہیں مری من ندی کا طوفاں ناموں کا پابند

لیکن عالی کے دوہوں کو ہندی شاعری کی روایت سے الگ کرنے کا مطلب یہ بہرحال نہیں ہے کہ اس کے تخلیقی وجدان پر ہندی دوہوں کے سرمایے سے استفادہ کی راہ بھی بند کر دی جائے۔ اس نے ہندی شاعری کی روایت سے اپنی راہ تو بے شک الگ نکالی ہے' اپنے دوہے کی زبان اور ڈکشن میں بھی تبدیلی کی ہے اور اس کی مروجہ روایتی شکل کو بھی بدلا ہے' مگر اس نے اپنے تخلیقی وجدان کو اس سرمایہ سے حسب ضرورت استفادہ کے لئے آزادی رکھا ہے جو ہندی میں تلسی داس' کبیر داس' بہاری اور رحیمن کے دوہوں کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں اگر اس سرمایہ سے استفادہ کی کچھ صورتیں کہیں کہیں نظر آجائیں تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسا استفادہ تو دنیا کی کسی بھی زبان کا شاعر دنیا کی کسی بھی دوسری زبان کے ادب سے کر سکتا ہے۔ اور کوئی اگر اس سے انکار کرے بھی تو عالی کے دوہوں کی داخلی شہادت خود ہی اسے جھٹلانے کے لئے کافی ہوگی۔

سور' کبیر' بہاری' میرا' رحیمن' تلسی داس
سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس

عالی تو جو چاہے کہے ظاہر ہے ترا انجام
سو راون ترے بیری اور تو نہ لچھمن' نہ رام

مضمون کی اول اشاعت(۱۹۸۶ء)۔۔۔اشاعت عالی کتاب
مرتبہ۔ جناب ایم حبیب خاں دہلی۔
جناب جمال پانی پتی کی کتاب "ادب اور ادیب"
ناشرالمد ثر اکیڈمی' کراچی (۱۹۹۳ء) میں شامل ہے۔

یہ ایک خط سے اقتباس ہے جو حیدر آباد (سندھ) سے شائع ہونے والے ماہنامے "شعور" (۱۹۵۶) میں شائع ہوا۔ اس ارمغان میں شامل ہے۔ ناشرین

ابن انشاء

عالی مرے آگے

("دنیا میرے آگے" پر مقدمہ)

ہمارے عالی صاحب نے سفر پہلے کیا' ہم نے بعد میں۔ انہوں نے اخباری کالموں میں اپنا سفرنامہ پہلے لکھا' ہم نے بعد میں۔ گویا وہ اس معاملے میں ہم سے آگے آگے تھے' ہم ان سے پیچھے پیچھے تھے۔ دنیا ان کے آگے' وہ ہمارے آگے۔ اور خود ہم کئی اور سفر کرنے اور لکھنے والوں کے آگے' ہر اونٹ کسی نہ کسی پہاڑ کے نیچے آتا ہے اور ہر پہاڑ کسی نہ کسی اونٹ کے نیچے ——— بہر حال ہمارے پہاڑ جمیل الدین عالی ہیں۔

ہم اعداد و شمار کے آدمی نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ ان کا سفرنامہ کس سن میں شروع ہوا اور کس سن میں ختم ہوا۔ نہ ان کے سفر کرنے کی تاریخیں اب یاد ہیں۔ یہ سب آپ کو ان کی اپنی تحریر سے معلوم ہو جائے گا۔ بس اتنا یاد ہے کہ سفر اس سفرنامے پر ختم نہیں۔ بعد میں بھی وہ سفر کرتے رہے۔ ہمیں اور دوسرے دوستوں کو نامے بھی لکھتے رہے' لیکن باقاعدہ سفرنامہ پھر نہ لکھا۔ شاید اس لئے کہ بعد کے سفر انہوں نے خاصی آسائش میں کئے۔ چہرے پہ جوانی کا نور اور جیبوں میں ڈالروں کا وفور۔ تاہم پہلے عشق کی شدت اور ہی ہوتی ہے۔ یہ سفرنامے ان کے پہلے عشق کا نتیجہ ہیں اور جتنا لطف اور جتنی لغزشیں اور جتنا خلوص اور جتنی حماقتیں پہلے عشق میں ہوا کرتی ہیں' وہ آپ کو اس سفرنامے میں درجہ بدرجہ مل جائیں گی۔

"دنیا مرے آگے" اردو کا پہلا سفرنامہ نہیں نہ ہم تحقیق کر کے آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ پہلا سفرنامہ کون سا تھا ہاں ہم نے جو پہلا پڑھا وہ "یوسف کمبل پوش" کا سفرنامہ تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص تھا اور اپنے بیان کے مطابق مذہب سلیمانی رکھتا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ فری میسن ہو گا۔ پورا مسلمان یا پورا عیسائی کسی طرف سے

معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء کی ہے۔ وہ سست رفتار جہاز کا تھا اور اس میں ولایت کے عجائب اور ان کے اپنے عجائب' میموں کے پیچھے بھاگنے کا ذکر بہت ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ لیکن میموں کے پیچھے بھاگنے کی بات بھی سفر کرنے والوں اور سفرنامے لکھنے والوں میں مشترک ہے۔ بیچارے کمبل پوش کو کیوں الزام دیجئے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے' کوئی کم کوئی زیادہ' کوئی سلیقے سے چھپا گیا کوئی سلیقے سے لکھ گیا۔ کسی نے دونوں کام بد سلیقگی سے کئے۔ بہرحال یہ کمبل پوش مزے کا آدمی تھا۔ دوسرا مشہور سفرنامہ سرسید احمد خاں کا ہے۔ یہ بیچارے البتہ کام کرنے گئے تھے اور کام کرتے رہے۔ جائیداد بیچ کر اسلام کی محافظت میں قلمکاری کا حق ادا کیا۔ صرف علمی شغف کی داستان سننی ہو تو اسے پڑھئے۔ اس کے بعد ہمارے قلمکار مولوی محبوب عالم آتے ہیں۔ یہ ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ گئے تھے۔ ہم نے جب سفر کیا تو ان کا سفرنامہ ہماری جیب میں تھا بلکہ بغل میں کیونکہ جیب میں سمانے کی چیز وہ نہیں۔ ان کے ہاں ملکوں اور تجربوں کا تنوع ملتا ہے۔ یہ بھی میاں آدمی ہیں۔ ملک کی فکر میں غلطاں اور سرگرداں رہتے تھے۔ ایک بار ویانا میں پراتر کے میدان میں (پتہ نہیں حالی وہاں گئے یا نہیں۔ ہم محض مولوی محبوب عالم کی یاد میں گئے) ان کو کھنڈری لڑکیوں نے گھیر لیا اور کاغذوں کی رنگین کترنیں ان کا کالر کھول کر اندر ڈال دیں' اور بھی خلاف شرع مذاق ضرور کئے ہوں گے۔ بہرحال منشی جی لاحول پڑھتے لوٹے۔ ان کا زیادہ عرصہ کوشر خوراک یعنی حلال گوشت کی تلاش اور جھٹکے سے بچنے کی کوشش میں گذرا۔ اخباروں کے دفتر جھانکتے رہے۔ پیرس کی مشہور عالم نمائش دیکھتے رہے بلکہ فی الاصل اسی کے لئے گئے تھے' برلن میں ہم منشی جی کے ہاتھوں بہت پریشان ہوئے۔ پہلے مشرقی برلن جا کر اخبار برلنر ٹاگ کا وہ شمارہ مشکل سے ڈھونڈا' اخبار کا عکس چھپا تھا۔ پھر اس اخبار کا دفتر دیکھنے گئے۔ وہاں میدان تھا۔ سبزہ اگا تھا۔ درودیوار پر نہیں کہ وہ پھر ایک بات ہے۔ درودیوار کے ہونے کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ زمین پر' قصہ یہ ہے کہ ان کے زمانے پر دو مہیب جنگیں اور ستر سال گزر چکے تھے۔ بعد میں بھی کچھ سفرنامے آئے اور ہمارے زمانے میں تو خیر سے جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا اور برابر ہو رہا ہے بلکہ اب تو سنا ہے امیگریشن والے جانے والوں سے یہ شرط کر لیتے ہیں کہ واپس آ کر سفرنامہ نہ لکھنے کا وعدہ کرو تو جانے کی اجازت دیں گے۔ لیکن حالی کا سفرنامہ اپنی علیحدہ شان رکھتا ہے اور جب چھپتا تھا تو اخبار کا مقبول ترین فیچر تھا۔ اس میں فقط معلومات کی بات نہ تھی۔ اسٹائل کی دلکشی کا حصہ تھا۔ جہاں خود جاتے تھے' قارئین کرام کو ساتھ لے جاتے تھے۔ کہیں روما کے کلوسیم میں گھوم رہے ہیں' کہیں سین کے پل پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کہیں ٹیمز میں جھانک رہے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ اس میں سوائے پانی اور کیچڑ کے کچھ نہیں۔ کچھ ان کو بڑے اور نامور آدمیوں سے ملنے کا بھی شوق تھا۔ سو یہ شخص کہ تماشا گاہ عالم روئے او تھا' بہر تماشا دوسروں کے ہاں جاتا بھی ملے گا جس سے بعض نادانوں کو یہ شبہ کرنے کا موقع بھی ملا کہ ان کو نمود کا بہت شوق ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا اس بیداد گر رنج فزا نے ہم سے پیش لفظ لکھوانا کیوں پسند کیا۔ دوستی اپنی جگہ لیکن ان کا

مزاج اور ہمارا اور، وہ ہیں مقطع۔ ہم ہیں 'بفسوڑ۔ ہم مارک ٹوین کے دبستان کے آدمی ہیں کہ خبردار جو تحریر کو معلومات سے آلودہ کیا، افادیت کو پاس آنے دیا۔ ہم نے اپنے پہلے سفرنامے "آوارہ گردی کی ڈائری" کے دیباچے ہی میں خبردار کردیا تھا کہ کوئی شخص اسے گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر کرے گا تو نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔

عالی صاحب کی کوٹھی میں آپ کو ہر طرح کا ناج ملے گا۔ تاریخ' جغرافیہ' اعداد و شمار' عمرانیات' معاشیات' سیاسیات' آثار قدیمہ' آثار جدیدہ۔ یا تو یہ نوٹ رکھتے تھے یا ان کا حافظہ ہی ایسا ہوگا۔ اخبار میں چھپا تو اس سفرنامے میں تصویریں بہت تھیں۔ لندن ہو یا روم ہو یا فرانس ہو' ہر ایک میں سوٹ پہنے' کیمرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے دکھائی دیتے تھے۔ کتاب میں سے ہم نے زیادہ تصویریں خارج کر رکھی ہیں۔ یہ پھکانہ شوق ہے۔ یہ ثبوت تصویر سے دینا کیا ضروری ہے کہ آپ واقعی لندن تاور گئے تھے۔ لوگ آپ کے بیان کو کافی سمجھیں گے۔ ایک وجہ شاید ہمارا حسد اور رشک کا جذبہ بھی ہو۔ ہم بہت جگہ گھوم آئے۔ کہیں ہماری تصویر نہ کھنچی۔ آخرکار ٹون بنوائے گئے۔ وہی ہمارے کام آئے۔

اس سفرنامے سے معلوم ہوگا کہ قوم کی اصلاح اور مساوات کے نظاموں اور فلسفوں کے بارے میں ان کا شوق کوئی نیا نہیں ہے۔ ان کا مزاج لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔ اس ترنگ میں بہت سی باتیں لکھ گئے' جو مصلحت کے خلاف تھیں۔ ایک آدھ ملک سے تو پروٹسٹ بھی آیا۔

ہم نے شروع میں عرض کیا کہ سفر کرنے اور سفرنامہ لکھنے میں اولیت تو انہی کی تھی لیکن کتابی صورت میں ہمارے سفرنامے پہلے آئے اور پھر آتے چلے گئے۔ ہر سفرنامے پر یہ کھنکار کر چپ ہو جاتے تھے۔ ایک آدھ بار گلہ بھی کیا کہ تم بہت ہاتھ پاؤں نکال رہے ہو۔ ہمارے حصے کی بھی داد سمیٹے جا رہے ہو۔ ہمارے سفرنامے کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی کہ ان میں کچھ نہیں ہوتا محض "بسنوزری" ہوتی ہے اور غسل خانے ہوتے ہیں۔ ازراہِ رشک و حسد ایک ہم عصر کو یہی کہنا چاہیے تھا۔ ہم سیر چشمی سے طرح دیتے گئے۔ کبھی کہا تو یہ کہا کہ بھئی سنار کی سو سے کیا ہوتا ہے تمہارا سفرنامہ لوہار کی ایک کی طرح آئے گا تو ہمارا سفر اور سفرنامے ملیامیٹ ہو جائیں گے۔

یہ سفرنامہ اخباری صفحات پر بے طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس طومار کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے اور یہ اس کو چھاپنے کا ارادہ ملتوی کرکے دوبے کہنے لگتے تھے۔ آخر ہم نے اس طومار کو چھنوایا۔ اس کی کتابت اپنی نگرانی میں کرائی۔ یہ کام بہت کچھ بڑھا اور بیل منڈھے چڑھتی نظر آئی تو ان کا حوصلہ بھی بڑھا۔ اور بھی کئی دوسروں نے اس سلسلے میں مدد دی۔ بالخصوص مشفق خواجہ اور جمال پانی پتی نے' ورنہ یہ دفتر اب بھی نہ کھلتا۔ تاخیر کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ جس کاتب نے لکھنے کا آغاز کیا' اسے پیچش تھی یا شاید یہ سفرنامے لکھتے لکھتے ہوگئی۔ کیونکہ اس میں کئی ثقیل مقام بھی آتے ہیں۔ بہرحال اب جو سفینہ کنارے پر آلگا ہے۔ اور پبلشر شیخ نیاز احمد اور ارشد

نیاز کی بندرگاہ میں لنگر ڈال چکا ہے، جو رستمِ ناخدا کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سال مبارک ۱۹۷۵ء میں یہ کتاب مستطاب ہم زیورِ طبع سے آراستہ کر کے بارگاہ عالی میں نذر کرتے ہیں اور ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور خود آرام کا سانس لیتے ہیں کہ پہاڑ کٹا۔ یہ کے۔ٹو کی چوٹی سر ہوئی۔ اب تک تو دنیا ان کے آگے تھی، اب انشاءاللہ یہ آگے ہوں گے اور دنیا ان کے پیچھے پیچھے ہوگی۔ بہرحال آگے پیچھے ہونا ان کا اور دنیا کا داخلی معاملہ ہے۔ ہم اجازت چاہتے ہیں۔

(۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر انور سدید

جمیل الدین عالی کے سفرنامے

اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے "ذمہ دار" مورخ اس حقیقت کو شاید نظر انداز کر چکے ہیں کہ محمود نظامی کے نظرناموں سے اردو سفرنامے کی جدیدیت کا آغاز ہوا تو اس افق پر اختر ریاض الدین اچانک وارد نہیں ہو گئیں بلکہ محمود نظامی اور اختر ریاض الدین کے درمیان جمیل الدین عالی کے نام سے بھی ایک تابندہ ستارہ طلوع ہوا تھا جس کی روشنی دور دور تک پھیلی اور جس نے سفرنامے میں جدیدیت اختیار کرنے والوں کو ایک نئی قسم کے پرسکون اجالے میں سفر کی دعوت دی۔ زمانی اعتبار سے جمیل الدین عالی کے سفرنامے ۱۹۶۳ء کے لگ بھگ شائع ہونے شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے لئے خوش ذوق قارئین کا ایک وسیع عوامی حلقہ بھی فراہم کر لیا تھا۔ لیکن حادثہ یہ ہوا کہ جمیل الدین عالی نے اپنے سفرنامے کو اخباری دنیا سے نکال کر ادبی دنیا میں داخل کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ جمیل الدین عالی کی غزلیں، دوہے اور گیتوں کا لہرا اتنا تیز تھا کہ ان کی فنی شخصیت کا بیشتر سفر اس لہرے کی موسیقیت، حلاوت اور نغمگی میں ہی طے ہونے لگا۔ چنانچہ جمیل الدین عالی کو شاعر تسلیم کرنے میں تو کوئی امر مانع نہ رہا تھا لیکن ان کا سفرنامہ جو کراچی کے ایک معروف اخبار کے سنڈے ایڈیشنوں میں کئی برسوں تک چلتا رہا اور نہ صرف اس اخبار کا مقبول ترین سلسلہ ثابت ہوا بلکہ ایک رجحان ساز بھی بن گیا، بعد کے سفرناموں پر لکھنے والے نقادوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ تیسری بات شاید اتنی وزنی نہیں لیکن اس میں حقیقت کا شائبہ ضرور موجود ہے کہ ایک طویل عرصے تک پاکستان رائٹرز گلڈ بھی جمیل الدین عالی کی شخصیت کا اٹوٹ انگ بنا رہا ہے۔ اس ادارے کی کامیابیوں کا ثمرہ تو شاید جمیل الدین عالی کو کم نصیب ہوا لیکن اس کی "موہوم ناکامیوں" پر تنقید کے جتنے تیر و نشتر چلے ان سب کی زد میں بلا واسطہ طور پر جمیل الدین عالی ہی آئے۔ اور یوں ان کی تخلیقی شخصیت رائٹرز گلڈ کی تنظیمی کارروائیوں میں اور ادیبوں کے تلخ و ترش رد عمل کے بوجھ تلے دبتی چلی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ ابن انشاء، مشفق خواجہ اور جمال پانی پتی ان کے سفرناموں کو اخبار

کے 'طومار' سے نکال کر نہ چھپواتے تو جمیل الدین عالی آج بھی اطمینان سے دوہے' غزلیں' گیت کہہ رہے ہوتے لیکن ادبی دنیا ایک منفرد سفرنامہ نگار کو اخبار کے کہنہ صفحات میں گم کر چکی ہوتی۔ اس تمام عرصے میں جمیل الدین عالی نے دوہے کہنے' گیت تخلیق کرنے اور غزلیں لکھنے سے تو ہاتھ نہیں کھینچا بلکہ اپنی دھرتی کے نغمے لکھ کر انہوں نے اظہار کی ایک اپنی فنی جہت بھی دریافت کی جس میں حب الوطنی کے تمام مظاہر موجود ہیں۔ تاہم اطمینان کا باعث یہ بھی ہے کہ ان کے مخلص دوستوں نے ان کے سفرنامے کو زمانے کی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کتابی صورت میں چھاپ کر انہیں ادبی دنیا میں داخل ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اور اب "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" کی صورت میں دو ایسے سفرنامے ہمارے سامنے موجود ہیں جو اردو کے طویل ترین جدید سفرنامے ہیں اور جن کے وسیلے سے جہاں گرد جمیل الدین عالی نے نئی پرانی دنیا کے بہت سے اسرار ہمارے سامنے آشکار کر دیئے ہیں۔

اس طویل جملۂ معترضہ کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کا بنیادی مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ سفرنامہ نگاری جمیل الدین عالی کی تخلیقی اور فنی شخصیت کی ایک اہم جہت ہے۔ ان کے داخل میں جو ادوسگ رہا ہے اس کا بالواسطہ اظہار تو انہوں نے دوہوں' غزلوں اور گیتوں میں کیا ہے اور ان کے مخاطب اہل ذوق اور اہل ادب ہیں۔ تاہم سفرنامے میں جمیل الدین عالی گفتگو عوام سے کرتے ہیں اور وہ تمام افکار و مسائل جو شاعری میں علامتی روپ اختیار کرتے ہیں' سفرنامے میں بلا واسطہ اور دو ٹوک انداز میں آئے ہیں اور جمیل الدین عالی ان پر اپنے تلخ و شیریں رد عمل کو بلا کم و کاست بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ عالی کے سفرناموں کا جائزہ لیں تو وہ بنیادی طور پر یوسف خان کمبل پوش کے قبیلے کے فرد نظر آتے ہیں۔ بقول ابن انشاء "یوسف کمبل پوش مزے کا آدمی تھا" دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کا اسے سودا تھا۔ جیب میں ایک دمڑی بھی نہ ہوتی تو وہ سفر کرنے سے باز نہ آتا اور جہاں جاتا جغرافئیے کو روندتا چلا جاتا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ منظر کو کھلی آنکھ سے دیکھتا تھا اور پھر اس کا سارا حسن اپنے اوپر نچھاور کرنے لگتا تھا۔ وہ کسی ذہنی تصادم سے گزرے بغیر اپنے معصوم جذبوں کی تسکین کا آرزومند تھا اور جنت نظارہ کو اپنی آنکھ میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ یوسف خان کمبل پوش کو جہاں یہ تسکین حاصل ہو جاتی' وہیں گویا ان کے دل کا دبستان کھل جاتا اور وہ بلبل ہزار داستان کی طرح والہانہ خود فراموشی میں سفری داستانیں سنانے لگتا۔ آوارہ خرامی کا یہ عنصر اور منظر کو تار نظر سے دل میں اتارنے کا یہ انداز جمیل الدین عالی کے ہاں بھی موجود ہے ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی جو صرف فطری سیاحوں کے مزاج میں موجود ہوتی ہے ان کے بطون میں بھی پرورش پا رہی ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کو بوجھ نہیں بننے دیتے بلکہ یہ ایک ایسا بازیچہ اطفال ہے جس پر جب نظر ڈالیں نئی نظر آتی ہے۔ اور جمیل الدین عالی کسی ایک مقام کو دل میں مستقل جگہ دینے کے بجائے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آج عراق میں ہیں اور کل ایران میں' پرسوں برطانیہ کی ملکہ عالیہ ان کا استقبال بکنگھم پیلس میں کریں گی' فرانس ان کے لئے چشم براہ ہے اور ہالینڈ عرصے سے ان کا انتظار کر رہا ہے۔ جمیل الدین عالی جگہ جگہ پھرتے ہیں' حسن و رعنائی' واقعات و حادثات اور اذکار و افکار سمیٹتے ہیں اور پھر دوسری منزل کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔ ان کا سفرنامہ سوچی ہوئی حقیقت کا بیانیہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسے ادیب کا سفرنامہ ہے جو زندگی کے حال کو اس کے

روشن ماضی کے ساتھ مربوط کرنے کا آرزومند ہے اور زندگی کو مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کی آسودہ اور پرامن دعوت دیتا ہے۔ ان کے سفرنامے کی یہ جہت انہیں یوسف خاں کمبل پوش سے انحراف کی راہ دکھاتی اور محمود نظامی کے قریب کر دیتی ہے۔

محمود نظامی سفرنامے میں تاریخ کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ وہ جب ماضی کی طرف لوٹتے ہیں تو شوکتِ رفتہ ان کے جذبات پر وارفتگی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے اور جب زمانۂ حال میں واپس آتے ہیں تو ان کے احساسات پر افسردگی کی دبیز تہہ جم چکی ہوتی ہے۔ جمیل الدین عالی نے بھی تاریخ سے استفادہ کیا ہے لیکن وہ اس سے مغلوب ہرگز نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے حال کے منظر اور ماضی کی تاریخ دونوں پر اپنی کشادہ نظری اور آزادہ خیالی سے فتح حاصل کرنے کی کاوش کی ہے چنانچہ جب وہ تاریخ کی یاترا سے واپس حال میں آتے ہیں تو ایک چنچل مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آویزاں ہوتی‘ جیسے کہہ رہے ہوں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق

محمود نظامی منظر کو ایسی آنکھ سے دیکھتے ہیں جس کی پلکوں پر آنسوؤں نے چراغ روشن کر رکھے ہیں۔ عالی منظر میں گم ہو جانے کے بجائے قاری کو اس منظر سے لطف اٹھانے کا مشورہ دیتے ہیں اور منظر کا گھونگھٹ یوں الٹتے ہیں کہ ایک جہانِ دیگر اپنے نئے مطالب و معانی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ محمود نظامی کا سفر تنہا آدمی کا سفر ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی خلوت میں گم نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس جمیل الدین عالی نے اپنے قارئین کے ہجوم کو ساتھ لے کر سفر کیا ہے۔ ان کے ہاں فضا مشاعرے کی ہے اور جونہی کوئی منظر اپنی بوقلمونی ظاہر کرتا ہے عالی اپنے ہم سفروں سے اس کی داد اچھے شعر کی طرح وصول کر لیتے ہیں۔ ان کے سفرنامے میں ایک پررونق مجلس جمی ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو ملحوظِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ عالی نے تاریخ کی انگلی پکڑنے کے بجائے تاریخ کے داخل میں سفر کرنے کی طرح ڈالی ہے‘ وہ دو دنیاؤں میں بیک وقت سفر کرتے ہیں۔ ایک دنیا ان کی نظروں کے سامنے منظر در منظر بکھری ہوئی ہے‘ دوسری دنیا ان کے ذہن میں مدفون ہے۔ اس دنیا کو عالی نے کتابوں کی مدد سے پڑھا ہے تو اس کی چکا چوند کا نظارہ اپنے ذہن کی تابندہ آنکھ سے بھی کیا ہے چنانچہ یہ دنیا جب کاغذ پر منعکس ہوتی ہے تو اس کا کوئی منظر دھندلا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے خد و خال روشن اور گرد و پیش واضح ہے اور اس میں وہ تہذیب سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو ہزاروں برسوں کا سفر طے کر کے ہمارے زمانے تک پہنچی ہے تو اپنی صورت تبدیل کر چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جمیل الدین عالی کے سفرنامے میں مورخ طبری اور ابن خلکان ان کے ساتھ ہی سفر کر رہے ہیں۔ مورخ طبری کے ہاتھ میں پتوار ہے۔ مورخ ابن خلکان چپو ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے۔ جمیل الدین عالی قلم تھامے اس دور کا سفرنامہ لکھ رہے ہیں اور مناظر ان کے سامنے ’خیابان خیابان ارم‘‘ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک پردے کے بعد دوسرا پردہ اٹھتا چلا جا رہا ہے اور چشمِ بینا کو حیرت زدہ کر رہا ہے۔

”۱۴۶ھ یا ۷۶۳ء میں خلیفہ منصور عباسی پر کوفے میں باغیانہ حملے ہوئے تو اس نے دارالسلطنت ہی بدلنے کی سوچی

اور اس مقام کا انتخاب کیا اور کہا ---- "یہ فوجی چھاؤنی کے لئے بہت اچھا مقام ہے' اس کے ایک پہلو میں دجلہ رواں ہے۔ یہاں سے چین تک ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں' ہمیں ہر قسم کا سامان معیشت بحری راستے سے وصول ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تمام سامان خوراک جزیرہ آرمینیہ اور آس پاس کے علاقوں سے ہمیں پہنچ سکتا ہے۔ دریائے فرات بھی ہمارے قریب ہی واقع ہے۔ اس کے ذریعہ شام اور رقہ اور آس پاس کے علاقوں سے ہر قسم کی پیداوار وصول ہو سکتی ہے ۔ اور پھر منصور نے اس قطعۂ زمین پر ایک نقشے کے مطابق روئی کے بنولوں سے لکیریں ڈلوائیں اور ان پر تیل چھڑکا اور پھر ان میں آگ لگوا کر ایک بلند مقام سے معائنہ کیا۔ تعمیر کے بعد شہر کیسا نظر آئے گا"۔

"اور وہ دیکھو کہ ہارون الرشید کے زمانے میں جبکہ بغداد کی تعمیر کو صرف پچاس برس گزرے ہیں' اس کی شان و شوکت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے --- اس شہر میں دنیا بھر کی دولت و حشمت اس طرح سمٹ کر آ گئی ہے کہ سڑکوں پر کوئی فقیر نظر نہیں آتا کیوں کہ بیکار' بے کار لوگ محتاج خانے میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ خلیفہ کی ملکہ زبیدہ کے دستر خوان پر کوئی برتن سادہ نظر نہیں آتا بلکہ سونے چاندی کے برتنوں پر جواہر' زمرد اور عقیق جڑے ہوئے اور اس کی جوتیوں کی نوکوں پر ہندوستان اور افریقہ کے سفید ہیرے زمین سے آسمان کو آنکھیں مارتے ہیں۔"

"اور وہ سامنے کا محل ملکہ زبیدہ کی نند شہزادی عالیہ کا ہے۔ یہ خلیفہ ہارون الرشید کی سوتیلی بہن ہے۔ یہ حسن و خوبی میں زبیدہ کی ہمسر ہے مگر اس کے ماتھے پر ایک داغ ہے جس پر یہ ایک ٹیکا لگاتی ہے۔ اس ٹیکے کا نام اعلیٰ علیہ ہے۔ یہ ٹیکا بغداد سے ایران' ایران سے ہندوستان اور دوسری طرف مغرب میں اور یورپ پہنچے گا جہاں خواتین اسے فیشن کے طور پر اختیار کریں گی اور یہ حسن اور امیری کی نشانی کہلائے گا۔ حالانکہ علیہ نے یہ ٹیکا اپنے ماتھے کے داغ چھپانے کے لئے ایجاد کیا ہے۔"

"اور قصر خلافت میں داخل ہو تو پتا نہیں چلتا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اس محل میں اڑتیس ہزار ریشمی پردے لگے ہوئے ہیں اور بائیس ہزار ایرانی' مصری اور عربی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ سامنے ایک طرف دارالشجرہ ہے۔ یعنی درخت والا کمرہ جس میں سینکڑوں من وزنی سونے کا ایک درخت آویزاں ہے اور اس کی شاخوں پر چاندی کی بنی ہوئی چڑیاں بیٹھی ہیں جو کہ ہوا کی سرسراہٹ سے طرح طرح کے نغمے گاتی ہیں۔"

"اور دجلہ کے اس کنارے خلیفہ کے وزیر خاندان برامکہ کے محل ہیں جن کی چھتوں سے آتش بازیاں اور روشنیاں آسمان کو چھو رہی ہیں ۔ یہاں وزیر کی بیٹی بوران سے شہزادے مامون الرشید کی شادی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ سامنے والے محل میں برات پہنچی تو اسے سونے کے وسیع و عریض فرش پر بٹھایا گیا جس کے چاروں طرف موتی اور یاقوت لگے ہوئے تھے۔ دولہا دولہن کے سامنے جڑاؤ سونے کی کشتی لائی گئی جس میں ایک ہزار موٹے موٹے موتی بھرے ہوئے تھے اور چشم زدن میں وہ پوری کشتی ان پر سے نچھاور کر کے باہر پھینک دی گئی۔"

یہ چند مثالیں تاریخ کے بطون میں والہانہ سفر کرنے کی مثالیں ہیں۔ لیکن جمیل الدین عالی بیسویں صدی کے سفرنامہ نگار ہیں۔ وہ ابن بطوطہ کی طرح صرف منظر کا تحیر کشید نہیں کرتے بلکہ وہ منظر کو دیکھتے ہیں تو اس سے اپنی سوچ کو مہمیز بھی

لگاتے ہیں۔ ایک تو آزاد ترقی پذیر ملک کا نمائندہ ادیب ہونے کے ناتے انہوں نے اپنے سر پر بھاری ذمہ داری کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ چنانچہ جب وہ ماضی میں سفر کرتے ہیں تو حال کو یکسر نظرانداز نہیں کرتے۔ عالی نے ان دونوں زمانوں کو آپس میں باہم مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی جمیل الدین عالی کی تمنا کا ایک قدم ہے تو حال ان کے دوسرے قدم کی زد میں رہتا ہے اور وہ ایک بڑے مقصد کی تکمیل میں ہمیشہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے مقامات پر جمیل الدین عالی کے ہاں شدید قسم کی طنز سر ابھارتی ہے اور وہ اپنے تلخ و ترش ردعمل کو شکر کی دبیز تہہ میں لپیٹنے کے بجائے اسے کھردرے اور سچے انداز میں سفرنامے کی نیت میں شامل کرتے چلے جاتے ہیں۔ فنی طور پر اس طنز کی ایک صورت تو یوں ہے کہ یہ سفرنامے کے پرکیف اور لذت انگیز بیانیہ میں اچانک زہر کی گٹھلی کی طرح نمودار ہو جاتی ہے اور اپنے سمیت قاری کے جسم و جان میں اتار دیتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں جو بالواسطہ اور غیر ارادی طنز کے عمدہ نمونے ہیں۔

"منصور کے بغداد کا نام المدورہ بھی ہے ۔۔۔ یعنی گول شہر۔ اس کے تین طرف نوے فٹ اونچی فصیلیں اور خندقیں ہیں۔ اور ان میں چار دروازے ہیں اور ہر دروازے سے ایک سڑک اسلامی دنیا کے چاروں سمت جاتی ہے اور یہ تمام سڑکیں گول شہر کے وسطی مرکز سے چلتی ہیں پھر ہم بارہ سو برس بعد واپس کود سکتے ہیں اور اپنے لائل پور کو منصور عباسی کے بغداد سے مشابہت دے سکتے ہیں۔ ہائے لائل پور ۔۔۔۔ انگریزی نام ہے۔ (۱)

"اس بوڑھے کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہوتی جا رہی ہیں جو مجھے پورا ملک دکھانا چاہتا ہے۔ "نا۔ بابا" میں نے بولتی ہوئی جھریوں سے کہا۔ "میں ایک نوکری پیشہ مجبور زبان بند آدمی ہوں۔ پھر میں اردو کا شاعر بھی ہوں۔ جو عاشقانہ کلام نہ لکھے لوگ اسے شاعر ہی نہیں مانتے۔ میں پورا ایران کیا دیکھوں گا۔ مجھے تو یہ صاف چکنی سڑکیں، یہ عالیشان محلات یہ آراستہ عجائب گھر، یہ لمبی لمبی موٹریں اور سرخ و سپید ایرانی لڑکیاں ہی کافی ہیں۔"

"اپلو صاحب تھکنے میں نہیں آتے، نہ گھومتے تھکتے ہیں نہ بولتے تھکتے ہیں مگر ان کی اطلاع رسانی اور طراری میرے لئے بالکل بیکار ہے۔ وہ مجھے کوئی ایسا ایشیائی سمجھے ہوئے ہیں جو علم کی تلاش میں ملک ملک گھوم رہا ہے۔ اب میں ان کو اپنی اصلیت کا کیا بتاؤں۔ (آپ تو جانتے ہی ہوں گے) میں فرینکفرٹ دیکھ دیکھ کر کباب ہو رہا ہوں۔ اس کی شیشے جیسی سڑکیں میری آنکھوں کو تراوٹ بخشنے کے بجائے میرا کلیجہ کاٹے لیتی ہیں۔ کیوں بھئی ہم ایسی سڑکیں کیوں نہیں بنا سکتے۔ ہم ایسے شہر کیوں نہیں بسا سکتے۔ ہم ایسی کتابیں کیوں نہیں چھاپ سکتے۔؟"

"ایک طرف دار الشجرہ ہے یعنی درخت والا کمرہ جس میں سینکڑوں من وزنی سونے کا ایک درخت آویزاں ہے اور اس کی شاخوں پر چاندی کی بنی ہوئی چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، جو ہوا کی سرسراہٹ سے طرح طرح کے نغمے گاتی ہیں چا، چا، چا، یہ سلطنت بہت طاقتور ہے۔ بلکہ ہمیں ایڈ بھی دے سکتی ہے۔ امداد خواہ قرضوں کی صورت میں ہو خواہ چا، چا کے ریکارڈوں کی شکل میں۔"

طنز کی دوسری صورت نسبتاً واضح اور بلاواسطہ ہے اور یہاں جمیل الدین عالی ایک زیرک اور صحت مند مفکر کی

حیثیت میں منظر کو بلندی سے دیکھتے ہیں اور اپنے کڑوے رد عمل کو بے اختیار عریاں کر ڈالتے ہیں۔ اس قسم کی طنز کی چند نمائندہ مثالیں حسب ذیل ہیں :

" یہ بین الاقوامی عدالت عالیہ کی عمارت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی میری نظر اس عمارت پر نہیں جمی بلکہ میں سامنے والے دروازے سے نکلنے والی ایک نہایت جاذب نظر "ٹورسٹ" خاتون کو دیکھ رہا ہوں جن کی تصویر ابھی آپ کو نہیں دکھاؤں گا۔ یوں بھی آپ عورت اور انصاف کے رشتے کو ایک دم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ عورت خدا نے بنائی ہے اور آج تک چل رہی ہے یعنی ہر جگہ عورت کا وجود باقی ہے اور انصاف بھی خدا نے بنایا ہے مگر وہ عورت سے کمزور نکلا۔ کہیں دھیما چل رہا ہے کہیں چلا ہی نہیں۔ کہیں چل کر رہ جاتا ہے۔ کہیں چلنے ہی نہیں پاتا۔"

"اب میں سوئٹزرلینڈ پہنچتا ہوں' یعنی اس ملک میں پہنچتا ہوں جو اپنے سرکاری ٹورسٹ بیورو والے اشتہارات کے مطابق دنیا کا سب سے عجیب ملک ہے۔ واہ بھی! میں اسے دنیا کا سب سے عجیب ملک کیسے مان لوں؟ کیا خود میرا ملک دنیا کا سب سے عجیب ملک نہیں ہے؟ اور پاکستان میں تو یہ بات ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ بہت دنوں تک تو باہر والی دنیا پر بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

" کرخنداری زبان میں یہ ملک ایک چوں چوں کا مربہ ہے۔ یہاں تین زبانیں بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ملک میں زبان کے معاملے پر تکرار نہیں چلتی۔"

"پھر میں دکان کرلیتا ہوں۔ مجھے ہلدی میں زرد گھاس ملی ہوئی پہنچتی پڑتی ہے۔ گھی میں تیل' آٹے میں برادہ' دال میں کنکر ---- گاہک مجھ سے پوچھتا ہے۔ کیوں بھائی گھی اصلی ہے نا؟ میں کیا جواب دوں' تمہاری طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں اور کہوں speak no evil گاہک چلا جائے گا اور اگر کہوں کہ جناب سو فیصدی خالص ہے۔ قرآن مجید کی قسم ذرا ملاوٹ نہیں۔ گاہک خوشی خوشی خریدے گا مجھے نفع ملے گا۔ میرے بچے اسکول میں ذلیل نہیں ہوں گے۔ میری بیوی شام کو میرا استقبال تازہ تازہ مسکراہٹ سے کرے گی۔ میں بی ڈیز کا الیکشن لڑوں گا اور پھر اسمبلی کا ممبر' اور ہو سکتا ہے کہ وزیر بھی ہو جاؤں اور بڑی بقراطی تقریریں بھی کروں' رفاہ عامہ کے کارنامے سرانجام دوں اور ملی تاریخ میں ایک مدبر کی حیثیت سے اپنا نام بھی چھوڑ جاؤں۔"

جمیل الدین عالی کی طنز میں زہر موجود ہے لیکن یہ دردمندی سے عاری نہیں۔ ان کی طنز میں جراحت کا خطیر عنصر شامل ہے۔ لیکن یہ جراحت جسم سے گندے خون کا اخراج بھی کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے سفرنامے کے اکثر مقامات پر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جمیل الدین عالی فطری طور پر سرسید احمد خاں' الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے قبیلے کے آدمی ہیں اور اپنی سفری تحریروں اور تجربوں سے سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی ہلکی سے چٹکی لے کر اور کبھی تیز دھار آلے سے زخم کے داخل میں گھس کر۔ چنانچہ ان کی طنز بے غرض نہیں بلکہ اس کے پس پشت ایک اجتماعی مگر غیر ذاتی مقصد موجود ہے اور ان کا سفرنامہ اس مقصد کے حصول کا ہی ایک وسیلہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمیل الدین عالی کا ذوقِ آوارگی بہت پختہ ہے اور وہ بھری پُری دنیا میں گم ہو جانے کے

بجائے اسے ایک مخصوص مشرقی زاویئے سے ہی دیکھتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ جمیل الدین عالی کے طنزیہ لہجے سے ان کا احساس تفاخر بھی نمایاں ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ اپنی انا کو لوریاں دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وجہ شاید یہ ہے کہ مشرق کے کسی ترقی پذیر ملک کا سیاح جب مغرب کی گوناگوں سائنسی ایجادات کا سامنا کرتا ہے تو وہ ان سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مغرب کی خیرہ کن شخصیت کے سامنے مشرقی سیاح اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرتا کہ ماضی بعید میں جب مشرق تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا تو مغرب جہالت اور پسماندگی کی تاریکیوں میں گم تھا۔ چنانچہ جب مغرب اپنی صنعتی ترقی سیاح پر آشکار کرتا ہے تو وہ اپنے شاندار ماضی کو ہی سہارا بناتا ہے۔ جمیل الدین عالی کے ہاں بھی مشرقی سیاح کی یہ روایتی صورت ہمیں متعدد مقامات پر اپنی جھلک دکھاتی ہے تاہم ان کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ وہ منظر سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی انفعالی حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں اور یوں ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ منظر کی قدر و قیمت محض اس لئے بڑھ گئی ہے کہ اس پر جمیل الدین عالی نے التفات کی نظر ڈالی ہے۔ اس قسم کے مقامات پر وہ پسماندہ مشرق کو ایک باوقار مقام پر فائز کر دیتے ہیں۔ اور اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ان کا سفرنامہ "باادب باملاحظہ ہوشیار" قسم کی چیز بنتا جارہا ہے۔ چنانچہ مغرب' جب مشرق کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے تو جمیل الدین عالی پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ مشرق کے اس برتر روپ کو مزید ابھارتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں ایک غریب ملک کا باوقار سفرنامہ نگار منظر کو مغلوب کئے دیتا ہے اور قاری اس کے احساس تفاخر میں شامل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

یہ ہوٹل امبیسڈر ہے۔ بیچ شہر میں ایک شاندار عمارت' بے حد مکلّف اور آراستہ' باوردی مودب بیرے دوڑے۔ مادام نے جلدی سے اتر کر گھبرائی ہوئی آواز میں شور مچانا شروع کردیا۔ ایک اسسٹنٹ مینیجر قسم کے شخص کو پکڑ لائیں "یہ وزیر خارجہ کے مہمان ہیں۔" انہوں نے انگریزی میں کہا' اور اسسٹنٹ مینیجر نے تین چار بار ادب سے سر ہلایا "گڈبائی" مادام اور ان کی بیٹی اور داماد ایک ساتھ بولے۔ "کل صبح گیارہ بجے آپ وزیر خارجہ سے ملیں گے" گڈبائی مادام۔ سینوریتا۔ سینوریتا گڈبائی۔ گرآت سی آ۔بائی" میں نے تعظیماً جھک کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ کمرہ کیا تھا۔ ملکہ قلوپطرہ کا بجرا تھا' جس میں وہ مارک انطونی کا استقبال کرنے آئی تھی۔

> "ہر سال روما میں ہوٹلوں کے پندرہ درجے مقرر کئے جاتے ہیں۔" اسسٹنٹ مینیجر صاحب کمرہ دکھاتے ہوئے فرمارہے تھے۔ "یہ ہوٹل ہمیشہ سے اول درجے کا تسلیم کیا جاتا ہے اور آپ جیسے معزز مہمان اکثر یہیں ٹھہرتے ہیں" میں نے انہیں ایک جرمن سگریٹ پیش کیا' جو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سلگایا اور رخصت ہوگئے۔ دروازے کے اندر کی طرف ایک کارڈ پر اطالوی' فرانسیسی اور انگریزی میں کمرہ کا کرایہ لکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر میری جان نکل گئی مگر پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دھم سے بستر پر گر گیا جس پر جھولے کا سا مزا آنے لگا۔"

اور اب شاعر جمیل الدین عالی کی مصنف ہنری طرسے ایک بے تکلف ملاقات کا منظر دیکھئے :

"مسٹر طر آپ الجزائریوں کی مدد کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں کس سالے کی مدد کر رہا ہوں۔" اس نے تقریباً ایک موٹی سی گالی دی۔ "میرا سیاست سے کیا تعلق؟ اگر تمہیں یہ بکواس کرنی ہے تو یہیں سے واپس ہو جاؤ؟" میں نے بھی غصے میں ایڑ ھی ماری اور واپس ہونے لگا۔ "گڈ بائی" میں نے زور سے اور جلدی سے کہا۔ "گڈ بائی" اس نے بھی غصے سے کہا۔ "او لونڈے تو بالکل گدھا ہے اور گدھا ہی رہے گا۔ تو فراڈ بھی معلوم ہوتا ہے۔ پتا نہیں تجھے کس حرام زادے نے میرا پتا بتا دیا ہے۔" گالی سن کر ایک دم میرا جی چاہا کہ میں پلٹ کر ایک گھونسا ماروں۔ چھوٹے قد کا نحیف بڈھا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ میں یکایک غصے کے عالم میں مڑ گیا اور تیزی سے اس کی طرف واپس ہوا۔"

اظہار کی یہ بے تکلفی جمیل الدین عالی کے رواں دواں اسلوب کا حصہ ہے۔ وہ گالیاں دے کر اور پھر گالیاں کھا کر بدمزہ نہیں ہوتے' اس سے چٹخارے میں اضافہ ہوتا ہے اور احساس یہ ہوتا ہے کہ ہم پیرس کی مصور گلیوں میں آوارہ خرامی نہیں کر رہے بلکہ اپنے ہی وطن کے کسی گنجان گوشے میں چل پھر رہے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے مصنف' منظر اور قاری کی تثلیث کو باہم مربوط کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کا سفرنامہ ایک ایسے ادیب کا سفرنامہ ہے جو ادب کے کلاسیکی پس منظر کو زندگی کے موجود منظر سے ہم آہنگ کرنے کا آرزومند بھی ہے اور اس مقصد کو نسبتاً زیادہ کامیابی سے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تاثر کو شاعری کے ساتھ آمیخت کرنے کی شعوری کاوش بھی کی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میں دیکھئے' جمیل الدین عالی نے سفرنامے میں شعر کو کس خوبصورتی سے زدبان کے طور پر استعمال کیا ہے

"آخر اس قضیئے میں کیوں پڑوں؟" میں نے سوچا۔ "میرے اپنے مسائل کم ہیں جو میں پیرس میں جنرل ڈیگال کے خلاف بغاوت کے مناظر دیکھنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالوں۔ جان ہے تو جہان ہے پیارے۔"

" آگے چلو میاں۔ برلن دکھاؤ برلن۔ کسی مادام کی کوئی بات بتاؤ۔ کوئی سنسنی خیز' چٹپٹی بات۔ یا کسی قحبہ خانے میں لے کر چلو۔ یا کوئی غزل سناؤ

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مےِ ناب و سفینۂ غزل است"

"آپ بائیں ہاتھ کے کونے پر ان چار لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں جن کی صحت اور تازگی کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ کر مرزا غالب نے کلکتے میں یہ مصرع فرمایا تھا :

"طاقت ربا دو ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے"

اسی ڈبے میں وہ وہ پریاں بیٹھی ہیں' چہلیں کر رہی ہیں کہ

"زفرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیر لبی"

خوبصورت اشعار کے اس استعمالِ فراواں سے تو اکثر اوقات یہ گمان بھی ہونے لگتا ہے کہ جمیل الدین عالی سفرنامے کے بہانے قاری کے دل میں دل آویز اشعار اتارنے کی ہی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار

ممکن نہیں کہ جمیل الدین عالی کی شعریت نے سفرنامے کو رنگین اور معطر بنا دیا ہے اور اکثر مقامات پر تو انہوں نے نثر میں بھی شاعری کی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل پارۂ نثر ملاحظہ کیجئے' جس میں شاعری کے بیشتر عناصر موجود ہیں :

"پھول عورت کی طرح ہوتا ہے۔ یعنی جیسے کسی ایک ملک کی عورت دوسرے ملک کی عورت سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہوتی' ایسے ہی ایک مقام کا پھول دوسرے مقام کے پھول سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس لئے ہارلم کے پھولوں میں کوئی ایسی بات نہیں جو ایران یا انگلستان یا فرانس یا ہندوستان کے پھولوں میں نہ ہو۔ مگر ہارلم اور دوسرے مقامات میں یہ فرق ہے کہ دوسرے مقامات میں پھول بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن یہاں پھول ہی پھول ہوتے ہیں یا عورتیں ہی عورتیں۔ اللہ اکبر۔ کیا فرق ہے ۔۔۔ میں روز ہیگ سے ایمسٹرڈم جاتا ہوں اور یہ موسم بہار کا ہے۔ اس لئے روز دوبار کم از کم پانچ چھ منٹ کے لئے ایک عجیب و غریب منظر آنکھوں کے آگے سے گزرتا ہے' ایسا منظر جو ہارلم سے پہلے اور ہارلم کے بعد کبھی میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ میلوں لمبے رنگ برنگ پھولوں کے تختے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں' رنگ اچھلتے ہیں' پھٹے پڑتے ہیں۔ ہوا میں آمیز ہو جاتے ہیں۔ سورج کی تیز کرنوں پر سوار ہو کر میری آنکھوں میں' میری روح میں در آتے ہیں' میرے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ اور ریل کی دلدوز گڑگڑاہٹ ترنم' سبک' شیریں نغموں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ پہیے رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے باضابطہ طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہو۔ جیسے عربی فارسی تقطیع کے ارکان کئی قطاروں میں مارچ کر رہے ہوں' فعل فعولن فعل فعولن' مفاعیلن۔ مفاعیلن۔"

جمیل الدین عالی کے سفرنامے میں خود روئیدگی کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ منظر ان کے سامنے متحرک رہتا ہے اور وہ اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرنے اور دوبارہ بصیرت سے تخلیق کرنے کے بجائے اسے فوراً کاغذ کی سطح پر اتارتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی منظر باسی نہیں ہوتا۔ کوئی تاثر سیکنڈ ہینڈ نہیں۔ راہوار خیال جس طرح روانہ ہوتا ہے جمیل الدین عالی اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے سفرنامے میں نے ہاگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں' کی صورت بھی نظر آتی ہے تاہم اس عمل میں جمیل الدین عالی نے قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں دی اور اس کی دلچسپی کے تمام سامان فراہم کئے ہیں۔ اور دنیا واقعی ایک تماشا نظر آنے لگتی ہے۔ اس تماشے کا یہ لذیذ منظر دیکھئے :

"اس علاقے کا نام ہے کوفر سٹنڈام' شہر کا ایک نہایت بارونق علاقہ ہے' بہت سے مشہور ہوٹل دکانیں اور نائٹ کلب اسی مقام پر واقع ہیں۔ لہذا جرمن طوائفیں بھی یہیں واقع ہوتی ہیں اور غیر ملکی تماشبین بھی یہیں واقع ہو رہے ہیں اور اس لئے بھی میں یہیں واقع ہو گیا ہوں ۔۔۔ چنانچہ اس بازار میں گھومتا ہوں ۔۔۔ "آہ موسیو' رات کے بارہ بجے آپ یہاں اکیلے کیوں گھوم رہے ہیں۔" اس نہایت مرد معقول نے نہایت معقول انگریزی اور فرنچ لہجے میں فرمایا اور جھٹ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں ایک ٹورسٹ ہوں۔" میں نے ان کا ہاتھ ہٹانا چاہا' جو نہ ہٹا۔

"آہ تو کیا آپ یہ کتاب دیکھنی پسند کریں گے۔" انہوں نے جھٹ سے ایک البم میرے ہاتھ میں تھما دی اور میرے شانے والے ہاتھ کو اٹھا کر اس میں ایک ٹارچ پکڑا دی جو خاصی تیز اور سرخ روشنی پھینک رہی تھی۔

اس البم میں کوئی بیس خواتین کی ننگی تصویریں تھیں۔ نہایت عمدہ اور بہت مختلف الاقسام پوز ان کے نیچے ان کی عمریں اور قومیتیں اور ایک رات کی قیمت تین چار یورپی زبانوں میں ٹائپ کردی گئی تھی جن میں سے ایک انگریزی بھی تھی۔ میں نے ہر تصویر کی تعریف شروع کی اور وہ ہر تعریف پر تفکر و امتنان سے سرہلاتے گئے۔

"اچھا مجھے اجازت دیجئے' مجھے اپنے ہوٹل واپس پہنچنا ہے۔" میں نے ایک دم البم ختم کر کے عرض کیا۔ "بس! تو' موسیو' کیا آپ کو سیرو تفریح پسند نہیں یا آپ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔" انہیں غصہ آنے لگا تھا---- "آپ نے میرا وقت ضائع کیا اور ان خوبصورت عورتوں کی توہین کی۔ آپ کو اس کی قیمت دینی ہوگی"----میں نے کوشش کی کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر ٹٹولوں اور ایک نوٹ برآمد کرلوں۔ مگر وہ صاحب کچھ اور سمجھے انہوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "اوہو' تو آپ کے پاس ریوالور بھی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ---- میرے منہ کی سیدھ میں ایک زوردار گھونسا چلا دیا' جو میرے دائیں کلّے کی آخری داڑھ پر پڑا---- اتنے میں برابر والی گلی سے ایک مضبوط اور خوش شکل خاتون نمودار ہوئیں۔

"مرڈر۔ مرڈر" ان کی چیخیں بلند ہونے لگیں---- میں نے جلدی سے اپنا فیلٹ ہیٹ منہ کے آگے کیا اور دونوں مٹھیاں ملاکر ایک جوابی گھونسہ مارا جو ان کی ناک پر لگا وہ چکرا کر گر گئے اور گرتے ہی گرتے اٹھ کر بھاگے۔

اس قسم کے مناظر سفرنامے میں افراط سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اس کی دلچسپی میں معتدبہ اضافہ کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ سفرنامے اخبار جنگ میں چھپنے شروع ہوئے تو انھیں دلچسپی سے پڑھا گیا اور ان کا حلقہ قرأت روز بروز وسیع ہوتا چلا گیا چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ جمیل الدین عالی کا سفرنامہ ابن جبیر' ابن بطوطہ اور مارکوپولو کے سفرنامے کی طرح دلچسپ' لذیذ اور حیرت انگیز ہے تو یہ کچھ غلط نہیں ہوگا۔

مجموعی طور پر جمیل الدین عالی کا سفرنامہ ان کی جو شخصیت مرتب کرتا ہے وہ ایک دردمند ادیب اور سوچنے والے سیاسی زائر کی شخصیت ہے۔ وہ جب ہندوستان میں اپنی آبائی دھرتی پر قدم رکھتے ہیں تو ان کے داخل سے اچانک ایک خالص پاکستانی برآمد ہوجاتا ہے۔ وہ ہمک کر دھرتی ماں کی طرف لپکتے ہیں۔ لیکن فوراً ان کے سامنے ایک ڈائن کا چہرہ آجاتا ہے جو جمیل الدین عالی کے بچوں کو مفلوج اور اپاہج کردینے کی سازشیں کررہی تھی۔ پھر وہ اپنے اس قدیم وطن میں اجنبی ہوجاتے ہیں اور گھبرائے گھبرائے اس بستی میں پھرنے لگتے ہیں جو ان کا پہلا پردیس ہے۔ جمیل الدین عالی کی یہ شخصیت ایک سچے پاکستانی کی شخصیت ہے۔ اسے کسی آرائش اور نمائش کی ضرورت نہیں اور یہ سفرنامے کے بطون سے اپنی جھلکیاں بار بار دکھاتی ہے۔ اس پاکستانی کا دل اپنے وطن کی پسماندگی پر مسلسل کڑھتا' جلتا اور کراہتا ہے' وہ امریکہ' برطانیہ' فرانس' مغربی جرمنی اور ہالینڈ وغیرہ کی جدیدیت کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے ملک کی قدامت یاد آتی ہے اور وہ یورپ کا تذکرہ کچھ اس والہانہ انداز میں کرتا ہے کہ اس کا قاری اپنے دامن میں خود بخود جھانکنے پر مجبور ہوجاتا ہے اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ جمیل الدین عالی نے اپنے سفرنامے کو سیاسی عقائد و نظریات کا پلندہ بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ پاسبانِ عقل کو ہر مقام پر تنہا چھوڑنے اور پرواز کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں آنسو

زیر سطح دب جاتا ہے۔ مسرت پھلجڑیوں کی صورت میں قہقہہ بار ہو جاتی ہے۔ اور یوں ایک بے ساختہ کیفیت خود بخود تخلیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ جمیل الدین عالی کی یہ خوبی انھیں بہت سے دوسرے سفرنامہ نگاروں سے نہ صرف برتر مقام پر فائز کرتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس اسلوب نے سفرنامے کو جدیدیت کی طرف قدم بڑھانے میں بھی بہت مدد دی ہے۔

یہ سفرنامہ روزنامہ "جنگ" میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔(دو جلدوں کی صورت میں پہلی بار ۱۹۷۴، ۱۹۷۵ء میں آیا۔

از کتاب: "جمیل الدین عالی' فن اور شخصیت"
مرتبہ : ایم حبیب خاں' علمی مجلس دہلی (۱۹۸۸)

ڈاکٹر مظفر حنفی

اردو میں دوہے

اردو شاعری کی قدیم کلاسیکی اصناف میں سے بیشتر وہ ہیں جو فارسی سے آئی ہیں۔ مثلاً قصیدہ' مثنوی' رباعی' غزل' مرثیہ وغیرہ۔ ان کلاسیکی اصناف سخن میں اردو نے مرثیے کو چھوڑ کر بقیہ سبھی میں انہی اصولوں' معیاروں اور ضابطوں کی پیروی کی ہے جو فارسی میں مروج تھے۔ مرثیے کو میں نے اس کلیے سے یوں مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ فارسی کے برعکس اردو میں اس صنف سخن نے ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے تبدیلی' ترمیم اور اضافے کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ تمہید اس لئے اٹھائی گئی تاکہ واضح ہو جائے کہ اردو میں مروج اصناف میں اصل زبان کے قاعدے' قانون کی پیروی کے ساتھ ساتھ ترمیم و اضافے کی اجتہادی شکلیں بھی ابتداء سے ہی نظر آتی ہیں۔

نسبتاً نئی اصناف سخن اردو والوں نے فارسی کے برعکس دوسری زبانوں سے اخذ کی ہیں۔ مثلاً سانیٹ اردو میں انگریزی سے آیا جبکہ ترائیلے' ثلاثی اور ہائیکو اردو کو چینی اور جاپانی زبانوں کی دین ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو نے ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں سے بھی کچھ اصناف سخن مستعار لی ہیں اور ان کے بدلے میں ان زبانوں کو غزل اور اپنی دیگر اصناف سے استفادہ کی راہ دی ہے۔ مثلاً اردو میں کافی اور ماہیے پنجابی اور سندھی کے اثر سے آئے اور دوہا قدیم ہندی کے وسیلے سے منتقل ہوا۔ لیکن ان سبھی اصناف سخن میں اردو والوں نے لکیر کا فقیر بننا پسند نہیں کیا بلکہ اپنے لسانی مزاج کی مطابقت سے تبدیلی و تغیر کو روا رکھا ہے اور اکثر مقامات پر اصل زبان میں رائج اصول و ضوابط سے اختلاف کیا ہے۔ جہاں ہم زبانوں کے منفرد اجتہادی حقوق کو تسلیم نہیں کرتے وہاں بڑی مضحکہ خیز صورتیں رونما ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے دنوں ایک محقق نے تحقیق کا پہاڑ کھود کر یہ چوہا برآمد کیا کہ اردو میں تصدق حسین خالد سے تاحال سانیٹ کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے' تکنیکی اعتبار سے اغلاط کا پشتارہ تھا اور لے دے کر محقق موصوف اور ان کے ایک ہم وطن نے ہی صحیح اور معیاری سانیٹ لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے غلط نتائج پر منتج ہونے والی تحقیق

دراصل اپنوں میں ہی لڈو بانٹتی ہے ورنہ حقیقتاً سانیٹ کے سلسلے میں اردو نے اپنے اس جائز اجتہادی اور تخلیقی حق کو استعمال کیا ہے جو مرثیے کے سلسلے میں روا سمجھا گیا تھا۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ میں نے دوہے کو نئی اصناف سخن میں کیوں شمار کیا ہے اور ثبوت میں امیر خسرو کا یہ دوہا پیش کیا جا سکتا ہے۔

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چھو دیس

عرض کرنے دیجئے کہ امیر خسرو بلکہ ان کے بھی پیشرو اور دادا پیر بابا فرید گنج شکر نے متعدد دوہے لکھے ہیں جن میں سے ایک سو تیں سکھوں کی مذہبی کتاب "آدگرنتھ صاحب" میں شامل ہیں۔ موصوف کا ایک دوہا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

دور ہے گھر اور گلی میں چکر اور پیا سے پیار
چلوں فرید تو کمبل بھیگے، رہوں تو ٹوٹے پیار

یا شیخ بو علی قلندر پانی پتی کا یہ مشہور دوہا :

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی کیجیو، بھور کبھی نہ ہوئے

بابا فرید، بو علی قلندر اور امیر خسرو کے دوہوں کی قدامت مسلم اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کہ اردو کی ابتداء کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام نے دوہوں سے استفادہ شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اردو نثر کی پہلی کتاب یعنی ملا وجہی کی "سب رس" میں متعدد دوہے درج کئے گئے ہیں لیکن بہ حیثیت صنف سخن دوہا ہمارے یہاں کئی صدیوں تک کوئی مستحکم روایت نہیں بنا سکا حالانکہ امیر خسرو کے بعد بھی اردو وقتاً فوقتاً رحمت اللہ بلگرامی، شاہ عالم ثانی، عبدالغفار غفار جیسے معروف اور غیر معروف شعراء دوہے بھی کہتے رہے۔ ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ کے بعد اور ۱۹۴۷ء تک جن شعراء نے اردو میں دوہے لکھے ان میں احمد علی خان رونق، الف شاہ وارثی، شائق وارثی، اوگھٹ شاہ وارثی، نجم آفندی، مظفر خیر آبادی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

بایں ہمہ اردو ادب میں دوہے نے صنف سخن کی حیثیت سے اپنے لئے مستقل جگہ آزادیِ ہند کے بعد بنائی اور اس پر لطف حقیقت کا اعتراف بھی کرنا ہو گا کہ ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں دوہے نے زیادہ برگ و بار نکالے ہیں، جس کے اسباب پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد چونکہ ہندوستان کے اردو جاننے والے ہندی سے بھی جڑے رہے، اس لئے موجودہ جدت پسند دور میں اردو کے ہندوستانی شعراء کے لئے دوہا زیادہ پرکشش ثابت نہیں ہوا حالانکہ اکا دکا لکھنے والے یہاں بھی دوہا کہتے رہے۔ اس کے برعکس پاکستانی شعراء کی اکثریت ہندی سے نابلد تھی اس لئے وہاں دوہا اپنی تمام تر قدامت کے باوجود نسبتاً نئی صنف سخن سمجھا گیا اور متعدد تخلیق کاروں نے اسے لائقِ اعتنا سمجھا۔ چونکہ اسی دور میں اچھے اور اہم شاعروں کی قابل لحاظ تعداد دوہے لکھنے پر مائل ہوئی اور معیاری

جریدوں میں دوہے مسلسل شائع کئے جارہے ہیں اس لئے میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں دوہے کو نسبتاً نئی صنف سخن قرار دیا۔

اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں زبان و ادب کے معاملے میں جغرافیائی سرحدوں کا قائل نہیں ہوں اس کے باوجود دوہے کے سلسلے میں گفتگو کے دوران میں نے ہندوستان کے ہندوستانی اور پاکستانی شعراء کا الگ الگ ذکر کیا ہے جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی شعراء اردو میں دوہے کے لئے اس ہیئت کو مناسب و درست سمجھتے رہے جو قدیم ہندی میں رائج تھی۔لیکن اس دور کے پاکستانی شعراء نے دوہے کی ہیئت میں کچھ ترمیم و اضافے سے بھی کام لیا ہے۔اگر سخت گیر عروض داں کی نگاہ سے دیکھا جائے تو سرحد پار لکھے جانے والے بیشتر دوہے تکنیکی اور اصطلاحی معنوں میں دوہے نہیں کہے جاسکتے لیکن جیسا کہ میں نے گفتگو کے آغاز میں اشارہ کیا تھا اردو نے اپنے ابتدائی دور سے ہی تخلیق کاروں کو لسانی مزاج کی مطابقت سے اجتہادی رویہ اختیار کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اس لئے ہم مرثیے، سانیٹ اور ہائیکو کی طرح دوہے میں بھی مناسب ترمیم و اضافہ کرکے لچکیلی ہیئت اختیار کرسکتے ہیں چونکہ قیام پاکستان کے فوراً بعد سے جمیل الدین عالی نے وہاں ایک بدلی ہوئی ہیئت میں دوہا کہنے کا آغاز کیا اور ان کے بعد آنے والے تخلیق کاروں کی ایک بڑی نسل نے انہیں کا اتباع کیا ہے، اس لئے ان تخلیق کاروں کی روش پر انگشت نمائی کرنا میں مستحسن نہیں سمجھتا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر قدیم ہندی دوہے کی ہیئت بیان کردی جائے۔

قدیم ہندی دوہے کا ہر مصرع چوبیس ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ غزل کے مطلع کی طرح دوہے میں دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔مصرعے کا پہلا حصہ جس میں تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں "سم" اور دوسرا حصہ جس میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں "وسم" کہلاتا ہے۔ نیز ان دونوں حصوں کے درمیان لازماً وقفہ دینا ہوتا ہے۔اردو کے ہندوستانی شعراء نے عام طور پر اپنے دوہوں میں ان التزامات کی پابندی کی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ دوہے ملاحظہ فرمایئے :

سوامی مارہروی کہتے ہیں :

ماٹی کی اس کایا بھیتر بس میں کرکے پران
تم نے ہم کو منش بنایا، آپ بنے بھگوان

تصور گوالیاری کا دوہا ہے :

پورا دیش کٹمب ہے، بھائی سب کو جان
بھارت ماں کے پتر ہیں، سب جن ایک سمان

بیکل اتساہی نے بھی بہت سے دوہے قدیم ہندی دوہے کی طرز پر لکھے ہیں۔موصوف کے دو دوہے بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :

بکل جی کس فکر میں' بیٹھے ہو من مار
کاغذ کی اک اوٹ ہے' زنداں کی دیوار

نشتر چاہے پھول سے' برف سے مانگے خون
دھوپ کھلائے چاند کو' اندھے کا قانون

وقار واثقی کے دوہے بھی قابل سماعت ہیں کیونکہ ان میں ہم عصر زندگی کے نئے نئے پہلو جھلک مارتے ہیں :

گڈی نچہ کر گود میں' بات کرے تتلائے
دفتر کی ساری تھکن' اک پل میں مٹ جائے

کل تک میری چال میں' پڑ نہ سکا تھا جھول
منڈوے تلے میں بیٹھ کر' تج بکی بے مول

اور دو دوہے راقم الحروف کے بھی پیش خدمت ہیں :

ایک ہاتھ میں پھول ہے' ایک ہاتھ میں تیر
میرے دل پر نقش ہے' ساجن کی تصویر

جانے پھر کب رات ہو' کب یاد آئیں آپ
جی کہتا ہے اور کچھ' پڑے رہو چپ چاپ

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ ہندوستانی سرشار بلند شہری 'مرجاسی' بھگوان داس 'اعجاز میکش' اکبر آبادی' منزل لوہا ٹھری' کرشن موہن وغیرہ نے بھی دوہے کہے ہیں۔

پاکستان میں جو دوہا کہا جارہا ہے ہندی پنگل کے اعتبار سے اسے سرسی چھند کہا جاسکتا ہے۔ سرسی چھند میں بھی مطلعے کی طرح دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے پہلے حصے میں سولہ ماترائیں ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ گیارہ ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان وقفہ لازمی ہے جسے اصطلاح میں وشرام کہتے ہیں۔ دوہے میں سرسی چھند کے استعمال کی جدت یا بدعت کا آغاز جمیل الدین عالی سے ہوا۔ لیکن چونکہ پاکستانی دوہا نگاروں کی ایک بڑی نسل نے ان کی تقلید میں اس ہیئت کو اپنے دوہوں میں کامیابی کے ساتھ برتا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ پاکستانی دوہے میں سرسی چھند کے استعمال کو ایک ادبی اجتہاد کے طور پر قبول کرلیا جائے۔ دیکھئے' اس ہیئت میں سرحد پار کے تخلیق کاروں نے کیسی شگفتہ کاری اور ندرت کے مظاہرے کئے ہیں۔

جمیل الدین عالی :

آٹا اودل گانے والے پیادے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

بابو گیری کرتے ہوگئے' عالی کو دو سال
مرجھایا وہ پھول سا چہرہ' بھورے پڑگئے بال

اک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ
اے اندھیارو' سورج آیا' سورج آیا' جاؤ

پرتو روہیلہ کے دوہوں کا مجموعہ "رین اجیارا" کئی سال پہلے منظرِ عام پر آیا تھا۔ عالی کے بعد سب سے زیادہ دوہے انھی نے کہے ہیں :

جیون اک کنواں ہے جس میں گونجے بس سناٹے
دکھ کی ناگن اس میں لوٹے اس کی مٹی چاٹے

جیون ریل کا اندھا بابو' اندھیارے میں مارے
ٹھور ٹھکانا دیکھے ناہیں' رستے بیچ اتارے

توقیر چغتائی کے دو دوہے ملاحظہ ہوں :

تجھ سے پہلے من مندر میں' لوگ ہزاروں آئے
تیکھے نینوں والے تو نے' سب کے سب بسرائے

تن کا دیپک جلتا جائے' من بھیتر اندھیارا
تن دیپک' من باتی بن کے' بیتے جیون سارا

محمود علی ٹھاکر کے دو دوہے ملاحظہ فرمائیں :

دھنوتوں کے عیب چھپائے' نردھن کو بہلائے
دمڑی سے چھوٹا ہو کر بھی پیسہ ہی کہلائے

کنگوا اور پریتم سکھیو! ناہیں کسی کے یار
ایک جرا اکھیاں جھپکیں تو یار ندی کے پار

ادھر کچھ لوگوں نے عالباً لاعلمی کے تحت کچھ ایسی ہیئتیں بھی دوہے کے نام پر اختیار کرلی ہیں جن کا تعلق سرسری چھند سے بھی نہیں ہے اور یہ لوگ خود اپنی اختیار کردہ ہیئت کی پابندی اپنے ہی تمام دوہوں میں نہیں کرپاتے مثلاً رشید قیصرانیس کے یہ دو دوہے ملاحظہ ہوں :

بند کئے ہیں آخر ہم نے خواب کواڑ جو کھولے تھے
بے پر چاند چکور بنے تھے ہم بھی کتنے بھولے تھے

سوچ تھپیڑوں میں تن من کا ریزہ ریزہ صرف ہوا
تب جاکر وہ سوچ سمندر سمٹا اور اک حرف ہوا

اسی طرح حامد برگی نے بھی دوہوں کے لئے ایک خود ساختہ بحر منتخب کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کن چہروں نے کن چہروں کی یاد دلائی
روپ کی برکھا سندر سپنے لے کر آئی

اور :

سورج کا آکاش پہ پھیلا جال سنہرا
چاروں کھونٹ لگا ہے اجیارے کا پہرا

ان تخلیق کاروں کے علاوہ پاکستان میں تاج سعید، نگار صہبائی، ناصر شہزاد، عرفانہ عزیز، ظہیر فتح پوری وغیرہ نے دوہے کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

(ماہنامہ "ایوان اردو" اگست ۱۹۸۸ء دہلی)

ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کا بانکا اور سجیلا شاعر

(دوہوں کی روشنی میں)

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر جمیل الدین عالی پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ مشہور نواب خاندان میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی عملی زندگی کا آغاز دفتر کے ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ہوا۔ عمر کا بڑا حصہ محنت اور جفاکشی میں گزرا۔ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئے، یعنی آج کل وہ پاکستان بنکنگ کونسل میں پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ایڈوائزر ہیں۔ گویا ایک طرف آنے پائی کا حساب، جو سو فیصدی دماغی اور جسمانی محنت کا کام ہے، اور دوسری طرف دلوں کو چھوتے والے نرم و نازک اشعار اور دل کی گہرائیوں میں اترنے والے نشتروں کی تخلیق جس کے لئے مادی دنیا سے بے تعلق ہو کر دل کی دنیا میں گم ہونا پڑتا ہے۔ ان متضاد حالات سے بے شمار فنکاروں کو گزرنا پڑا ہے، لیکن وہ ''مشق سخن'' اور ''چکی کی مشقت'' دونوں میں ناکام رہے یا کم سے کم ایک میں ضرور ناکام رہے۔ عالی ان چند تخلیق کاروں میں ہیں جو دونوں میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہے۔ گویا وہ دیوانے بھی ہیں اور بہ کار خویش ہوشیار بھی ہیں۔

عالی کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر دلی کی اس فضاء میں ہوئی جس میں غالب کا احترام تو تھا لیکن سکہ داغ اور ان کے شاگردوں یعنی سائل دہلوی اور بیخود دہلوی کا چل رہا تھا اور جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی" یا "شمع میرے ہی جلانے کو تو ٹھنڈی کر دی" جیسی شاعری کو مقبولیت حاصل تھی۔ عالی کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی، اس لئے پورا امکان تھا کہ وہ بھی داغ اور ان کے شاگردوں کے اثر میں آ کر زبان کی شاعری کرنے لگتے باوجود کوشش کے مجھے کہیں

سے عالی کے سوانح نہیں مل سکے۔ "خاندان لوہارو کے شعراء" میں حمیدہ سلطان احمد نے صرف ان کے والد اور والدہ کا نام بتا کر شاعری پر تبصرہ کر دیا ہے۔ دوسرے عالی کے کلام کے دونوں مجموعوں "غزلیں' دوہے' گیت اور "لاحاصل" میں کلام اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ کون سا کلام کس زمانے میں کہا گیا۔ مجھے حقائق کے جاننے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں دلّی کے شاعر اور کافی حد تک نثر نگار زبان' محاوروں اور روزمرہ کے چکر میں رہے ان کی وجہ سے الفاظ اور محاورے تو خراد پر چڑھ کر سڈول اور خوبصورت ہو گئے' لیکن فکری سطح پر دلّی کی اردو شاعری ٹھٹھر کر رہ گئی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ عالی اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی یہاں کے ادبی اثرات سے کیوں کر محفوظ رہے۔ ان کے سوانح کلام کی تاریخ وار ترتیب کی عدم موجودگی میں اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عالی کی شاعری میں جو عصری زندگی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ نظر آتی ہے اور فکر میں جو پختگی ملتی ہے' وہ اس لئے ہے کہ شاعری میں عالی کا آئیڈیل غالب تھے۔ اس سلسلے میں عالی کے پہلے مجموعۂ کلام غزلیں' دوہے اور گیت پر دیباچہ کا آغاز حسن عسکری نے ان الفاظ میں کیا ہے :

> "وہ جو غالب بھی تھا اور معتقد میر بھی تھا۔" اس کے خاندان میں پیدا ہونے والے کا جمیل الدین عالی کے حق میں ایک برا نتیجہ نکلا۔ ان کے دل میں خواہ مخواہ یہ بات بیٹھ گئی کہ میں کچھ بھی کیوں نہ کرلوں' غالب نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ آدمی اسی وقت شاعری کرے' جب غالب بن سکنے کا امکان ہو۔ پہاڑ بھی ٹھیک اور اونٹ بھی ٹھیک۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اونچے۔"

مجھے حسن عسکری صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غالب کے خاندان میں پیدا ہونے کا عالی کے حق میں نتیجہ برا نہیں' اچھا نکلا۔ دلّی کے ادبی ماحول سے سینکڑوں میل دور ہوتے ہوئے بھی اقبال داغ کے اثر میں آگئے تھے' چوں کہ خدا کو منظور تھا کہ وہ اردو کے عظیم شاعر بنیں' اس لئے وہ بہت جلد داغ کے اثر سے باہر نکل آئے۔

عالی کی پرورش داغ کے شاگردوں کی محفلوں میں ہوئی اور وہ اس ماحول سے اس لئے متاثر نہیں ہوئے کہ وہ غالب بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں فکر کی روایت غالب ہی سے حاصل کی۔ وہ غالب تو نہیں بنے' لیکن غالب کے اثر نے ان کی شاعری کو نئی سمت' نئی تاب و توانائی' نیا حسن و رنگ' تازہ کاری' حسن کارانہ شعور اور فکر انگیزی سے ہمکنار کر دیا۔ عالی نے ادب کی دنیا میں نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کی تلاش غالب سے متاثر ہو کر ہی کی۔

غزل میں ان کا مذاق بہت پاکیزہ اور شستہ ہے غزل ان کے لئے محض حسن و عشق کی داستان بیان کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنی ذات کے اظہار' تخلیقی تجربے اور اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کی عکاسی کا بہت بڑا وسیلہ ہے۔ داغ اسکول کا ان پر یہ احسان ہے کہ انہیں زبان و بیان پر قدرت اسی اسکول کے اساتذہ کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ زبان پر جتنی قدرت عالی کو ہے ان کے معاصرین میں کسی اور شاعر کو نہیں۔ ہمارے ناقدین نے عالی کی شاعری کے اس پہلو پر سرسری تبصرہ تو کیا ہے' لیکن تفصیلی گفتگو نہیں کی' جو ضروری ہے۔ عالی کی غزل کا مصرع چست اور ہیرے کی طرح تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا انداز بیان غیر معمولی طور پر موثر اور دلنشیں ہے۔ عالی

کے گیت اور دوہے کی زبان پر آگے گفتگو ہوگی۔ عالی کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں ہندوستان اور وہ بھی ہندوستان کے شہر دلّی سے پاکستان کو ہجرت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس ہجرت نے انہیں وہ ذہنی کرب دیا' جو ترک وطن سے حاصل ہوتا ہے اور جو ایک موجِ تہ نشین کی طرح ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اس ہجرت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عالی کو دلّی کی گھٹی ہوئی ادبی فضاء سے نکل کر زیادہ وسیع اور کشادہ فضاء میں سانس لینے کا موقع ملا۔ اسی فضاء میں جہاں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے شاعروں اور ادیبوں نے ایک نئے ادبی ماحول کو جنم دیا۔ عالی کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کا تقسیم ہند سے قبل کا کلام کون سا ہے۔ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے تقسیم سے قبل اور بعد کے کلام میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ وطن عزیز سے ہجرت کے بعد ان کی غزل میں مضامین کا تنوع بہت زیادہ ہوگیا ہوگا' جوانی کے حسین خواب ٹوٹ کر زندگی کی سچائیوں میں بدل گئے ہوں گے۔

کئی نقادوں کا خیال ہے کہ عالی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اگر عالی دوہے اور گیت نہ کہتے تب بھی پاکستان کی اردو شاعری میں ان کا نام معتبر اور ممتاز ہوتا' بلکہ اگر پاکستان کے غزل گو شعراء کی مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو اس میں فیض' عالی اور ناصر کاظمی کے نام ہوں گے۔ ان تینوں نے اعلیٰ درجے کی شاعری ہی نہیں کی بلکہ شاعری کے میدان میں نئی راہوں اور نئی جہتوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان تینوں نے ترقی پسندوں کے ہاتھوں معیوب غزل کو وسیلۂ اظہار بنا کر اسے نئی زندگی دی۔ عالی نے اعلیٰ درجے کی غزلیں کہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عالی کا مزاج غزل سے زیادہ گیت اور دوہے سے ہم آہنگ ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان دونوں اصناف سخن میں غزل کے مقابلے میں زیادہ موسیقیت اور نغمگی ہوتی ہے اور عالی جس طرح مشاعروں میں جھوم جھوم کر ترنم سے دوہے پڑھتے ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں موسیقی کا خاصا علم ہے۔ خاندانِ لوہارو کے اہم فرد ہونے کی وجہ سے یہ عین ممکن ہے کہ دربارِ لوہارو میں موسیقاروں نے بالواسطہ طور پر ان کی ذہنی تربیت کی ہو۔ ممکن ہے کہ عالی نے تقسیم ہند سے قبل بھی گیت اور دوہے کہے ہوں' لیکن ان کے گیتوں اور دوہوں کو مقبولیت پاکستان ہی میں ملی۔

عالی دوہوں اور گیتوں کی طرف کیوں متوجہ ہوئے۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی ہے' جس کا بیان عالی کے بزرگ غالب ان الفاظ میں کرچکے تھے۔ "کچھ اور چاہیے وسعت میری زباں کے لئے۔" لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عالی کا تعلق لوہارو سے تھا۔ یہ علاقہ خاص کھڑی بولی کا ہے۔ یعنی وہ اردو جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہے اور جو الفاظ اس بولی میں شامل ہوگئے ہیں' انہوں نے اپنا روپ رنگ بدل لیا ہے۔ غضب' گجب اور ظلم' جولم بن گیا ہے۔ یعنی فارسی الفاظ نے خود کو کھڑی بولی کے مزاج کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ عالی نے باقاعدہ ہندی نہیں پڑھی اور اس کا امکان ہے کہ وہ دیوناگری رسم الخط سے بھی بالکل ناواقف ہوں اس لئے انہوں نے اپنی ریاست لوہارو ہی میں اس زبان پر قدرت حاصل کی۔ میرے پوچھنے پر ایک دفعہ عالی صاحب نے بتایا تھا کہ "انہیں مغربی یوپی کی نوٹنکی دیکھنے کا بہت شوق تھا ان نوٹنکیوں میں دوہے بہت پڑھے جاتے تھے' ان ہی سے مجھے ترغیب حاصل ہوئی"۔

عالی نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے کے لئے زبان و بیان کو سر کے بل کھڑا کرکے نہیں دکھایا۔ بلکہ غزل میں انہوں

نے کلاسیکی زبان اور روایتی اسلوب کو اپنے نئے لب و لہجے سے اپنے عہد سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے نئی نئی غلط سلط ترکیبیں وضع نہیں کیں بلکہ پرانے لفظ اور ترکیبوں کو نیا مفہوم دیا۔

جہاں تک دوہوں اور گیتوں کی زبان کا تعلق ہے' میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کھڑی بولی کے علاقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں اس بولی پر پوری قدرت حاصل تھی اور انہوں نے دوہوں اور گیتوں میں اس زبان کے رس' زبان معصوم اور پر خلوص لب و لہجے اور مٹھاس کا اس طرح استعمال کیا کہ مقبولیت عام کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ بقائے دوام کے مستحق قرار پائیں۔ جہاں تک عالی کے دوہوں کی زبان کا تعلق ہے' مجھے حیرت ہے کہ حسن عسکری جیسے نقاد نے یہ کیسے لکھا کہ :

"عالی نے ایک عقل مندی یہ کی ہے کہ تلسی داس یا کبیر کی زبان میں نہیں لکھا۔ اس پرانی زبان کے پھیر میں پڑ کر بعض دفعہ آدمی تلسی داس یا کبیر کے خیالات و جذبات اپنے اوپر اس طرح حاوی کر لیتا ہے کہ شاعرانہ خلوص میں کمی آجاتی ہے اور دوہے نویسی محض ایک ادبی مشق بن کے رہ جاتی ہے۔عالی نے اپنے دوہوں کے لئے مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے جس کی وجہ سے ان کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہو گئی ہے۔"

چھنن چھنن خود باجے مجیرا آپ مرلیا گائے
ہائے یہ کیا سنگیت ہے جو بن گائک ابھرا آئے
ایک ہی دھن یوں تھرائی ہے' سوتے دکھ گئے جاگ
ایک ہی لے یوں لہرائی ہے' جیسے ناچیں ناگ
دھندلی دھندلی سُر کے پیچھے کرنوں کی جھنکار
اتھلا جل اور گہری کائی' ناچیں ہار سنگار
ایک ایک تال کھرج لے من کو اک اک سر پر پیاس
اک اک مُرکی بدن جلائے' جیسے آگ پہ گھاس
گت میں چندن باس کا جھونکا' توڑ میں کندن روپ
نیچے سُر میں چھاؤں بھری ہے' اونچے سُر میں دھوپ
سات سروں کے سات ستارے' سات ہی جن کے رنگ
سب جھلکیں اک سرگم میں' پر اپنے اپنے ڈھنگ

میں نے یہ دوہے یہ بتانے کے لئے نقل کئے ہیں کہ ان کی زبان کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اس میں دس پانچ الفاظ ہندی کے ملا دیے گئے ہیں' عالی کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے۔ عالی کا وطن دلّی نہیں لوہارو کھڑی بولی کا خاص علاقہ ہے یہاں کی زبان پر فارسی' عربی یا دوسری زبانوں کے اثرات بہت کم مرتب ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کھڑی بولی میں جب

دوسری زبان کے الفاظ ملے اور اس نے اردو زبان کی شکل اختیار کی تو وہ ایک ایسی زبان بن گئی جو کھڑی بولی کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور خوب صورت بن گئی اور جس میں اظہار کے امکانات زیادہ وسیع ہو گئے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کھڑی بولی اپنی اصل شکل میں ایک ایسا رس رچاؤ' سُریلا پن اور موسیقت رکھتی ہے جس میں کہے ہوئے شعر دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔ حالی نے غالباً لوہارو میں رہ کر اس زبان پر قدرت حاصل کی اور اپنی کوششوں بلکہ ریاضت سے اس زبان میں ایک منفرد لہجہ بنایا۔ اس لہجے کی تشکیل میں مٹھاس' نرمی' معصومیت' خلوص اور انسانیت دوستی جیسے عناصر کارفرما ہیں۔ یہ چند دوہے ملاحظہ ہوں :

ڈھونڈھ لو میری ناری کو' ہے اس کی اک پہچان
چنچل لو تو چنچل ہے اور پوجو تو بھگوان

....

موتی کوٹ کے مانگ بھروں' چندن سے دھوؤں تیرے بال
ہائے یہ سندر انگ انوکھا' ہائے یہ تیری چال

....

پیار کروں تو بات کٹے اور بات میں جائے پیار
ہائے نری باوری ابلا ہوتے' تیرے ہونٹ ہزار

....

ٹھنڈی چاندنی اجلا بستر' بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے' پر وہ نہیں جن کو ترس گئے میرے نین

....

ٹل ٹل کر اب تو دیکھی جائے نہ ان کی بات
چل رے حالی دوار کے باہر ڈالیں اپنی کھاٹ

....

نیند کو روکنا مشکل تھا پر جاگ کے کاٹی رات
سوتے میں آ جائے وہ تو نیچی ہوتی بات

....

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری ناری کو دیکھ آئے

....

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

....

آپ بنا بنجارہ میں اور آپ بنائی باٹ
سچ کہیو رے دیکھنے والے ایسے کس کے ٹھاٹ

یہ تو وہ دوہے تھے جن میں فارسی، عربی کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا اب ایسے کچھ دوہے ملاحظہ کیجئے جس میں فارسی کے بھی ایک دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن یہ الفاظ نگینے کی طرح جڑے گئے ہیں۔ اب یہ دوہے ملاحظہ کیجئے :

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان
چڑھی ندی اور اتر گئی پر گھر ہوگئے ویران

....

چھوٹے بڑوں کے سنگم کا سب دیکھ لیا انجام
پاٹ بڑھایا جمنا نے پر ہے گنگا کا نام

...

کون ہے جس کی یاد سے ہی مری نس نس میں ہے آگ
کون ہے جس کے دھیان سے ہی ہر پون جھکورا راگ

....

کون ہے جس کی آنکھ کا موتی میری آنکھ میں اوس
کون ہے جس کی خوشبو میرے ساتھ ہزاروں کوس

....

جاڑا آیا ٹھنڈی ہوائیں من سب کے بھائیں
کتنے درد کی بات ہے گوری ہم تجھے یاد نہ آئیں

ان دوہوں میں فارسی کے ایک دو ہی لفظ استعمال ہوئے ہیں اب ایک ایسا دوہا ملاحظہ کیجئے جس میں پانچ لفظ فارسی کے ہیں اس کے باوجود دوہے میں کھڑی بولی کی پوری مہک ہے :

نا مرے سر کوئی طرہ کلغی نا کیسے میں چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری سانوری اور اللہ کا نام

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ دوہے عوام کی شاعری ہے اور اس میں زندگی کی بنیادی سچائیاں اور اخلاقی تعلیم، زندگی کے عرفان کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کی جاتی ہے۔ عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے تو بہت معصوم اور

پرخلوص لب و لہجے کے ساتھ۔ عالی نے اردو اور ہندی کے کلاسیکی دوہا نگاروں کی طرح دوہوں کو اخلاقی تعلیم کے لئے استعمال نہیں کیا ان کے دوہوں میں ایک صحت مند توانا محبت کرنے والا جنس کے قدرتی تقاضوں سے مجبور نوجوان نظر آتا ہے اب اس روشنی میں یہ دوہے ملاحظہ کیجئے :

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

. . . .

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

. . . .

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اتار

. . . .

یہ گدرایا بدن ترا یہ جوبن رس یہ چال
اری مرالن ہم پر دیسی سن تو ہمارا حال

. . . .

گھاٹن یوں ججمان سمجھ کر ہم سے نا کترائے
پیا کے جو من بھائے باوری وہی رانی کہلائے

. . . .

دو اندھیاروں میں کل عالی بن گئی اپنی بات
ایک طرف تھی دکھی ابلا ایک طرف تھی رات

عالی نے ایک طرف تو اردو دوہوں کا احیاء کیا اور دوسرے اس میں نئے نئے تجربات کئے۔ اصلی زندگی کے مسائل کے اظہار کے لئے دوہا استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ عالی نے مسلسل دوہے کہے ہیں یعنی مسلسل غزل کی طرح ایک مفہوم کو کئی اشعار میں بیان کیا ہے۔ یہ جدت ضرور ہے اور اس سے اظہار کو وسعت بھی ملتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے دوہے کی تاثیر اور کاٹ میں بہت فرق آجاتا ہے۔ غزل کے ایک اچھے شعر کی طرح ایک اچھا دوہا بھی ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرکے ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے لیکن مسلسل دوہا اس خوبی سے محروم ہو جاتا ہے۔ انہیں دوہا کہنے کے بجائے اگر نظم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مسلسل بیان کی وجہ سے دوہے میں تاثیر بھی نہیں رہ پاتی اس طرح کے چھ مسلسل دوہے ملاحظہ ہوں :

سنو سنو یہ بالک میرا یوں ہی ناچلّائے
کھوے ہے اس بندی گھر میں کا ہے مجھے لے آئے
آتما جیسی بانکی تتلی جب بن جائے شریر
اور نہ جانے اب جیون کی کیا کیا ہو تاثیر
اے بالک' اس چکّر کو پرماتما خود بھی روئے
جیون کی تو ذات ہی کالی' کون سیاہی دھوئے
اے بالک' تو جگ جگ جیوے' رکھیو یاد یہ بول
جیون کے اندھیارے میں ہے دکھ ہی سکھ کا مول
اے بالک' اس جگ میں رکھیو آندھی جیسے ٹھاٹ
نیچے پودے اونچے کیجو' اونچے دیجو کاٹ
اے بالک' سب دھوکا ہے وہ نیائے ہویا انیائے
پر وہ دھوکا کبھی نہ دیجو جو تو آپ نہ کھائے

عالی کے دوہے محض رومانی نہیں ہیں' بلکہ ان میں موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ان کے مضامین میں غیر معمولی تنوع ہے۔ ان دوہوں میں ایک خلاّق ' طبع رسا' باشعور ذہن کے غیر معمولی تخلیقی تجربوں کا اظہار ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان دوہوں میں شاعر کا لب و لہجہ عالم' مفکر یا دانشور کا نہیں بلکہ ایک عام انسان کا ہے۔ ایک ایسا عام انسان جسے ورثے میں برصغیر کے صوفی سنتوں کی عظمت ملی ہے۔ان دوہوں کا خالق ایک سیدھا سادا' عام انسان ہے' عوام سے بلند ہوتے ہوئے بھی عوام کے ساتھ ہے۔

کتاب:"جمیل الدین عالی' فن اور شخصیت"
مرتبہ:ایم حبیب خان
علمی مجلس دلی سنہ ۸۸

حضرت جگر مراد آبادی اور جمیل الدین عالی
۱۹۵۴ء کراچی

فیض احمد فیض کے ساتھ کراچی۔ (۱۹۶۰ء)

بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق اور جمیل الدین عالی

اینگلو عربک (دہلی) کالج کے تین طلبائے قدیم "دہلی ۱۹۸۳ء)
دائیں سے بائیں اختر الایمان۔ علی سردار جعفری۔ جمیل الدین عالی

قراۃ العین حیدر اور جمیل الدین عالی
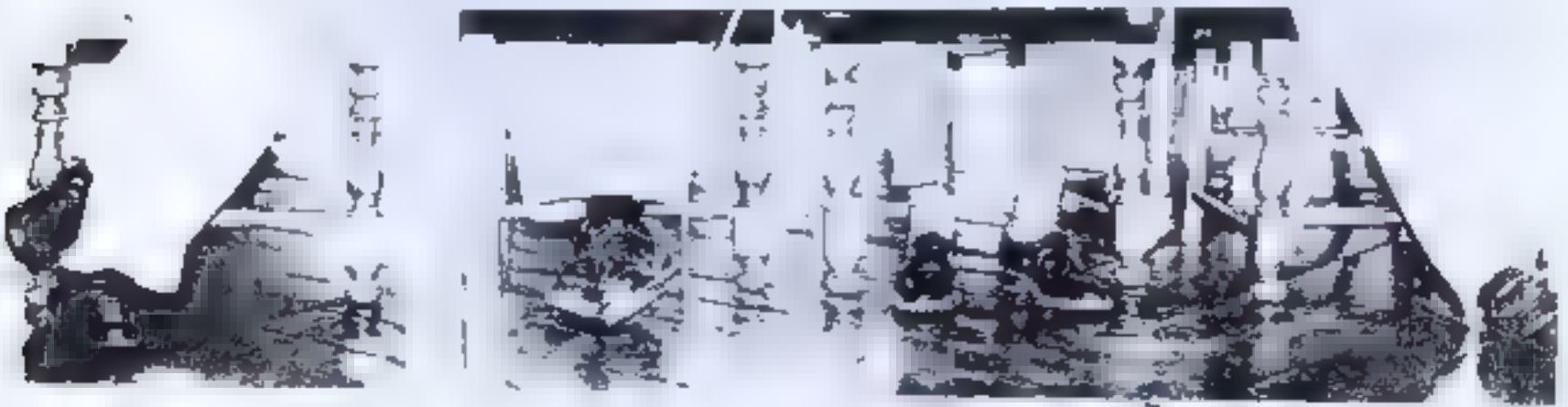
افتخار احمد عدنی، احمد ندیم قاسمی، رالف رسل، اور جمیل الدین عالی
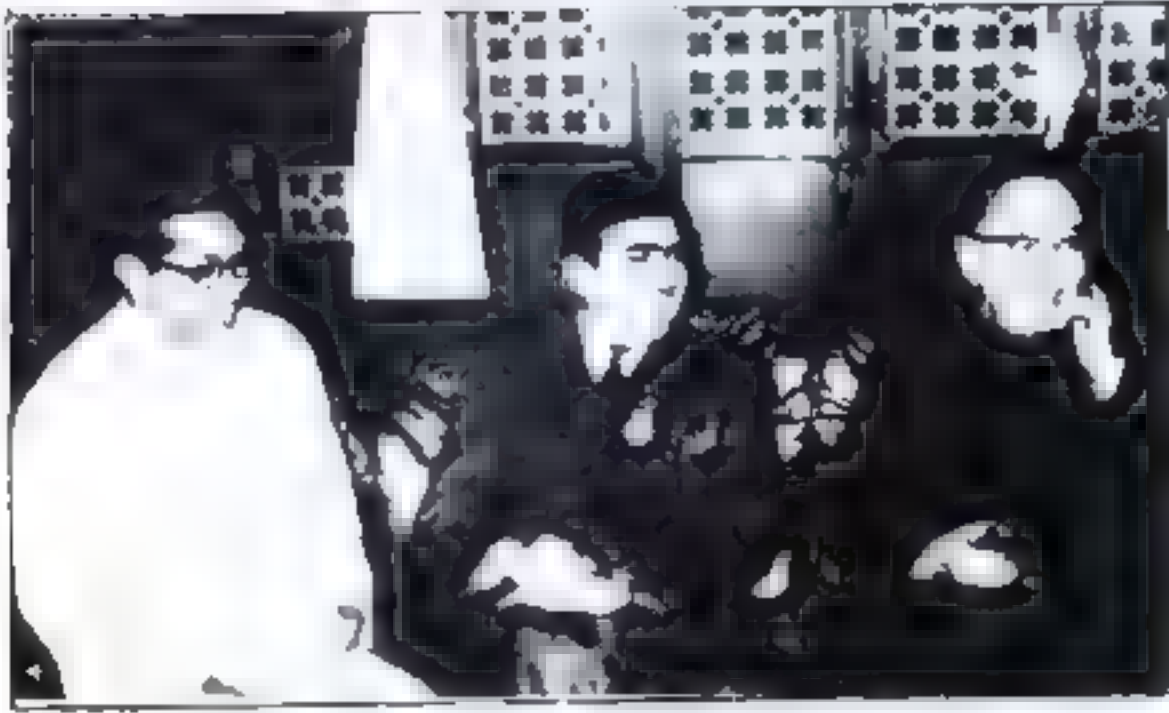
دائیں سے عوامی جمہوریہ چین کے عظیم شاعر اور ادیب تنگ کے دست راست اور چینی ادیبوں کی یونین کے صدر آن جانی کو مورو

جمیل الدین عالی (اس وقت سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ) آر۔ڈی سینا نائک سکریٹری جنرل افرو ایشین رائٹرز یونین مرز لولمبو۔ اس وقت دفتر بیجنگ

دائیں سے بائیں مارشل چن ژی۔ چینی وزیر خارجہ اور شاعر۔ جمیل الدین عالی (بہ حیثیت قائم مقام سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ)

لن۔ یو آن۔ چینی ادیب (ایشیائی ادیبوں کی انجمن میں چینی منتظم مندوب) بیجنگ ۱۹۶۶ء

عکسِ تحریر

چند خطوط، مشاہیر

پیغامات و دستاویزات

عکس تحریر
چند مشاہیر کے خطوط
پیغامات و دستاویزات

جنرل محمد ضیاء الحق (عتاب نامہ)	صدر مملکت
غلام اسحاق خان	صدر مملکت
ملک معراج خالد	وزیر اعظم پاکستان
مادام الوا مرڈال	(نوبل انعام یافتہ)
پروفیسر گنار مرڈال	(نوبل انعام یافتہ)
ڈاکٹر ہنری کے سنجر (وزیر خارجہ امریکہ)	نوبل انعام یافتہ
لیوٹنڈے مان	وزیر اعظم بیلجیم
ڈاکٹر محبوب الحق	عالمی شہرت کے ماہر معاشیات اور جنوبی ایشیائی انسانی ترقی کے صدر نشین
ڈاکٹر اے۔ کیو۔ خان ہلال امتیاز۔ نشان امتیاز	کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری
ڈاکٹر عبدالسلام	(نوبل انعام یافتہ)
ڈاکٹر عشرت عثمانی (مرحوم) ستارہ امتیاز	صدر نشین اٹامک انرجی کمیشن

ڈاکٹر سید عبد اللہ

ڈاکٹر مالک رام

فیض احمد فیض

قدرت اللہ شہاب

پروفیسر رالف رسل

اختر الایمان

قرۃ العین حیدر

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ہنری طرا (ترجمہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

.. of 1985

THE PRESIDENT

GOVERNMENT SERVANTS AS COLUMNISTS

Enclosed copy of my DO letter to the Governor Punjab on the subject refers

1. So far only two Federal Government employees, who are contributing newspaper columns, have come to my notice. They are Dr Safdar Mahmood, Chairman Central Board Film Censors, Islamabad, and Mr Jamiluddin Aali, National Bank of Pakistan, Karachi

2. I would like appropriate action to be initiated, and these two officers and others, falling in this category, advised to abide by the relevant provision on the subject under the Government Servants (Conduct) Rules.

Establishment Secretary

No 57/1/CMLA of 31 August 1985

General
(M Zia-ul Haq)

یہ حکمنامہ دونوں کو اسی طرح ملا۔ غالبا" پہلا پیراگراف پروفیسر وارث میر مرحوم استاد جامعہ پنجاب سے متعلق تھا جنکی شکایت بمینہ طور پر گورنر پنجاب نے کی ہوگی (وہ راست (direct) اور بعض اوقات تحت سیاسی کالم لکھتے تھے) میں نے لکھا نہیں چھوڑا جواب دیا کہ مجھے بتایا جائے میں نے کن ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے۔ ساتھ ہی اپنے کالم کو اظہاریے کا نام دیدیا۔ اپنی وضاحت میں نے بذریعہ وزیر اعظم (جناب محمد خان جونیجو مرحوم) بھیجی۔ ان سے ملا بھی انکے ایما پر وقت کے اسٹیبلشمنٹ سکریٹری جناب حسن ظہیر نے فائل روکے رکھی یہاں تک کہ مارشل لا اٹھا لیا گیا۔(عالی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان

اسلامی جمہوریہ پاکستان

غلام اسحاق خان

اسلام آباد

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ

۲۱ جنوری ۱۹۸۹ء

مکرمی جمیل الدین عالی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی تازہ ترین تصنیف "حرفے چند" آپ کے پُرخلوص جذبات کے ساتھ موصول ہوئی۔ شکریہ!

آپ کی شعر و شاعری سے تو میں کئی برس سے مستفید ہوا ہوں۔ آپ کے ایک اعلیٰ پائے کے نثر نگار ہونے کا بھی آپ کے اخباری کالم کی وساطت سے مجھے کچھ علم تھا۔ لیکن آپ کی اس قدر جامع مقدمہ نویسی سے واقف نہ تھا۔

میں نے "حرفے چند" کے چند حروف و مندرجات ایک نظر دیکھے ہیں۔ میرے خیال میں اُردو ادب کی متعلقہ موضوعات کی تصانیف میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ "یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر"۔ آپ کو نثر کے میدان میں اور بہت کچھ کرنا ہے۔

گمان مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور انجمن ترقی اُردو پاکستان کی وساطت سے اردو ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بے شک اردو کی خدمت پاکستان کی خدمت ہے اور آپ پاکستان کے قابلِ فخر خدمت گاروں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین!

دعاگو

غلام اسحاق خان

جمیل الدین عالی

انجمن ترقی اردو پاکستان

۱۱ سی اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

PRIME MINISTER

جمیل الدین عالی کی خدمات کے ضمن میں وزیر اعظم کا پیغام

جمیل الدین عالی ہمارے عہد کی ایک نامور قومی شخصیت ہیں جنہوں نے ثقافتی، علمی و ادبی اور صحافتی شعبے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

میں ہمیشہ سے عالی صاحب کی شاعری کا مداح رہا ہوں۔ "غزلیں" "دوہے" "گیت" "لا حاصل" اور "اے مرے دشت" شاعری کے خوبصورت مجموعے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، گیت اور دوہے سب اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دوہے کہنے اور پڑھنے کا جو انداز عالی نے متعارف کرایا ہے وہ اہل ذوق میں ہمیشہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ "جیوے جیوے پاکستان" ان کی ملی اور قومی شاعری کا مجموعہ ہے۔ میرے خیال میں بہت کم شعرا نے اتنے تواتر اور تسلسل کے ساتھ قومی زندگی کے حوالے سے اتنے خوبصورت گیت لکھے ہوں گے۔ ان کے نغمے "جیوے جیوے پاکستان" "ہم مصطفوی ہیں" "اے ماؤں بہنو بیٹیو" "میرے نغمے تمہارے ... " ... کے لیے لکھے ہیں، قومی تاریخ میں قومی شاعروں کی روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ان کا کالم "... خانے میں" اچھی معلومات اور مسائل کا عمیق تجزیہ پیش کرتا ہے۔ عالی نے سفرنامہ میں بھی اپنے طرز کا اختصاص قائم رکھا ہے۔ جمیل الدین عالی نظم اور نثر کی کسی صنف میں بھی لکھیں ان کی پاکستانیت ایک ایک حرف میں نظر آتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

تحریک پاکستان میں اہل قلم نے جس طور رہنمائی فرمائی وہ اسلامیان عالم کے لئے بالعموم اور مسلمانان برصغیر کے لئے خاص طور باعث افتخار رہا ہے۔ مجھے یقین ہے آج کے مشکل زمانے میں بھی صاحبان قلم پاکستانی عوام کے تمام طبقوں کے حقوق کی بحالی جمہوری اداروں کے استحکام کے لئے اور قومی تشخص کو ابھارنے اور قومی حمیت کے بیدار کرنے میں اپنی ذمہ داری پوری کریں گے۔

میں پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کے منتظمین اور رفقائے کار کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے جمیل الدین عالی جیسی شخصیت کی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی ارمغان کا اہتمام کیا ہے۔

(دستخط)

Jamiluddin Aali
With great regard
from the author
Alva Myrdal

THE GAME OF
disarmament

Again a very good discussion
and with high appreciation
Stockholm 12 December 1978

نوبل انعام یافتہ مادام الوامرڈال کی تحریر ان کی کتاب پر

نوبل انعام یافتہ مصنف ڈاکٹر الوا مرڈال کے ساتھ اسٹاک ہوم (۱۹۷۸ء)

For Jamiluddin Aali
Executive Vice President
National Bank of Pakistan
In appreciation and understanding.
Gunnar Myrdal

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر گنار مرڈال کی تحریر "ایشین ڈرامہ" کی تلخیص کے پہلے سادہ صفحے پر (اسٹاک ہوم۔ دسمبر ۱۹۷۸)

اسٹاک ہوم (سویڈن) نوبل انعام یافتہ مصنف "ایشین ڈرامہ" ڈاکٹر گنار مرڈال پیچھے جمیل الدین عالی

HARVARD UNIVERSITY
INTERNATIONAL SEMINAR

HARVARD SUMMER SCHOOL

6 DIVINITY AVENUE
CAMBRIDGE
MASSACHUSETTS 02138

HENRY A. KISSINGER
Executive Director

November 1, 1967

Mr. Jamiluddin Aali
Pakistan Writers' Guild
16/B, Sindhi Muslim
Housing Society
Karachi-3, Pakistan

My dear Mr. Aali:

We are now planning for the 1968 International Seminar and once again I would appreciate hearing any recommendations you have to make. Your candidate, Mr. Ibnul Hasan, was an outstanding participant who made an excellent contribution to the success of the Seminar.

As in the past I have written to the Ministry of Education to ask their help in selecting candidates and I would be most grateful if you could keep an eye on the reviewing of applications.

Thank you again for your kind assistance and for recommending Mr. Hasan. I look forward to hearing from you about the 1968 session.

With warm regards.

Sincerely yours,

Henry A. Kissinger

S.G.
/14"

ہارورڈ انٹرنیشنل سیمینار ۱۹۶۲ء (فہرست اسما کھوئی ہوئی ہے عالی صاحب کی یادداشت کے مطابق دائیں ہاتھ سے) پہلی صف۔ نیمسو علی ون (ملایا میں۔ امتیازی صحافی پریذیڈنٹ میلا ناکرز۔ قیدی۔ آزاد صحافی) ایس۔ سہائے (بعد میں چیف ایڈیٹر) ۔ اسٹیٹسمین۔ دہلی کلکتہ ڈاکٹر ہنری کسنجر (بعد میں امریکی وزیر خارجہ اور نوبل انعام یافتہ) مس داوے (مسز اندرا گاندھی کی سیاسی سکریٹری) صدر سوکارنو کی ایک سیاسی مشیرہ ' انکے بعد ایک اطالوی سیاستداں ' بھر جمیل الدین عالی ' فیلا کارپوریشن کے صدر ' مصر کے پروفیسر یدادی ' آخری صف سے پہلے کی صف میں بائیں ہاتھ کو پہلے ہیں لیونڈے مَن جو بعد میں وزیر اعظم بیلجیم اور ہیلسنکی معاہدے کی تحرک اعظم بنے۔ پھر بعد عینک لگائے ہوئے پروفیسر ارہارڈ ایپلر جو بعد میں چھ برس تک مغربی جرمنی کے وزیر معیشت رہے۔ آخری صف میں بائیں ہاتھ سے دوسرے ایاں میک آرتھر برطانی ممبر پارلیمنٹ ' عالی ' لیونڈے مان اور ایان میک آرتھر ایک ہی کمرے میں رکھے گئے تھے۔

وائٹ ہاؤس واشنگٹن ڈی سی صدر جان ایف کینیڈی سے ہارورڈ سیمینار (۱۹۶۲) کے چند مندوبین کی ملاقات' (۱۹۶۲)

7th May, 1979.

Ref.: PS/XI/

Dear Mr. Aali,

I have duly received your letter of April 4, 1979 and I was very pleased to hear from you again.

I am sorry to hear that you have been in ill-health but I hope that this will take a turn for the better soon.

I shall be delighted to receive Mr. Vaseem Jafry but up to now I have not heard from him.

In my wife's name I already insist on thanking you for the folk dress and the teacosy.

On your visit to Belgium in May-June I will be glad to meet you. To this end you can contact Mrs. Demaseure (tel. 219.10.70), who will tell you when and where I can receive you.

Yours faithfully,

Leo TINDEMANS
President

Mr. Jamiluddin Aali
35 - S 11th East Street
Defence Housing Society
KARACHI

nationaal secretariaat
tweekerkenstraat 41 / 1040 brussel / tel 219 10 70

جناب ٹنڈمان بوقت تحریر بیلجیم کے وزیراعظم تھے۔(انہوں نے یورپین پارلیمنٹ کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے)
آپ ہارورڈ انٹرنیشنل سیمینار (1962) میں عالی صاحب کے ہم کمرہ room mate تھے۔ناشرین

ڈاکٹر محبوب الحق کا عکس تحریر

(انکی مولفہ یو-این-ڈی-پی مطبوعات پر)

To

Jameeluddin Aali

whose sincerity and friendship I have prized most of all.

with great admiration,

Mahbub
1991

To

Jameeluddin Aali

whose deep patriotism has been a source of inspiration and courage.

with great affection,

Mahbub
1992

To

Jameel

who has shared so many of our intellectual comrades and journeys together.

with warmest personal regards,

Mahbub
11.6.94.

To

Jamiluddin Aali

with great admiration for his deep commitment & his cause of human development and with warmest personal regards,

Mahbub
21.7.93.

To

Jamil

with deep appreciation for his steadfast support for human development issues and with heartfelt thanks for his gift of friendship,

Mahbub
4.8.96.

ڈاکٹر محبوب الحق کا خط

New York

30 June 1998

Dear Aali Bhai

It was lovely to get your very thoughtful and gracious letter. I have taken on this national challenge as I am convinced that there is no greater contribution we can make to the nation at this stage than to educate it and to prepare it for the 21st century. What is more, with your help, Inshallah, I intend to accomplish the task in less than 5 years.

Hope you have been invited to our first meeting of the Iqra National Task Force on 15th July on my behalf by Chairman PMLC and that you will join us. I am already mobilising major financial support for the programme from here — from World Bank, expatriate community, UN system and others.

As soon as I return on 6th July, I would love to get together with you to seek your guidance and help.

Yours sincerely,

Mahbub

Mr Jamiluddin Aali,

(Chairman, Senate Committee on Education)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Tel. 843397

DR. A. Q. KHAN RESEARCH LABORATORIES, KAHUTA
P.O. BOX 502, RAWALPINDI (PAKISTAN)

Date 11.5.1987

محترمی و مکرمی عالی صاحب، السلام علیکم۔

آپ کے ۱۹ اپریل کے گرامی نامہ کا بے حد شکر گزار ہوں، جواب دینے کا فوراً ارادہ تھا مگر جب یہ علم ہوا کہ آپ چند دنوں کے لئے سعودی عرب تشریف لے جا رہے ہیں تو پھر سوچا کہ چند دن بعد ہی جواب تحریر کروں تاکہ آپ کی آمد پر فوراً مل جائے، اندازہ یہی ہے کہ اب تک آپ یقیناً واپس تشریف لے آئے ہوں گے۔

یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ اسلام آباد تشریف لائے اور رابطہ قائم نہ کیا۔ مجھے یقیناً بہت خوشی ہوتی۔ آپ نے دنیا دیکھی ہے یہاں زبانی جمع خرچ کرنے والے بہت سے "ہمدرد" مل جاتے ہیں (جس کا علم ابھی حدیبیہ والے واقعہ سے ہو گیا) پرخلوص اور ہمدرد لوگوں کی کمی مارے ڈالتی ہے۔ اپنے وطن اور ملک میں رہ کر اور اس قدر اہم کام سر انجام دے کر بھی غیروں میں رہنے اور ان سے واسطہ کا گمان رہتا ہے۔ صوبہ پرستی، فرقہ پرستی، برادری، رشوت ہر جگہ اپنی مکروہ شکل دکھاتی ہے اور اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہ تمام کوشش، یہ تمام مصائب واقعی اٹھانے کے قابل تھے۔ صرف آپ جیسے پرخلوص، مہربان لوگوں اور عام سیدھے سادے محب وطن لوگوں کے جذبات، دعاؤں کی وجہ سے دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ جو کچھ مشقت، مصائب اٹھائے ہیں شاید وہ بیکار نہیں گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس سے بیشتر تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کے قتل عام نے دل پر جو اثرات چھوڑے تھے محض ان کی وجہ سے یورپ کے تمام آرام و آسائش چھوڑ کر واپس آیا تھا کہ اب اگر کچھ نہ کیا تو جو کچھ بچا کھچا ملک رہ گیا ہے وہ بھی ہندو کی گود میں چلا جائے گا۔ آپ نے ہر جگہ حالات و حوصلہ (بے حوصلگی لکھنی تو شرم ہے) اس قدر کی دیکھی تھی وہ ایک غریب الوطن انسان کی ہمت توڑ دیتی۔ لیکن خدا نے تمام حالات تبدیل کر دیے ہیں اور اب ہم بفضل خدا سر اونچا کر کے سینہ تان کے چل سکتے ہیں

آپ کی نصیحت گرہ میں باندھ لی ہے نہ ہی کسی سوشل فنکشن میں حصہ لے
رہا ہوں اور نہ ہی کسی شادی تقریبوں یا جنازوں میں شرکت کرنے کا ارادہ ہے
جو کچھ سنتا ہوں ان سے سلام دعا ہو جاتی ہے۔ آپ نے ٹھیک، آپ وطن میں
رہ کر ہی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے۔ نہ باہر جا سکتے ہیں نہ بات کر سکتے ہیں اور نہ ہی
مل جل سکتے ہیں۔ بہرحال ملک کی خاطر یہ چھوٹی قربانی دینا بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں
آکر آپ کے تجربے میں محسوس کرتا ہوں جس طرح چاروں طرف بھیانک ہولناک
سمندر ہے جو ہر طرح کے بے ایمان، غدار لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ
مالک ہے۔ یہ سب سے بڑے دشمن یہی خود ساختہ ڈاکٹر صاحبان ہیں جن کی تعلیمی
اور فنی صلاحیتیں کبھی نہ تو شبہ نے یاد کیں نہ کبھی قابل ہیں ہاں البتہ ہر ان دوستی، رشتہ داری
اور دوسرے مقاصد ان کو کافی اہمیت دیتے ہوئے ہیں۔

پرسوں صاحبزادہ یعقوب خان وزیر خارجہ سے ملاقات ہوئی اور جب آپ کا ذکر
سامنے کیا تو انہوں نے بتلایا کہ آپ سے ان کی عزیز داری ہے بہت تعریف کر رہے تھے۔

یہ یقیناً محنت، مشقت کا صلہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ آپ نے جس طرح کا
فرمایا ہے شناخت بڑی چیز ہے، میں اپنے نام میں تین رشتے ملاتا ہوں اور اس سے جو دل اور
ذہنی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ اپنے کو اگر لکھا جاؤں تو اس صفحہ
کی جگہ کافی پر ختم ہو جائے گی۔ قلم جو دو تین حرف پر لکھے نام ہمارا۔ میری تنخواہ کی
کی انتہا اور ابتدا کہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔

آپ اسلام آباد تشریف لائیں تو ضرور مطلع کیجئے تا کہ میں کراچی آیا تو انشاء اللہ
ضرور ملاقات کروں گا۔ ۸۴ سال صحت والدہ بہن بھائی وہاں ہیں خیریت سے ہیں ان سے
ملنے جلنے کے لیے ضرور آتا جاتا ہوں۔ فقط۔

والسلام۔ آپ کا خیراندیش۔
ڈاکٹر عبدالقدیر خان

جمیل الدین عالی کے ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر

عالمی نوبل انعام یافتہ سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ (ٹریسٹ اٹلی ۱۹۹۱ء)

I enclose a copy of the lett. to Heads of State and also a copy of the letter of Prime Minister G. Andreotti which expresses his commitment to the Centre

I am glad that you are working towards the looking after of your kind mother. I am happy you are able to do so because a mother and father's connection with children is something unique and no amount of help can compensate for the debt we owe to them. I lost my mother two years before the award of the Noble Prize, and my father had died ten years before so neither of them was able to see the end of their prayers. Kindly do give your mother my regards.

With my best wishes

Yours sincerely,

Muhammad Abdus Salam

Enc.

Mr. Jamiluddin Aali
35/S 11th East Street
Defence Housing Society
Karachi
Pakistan

Dr. I. H. Usmani

33 Eaton Square,
Apt. 3d
Belgravia,
London. S.W.1

✓

۲۷ جون ۔ 1986

ڈیر جمیل ۔ السلام علیکم ۔ پچھلے دنوں Herald کے کسی
نمبر میں بس تمہاری جھلک ہی دیکھ پایا ۔ بات چیت پوری نہ ہو سکی ۔ اور نہ
گلا شکوہ کر سکا ۔ بس دماغ کی کھڑکی کھلی تو جگر کا یہ مصرع سامنے آ گیا کہ :

"وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی"

یعنی یہ تو مانا کہ تم بڑی مانی ہوئی ناز ہستی ہو اور اردو زبان کے بڑے ماہر بھی ہو
بلکہ ایک اردو کے بہت بڑے اخبار کے کالم نویس بھی ہو ۔ مگر میاں تم نے کبھی
لگتا ہے کہ بٹلر سے بھی نہیں پوچھا کہ بڈھا مر گیا یا زندہ ہے + شرافت مانع ہے کہ شکایت
تم سے کچھ پرانے تعلقات کی بنا پر کر رہا ہوں ۔ جی چاہتا تھا کہ تم سے کچھ سنوں اور کچھ
سناؤں مگر افسوس کہ تم پا بہ رکاب تھے اور کچھ ضرورت سے زیادہ ڈرے اور
گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے ۔ اپنی صحت کا خیال کرو اور کچھ کھانا پینا شروع کرو ۔ دیکھو مجھے تمہارا
جمیل نشتر مل گیا ۔ ہمارے پاس گنتی کے تو آدمی رہ گئے ہیں اور وہ بھی

ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی کئی برس (صدر پاکستان اٹامک انرجی کمیشن رہے تھے)

ڈاکٹر سید عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ

(پرنسپل، اورینٹل کالج، لاہور)

Malik Ram

C-504, Defence Colony
New Delhi-110024

۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء

صاحبِ مکرم آداب

۹ مارچ کے گرامی نامے کا شکریہ قبول فرمائیے
آپ نے انجمن کی صدارت پر مبارکباد لکھی ہے۔ شکریہ
مجھے اس کی خوشی ہے کہ میرے احباب کو اس انتخاب سے
خوشی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یاد فرمائیے کہ میں ذمہ داری سے
ڈر رہا ہوں۔ دعا فرمائیے کہ خدائے بزرگ و برتر کی توفیق
شاملِ حال رہے تاکہ میں زبان اور ادب کی کچھ
حسبِ دلخواہ خدمت سر انجام دے سکوں۔ آمین!
۲۔ کتاب کی اشاعت کا مسئلہ۔ آپ نے ذکرِ غالب
اور فسانۂ غالب کو انجمن کی طرف سے چھاپنے کی خواہش
ظاہر کی تھی۔ ظاہرا ان کی اشاعت میں کوئی

بات نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن آپ کی راہ میں کوئی
مصلحت حائل ہے، تو بیشک ارادہ ترک کر دیجیے۔ اس
سے کیا فرق پڑ جائیگا!

میں نے آپ کی خدمت میں پانچویں ایڈیشن کا نسخہ پیش کیا تھا۔
آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ ایڈیشن بھی ختم ہو گیا ہے
عنقریب چھٹا ایڈیشن شائع ہو جائیگا۔ ان شاء اللہ

مشاعرے اور سیر سپاٹا تو ہوتا ہی رہیگا، آپ اپنی صحت
کا خیال رکھیے۔ "جان ہے تو جہان ہے" بڑا مقولہ ہے اور
کسی کو اس کے درست ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

عزیزہ بیگم صاحبہ دونوں کا سلام قبول فرمائیں،

والسلام مع الاکرام

خاکسار
مالک رام

۱۱ مئی -

جناب عالی - السلام علیکم

آپ کے سارے نوازش نامے ملتے رہے - اور عالم بے کسی میں سہارا دیتے رہے - شکریہ ادا کروں تو رسم سی نظر آئیگی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعی دل سے ممنون ہوں -

میں نے بھی سنا ہے کہ استعفیٰ منظور ہو گیا - اللہ کا شکر ہے کہ عزت و آبرو سے سرخروئی نصیب ہوئی - نہ معلوم یہ سال بھر کی کشمکش چہ ضرور تھی؟ آخر میں کچھ مانگ تو نہ رہا تھا - بلکہ اپنی بیداغ ملازمت کے چند سال شیر مادر کی طرح بخش رہا تھا - خیر - ہر کام میں اللہ میاں کی کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے -

اب داستان گوئی کا ہنر آزمانے کا ارادہ ہے - کچھ دید - کچھ شنید - آپ اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں - کوئی گُر، کوئی داؤ، کوئی اکھاڑہ ہمیں بھی سمجھائیے - اچھے چار پانچ مہینے بیٹھے ہی رہتا تھا جس پر آپ کا خط آیا ہے -

بھابی کو سلام - راجو کو پیار - ہمیرا کیسی ہے؟ عفت اور سلویٰ دستور لندن کے نواح میں ہیں - نیازمند قدرت اللہ

ہنری ملر کا ایک خط

(بنام جمیل الدین عالی)

پیارے!

تمہارا پر خلوص خط پا کر کتنی خوشی ہوئی! ڈنمارک اٹلی اور فرانس کا سفر کر کے میں حال ہی میں ائرلینڈ پہونچا ہوں اور اسی ہفتے اپنے بچوں سے ملنے کیلیفورنیا چلا جاؤں گا۔ اب پاکستان کب آؤں گا کیسے آؤں گا (اور آؤں گا بھی یا نہیں) یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ یہ طے ہے کہ مجھے وہاں آکر یقیناً خوشی ہوگی۔ لیکن پہلے تو مجھ کو اپنے ہی بہت سے مسئلے حل کرنے ہیں۔ (میرا پتہ اس خط کے پیچھے لکھا ہوا ہے) ویسے تم مجھے بتوسط رہو بلٹ ورگ۔ ر۔ بمبک۔ ہیمبرگ جرمنی کے پتے پر بھی خط لکھ کر مدعو کرسکتے ہو۔ ڈاکٹر شمٹ کی کتاب (ہنری ملر کی سوانح عمری) حال ہی میں بازار میں آئی ہے۔ میں نے روبلٹ سے کہا ہے کہ وہ اس کی ایک کاپی اور میری ایک اور چھوٹی سی کتاب ٹو پینٹ از ٹو لو اگین تمہیں بھی بھیج دیں۔

میں نے حال ہی میں چارلٹ گے کی ایک چھوٹے سائز کی کتاب Yellow turbon پڑھی ہے۔ اس کتاب سے پاکستان کی ایک عجیب تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ خاص طور پر کراچی کی۔ میں تو حیرت میں رہ گیا۔

اب ختم کرنا چاہیے۔ مجھے مزید لکھتے رہو۔ امید تو یہی ہے! ہاں ایچ۔ایم لٹریری سوسائٹی سے پاکستان کے بارے میں کچھ چیزیں بھیج دینا چاہیے۔ معمولی ڈاک سے بھیجو!

گرمجوشی کے ساتھ سلام اور بہترین اور مستقبل کی دعائیں۔

ہنری ملر

"ہم قلم" کراچی

نومبر ۱۹۶۱ء

شخصیت

شخصیت

ممتاز مفتی

جمیل الدین عالی

سیانے کہتے ہیں، تمہیں صرف اس شخص پر لکھنے کا حق حاصل ہے جس کے لئے تمہارے دل میں جذبۂ ہمدردی ہے۔ میرے دل میں عالی کے لئے جذبۂ ہمدردی کا فقدان ہے۔ یہ تعصب اس روز سے پیدا ہوا تھا جب میں پہلی بار اس سے ملا تھا اور آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ لہٰذا عالی کی شخصیت پر لکھنے کا مجھے حق حاصل نہیں ہے' اس لئے یہ تحلیلِ نفسی جو میں پیش کر رہا ہوں سند نہیں ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے جب پہلی مرتبہ مجھے وہ مشہور واقعہ سنایا جب عالی وزارت تجارت میں اسسٹنٹ تھا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ واقعہ یوں تھا کہ عالی سے ایک ضروری فائل گم ہو گئی۔ قدرت اللہ نے افسر کی حیثیت سے عالی سے پوچھا کہ میاں وہ فائل کیسے گم ہوئی تو عالی نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ بس صاحب گم ہو گئی۔ میں نے قدرت سے پوچھا کہ ایک اسسٹنٹ کی اس دیدہ دلیری پر آپ کو غصہ نہ آیا۔

قدرت نے جواب دیا' آپ ٹھیک کہتے ہیں' غصہ آنا چاہئے تھا مگر انداز میں کچھ ایسی شانِ بے نیازی تھی کہ میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے پھر پوچھا کہ عالی کے جواب پر آپ نے کیا محسوس کیا تھا۔ قدرت نے کہا میرے احساسات اس وقت کچھ ایسے تھے جیسے شہنشاہ جہانگیر کے ہوں گے جب انہوں نے مہرالنساء سے پوچھا تھا کہ کبوتر کیسے اڑ گیا اور مہرالنساء نے دوسرا کبوتر اڑا کر کہا تھا عالی جاہ ایسے۔

شہاب عالی کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔ کچھ زیادہ ہی اچھی۔ ان کی رائے میرے اور عالی کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ قدرت اللہ تو رخصت ہو گئے لیکن وہ دیوار ابھی تک جوں کی توں قائم ہے۔

ذاتیات سے قطع نظر یہ بھی سچ ہے کہ عالی کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر موجود ہیں جو ہاسٹلیٹی پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا بھڑ ہے جس میں ڈنک نہیں صرف بھوں بھوں ہے۔ اس کا بیرونی facade بڑا forbidding ہے۔ کسی میں

اندر جانے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی اندر جھانکنے سے خوف زدہ ہے اس لئے کہ اندر بے اطمینانی کے انبار لگے ہوئے ہیں۔

عام طور پر وہ لوگ جو ہاسٹیلٹی جنریٹ کرتے ہیں ان کی شخصیت میں بنیادی طور پر ایک بے نام کشش ہوتی ہے' ایک میگنیٹک فورس۔ ایک ان جانا لگاؤ ہوتا ہے جو کچھ لوگوں میں ری ایکشن پیدا کرتا ہے۔ عالی کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں۔ آپ اسے ایڈمائر کرسکتے ہیں۔ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تحریر کو appreciate کرسکتے ہیں لیکن اس کی شخصیت سے محبت یا عقیدت بھرا لگاؤ محسوس نہیں کرسکتے۔

یہ حیرت کی بات ہے۔ اس لئے کہ عالی کی قابلیت کو سب مانتے ہیں۔ اس کی تخلیقی صلاحیت سے کسی کو انکار نہیں۔ وہ ایک مجلسی آدمی ہے' اسے بات کرنی آتی ہے۔ بلکہ اسے کہہ دینے کی بری عادت ہے۔ کہہ دینے کی عادت کوئی مقبولیت حاصل نہیں کرتی لیکن وہ اندر باہر سے ایک ہوتا ہے۔ دو نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بھٹیاری جیسے چڑ دانے نہیں بھونتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیاست میں مقام پیدا نہیں کرسکا۔

عالی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اونچے خاندان کا فرد ہے۔ اس کے آبا بڑے لوگ تھے۔ اس کے والد ریاست لوہارو کے نواب تھے۔ والد عالی کو ریاست تو نہ دے سکے البتہ نوابی کی خُو دے گئے۔ آبا جینز میں لیڈرشپ کی کلی ٹانک گئے۔

صاحبو' قدرت بڑی تماش بین ہے۔ اس نے عالی کی جوانی کو ابوالحسن سوتے جاگتے کا قصہ بنا دیا۔

بڑے خاندان کے کسی فرد کو اگر چھوٹا بن کر جینا پڑے تو یہ آزمائش بڑی سخت ہوتی ہے۔ عالی کو اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔

اگر وہ اس آزمائش سے گزر گیا تو اس کی وجہ عالی نہیں تھا بلکہ کامی تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ عالی کی شخصیت میں کامی کیسے آگیا۔ صاحبو' مجھے نہیں پتہ کہ ایسا کیوں ہے' میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ عالی کی شخصیت میں نوابی اور لیڈرشپ کے باوجود ایک عامی بھی ہے جو کامی ہے۔

بڑا بننے اور بڑا جانے جانے کے جنون میں عالی نے اپنے اندر سوتے ہوئے کامی کو کوڑے مار مار کر جگایا اور مشقتی بنا دیا۔

سیانے کہتے ہیں :

"بھو بھاگت بھاگے رنگ لاگت۔ لاگت لاگے بہت دنوں کا سویا منوا جاگت جاگے"

عالی میں اتنا صبر نہ تھا کہ وہ جاگت جاگت جاگتا۔ اس کی سرشت میں حرکت ہے' شدت ہے۔ یہ شدت مشین والی شدت نہیں شوئے والی شدت ہے' لہٰذا عالی ازلی طور پر گھڑ سوار ہے' پیدل نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ صرف گھڑ سوار ہی نہیں۔ وہ سرپٹی بھی ہے' ڈُکی کو کسر شان سمجھتا ہے۔ اس نے گھڑکی کو ایسی ایڑ لگائی کہ ایڈوائزری پر جا کر دم لیا۔

عالی کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں متضاد صلاحیتوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ایک طرف خواب دیکھنے والا شاعر

ہے'دوسری جانب سوچوں کا مارا ہوا حقیقت پسند فلسفی ہے۔ ایک طرف ان جھک کہہ دینے والا منہ پھٹ ہے'دوسری جانب سوچ سمجھ کر بات کرنے والا اہل کار ہے'ایک طرف ازلی محبوب ہے'دوسری جانب حسن پرست ہے'ایک جانب ادیب ہے'دوسری جانب اقتدار پرست افسر ہے۔ ایک جانب مشتقی ہے'دوسری جانب ثواب ہے۔بے شک یہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

عالی انہی تضادات کی پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ بظاہر ایک کامیاب شخص ہے۔ عہدے کے لحاظ سے بھی'ادب کے لحاظ سے بھی۔لیکن اسے خود کو یقین نہیں کہ وہ کامیاب ہے'اندر ڈاواں ڈول ہے۔ بے چین ہے۔ اضطراب کا مارا ہوا اندر ایک گرداب گھوم رہا ہے اور وہ اس گرداب میں ڈب جھکے کھا رہا ہے۔

اللہ کی شان ہے'جنہیں حاصل ہے انہیں یقین کی دولت حاصل نہیں اس لئے خود کو محروم سمجھتے ہیں۔جنہیں حاصل نہیں؟ دراصل عالی کو کراچی کی فضا راس نہیں آئی۔

کراچی ادبی تفاخر کا گھر ہے'عالی ادبی تفاخر سے محروم ہے'شاید اس لئے کہ شعر و سخن اس نے ورثے میں پایا ہے۔ اس کا شجرہ نسب غالب سے ملتا ہے۔ صرف ادبی تفاخر ہی نہیں'اس کی شخصیت کے کچھ پہلو اہل کراچی کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

اہل زبان جب کراچی آئے تھے تو وہ اپنے ساتھ اپنا کلچر لائے تھے۔ یہ ایک بڑا متمدن کلچر تھا۔ اگرچہ اس میں یہاں وہاں کچھ Decadant عناصر بھی تھے لیکن بنیادی طور پر یہ عظیم کلچر تھا۔ جس کے پیچھے سالہا سال کی تاریخ تھی۔ تمدن تھا' ادب تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ پاکستان کا قیام بڑی حد تک ان کی جدوجہد کا مرہونِ احسان تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر انہیں ایک احساس برتری تھا۔

ابتدائی دور میں وہ زبان کو ہتھیار کے طور پر چلاتے رہے جس کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ جنہیں ہم آج تک حل نہیں کر سکے اور آج بھی ہماری قومی زبان سیکرٹریٹ کے باہر دھتکاری ہوئی کھڑی ہے۔ صاحبو'یہ بات سنی سنائی بات نہیں بلکہ آپ بیتی ہے۔آدھی زندگی لوگ مجھ پر آوازے کستے رہے۔ "تمہیں زبان نہیں آتی۔ بند کرو یہ بکواس"۔ وہ سچ کہتے تھے'واقعی مجھے زبان نہیں آتی تھی اور میں اردو ادب سے ناواقف تھا۔ بات تو سچی تھی لیکن کہنے کے انداز میں تحقیر کا عنصر تھا۔

اس پر میں نے اشفاق سے کہا جو ان دنوں اردو بورڈ کا ایڈیٹر تھا کہ مجھے ایسے الفاظ کی ایک لسٹ بنا دے جو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں مستعمل ہوں۔

اشفاق احمد نے لسٹ بنانے کی بجائے ایک کتابچہ مرتب کر دیا جس کا نام تھا "اردو کے خوابیدہ الفاظ"

جب اردو بورڈ کی سالانہ میٹنگ منعقد ہوئی تو بورڈ کے ممبران نے اس کتابچے کی اشاعت پر سخت اعتراض کئے اشفاق احمد نے کہا'جناب میں نے ان الفاظ کا چناؤ نور اللغات سے کیا ہے۔ بورڈ کے ممبران جو زیادہ تر اہل زبان تھے'بولے کہ نور اللغات کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ اتھارٹی ہم اہل زبان ہیں۔ یہ الفاظ شاید کسی زمانے میں مستعمل سمجھے جاتے ہوں لیکن

متروک ہیں۔

بورڈ کے ممبر پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اردو ادب سے واقف تھے اور حکومت پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ اہلِ زبان کا کیا مفہوم ہے۔

عالی زبان کے تعصب سے بھی کورا ہے۔

دراصل وہ کسی منفی تعصب کا قائل نہیں۔ نہ ادب کا نہ زبان کا نہ کلچر کا نہ علاقائی۔ شاید اس لئے کہ وہ پاکستان کے مثبت تعصب سے اس قدر لبالب بھرا ہوا ہے کہ کسی منفی تعصب کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ ٹھیٹھ پاکستانی ہے اور اسے ٹھیٹھ پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔

عالی نے پاکستان پر جتنے بھی گیت لکھے ہیں وہ ذہن کی تخلیق نہیں ہیں۔ ان میں عالی کا دل دھڑکتا ہے۔ اسے پاکستان سے عشق ہے۔ وہ پاکستان کو عام ملک نہیں سمجھتا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں پاکستان کی عظمت کا بے نام احساس ہے جس کا اس نے شعوری طور پر کبھی اظہار نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ عقل کا مارا ہوا دانشور ہے اور القا کے اظہار سے گریز کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ہم نے اس ملک کو بڑی جدوجہد سے حاصل کیا ہے۔ اگر اب ضمنی اور فروعی اختلافات سے ضائع کر دیا تو یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

عالی کی شخصیت میں کئی ایک انوکھی بھنبیریاں گھوم رہی ہیں۔ مثلاً حیرت ہے کہ اس انا سے بھری ہوئی شخصیت میں بیراگ کیسے در آیا۔ ایک نوابی ذہنیت کا فرد اہلکاری تفاخر سے مخمور جانا پہچانا تخلیق کار، اس میں بیراگ کیسے جاگا۔ وہ دوہے لکھنے پر کیسے مائل ہوا۔ دوہے میں تو تیاگ کا جذبہ ہوتا ہے۔ عالی جیسے ambitious فرد میں تیاگ کی کیفیت جاگے بیراگ کا جذبہ ابھرے۔

صاحبو! میں جو خود کو انسانی شخصیت کو سمجھنے کا پھنے خان سمجھتا ہوں۔ یہ معمہ آج تک حل نہیں کر سکا۔ عالی کے دوہے نمائشی تخلیق نہیں ہیں۔ وہ تو دل کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں اور پھر اللہ نے عالی کو بھرپور آواز دی ہے جس میں درد ہے بھرت ہے 'لے ہے' تاثر ہے۔ یا اللہ! عالی میں یہ کون بول رہا ہے۔ لیکن عالی نے اس عطا کی قدر نہ کی۔ غالباً اس لئے کہ اس میں سے "قدیم" کی بُو آتی تھی۔ تیاگ میں ویرانہ تھا بن باس تھا اور عالی کا آئیڈیل ایک ویل انفارمڈ ویل ریڈ Well informed,wellread ماڈرن دانشور تھا اس لئے اس نے کویتا دیوی کو تیاگ کر حقیقت پسند دانشور فلسفی کا رول اختیار کر لیا اور اخبار میں کالم نویسی کا شغل اختیار کر لیا۔

ایک زمانہ ہوتا تھا جب اخبار میں دھلی دھلائی خبریں ہوتی تھیں اور علمی مضامین چھپتے تھے۔ اب اخبار میں خبریں نہیں ہوتیں پراپے گنڈا ہوتا ہے۔ اسکینڈل ہوتے ہیں۔ مصالحے دار کالم ہوتے ہیں جن میں ڈنک ہوتا ہے۔ ڈنک نہ ہو تو کالم پھس پھسا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اب تو یہ عالم ہے کہ ٹھنڈی میٹھی چیزیں آؤٹ ہو چکی ہیں۔ نوجوان کلاسیکل ناول نہیں پڑھتے کہتے ہیں ٹمپو سلو ہے۔

عالی کے کالم میں فلسفہ ہوتا ہے' اقتصادیات ہوتی ہے' شماریات ہوتے ہیں۔ دلیلیں ہوتی ہیں۔ حب الوطنی ہوتی ہے۔ ایسی سنجیدہ تحریروں کے قاری بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن عالی کو کون سمجھائے کہ :

"وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے" عالی پر سب سے بڑا الزام رائٹرز گلڈ کا قیام ہے۔ میری دانست میں جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب نے رائٹرز گلڈ قائم کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ یہ کلنک کا ٹیکہ دونوں کے ماتھے پر ایسا لگا ہے جو دھونے سے کبھی نہیں دُھلے گا۔ انہیں علم نہ تھا کہ ادیب برادری میں نیک خواہشات نہیں چلتیں۔

صاحبو! ہم سمجھتے ہیں کہ تخلیق کار نارمل لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہماری بھول ہے۔

اگر نارمل لوگ زمین ہوتے ہیں تو تخلیق کار پانی۔ ان پانیوں میں لہریں چلتی ہیں۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں۔ تخلیق کار میں hypersensitivity ہوتی ہے' جس میں حساسیت کا جھکڑ چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی میں adjustment پیدا نہیں کر سکتے۔ اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ حساسیت کی دھار بلیڈ کی طرح کاٹ کرتی ہے۔ دوسروں کو بھی' خود کو بھی۔ حساسیت بیک وقت اللہ کی بہت بڑی دین بھی ہے اور بہت بڑی بدقسمتی بھی۔

گلڈ قائم کرتے وقت عالی کا خیال تھا کہ وہ ادب اور ادیبوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب اس بات پر پھولے نہیں سماتے تھے کہ گلڈ کے پہلے ان جنرل جلسے میں صدر ایوب کو سامعین کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ انہیں علم نہ تھا کہ دنیا کی کوئی تنظیم جو پاکستانی ادیبوں کی فلاح کے لئے قائم کی جائے اس سے ادیب کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے اندر عدم اطمینانی کے انبار لگے ہوتے ہیں اور مزاحمتی رویئے کیلئے وہ بیرونی حالات کے محتاج نہیں ہیں۔

جب گلڈ قائم کیا گیا تھا تو مجموعی طور پر فضا تحسین سے بھری ہوئی تھی' پھر چاروں طرف سے میں میں کی آوازیں آنے لگیں۔ اور ان کا سلسلہ آج تک ختم نہیں ہوا۔

عالی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں سے نوابیت کی بو نہیں جاتی۔ لیکن نوابیت میں چند خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ عالی شاہ خرچ ہے۔ اس کے پاؤں ہمیشہ چادر سے باہر نکلے رہے۔ وہ بڑا دیالو ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس نے ہمیشہ ادیبوں کی مدد کی ہے صرف مدد ہی نہیں' نوابی ٹھاٹھ سے مدد کی ہے۔

مجھے یاد ہے' ایک بار ریڈیو کا ایک پروڈیوسر ادیب بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔

وہ کراچی کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ تنخواہ تھوڑی تھی ٹھاٹھ ادیبانہ تھا۔ اس نے کئی ایک ماہ ہوٹل کا بل ادا نہ کیا تھا۔ ہوٹل والوں نے اس کا کھانا بند کر دیا تھا اور چوکیدار کو اس کے دروازے پر متعین کر دیا تھا کہ کہیں چپکے سے ہوٹل سے نکل نہ جائے ہم چار ایک ادیب اس سے ملنے ہوٹل میں گئے تو ہمیں حالات کا پتہ چلا۔

حالت بڑے سنگین تھے۔ ہم میں کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جو ہوٹل کا بل ادا کر سکتا۔ اس کی مدد کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر دفعتاً ایک صاحب بولے ' عالی!

ہم نے عالی کو فون کیا۔ فون پر اسے ساری سچوئیشن سمجھائی۔ عالی نے کہا' تو پرابلم میں آ رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ عالی ان

ڈنوں انکم ٹیکس افسر تھا۔
عالی نے آتے ہی ہوٹل کے مینجر سے کہا۔ ان کا بل ادا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس نے مینجر کو ڈانٹا بولا۔ فوراً انہیں کمرے میں کھانا بھیجو' ابھی۔ اور چوکیدار کو وہاں سے ہٹا لو۔
عالی اس مشکل کو اور کسی انداز میں بھی حل کر سکتا تھا لیکن اس کا چھوٹتے ہی یہ کہنا کہ ان کا بل میں ادا کروں گا۔ نوابی دیا کا مظہر تھا۔
عالی ادیبوں کی ہمیشہ مدد کرتا رہا ہے لیکن اسکا انداز patronising ہو جاتا ہے جو مجھے بہت کھٹکتا ہے۔ یہ بکری دودھ تو دیتی ہے لیکن مینگنی ڈال کر۔
عالی ایک کامیاب شخص ہے۔ ہر لحاظ سے کامیاب' کیریئر کے لحاظ سے' تخلیق کار کے لحاظ سے' لیکن اسے یقین نہیں آتا کہ وہ کامیاب ہے۔ وہ اپنے اندر سے ڈانواں ڈول ہے۔ بے چین ہے' اضطراب کا مارا ہوا۔ ناشکرا۔ اسکے اندر محرومیت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ احساس محرومیت کا ایک گرداب چل رہا ہے اور وہ اس گرداب میں ڈوب جھٹکے کھائے جا رہا ہے' نہ تیرتا ہے نہ ڈوبتا ہے۔
اللہ کی شان ہے' جنہیں حاصل ہے انہیں یقین کی دولت حاصل نہیں اور وہ خود کو محروم سمجھتے ہیں۔

(ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی)
نومبر' دسمبر ۹۵

قدرت اللہ شہاب

عالی
(اقتباسات از شہاب نامہ)

(۱)

ایک روز کامرس سیکریٹری مسٹر ممکفار فرکر نے امپورٹ ایکسپورٹ سیکشن کی ایک فائل طلب کی۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی' لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن کے اسسٹنٹ سیکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسسٹنٹ کے سر تھوپ دیا' کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپروائی سے گم ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا' کہ یہ اسسٹنٹ لاابالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم کا انسان ہے۔ دفتری دستور العمل کی چنداں پابندی نہیں کرتا۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادیبی کارروائی کر کے قرار واقعی سزا ضرور دینی چاہیے۔

میں نے "ملزم" کو اپنے کمرے میں طلب کیا' تو ایک خوش پوش' بانکا ترچھا' گورا چٹا چھریرے بدن کا جوان لٹکتا مٹکتا بے اعتنائی سے آیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی کرنے والا ہو۔ میں نے اس سے فائل کی متعلق دریافت کیا' تو اس نے بے حد رکھائی سے بے حد مختصر جواب دیا "مل نہیں رہی"۔

"کیوں نہیں مل رہی؟" میں نے بھی لہجے میں تیزی پیدا کر کے کہا۔

"گم ہو گئی۔" اسسٹنٹ نے وضاحت کی۔

"کیسے گم ہو گئی؟" میں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔

"بس جی گم ہوگئی۔ بتا کے تو نہیں گئی۔" اسسٹنٹ نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت ناک پر رگڑ کر کھوں کھوں کیا' اور جس طرح لٹکتا مٹکتا کمرے میں داخل ہوا تھا' اسی طرح لٹکتا مٹکتا واپس چلا گیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر میں کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آگیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر ہنسی آنے لگی۔ اگر ہر لاپتہ چیز یہ اعلان کر کے جائے کہ وہ کیسے گم ہو رہی ہے' تو گمشدگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں؟

میں نے اپنے افسران بالا کو نوٹ لکھ کر بھیج دیا' کہ فائل نہیں ملی اور غالباً گم ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ لغزش میرے سیکشن میں وقوع پذیر ہوئی ہے' اس لئے انچارج افسر کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر مجھے سیکرٹری مسٹر غفار فرکر' جائنٹ سیکرٹری ایس اے حسنی' ڈپٹی سیکرٹری ایم ایوب اور دوسرے ڈپٹی سیکرٹری اشرف سعید سے درجہ بہ درجہ تحریری طور پر خاطر خواہ ڈانٹ پڑی اور ہر ایک نے مجھے آئندہ محتاط رہنے کی شدید وارننگ دی۔

وہ دن اور آج کا دن' جمیل الدین عالی سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں۔ کیونکہ امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا "الھڑ" بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا' جمیل الدین عالی ہی تھا۔ میں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا قیمتی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالی کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے خوبصورت دوہوں اور ملی نغموں نے مجھے شاد کام کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے مالا مال کیا ہے۔ اور جس کی نازک مزاجی' زود رنجی' تلملاہٹ' جھنجلاہٹ اور کج کلاہی نے میرے دل میں کبھی کوئی آزردگی پیدا نہیں کی۔ (صفحہ ۲۴۳)

(۲)

تنہائی کے احساس نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ میں اکیلے میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔ خوش قسمتی سے مجھے ایسے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی' جن کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی شخصیت ہے۔ مثلاً ابن انشاء ممتاز مفتی' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' واصف علی واصف صاحب' جمیل الدین عالی' ریاض انور' ایثار راعی' مسعود کھدر پوش' ابن الحسن برنی' اعجاز بٹالوی' ایوب بخش اعوان وغیرہ یہ سب اپنے اپنے میدان کے منفرد شہسوار ہیں۔ باہمی محبت' خلوص' احترام اور اعتماد کے علاوہ ہمارے درمیان اور کوئی خاص قدر مشترک یا مقصدیت نہیں۔ اس کے باوجود ہر زمانے میں ہمارے تعلقات میں نہ کوئی کجی آئی ہے اور نہ کوئی کمی پیدا ہوئی ہے۔ (صفحہ ۱۲)

(۳)

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری جنرل کے طور پر مجھے دوبارہ منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ابتدائی دور میں

گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے۔ اپنی توانا ئی، کجکلاہی، شاعرانہ نازک مزاجی، ذہنی زود رنجی، ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن، لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لئے انتھک کام کیا۔ طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس معرکہ آرائی میں انہیں انواع و اقسام کے مصائب اور اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کشمکش میں کچھ عرصہ کے لئے اپنے ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لئے ان کے جذبۂ خدمت سے عالی صاحب نے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ (صفحہ ۷۷۶)

"شہاب نگر" سے شہاب صاحب کا انٹرویو

انٹرویو : طاہر مسعود

(۴)

(ص ۱۵۹ تا ۱۶۳ اور ۱۶۹ تا ۱۷۱)

سوال۔ پچھلے دنوں اسی شہر میں اکادمی ادبیات پاکستان نے ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس منعقد کی جو بہت کامیاب رہی۔ آپ نے اپنے زمانے میں بہت سی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے بلکہ ادبی کانفرنسیں منعقد بھی کرائی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے، ایسی کانفرنسیں ادبی تخلیقات کی پیداوار یا اسے فروغ دینے میں کس حد تک معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں؟

قدرت اللہ شہاب : مجھے ایسی کانفرنسوں کا ایک ہی فائدہ نظر آتا ہے کہ ادیبوں کی ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی کانفرنسوں کی مجھے کوئی افادیت نظر نہیں آتی۔

سوال۔ ایسی کانفرنس جس کے انعقاد پر لاکھوں روپے خرچ کئے جائیں، ان کا بس اتنا ہی سا فائدہ ہے؟

شہاب : جی ہاں! ان کانفرنسوں کا مقصد نشستند، گفتند، خوردند اور برخاستند ہی ہوتا ہے۔ میں اکادمی کی چار میں سے دو کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ مجھے تو ان میں یہی فائدہ نظر آیا ہے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں یہ کثیر رقم قومی سرمائے کے زیاں کے ذیل میں نہیں آتی؟ یعنی اس رقم کو کسی مفید کام میں صرف کیا جائے تو کیا زیادہ بہتر نتائج سامنے نہیں آئیں گے؟

شہاب : میں اس کا کیا جواب دوں؟ جب ہم نے گلڈ بنایا تھا تو ترستے رہتے تھے کہ اتنی رقم جو آج ایک کانفرنس میں خرچ کی جاتی ہے، ہمیں یکمشت مل جائے تو ہم کیا کچھ کر ڈالیں۔ لیکن گلڈ کو پورے سال میں صرف ایک لاکھ روپے ملتے تھے، جن میں سے آدھی رقم مشرقی پاکستان والے خود رکھ لیتے تھے اور آدھی رقم مغربی پاکستان کے حصے میں آتی تھی۔ گو گلڈ نے بھی کوئی ایسا خاص تیر تو نہیں مارا۔ بس کاپی رائٹ ایکٹ یا رائٹروں کی بہبود کے لئے فنڈ مخصوص کرایا اور حقیقت یہ ہے کہ رائٹرز گلڈ نے اکیڈمی آف لیٹرز کے قیام کا منصوبہ اکیڈمی آف فرانس کی طرز پر بنا کر پیش کیا تھا لیکن د۔

منصوبہ اس قسم کی اکیڈمی کا ہرگز نہیں تھا جو آج آپ کو نظر آ رہی ہے۔ یہ تو ایک ڈیپارٹمنٹل قسم کی چیز ہے۔

سوال۔ اکادمی ادبیات کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ اس کا مقصد ادیبوں اور مارشل لا حکومت کے درمیان ایک رابطے کا قیام ہے اور بالخصوص یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ ادیب مارشل لا کے مخالف نہیں حامی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

شہاب : یہی الزام رائٹرز گلڈ پر لگتا تھا کہ گلڈ ایوب خاں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

سوال۔ لیکن گلڈ بنیادی طور پر ادیبوں کی انجمن تھا۔ اس کے عہدے دار ادیب تھے۔ اس کے انتخاب ہوتے تھے اور سب کچھ جمہوری ماحول میں ہوتا تھا لیکن اکادمی میں یہ صورت موجود نہیں ہے؟

شہاب : جی ہاں! یہ درست ہے' اکادمی میں تو سارے نامزد لوگ ہیں جبکہ گلڈ میں انتخابات ہوتے تھے۔ گلڈ یونہی تو نہیں بن گیا تھا۔ مولوی عبدالحق' ابن انشاء' جمیل الدین عالی' عباس احمد عباسی' شاہد احمد دہلوی (۱) وغیرہ ان لوگوں نے مل کر بنایا تھا۔ ان کی آپس میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی' جس میں گفتگو ہوئی کہ حکومت زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب لانے کے دعوے کر رہی ہے لیکن ادب کے شعبے میں اب تک کچھ نہیں ہوا' لہٰذا اس میں کچھ ہونا چاہئے' تو یہ سات آٹھ آدمی میرے پاس آئے۔ میں اس وقت ایوب خاں کے پرسنل سیکریٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو میں نے کہا کہ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے البتہ آپ لوگ دونوں ونگ سے رائٹرز کو اکٹھا کریں اور ان سے پوچھیں کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ مقصد ہمارا یہ ہونا چاہئے کہ اگر حکومت رائٹرز کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہے تو ادیب اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اس کے خلاف لڑ سکیں۔ یہ بات ہم اپنے منشور میں بیان نہیں کر سکتے لیکن ہمارے ذہن میں مقصد یہی ہونا چاہئے' تو پھر بارہ رائٹرز اکٹھے ہوئے اور ۱۲۰ روپے کے چندے سے تنظیم کا کام شروع ہوا۔ بعد میں جمیل الدین عالی سے کچھ لوگوں کے تعلقات تھے' ان سے چندہ لیا گیا' پھر ملک بھر کے ادیب ایک جگہ جمع ہوئے جن میں ۶۲ ادیب مشرقی پاکستان کے تھے اور بقیہ مغربی پاکستان کے۔ دو تین دن بیٹھے' بڑی لڑائیاں ہوئیں' زبانوں پر اور دیگر مسائل پر بالکل اسمبلی کا منظر تھا۔ طے یہ ہوا کہ گلڈ کو ادیبوں کی ٹریڈ یونین ہونا چاہئے۔ اسے ادب اور ادبی نظریات سے لاتعلق رہنا چاہئے۔

سوال۔ یعنی گلڈ ادیبوں کے غیر ادبی مفادات کے تحفظ کے لئے قائم ہوئی تھی؟

شہاب : جی ہاں! جیسے صحافیوں کی انجمن ہوتی ہے یا جیسے ٹریڈ یونین۔

سوال۔ آپ اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلے میں چند ایسی تجاویز پیش کرنا چاہیں گے جس سے مفید نتائج برآمد ہوں؟

شہاب : میرا خیال ہے کہ دنیا بھر کی اکیڈمیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہی خطوط پر ایک ایسی اکیڈمی بنائی جانی چاہئے جو ہمارے ماحول اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ اس اکیڈمی کا تعلق حکومت سے نہ ہو۔ گلڈ کا حکومت سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ ہم اس سے گرانٹ لیتے تھے۔ مجوزہ اکیڈمی کا درجہ اتنا بلند ہو کہ ہر ادیب کے لئے کہ وہ مرنے سے پہلے

اس کا ممبر بن جائے' ایک اعزاز کی بات ہو جیسے فرانس کی اکیڈمی آف لیٹرز ہے کہ اس کے مخصوص ممبران ہوتے ہیں اور ایک کی جگہ خالی ہو جبھی دوسرا اس میں نامزد ہوتا ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے پچھلے دنوں ایک مذاکرے میں کہا ہے کہ گلڈ ادیبوں کو نقصان پہنچنے کا موجب ہوا۔ (۲) ادیب جنہیں پتہ نہیں تھا کہ شہرت حاصل کرنے 'بیان دینے' پریس کانفرنسیں کرنے کی کیا اہمیت ہے؟ گلڈ نے انہیں اس راہ پر لگایا اور یہ کہ گلڈ تو ادیبوں کو ایوب خان کے جال میں پھانسنے کا ایک حربہ تھا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

شہاب : ایسی بات تو نہیں ہے' میں اس کا گواہ ہوں اور اپنی کتاب "شہاب نامہ" میں رائٹرز گلڈ پر پورا ایک باب لکھ رہا ہوں جس میں ان سارے الزامات کی وضاحت موجود ہوگی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ گلڈ کی مخالفت دو سطحوں پر تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ گلڈ ایوب خاں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے اور حکومت کے اندر بعض افسران کا تاثر تھا کہ یہ سُرخوں کی پناہ گاہ ہے اور وہ کہتے بھی تھے کہ گلڈ تو فیض اور احمد ندیم قاسمی کے لئے بنا ہے۔ "نوائے وقت" گلڈ کا سخت مخالف تھا اور اس کے خلاف اکثر لکھتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں میری حکومت میں پیشی بھی ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ الزام غلط ہے کہ اس میں صرف بائیں بازو کے لوگ شامل ہیں۔ اس میں فیض اور قاسمی ہیں تو حفیظ جالندھری اور نسیم حجازی بھی ہیں۔

سوال۔ بعد میں حکومت اور گلڈ کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے تھے؟

شہاب : حکومت سے نہیں' بلکہ چند لوگوں سے اختلافات ہوئے تھے۔

سوال۔ کن لوگوں سے؟

شہاب : چھوڑیئے نام کیا لینا۔

سوال۔ یہ فرمایئے کہ آپ ذاتی طور پر زندگی میں ادب کو کس حد تک اہمیت دینے کے قائل ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک ادب کوئی ایسی قابل قدر اور قیمتی جنس ہے کہ جس کے لئے دنیاوی آسائشوں کو تج دیا جائے؟

شہاب : اس کا انحصار ادیب کے رویّے پر ہے کہ وہ ادب کو کس شدت سے اہمیت دیتا ہے۔ اگر وہ کُل وقتی ادیب ہے تو ظاہر ہے ادب اس کا اوڑھنا بچھونا ہوگا' اگر اس کا پیشہ کچھ اور ہے تو ظاہر ہے ادب اس کے لئے محض ایک مشغلہ ہوگا۔ اس لئے کوئی اصول متعین نہیں کیا جا سکتا۔

سوال۔ لیکن ذاتی طور پر آپ کا رویّہ اس ضمن میں کیا رہا ہے؟

شہاب : میں اسے Whole time نہیں بنا سکا۔ میرا ذاتی وقت دوسرے دفتری کاموں میں گزرا لیکن اس عرصے میں مجھے جن چیزوں نے متاثر کیا ' ان کے بارے میں جتنا لکھنے کا موقع ملا میں نے لکھا۔

سوال۔ آپ کی دو حیثیتیں تھیں' ادیب کی اور افسر کی۔ آپ نے اپنے افسر ہونے کی حیثیت کو ادیب کی حیثیت پر مقدم جانا اور اسے زیادہ اہمیت دی جبکہ آپ میں ایک بڑے ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود تھیں؟

شہاب : افسر ہونے کے تقاضے اتنے زیادہ تھے کہ حلال روٹی کمانے میں وقت خرچ ہونے لگا لہٰذا ادب کو میں اتنا

وقت نہ دے سکا۔

سوال : اب ذرا عمومی دلچسپی کے سوالات۔ آپ ایوب خان کے نزدیک رہے ہیں۔ اس لئے آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ کیا ایوب خاں ایک ادب شناس حکمران تھے۔ انہیں ادب وغیرہ سے دلچسپی تھی؟

شہاب : بالکل نہیں۔ وہ ادب کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ ایک واقعہ سناتا ہوں' اس سے اندازہ ہو جائے گا۔ اس زمانے میں گلڈ کے تحت "اداس نسلیں" والے عبداللہ حسین' احمد ندیم قاسمی اور جعفر طاہر کو ایوارڈ دیئے گئے تھے۔ جعفر طاہر فوج میں نان کمیشنڈ افسر تھے۔ تقسیم ایوارڈ کے موقع پر جعفر طاہر ایوارڈ وصول کرنے وردی میں ملبوس ہو کر آئے تھے۔ ایوب خان کو یوارڈ تقسیم کرنا تھا۔ جب انہوں نے جعفر طاہر کو وردی میں ملبوس دیکھا تو سب سے پہلے ان کی طرف آئے اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پوچھتے رہے کہ کہاں کے رہنے والے ہو وغیرہ۔ میں بھی قریب کھڑا تھا۔ ایوب خاں مجھے دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دے کر کہنے لگے! "دیکھا' فوج میں بھی کتنے پڑھے لکھے اور لائق فائق لوگ ہیں"۔ جعفر طاہر نے یہ سن کر دھیمے سے کہا "جی حضور! مگر صرف نان کمیشنڈ رینک تک"۔ ایوب خاں نے یہ بات سن لی مگر کچھ کہا نہیں۔ پھر عالی نے پیروی کی اور جعفر طاہر کمیشنڈ افسر کر دیئے گئے۔ اسی طرح ایک واقعہ اور ہے۔ بابائے اردو کو انجمن ترقی اردو سے ایک سازش کے تحت نکال دیا گیا۔ یہ بڑی گڑبڑ سی بات تھی۔ میں نے ایوب خاں کو بتایا کہ "صاحب بابائے اردو کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے' آپ انہیں وقت دیں۔ ایوب خاں بڑا حیران ہوا' کہنے لگا "یہ بابائے اردو کیا ہوتا ہے۔ یہ آدمی ہے' کتاب ہے یا کیا ہے۔" "جی آدمی ہے۔" خیر وقت دیا گیا۔ ایوب خاں سے بابائے اردو کی ملاقات ہوئی اور مسئلہ حل ہوا۔ مارشل لا کے ہم نے دو ہی فائدے اٹھائے' ایک تو کاپی رائٹ ایکٹ بنوایا اور دوسرا ڈاکٹر عبدالحق کو انجمن کا دوبارہ صدر بنوایا۔

سوال۔ ممکن ہے' ایوب خاں کا ادب سے تعلق ہوتا تو ملک کے مسائل کو سنجیدگی سے محسوس کرتے؟

شہاب : (ہنستے ہوئے) شاید۔ امید تو رکھنی چاہئے' ویسے گلڈ کو جتنی بھی کامیابی ہوئی اس میں ایوب خاں کی حمایت کا بھی عمل دخل تھا۔

سوال۔ حکومت کے اندر گلڈ کے جتنے مخالفین تھے' ان میں الطاف گوہر صاحب کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ سنا ہے' انہوں نے گلڈ کی طرز پر ایک اور انجمن قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس چپقلش کے نتیجے میں گلڈ کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟

شہاب : میں یہاں نہیں تھا۔ ہالینڈ چلا گیا تھا' البتہ اس چکر میں جمیل الدین عالی کو خاصا نقصان پہنچا بلکہ انہیں نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

سوال۔ اس معاملے کا آپ کو علم تو ہوگا؟

شہاب : میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ گلڈ کی مخالفت ادیبوں' افسروں' فوجی جنرلوں اور بعض اخباروں میں

تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے۔

سوال ۔ گلڈ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے بعض اہم کتابوں کو ایوارڈ سے محروم رکھا؟

شہاب : اس میں تو ہمیشہ جھگڑا رہے گا۔ یہ تو ججوں کی صوابدید پر ہے۔ اس معاملے میں دو گروپ ہمیشہ رہیں گے۔

سوال ۔ "آگ کا دریا" تو بڑی کتاب تھی۔ (۳)

شہاب : جی ہاں ! آگ کا دریا اور "علی پور کا ایلی" بڑی کتابیں تھیں' انھیں ایوارڈ نہیں ملا۔ لیکن یہ گلڈ کی خوبی تھی کہ وہ کسی جج پر پریشر ڈالنے سے گریز کرتا تھا۔ پھر شاہد احمد دہلوی اور وقار عظیم جیسے مصنفین بھی تھے جو کسی پریشر کو قبول نہ کرتے۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں گلڈ کا قیام ادیبوں کے حق میں مفید رہا؟

شہاب : گلڈ نے ادیبوں کو بعض ٹھوس فائدے پہنچائے۔ انعام وغیرہ تقسیم ہوئے۔ ان کی بیماری یا وفات کی صورت میں مدد کی گئی۔ یہ سب گلڈ کے زمانے میں شروع ہوا۔ گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ساری زبانوں کے ادیبوں میں بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنا ہے۔ گلڈ سے ادیبوں کی عزتِ نفس میں اضافہ بھی ہوا۔

سوال ۔ آپ اس بارے میں کس طرح سوچتے ہیں کہ ملک میں طویل عرصے تک مارشل لاء رہا۔ لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہیں رہی' بنیادی حقوق معطل ہوتے رہے۔ آدھا ملک الگ ہوگیا۔ ان حالات میں ہمارے ادیبوں نے جو ادب تخلیق کیا اس میں مذکورہ قومی مسائل کی جھلک بے حد کم نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں کوئی بڑا ناول یا افسانہ نہیں لکھا گیا۔ اسے آپ ادیبوں کی بے حسی کہیں گے یا بے توجہی' یا اس کا کیا تجزیہ کریں گے؟

شہاب : اسے بے حسی تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ادیب بے حس تو ہوتے نہیں ہیں' بس توجہ اس طرف نہیں گئی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ تقسیم ہند پر تو لکھا گیا ہے لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کوئی بڑی چیز سامنے نہیں آئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ غالب اس کی سیاسی وجوہات ہوں گی کہ اس واقعے کے بعد ایسے حالات پیش آئے جس میں ایسی چیز کا لکھنا یا چھاپنا ممکن نہ ہوگا۔ اصل میں یہ مارشل لا جو ہوتا ہے یہ لکھنے والے کے ذہنوں پر بندش لگا دیتا ہے۔ ہزار کہیں کہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن یہ از خود ہو جاتی ہے' مثلاً ایوب خاں کے زمانے میں انھیں کونشن میں بلایا گیا تھا۔ بحیثیت سیکریٹری کے میرا فرض تھا کہ انھیں بتاؤں کہ اس کونشن میں کیا تقریر کرنی ہے؟ لیکن میں نے ان سے بہانہ کردیا کہ وہاں آپ کو کوئی تقریر وغیرہ نہیں کرنی ہے۔ اصل میں' میں یہ سننا چاہتا تھا کہ ان کی ادیبوں کے بارے میں اصل رائے کیا ہے؟ ظاہر ہے' میں بتا دیتا تو وہاں میری لکھی ہوئی تقریر پڑھتے۔ اس لئے نہ صرف میں نے ان سے جھوٹ بول دیا بلکہ چھپے ہوئے پروگرام میں بھی ان کی تقریر کا ذکر غائب تھا۔ ایوب خاں کونشن کے آخری سیشن میں آئے۔ کونشن کنٹرک ہال میں ہو رہا تھا۔ انھیں صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے' اس عرصے میں انھیں ہر محفل میں صدرِ محفل بننے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس سے ہٹ کر کسی محفل میں شرکت کا تصور ان کے ذہن میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا وہ جونہی ہال میں داخل ہوئے' لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اسٹیج کی طرف اوپر بیٹھنے کے

ئے بڑھے۔ خیر انہیں بڑی مشکل سے روکا۔ قرۃ العین حیدر نے ان کے کوٹ کا کنارا کھینچا۔ عالی نے راستہ آگے سے روکا' یوں انہیں بحیثیت صدر کے اسٹیج پر جگہ نہیں دی گئی۔ میرے لئے مشکل یہ پیش آئی کہ عالی صاحب اسٹیج سیکریٹری تھے۔ میں گلڈ کا سیکریٹری جنرل منتخب ہو چکا تھا اور اسٹیج پر ڈاکٹر صاحب کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ میں بڑا پریشان تھا کہ میرا باس نیچے بیٹھا ہوا ہے اور میں اسٹیج پر چڑھا بیٹھا ہوں۔ خیر ڈاکٹر جاوید اقبال' ڈاکٹر سجاد حیدر وائس چانسلر راج شاہی یونیورسٹی وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ صدر ایوب سنتے رہے۔ پھر ڈاکٹر عبدالحق نے صدر ایوب کو دعوت دی کہ اب آپ آکر کچھ فرمائیں۔ ایوب خان نے نیچے سے مجھے گھورا۔ میں بھلا کیا کرتا' خاموشی سے بیٹھا رہا بلکہ میں نے ایک مقالہ "ادیب اور آزادیِ اظہار رائے" کے موضوع پر پڑھا اور اس میں نہایت سختی سے کہا کہ جو حکمراں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ادیبوں کے جسموں کو قید کر کے ان کے خیالات کو بھی قید کر سکتے ہیں وہ دراصل احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر مقالہ انگریزی میں پڑھا تاکہ صدر ایوب سمجھ جائیں۔ خیر ڈاکٹر عبدالحق کی دعوت پر صدر ایوب اٹھ کر آئے اور فی البدیہہ تقریر کی۔ وہ ایک اچھی تقریر تھی۔ انہوں نے ادیبوں کے خلاف تقریر نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ مارشل لا کا زمانہ ہے لیکن آپ ملک کو نقصان پہنچائے بغیر اپنا تخلیقی کام جاری رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو چار ہفتے کے بعد مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے ان کے پاس مسودوں کے لئے ایک ریگولیشن آیا کہ جو کتاب چھپے' اسے چھپنے سے پہلے ایک سرکاری سینسر کمیٹی منظوری دے لیکن صدر ایوب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ادیبوں سے وعدہ کر آیا ہوں' لہٰذا ان کے زمانے میں کتابوں پر پابندی نہیں لگی۔ وہ مسودہ میرے پاس آیا اور ہدایت کے مطابق مجھے اس پر نوٹ لکھنا چاہئے تھا لیکن میں نے صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ صدر صاحب نے کونشن میں ادیبوں سے جو وعدہ کیا ہے وہ انہیں یاد ہے یا نہیں' اس مسودے پر کوئی نوٹ درج نہیں کیا لیکن انہوں نے خود ہی اسے مسترد کر دیا۔

حواشی : عالی صاحب کی وضاحتیں ــــ

(۱) اس میں سہو ہوا ہے۔ پہلی گفتگو میں مولوی صاحب اور شاہد صاحب نہیں تھے۔ قرۃ العین حیدر' ابن الحسن' غلام عباس اور ابن سعید تھے۔

(۲) ڈاکٹر جمیل جالبی پہلے اجلاس میں بھی شامل ہوئے۔ گلڈ کی مجلس منتظمہ میں کئی بار منتخب ہوتے رہے۔ گلڈ کا "داؤد ادبی انعام" بھی وصول کیا۔ جسکے انتظامی معتمد بھی جمیل الدین عالی تھے

(۳) "علی پور کا ایلی" اس سال نہیں چھپی تھی۔ اگلی مرتبہ زیر غور آئی۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صدر ایوب کے ہاتھ سے کوئی انعام لینا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اس سال انعام کے ججوں میں شامل ہو گئیں۔ انعام "خدا کی بستی" اور "جاڑے کی چاندنی" کو ملا

☆ نوٹ از ناشر : عالی صاحب پورے احترام کے ساتھ اس بیان کو افسانویت سے متاثر کہتے ہیں۔

کتاب "شہاب نگر"

مرتبہ شیما مجید

جنگ پبلشرز' لاہور سنہ ۹۱

قدرت اللہ شہاب

اقتباس

آج سے تین ساڑھے نو برس پیشتر اسی شہر خوباں میں گلڈ کا خیال جمیل الدین عالی پر ان کے خوبصورت دوہوں کی طرح نازل ہوا تھا۔ اس خیال میں کچھ ایسی برکت تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے بابائے اردو جیسے عظیم رہنما کوی غلام مصطفےٰ جیسے بلند پایہ شاعر اور شاہد احمد دہلوی جیسے ثقہ ادیب ہماری صفوں میں انجمن اسلامیہ کے والنٹیروں کی طرح آشامل ہوئے۔ گلڈ کی تعمیر و تکمیل میں جمیل الدین عالی کا من، کسی کا فن، کسی کا تن بے دریغ کام آیا ہے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی خاکسار کا نام بھی بیچ میں آجاتا ہے۔ اس کے متعلق یہی عرض کرونگا کہ میں نے گلڈ کے لیے محض ایک گردپوش کا کام دیا ہے۔ جب ضرورت ہوئی گرد و غبار، باد و باراں سے بچاؤ کے لئے چڑھالیا اور جب طبیعت چاہی پرانے جالے کی طرح اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ چشم ما روشن دل ماشاد لیکن اس ادارے کو پروان چڑھانے میں آپ کے کارکنوں کو جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اس کی داستان بڑی عبرتناک ہے۔ جی تو بہت چاہا کہ آج آپ کو اس کے کچھ قصے بھی سناؤں لیکن صبح صبح اٹھ کر آج کے اخبار میں ایک خبر پڑھ کر یہ نیت توڑ ڈالی۔

قدرت اللہ شہاب کے مضمون "تن کی مکڑی من کا جالا"
کتاب: "پاکستان کا دس سالہ ادب"
ناشر: طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات، حیدر آباد سندھ

صدر ایوب مرحوم اردو سائنس کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد
رکھ رہے ہیں۔ مئی ۱۹۶۳ء

سید حامد

عالی نوجوانی میں

(جناب سید حامد ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نہایت نمایاں گو غیر سیاسی حیثیت کے حامل ہیں۔ آئی اے ایس (پاکستان میں مساوی سی ایس پی) میں آکر حکومت ہند میں وفاقی کامرس سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے منتخب صدر رہے۔ ۱۹۹۶ء سے ہمدرد تعلیمی فاؤنڈیشن اور متعلقہ معلوماتی اداروں کے صدر نشین ہیں اور ہندوستان میں مسلم حقوق کے تحفظ میں نامور کارکن۔ یہ ان کا ایک خط ہے جو انہوں نے جناب اصغر عباس' علیگڑھ کو لکھا۔ جناب عباس نے سید حامد صاحب پر ایک وقیع 'ضخیم' ارمغان مرتب کرنی شروع کی تھی (۱۹۹۹ء)۔ جس میں عالی صاحب کا مضمون بھی شامل ہوا ہے)

گرامی قدر' دعائیں

آپ کا مکتوب اور دونوں منسلکہ مضامین موصول ہوئے۔ بہت بہت شکریہ۔

جمیل الدین عالی کا مضمون بہت دلچسپ ہے۔ ہر سطر سے محبت ٹپکتی ہے۔ ہماری جوڑی بڑی انوکھی تھی۔ مگر...

"میں ہوں ہنوز اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"۔

اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ان ایام میں جو مکالمے ہوئے انہیں کسی طرح محفوظ کر لیا جاتا۔ خصوصاً" وہ گفتگوئیں' وہ بذلہ سنجیاں' فقرہ بازیاں اور نکتہ آفرینیاں جن کا تبادلہ (عالی کے چچا زاد بھائی اور خسر) صمصام میرزا صاحب مرحوم اور ان کے داماد کے مابین ہوتا تھا۔ دونوں بلا کے ذہین' شوخ اور طبّاع اور حاضر جواب تھے۔ اور گفتگو کے فن میں ان سے بھی زیادہ کامل ابن حسن برنی تھے۔ صمصام میرزا صاحب گویا زبان حال سے غالب کے اس شعر کو دہرایا کرتے تھے۔

"سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری۔ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے" طرحی غزلیں بڑے انہماک سے کہی

اور بڑے طمطراق سے پڑھی جاتی تھیں۔ چرخیاں صمصام میرزا صاحب عنایت کرتے تھے۔ غزل میں کوئی شعر اچھا ہوا تو اسے ایک چرخی عطا ہوتی۔ اگر زیادہ اچھا ہوتا تو دو چرخیاں اور اگر بہت اچھا ہوتا تو تین چرخیاں۔ چرخیوں کی اصطلاح انہوں نے (ٹک مارک) کے لئے وضع کی تھی۔ شکل اور وضع قطع برنارڈشا سے ملتی تھی۔ چہرے پر ذہانت کا بھی وہی عالم تھا۔ سسر داماد میں تابڑ توڑ نوک جھونک ایسی ہوتی کہ چنگاریاں لَو دینے لگتیں۔

اسی زمانہ میں ایک طویل نظم "شریک حیات کے انتظار میں" لکھی تھی' عالی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلند شہر کے مشاعروں کو ایک گلدستہ "قوس قزح" میں محفوظ کیا گیا۔ ایک غزل اس میں عالی کی تھی' غالب کی زمین میں۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

رشید* صاحب کی نظر سے وہ گلدستہ گزرا۔ اور عالی کی غزل کو انہوں نے سراہا۔ یہ بات میں نے ان تک پہنچا دی۔ گویا ۱۸ سال کی عمر میں وہ اچھی غزل کہنے لگے تھے۔ انہوں نے اہل قلم کی حیثیت سے امتیازات حاصل کئے۔ دوہوں کے لئے وہ اردو دنیا میں مشہور ہو گئے' لیکن غزل میں وہ اپنی اٹھان کی لاج نہ رکھ سکے۔ میں نے یہ بات ابن حسن برنی سے کہی تھی جو انہوں نے عالی کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے اپنی "رپننگ" کا جو گلہ مندانہ تذکرہ کیا ہے اس کا روئے سخن میرے اس تخمینہ کی طرف ہے۔ عالی نے حکومت اور اور ادب دونوں میں وہ مراتب حاصل کئے جو خود اپنے لئے میرے تصور سے باہر تھے۔ شاعری میں غیر معمولی ذہانت کو ریاضت سے کمک مل جاتی تو وہ آسمان سے تارے توڑ لاتے۔

عالی کی عمر مجھ سے پانچ چھ سال کم ہوگی۔ خوش رُو' خوش گو' خوش اندام' خوش جمال' خوش باش۔ بلند شہر کا پہلا قیام اس لحاظ سے میرے لئے اہم تھا کہ مشقِ سخن کا موقع ملا اور ابن حسن برنی اور جمیل الدین عالی ہاتھ آئے۔ اول الذکر کے تذکرے کو دفتر درکار ہوگا۔ وہ میرے سب سے اچھے دوست تھے لیکن مجھ سے بے تکلف اور بے باک بلاشبہ آخر الذکر ثابت ہوئے۔ ان کی ظرافت اور جسارت نے میرے خرقۂ سالوس میں جابجا چھید کر دئے اور اب بھی کبھی مل جاتے ہیں تو زبانی دست درازی سے باز نہیں آتے۔ شکایت اس کی رہی کہ ملتے بہت کم ہیں۔ سیاسی دیوار بھی حائل ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ ان کی کم حضری اور بسیار سفری۔ ایک عالم ان کے زیر بار رہتا ہے۔ ان کا سراغ لگائے رکھنا نہایت دشوار اور جہاں نیاں جہاں گرد' سیلانی' سیمابی' بے تاب' انہیں مجھ پر سدا اعتماد رہا۔ لیکن (یہاں بھی میں پلّے میں ہلکا پڑ رہا ہوں) اس طویل عرصے میں طویل فاصلوں اور ان سے زیادہ طویل وقفوں کی بدولت میں دور دور رہا' یہ بھی سوچا کہ ترقی کی منازل ہوش رُبا سرعت سے طے کرنے کے بعد شاید وہ مجھے درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ آپس میں خط کتابت بہت کم ہوتی تھی۔ ابن حسن برنی البتہ ان کی خیریت ضرور لکھ دیا کرتے تھے۔ ان سے ملے ہوئے "صدیاں" گزر جاتیں۔ شاید پینتیس سال کے وقفے کے بعد ایک مرتبہ دہلی کلاتھ مل کے مشاعرہ میں وہ نظر آئے' میری شومئی قسمت کہ لیل ونہار کی نقاب کو چیرنے میں ناکامیاب

رہا۔ زمان و مکاں کے فاصلے سے انہیں پہچان نہیں سکا۔ وہ بہت بدل گئے تھے۔ چھریرے بدن والے' اچھلتے ہوئے پھٹے پڑتے خوبرو نوجوان کی جگہ ایک ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم انسان نے لے لی تھی جس کی قامت کے پیچ و خم عمر کے ہاتھوں خود جھک گئے تھے۔ دبدبہ اور وجاہت نے حسن و جمال کی جگہ لے لی تھی۔ میری بیوی نے اشارہ کیا کہ وہ عالی تو نہیں ہیں۔ میں نامراد یہ نہ سمجھ سکا کہ ۱۸ اور ۵۰ میں بڑا فرق ہوتا ہے' میں عالی کی اسی ہیئت پر اڑا رہا جسے اتنے عرصے سے لئے گھوم رہا تھا۔ انہوں نے اسٹیج پر سے ہم دونوں کو تاڑ لیا تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا' اترے اور لپٹ گئے۔ اور اس کے بعد فوراً الگ ہو گئے اور سر سے پیر تک مجھ پر کئی بار نظر کی۔ ز فرق تا بہ قدم یہ ایک نظر جو بظاہر نگاہ سے بہت زیادہ تھی مجھ سے کہہ گئی کہ تم نے عالی کے بارے میں جن بدگمانیوں کو راہ دی تھی وہ بے بنیاد اور ناروا تھیں۔ ان کی نگاہ میں بلا کی اپنائیت اور محبت تھی۔ ایسا شخص کتنے ہی فاصلے پر رہے' تمہارے خیال سے کبھی غافل نہ ہو گا۔

میرے دوستوں میں ایک عالی ہی ہیں جو ہمارے گھر کے فرد ہیں۔ طیبہ بہن نے مجھے اپنا بھائی سمجھا۔ میں خوش ہوں کہ جب کبھی ان کی عالی سے شکر رنجی ہوئی' انہوں نے میرے گھر کو اپنا میکہ بنایا۔ اور انہیں راہ احتذار دکھادی۔ ہماری یہ بہن بہت محبت کرنے والی ہیں۔ عالی نے جو امتیازات حاصل کئے مجھے ان پر فخر ہے لیکن ان سے گہرے قرب کی ایک وجہ یہ ہے کہ طیبہ بہن کو بی جان (والدہ مرحومہ) نے بیٹی بنایا تھا اور اس منفلہ بہت کامیاب شادی کی محرک بی جان ہی تھیں۔ عالی دوسری طرف بھائی جان سے ملتے رہے۔ حکومت پاکستان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے ایک یا دو بار جب وہ اسلام آباد آئے تو بھائی جان کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی۔

کراچی میں ایک بار طیبہ بہن نے کھانے پر بلایا' بڑا اہتمام کیا۔ عالی حسب دستور نئی دنیا کی سیاحت کر رہے تھے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

میں نے یہ داستان اس لئے چھیڑ دی کہ آپ کو اس جانبداری کا راز معلوم ہو جائے جو عالی نے اپنے مضمون میں میرے تئیں برتی ہے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ میری سنجیدگی اور "معتبری" کی قبا کو چاک کریں گے۔ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت ناساز ہے۔ پروردگار انہیں صحت عطا فرمائے اور وہ پہلے کی طرح شوخ اور چونچال ہو جائیں۔

* پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

سید ضمیر جعفری

اردو ادب کا عبدالستار ایدھی

جناب جمیل الدین عالی ایک صاحبِ طرز شاعر' ایک منفرد کالم نگار اور ایک بالغ نظر دانشور کی حیثیت سے ملک کی اکابرو محبوب شخصیات کے "ذبّ اکبر" میں شامل ہیں۔ان کا فن اور فکر اشتراکیت کو زمانے اور سرمایہ داری میں جمہوریت کی پرورش کرنے والا ہے۔وہ جدید ہیں مگر ان پرانی غلطیوں کے ارتکاب سے ہچکچاتے نہیں؛ جو نئی سچائیوں سے بہتر ہیں۔ مگر مجھے تو یہاں ان کے فن کے رقص سے نہیں' ان کی ذات کے عکس سے سروکار رکھنا ہے۔

انہوں نے خوبصورت اور توانا ادب ہی تخلیق نہیں کیا اس ملک کی زمین میں لفظ کی کاشت کی آبیاری کے لئے ایک نہری "نیٹ ورک" (Net Work) کا ایک سدا ساون "سکھر بیراج" بھی تعمیر کیا جس کو ہماری تاریخ ادب فراموش نہیں کر سکتی- ایک ادبی تقریب میں مولانا چراغ حسن حسرت نے جناب ممتاز حسن (مرحوم) کے تعارف میں کہا تھا کہ ممتاز حسن ملک کے وزیر اعظم کے عہدے کے سوا ملک کے ہر عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اسی طرح جناب جمیل الدین عالی کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ قومی زبان کے مولوی عبدالحق نہیں رہے باقی سب کچھ رہے ہیں۔ اس عصر میں ان سے بہتر شاعر اور ادیب موجود ہوں گے مگر ادب اور ادیب کا ان جیسا دردمند دوست شاید کوئی نہ ہو' اس حوالے سے ان کو قلم قبیلے کے عبدالستار ایدھی کہنا بے محل نہ ہو گا' اگر کوئی دیکھنا چاہے تو ادب اور ادیبوں کی خدمت کے ایک وسیع محاذ پر جمیل الدین عالی کے نام کے کئی جھنڈے دور دور تک لہراتے دکھائی دیں گے۔ اپنے ہاں کے عسکری محاذ پر ہم نے ان کی سی مثال ۱۹۶۵ء کی جنگ میں "چونڈہ" کے محاذ پر سوار محمد حسین شہید کی تگ و تاز میں دیکھی؛ جس کے بارے میں اس محاذ کے کمانڈر جنرل عبدالعلی ملک کہا کرتے تھے کہ دشمن جس مورچے پر بھی فائر کرے' پہلی گولی سوار محمد حسین ہی کو لگے گی۔ جمیل الدین عالی کا تعلق ریاست لوہارو سے ہے مگر ان کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ وہ صرف عالی جی رہ گئے ہیں؛ جو سودا ان کے سر میں تھا وہ "صحرائے گوبی" میں نہ سما سکا' لوہارو کس کھیت کی مولی تھی- عالی جی

دراصل ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ذات کے بل بوتے پر اپنے شجرۂ نسب کے محتاج نہیں رہتے۔یہ تو اپنی ٹانگوں سے دوسروں کی نیند میں دوڑنے والے لوگ ہیں۔

شخصی حوالے سے بھی' وقت کی قلت اور "چہار سو" کے گوشے کی تنگ دامانی کے باعث ہم مجبوراً صرف ایک واقعے پر اکتفا کریں گے۔ عالی جی سے ہماری تعارفی نسبت کا آغاز اس صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز میں ہوا جب ان کے بڑے بھائی صاحب زادہ میرزا اعتزاز الدین احمد ہمایوں آف لوہارو ہمارے ضلع جہلم کے کپتان پولیس تھے (یہ کتنا عجیب مگر بامعنی اتفاق ہے کہ جس شاعر کی قومی اور رجزیہ شاعری نے آج ہمارے پورے ادب میں "تھرتھلی" برپا کرر کھی ہے اس نے اپنی باقاعدہ شاعری کا آغاز ضلع جہلم میں "سوہاوا" کے "ڈاک بنگلے" میں کیا'جہاں سے چند کوس کے فاصلے پر غازی تاجدار سلطان شہاب الدین محمد غوری آسودۂ خواب ہے)۔

واقعہ جس کی طرف ابھی اشارہ کیا ہمیں اپنے اکتوبر ۱۹۸۳ء کی ڈائری میں سے ملا (یہ روگ نہ جانے کیوں ہم نے ۱۹۴۳ء میں جان کو لگایا اور نہ جانے کس طرح اب تک اس سے نباہے چلے جا رہے ہیں' روداد حرف بہ حرف ڈائری میں سے نقل کی جا رہی ہے۔

عالی جی کی آمد

عالی جی نے کل کراچی سے فون کیا تھا کہ میں کل صبح کی پرواز سے آ رہا ہوں اور سیدھا آپ کے ہاں آ رہا ہوں' دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا' ابلے ہوئے چاول اور مونگ کی دال جو (آپ کے بقول) جناب ممتاز حسن آپ کے دوست نذیر احمد شیخ کے ہاں کھایا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ ملے بھی دن ہو گئے تھے' ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔سو بینک کی لمبی چوڑی "لیموزین" میں غریب خانے پر پہنچ گئے۔آتے ہی اپنے جگری دوست محمد عمر(ریڈیو پاکستان کے سابق کنٹرولر پروگرام) کو فون کیا' آجاؤ گاڑی بھجوا رہا ہوں۔ جلد ہی "چاول اور مونگ کی دال" کا وقت ہو گیا' اسی پر ملاقات کا ماجرا کھلا کہ پچھلے دنوں واہ چھاؤنی کے محنت کش شاعر سبط علی صبا کی موت نے عالی جی کو تڑپا دیا تھا' کھانے سے پہلے ہی نوالے پر صبا مرحوم کا یہ شعر۔

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لئے

سنا کے بولے ..... ضمیر بھائی! ایسا شعر کہنے والا شاعر ہمارے ملک میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور نہ ہم لوگ ٹس سے مس ہوئے'نہ کوئی ادارہ حرکت میں آیا۔ ضمیر بھائی!' یہ کتنے دکھ بلکہ شرم کی بات ہے۔ میں سوچتا ہوں' ہمیں کچھ کرنا چاہئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی سربراہی میں ایک صبا ٹرسٹ قائم کر دیا جائے۔پھر جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے بولے یہ رکھ لیجئے'چھ ہزار روپے ہیں (چیک تھے) اس حقیر رقم سے آغاز کیجئے'کچھ اور بھی مانگ تانگ لوں گا۔ایک کمیٹی بھی بنا دی گئی جو کرنل محمد خان' ابن الحسن (جو ان دنوں ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل تھے) رحیمہ فخری' پروین فنا سید' سلطان رشک' پروفیسر کرم حیدری اور واہ کے پروفیسر قاضی عارف پر مشتمل تھی (قاضی عارف سبط علی صبا مرحوم کے عزیز دوست تھے اور

برادری کی غالب تعداد اب بھی پنڈی میں رہتی ہے۔

اس کی پروانہ کیجئے کہ اسے انکم ٹیکس چھوٹ کا پروانہ ملا یا نہیں۔ نئے قانون کے مطابق اس میں دیر لگنے لگی ہے اور میری رائے میں آپ کو اتنی معمولی سی رقم کے لئے اس تفتیش کی ضرورت بھی نہیں۔ چھوٹ کے لئے اگر آپ کو زیادہ انکم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے تو یہ آپ کی دوسری سرمایہ کاری حدود مقررہ میں پہلے ہی سے پوری کرتی ہو گی..... لیکن جب چھوٹ کی اجازت سی بی آر سے مل گئی فوراً آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

چیک کی مجوزہ تاریخ اجراء پندرہ نومبر یوں ہے کہ ٹرسٹ اس تاریخ سے پہلے رجسٹرڈ ہو کر اکاؤنٹ نہیں کھول سکے گا۔

یہ بدیہی امر ہے کہ آپ کو اپنے چیک کی باضابطہ رسید ملے گی۔ واضح رہے کہ میں ایک اور خط اسی مضمون سے ذرا مختلف مگر اسی مقصد کے لئے اپنے تیس اور واقفوں کو بھیجوں گا لیکن ان سے مطالبہ ایک ہزار فی کس ہو گا۔ میرا یہ ہدف ساٹھ ہزار کا ہے۔ پندرہ آپ خواتین و حضرات جو ادیب برادری کے راست رکن ہیں اور تیس وہ جو تا حال میری توقع کے مطابق شاید اپنی ادب دوستی اور مجھ سے کچھ نہ کچھ مراسم کی بناء پر ایک ہزار دینے منظور کریں۔ چالیس تا پچاس ہزار عام عطیوں اور اشتہارات سے متوقع ہیں۔ دس ہزار میں مجموعہ چھپے گا۔ ایک لاکھ ٹرسٹ فنڈ کے ذریعے خاص ڈپازٹ میں ڈالنے کا منصوبہ ہے۔ زیادہ ہو گئے تو خاندان کی قسمت۔

میری ژولیدہ بیانی معاف مگر میرا مطالبہ' مقصد اور آپ سے توقع واضح ہے۔ معطیوں کے نام نہیں چھپیں گے نہ ظاہر کئے جائیں گے' لیکن اگر آپ نے مجھے مایوس کیا تو مجھے سخت قلق ہو گا۔ ہاں میں آپ کا انکار یا خاموشی کسی اور کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ کو یاد بھی نہیں دلاؤں گا۔ لیکن کم از کم رسید ضرور بھیجئے گا۔ اس خط کا جواب یعنی چیک حسب تجویز دس نومبر تک بھجوا دیجئے کیونکہ میں انشاء اللہ پندرہ نومبر کو تین ہفتے کے لئے نارتھ امریکہ چلا جاؤں گا۔

والسلام خادم آثم جمیل الدین عالی

(مطبوعہ۔ ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی' ۱۹۹۶ء)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

جمیل الدین عالی

گورا رنگ، چیکھے تیکھے نقش، قد قدرے لمبا مگر متوازن، گفتگو میں سنجیدگی، چال ڈھال رئیسانہ۔ یہ ہیں نواب زادہ جمیل الدین عالی جن سے میری پہلی ملاقات خواجہ شفیع کی اردو مجلس میں ہوئی۔ عالی میاں اس وقت بھی شعر کہتے تھے اور ترنم بھی بہت خوب تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اتنا تو اس وقت بھی نظر آتا تھا کہ آگے چل کر یہ ضرور کسی قابل ہوں گے لیکن اپنی محنت، کارکردگی، تجسس اور لگن سے جس مقام پر وہ اب پہنچے ہیں اس کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔ رئیس زادہ تو تھے ہی قیاس یہ ہوتا تھا کہ رئیسانہ زندگی بسر کریں گے اور جو معائب ومحاسن عام طور پر رئیس زادوں میں ہوتے ہیں ان میں بھی ہوں گے۔ کچھ ہی دیر کے بعد عالی میاں پاکستان ہجرت کر گئے کافی عرصے کے بعد جب دلّی آئے تو پتہ چلا کہ اپنی ذہانت اور محنت سے ممتاز عہدوں پر فائز رہے اور اب ایک بہت بڑے بینک کے سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ ان تمام مصروفیتوں کے باوجود عالی میاں کا ادبی ذوق نہ صرف قائم رہا بلکہ انھوں نے اس میں عالمی شہرت حاصل کی اور اس کی بدولت وہ دنیا کے ہر حصہ میں دورہ کر چکے ہیں لندن، امریکہ، کینیڈا، عرب ممالک، یورپ وغیرہ میں کئی بار مشاعرں میں شرکت کی ہے۔ بہت اچھی غزلیں اور نظمیں کہنے کے علاوہ دوہے بہت خوبصورت کہتے ہیں اور بڑے دلکش ترنم سے سناتے ہیں۔ آپ کئی شعری مجموعوں کے مصنف ہیں جو منظرعام پر آکر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی بڑی بڑی ادبی انجمنوں کے رکن بھی ہیں۔

ابھی حال میں ہی عالی بھارت آئے اور مجھے کچھ عرصہ ان کی رفاقت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ ان کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ ہر وقت علم حاصل کرنے کی سعی میں رہتے ہیں جہاں جاتے ہیں وہاں کے معاشرے کے بارے میں، اقتصادی حالات کے بارے میں، روایات کے بارے میں، غرض کہ طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں اور نوٹ بھی کر لیتے ہیں۔ سفرنامے بھی بہت اچھے لکھتے ہیں۔ روزنامہ "جنگ" میں آپ کا ایک مستقل کالم بھی چھپتا ہے کئی اور اخباروں اور ماہناموں میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ایک کارآمد اور فعال زندگی گزار رہے ہیں۔ رئیس زادوں میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہوں۔ عالی میاں یقیناً ایسی ہی شخصیت کے مالک ہیں مجھے عالی میاں بہت عزیز ہیں اور مجھے عزت بھی دیتے ہیں۔ خدا انھیں زندہ وسلامت رکھے۔ (آمین)

(اقتباس از سوانح حیات یادوں کا جشن)

احمد بشیر

ایک تاثر

"شہاب' جمیل الدین عالی کو بھی بہت چاہتا تھا مگر وہ ایک مراعات یافتہ مڈل کلاسیا ہے۔ انسان بھرے پیٹ کی صورت میں جس قسم کے غم پال سکتا ہے' عالی نے وہ سارے غم پال رکھے ہیں۔ اس کے مزاج میں اور اس کے کلام میں آلہا اودل کا لٹکا بھی ہے اور یوپی کے رئیس زادوں کی رضا بھی' جو تونگری اور خود پرستی کی دین ہوتی ہے۔ پاکستان سے اس کو اس لئے بھی عشق ہے کہ یہیں آکر اس نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ چھپ تو وہ ہندوستان میں بھی نہ سکتا' کیونکہ منہ زور آدمی ہے مگر کمان اس کی اس طرح نہ چڑھ سکتی۔ اس کا اپنا تحفظ ہو چکا مگر وہ جانتا ہے کہ وہ اقدار جن کو لے کر وہ گھر سے نکلا تھا خطرے میں ہیں وہ سیانا بہت ہے اس لئے برا کسی کو نہیں کہتا مگر نصیحت ہر ایک کو کرتا ہے۔ اس طرح بھی بعض لوگ بزرگ بن جاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں عدل کا دور دورہ ہو جائے' لوگ سچے پاکستانی بن جائیں اور کچھ تبدیلی بھی نہ ہو۔ اس کو ایوب خاں کی کوتاہیوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ وہ اگر ہماری بات مانتا رہتا تو ہم اسے شہو سے بڑا آدمی بنا کر چھوڑتے۔ وہ پاکستان کے زوال پر دل سے روتا ہے مگر اس کو بالکل یاد نہیں کہ اس کا عروج اس وقت شروع ہوا تھا جب ایوان صدر میں اس کے سانسوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ وہ ایک پر شکوہ خرد ماغ باشعور مڈل کلاسیا ہے جو جانتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ تاریخ کے بہاؤ میں ہے اور اگر محروموں اور مظلوموں کو زندگی کے اسباب اور کم سے کم عزتِ نفس نہ ملی تو دریا چٹانیں توڑ کر اور پہاڑ کاٹ کر نکل جائیں گے پھر نہ رہے گا جمیل الدین عالی اور نہ بجے گی بانسری' شہاب جس کے نغمے بڑے شوق سے سنتا تھا"۔

(اقتباس 'جو ملے تھے راہ میں' مطبوعہ ۱۹۹۵ء لاہور)

نورالحسن جعفری
(صدر انجمن ترقی اردو پاکستان)

عالی جی

عالی جی کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔ یہ شاعر ہیں۔ غزل' دوہے' قومی گیت اور اب "اے مرے دشت سخن" میں فکری شاعری : کالم نگاری' جس میں معیشت' سفرنامے' سیاسی اور سماجی مسائل سب شامل ہوتے ہیں۔ ۳۲ سال تسلسل سے جنگ میں کالم لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ فکر کے علاوہ اس میں ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی خاندانی نواب کے لئے جس کا نام Princes of India کے گزٹ میں درج ہو' یہ خاصا مشکل کام ہے کہ وہ اخبار کی Deadline کا پاس بھی رکھے اور اپنی سماجی اور سرکاری و غیر سرکاری ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہو۔ بحیثیت Assistant ملازمت شروع کی۔ پاکستان میں مقابلہ کے امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے۔ محکمہ' انکم ٹیکس کا ملا۔ کہاں شاعری اور کہاں روزی کے لئے لیجر اور بیلنس شیٹ' یہ بھی ان کے لئے امتحان تھا۔

ادیبوں کے لئے گلڈ بنایا' جس میں اپنی انتظامی صلاحیتوں کا پورا مظاہرہ کیا اور خوب بدنام بھی ہوئے۔ صدر ایوب خان کے دفتر میں افسر بکار خاص ہوئے۔ وہاں سے نکلے تو جناب اختر حسین صاحب کے ساتھ پریس ٹرسٹ کے سیکریٹری ہو گئے۔ اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ اس ادارہ سے استعفیٰ دینے کی ہدایت میں نے ہی ان کو ٹیلی فون پر دی تھی۔ اس کی وجہ میری دوستی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ فیصلہ کس سطح پر ہوا۔ میں لاہور سرکاری کام سے گیا ہوا تھا اور شام کو محمد شعیب وزیر خزانہ سے ملنے گورنمنٹ ہاؤس گیا ان کا حکم ہوا کہ عالی کو فون کرو کہ وہ پریس ٹرسٹ سے مستعفی ہو جائے۔ میں نے وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ تم کو معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ خود یہ احکامات کیوں نہیں دیتے تو جواب دیا کہ تم ان کے دوست ہو۔ میں نے کہا کہ جب عالی مجھ سے یہ

سوال کریں گے کہ کیوں اور ان کا کیا بنے گا کیونکہ وہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد دوسری بار ٹرسٹ میں آئے تھے تو میں کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے صرف یہ فرمایا کہ ان سے کہنا بعد میں انتظام ہو جائے گا۔ عالی سے میری رومنٹ کی گفتگو ہوئی اور عالی جی بے روزگار چند ہفتے بعد شعیب صاحب وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ یہ ملک سے باہر چلے گئے۔ کئی مہینے بے کار رہے۔ پھر نیشنل بینک میں ٹیکس ایڈوائزر کی آسامی خالی ہوئی تو وہ آسامی مشتہر ہوئی۔ یہ انتخابی بورڈ کے سامنے آئے اور نیشنل بینک میں ملازم ہو گئے اور کچھ مدت بعد طویل عرصہ بینکاری کے مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے اور اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ اس درمیان میں سیاست کا بھی شوق ہوا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ جنگ میں کالم لکھتے تھے۔ اچھے مقرر تھے۔ قومی نغموں کی بڑی شہرت تھی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی نظر ان پر پڑی اور یہ کراچی سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑے اور ہار گئے۔ اگر انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا ہوتا تو میں ان کو منع کرتا کہ بینک کی ملازمت نیم سرکاری ملازمت ہے وہ قانون تو بدل گیا مگر روایت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں' لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرا مشورہ نہیں مانتے' "نام وری" کا نشہ بھی ایک الگ چیز ہے۔ بحیثیت شاعر اور کالم نگار وہ خاصے مشہور تھے۔ لیکن کوچۂ سیاست کا لطف کچھ اور ہے۔

مارشل لاء کی حکومت آئی اور ایک عمومی مارشل لاء ضابطے کے تحت عالی جی بھی بینک سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ نیت ان کی نیک تھی' اچھی شہرت کے مالک تھے۔ بعض مصلحتوں سے اس ضابطے میں بھی گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے خلاف کوئی الزام بھی نہ تھا' سب سے بڑھ کر انہیں اپنے ان بہت سے کارکنوں کو سرکاری کارندوں کے عتاب سے بچانا تھا جو دراصل سرکاری اور نیم سرکاری کالجوں اور بینکوں کے ملازم تھے اور ان کی محبت میں الیکشن کے دوران میں ان کے کارکن ہو گئے تھے اور اب سخت خطرے میں تھے۔ کچھ تگ و دو کے بعد نیشنل بینک میں ہی واپس آ گئے۔ شکر ہے کہ پھر الیکشن کا شوق نہیں ہوا۔ ریٹائر ہوتے ہوتے ملازمت میں توسیع بھی ملی۔ اس سے پہلے پاکستان بینکنگ کونسل کے ممبر ہو گئے تھے اور غالباً سات سال ہوئے کہ ریٹائر ہو گئے اور اب آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باقاعدہ کالم لکھتے ہیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں جو ان کے پاس پہنچ جائے اور ایک دردناک کہانی سنائے۔ دوستوں کی دلجوئی اس وقت زیادہ کرتے ہیں جب وہ خدانخواستہ پریشان ہوں ورنہ ہفتوں غائب ہو جائیں گے۔ دعوت منظور کریں گے اور شریک نہیں ہوں گے۔ ان کے پاس ایک بہت آسان بہانہ ہے کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا بار بار تجربہ ہوا ہے لیکن بہرحال یہ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے اور جب آپ کی کسی سے دوستی ہو جائے تو پھر آپ کو اسے مکمل طور پر قبول کرنا ہوتا ہے۔

یہ ایک تاثراتی مضمون ہے۔ عالی صاحب کی شاعری یا کالم نگاری پر میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ عالی کی میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۱ء میں ابن سعید کی وساطت سے ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ان کی غزلیں "ماہ نو" میں شائع ہو رہی تھیں' ایک دن میں نے مرزا حسن عسکری (ابن سعید) سے ذکر کیا کہ بھائی

عالی کون ہیں۔ نہایت عمدہ غزلیں لکھ رہے ہیں۔ عسکری نے کہا کہ وہ عالی کے ہم جماعت اور بچپن کے دوست ہیں۔ ان سے ملاقات کے لئے ہم دونوں نے کراچی کے دورہ کا پروگرام بنایا۔ ہم دونوں سائیکل پر سوار عالی کے دفتر پہنچے' یہ بوسیدہ انکم ٹیکس کا دفتر اب بھی اسی طرح جناح روڈ پر موجود ہے۔ O.M.I جو اب ایک مشہور اسپتال ہے' اس کے نزدیک ہے۔ عالی سے میرا تعارف ہوا۔ دبلے پتلے' کھلتا ہوا رنگ' شیروانی میں ملبوس تھے۔ انہوں نے دفتر سے غالباً' رخصت لی اور ہم تینوں پیدل Zelin کافی ہاؤس کے لئے روانہ ہوگئے۔ غالباً تین چار گھنٹے وہاں بیٹھے رہے۔ لنچ بھی کھلایا۔ یہ تو تھی ابتدا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ میں عالی کو ہمیشہ سے جانتا ہوں' اس میں ماہ و سال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

میرے بچوں کو میری اور عالی کی دوستی پر بہت حیرت ہے اور اب بھی وہ کبھی کبھی اس کا اظہار کردیتے ہیں۔ میرا تعلق ایک متوسط طبقہ سے ہے۔ میں نے اپنی پوری تعلیم الہ آباد یونیورسٹی میں مکمل کی۔ اہل زبان ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ میں ہندوستان میں مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا۔ کامیاب ہوگیا اور افسر ہوگیا۔ وقت کی پابندی میری کمزوری ہے' جس سے میری بیوی زندگی بھر نالاں رہی۔ میں قاعدہ قانون کی پابندی اپنے اوپر عائد کرتا ہوں۔ فطرتاً" محتاط ہوں۔ آپ چاہیں تو ڈرپوک کہہ لیں۔ عالی دہلی کے نواب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور نوابوں کا مزاج رکھتے ہیں۔ وقت کی پابندی کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وقت طے کرکے کسی پروگرام میں شریک نہ ہونا ان کے نزدیک کوئی غیر اخلاقی بات نہیں ہے۔ بچوں سے محبت کرتے ہیں لیکن دوستوں کے سامنے بھی جوان بچوں پر اونچی آواز میں حکم چلاتے ہیں جس پر میں نے ان کو منع بھی کیا' کیونکہ متوسط درجے کے خاندانوں میں یہ رواج نہیں ہے۔ وہ گھر کو بھی دربار سمجھتے ہیں جہاں ان کے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے اور دربار کی طرح ہر شخص اپنے منصب سے آگاہ ہو۔ لیکن ان کے نوابی مزاج کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ عالی ہر ایک سے برابری کے درجے پر ملتے ہیں' خواہ وہ وزیر ہو یا اس سے بھی کوئی اونچا عہدہ دار۔ کسی کے سامنے اپنے مفاد کے لئے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ آخر کو مغل نواب زادے ہیں۔ جب یہ ایوان صدر سے الگ ہوئے یا جب انہوں نے Press Trust سے استعفیٰ دیا۔ اگر یہ مفاہمت کے لئے اشارہ بھی کرتے تو ان کی واپسی کچھ مشکل نہیں تھی مگر عالی ٹوٹ جائیں گے' جھکیں گے نہیں۔

عالی جی کو خوب معلوم ہے کہ ان کے قریب ترین دوستوں کو ان سے شکایت رہتی ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ سماجی تعلقات میں روایتی وعدوں کو پورا نہیں کرتے۔ کھانے سے غائب ہوجاتے ہیں۔ انتظار ہوتا ہے اور وہ نہیں آتے اور بس بخار یا سر کے درد کا بہانہ کردیتے ہیں لیکن باوجود اس کے ان کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش وجاذبیت ہے کہ ان کے دوست ان کو چھوڑتے نہیں۔ لیکن انہیں امید ہے کہ ان کے صبر کا صلہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ضرور ملے گا۔

ذاتی معاملات میں ان کی زندگی بے ترتیبی سے عبارت ہے۔ چار پانچ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنا ٹیکس کا گوشوارہ صحیح وقت پر فائل نہیں کرسکتے کیونکہ متعلقہ کاغذات کسی ایک جگہ دستیاب نہیں ہوتے۔ انہوں نے بہت لکھا ہے لیکن تمام مسودات ایک جگہ پر نہیں ہیں' ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس جگہ ہیں۔ کبھی کتابوں میں مل گئے ' کبھی درازوں میں' کبھی کسی بستے میں یا کسی بکس میں جہاں ان کو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اس کام کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ اور اس کے لئے تھوڑا صبر بھی چاہئے۔ اسی بے صبری کی وجہ سے عالی جی عموماً Tense رہتے ہیں۔ یوں تمام شاعر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عام آدمی سے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور اسی بہانے وہ اپنی بہت ساری ذمہ داریوں کو ٹال بھی جاتے ہیں۔

جب تک میں اسلام آباد اور لاہور رہا' اور یہ عرصہ تقریباً ۲۵ سال ہے ' عالی جی سے ملاقات تفصیلی ہوا کرتی تھی۔ اب جبکہ پندرہ سال سے ہم دونوں ایک ہی شہر میں مقیم ہیں مجھے ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا لیکن ملاقات کا دورانیہ کم ہوگیا ہے۔ فون پر گفتگو زیادہ ہوتی ہے۔ کراچی اتنا مصروف شہر ہے کہ اس کے لئے خصوصی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ سال میں ایک دو بار سے زیادہ اس کا موقع نہیں ملتا جب صرف عالی جی اور طیبہ بہن سے بے تکلف گفتگو کا موقع ملے' جس میں بحث بھی ہوتی ہے اور لڑائی بھی۔ انجمن اور سماجی تقاریب میں ملاقات ہوجاتی ہے لیکن شہر میں نہیں ہوتی۔

کسی سرکاری ملازم کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ حکومت کا سیکریٹری ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ یہ اعزاز مجھے بھی حاصل ہوا لیکن اس میں میری لیاقت کا کوئی دخل نہیں۔ صرف ربِّ کریم کا احسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز انجمن کی صدارت ہے۔ اس میں عالی جی کا ہاتھ ہے۔ جب ۸۳ء میں ریٹائر ہوا تو عالی جی نے کہا کہ میں کچھ وقت انجمن کو دوں' میں نے معذرت کی۔ میں علمی آدمی نہیں ہوں۔ اردو کا ایک عام قاری ہوں۔ مجھے زبان سے کوئی جذباتی لگاؤ بھی نہیں تھا۔ بابائے اردو کو میں نے صرف ایک بار گلڈ کے افتتاحی اجلاس میں صدارت کی کرسی پر دیکھا جب عالی صاحب کی ذہانت و جرأت کی وجہ سے صدر ایوب جلسہ میں عام سامعین کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً پاکستان کی تاریخ میں صرف ایک بار ایسا ہوا کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر ایک ادبی جلسہ میں عام سامع کی حیثیت سے شامل ہوا اور کرسیِ صدارت پر کوئی اور عالم جلوہ افروز تھا۔ عالی جی نے کہا کہ اختر حسین بھی انجمن کے صدر رہ چکے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ مغربی پاکستان کے گورنر رہ چکے تھے۔ شہاب صاحب ان کے بعد صدر ہوئے۔ جیسا کہ شہاب صاحب کا قاعدہ تھا' انہوں نے نہایت نرم لہجے میں مجھ سے بات کی اور یہ کہا کہ وہ کُل وقت تو کراچی میں قیام نہیں کرسکتے۔ اسلام آباد میں رہتے ہوئے وہ صرف ادبی معاملات اور پالیسی کے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرسکتے ہیں لیکن روز مرہ کے معاملات اور بلوں کی ادائیگی وغیرہ کے لئے میرا تجربہ نہایت موزوں ہے۔ میں

تیار ہو گیا عالی صاحب کا اصرار اور پھر شہاب صاحب کی گفتگو' انجمن کے دستور میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے ان کے مشورے پر متولیان نے مجھے "ناظم اعلیٰ" کا درجہ عطا کیا اور شہاب صاحب نے اپنی بہت ساری انتظامی ذمہ داریاں مجھے سونپ دیں وہ تقریباً ہر تیسرے ماہ آتے۔ دس پندرہ دن قیام کرتے۔ میں کچھ اہم فائلیں ان کو ڈاک سے بھیج دیا کرتا۔ میں نے انجمن کے مالی حالات بہتر کرنے کی کوشش کی' لیکن یہ الگ کہانی ہے۔

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد عالی کی تحریک پر متولیان نے مجھے صدر انجمن منتخب کرلیا۔ اس کے بعد عالی صاحب سے رابطہ بڑھا وہ اب ۳۲ سال کے عرصہ سے انجمن کے معتمد اعزازی ہیں۔ اسی دوران میں انہوں نے اردو فنون کالج کی توسیع کی اور اختر حسین صاحب کی سرپرستی میں نئے اردو سائنس کالج کی زمین حاصل کی اور عمارت بنوائی۔ ظاہری بات ہے کہ دوڑ دھوپ تو عالی صاحب ہی نے کی۔ صرف یہی دو کارنامے عالی صاحب کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کی شخصیت کی بہت ساری جہتیں ہیں۔ پاکستان کی ستر فیصد آبادی ناخواندہ ہے۔ عالی صاحب "جیوے جیوے پاکستان" اور "ہم مصطفوی مصطفوی ہیں" کے خالق کی حیثیت سے نسل در نسل یاد کئے جائیں گے۔ جنگ کے زمانے میں ان کے لکھے ہوئے قومی نغمے اس کے علاوہ ہیں۔ عالی صاحب کی یہ تخلیقات "قومی ترانہ" کی طرح ہی مشہور ہیں۔ ایک پڑھا لکھا قاری ان کو "غزلیں دوہے گیت" اور سفرناموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ان کی غزلوں اور دوہوں میں جو غنائیت اور رچاؤ ہے' اس کا جواب نہیں۔ میں بحیثیت قاری صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عام قاری کے لئے یہ غزل اور دوہے کے منفرد شاعر ہیں۔ دوہوں میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ اخبار نویس اور قاری ان کو ان کے مستقبل اور معاشیات کے کالموں کی وجہ سے یاد رکھیں گے۔

ان کو دنیا کے کلاسیکی ادب پر دسترس حاصل ہے اور ایک عام قاری ان کی وجہ سے ان نادر چیزوں سے بھی روشناس ہوا ہے۔ یہ بذات خود ایک منفرد اعزاز ہے۔ دانشوروں کی نظر میں وہ اپنی عام تحریروں' بے لاگ تبصروں اور اب اپنی تازہ ترین تصنیف "اے مرے دشت سخن" کی وجہ سے اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ عالی صاحب انجمن کی ہر کتاب پر "حرفے چند" کے عنوان سے کبھی مختصر کبھی طویل تعارف لکھتے ہیں۔ "حرفے چند" کی دو جلدیں انجمن سے شائع ہو چکی ہیں' اس سے عالی صاحب کے علمی مقام کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے' ان کو مختلف موضوعات پر کتنا عبور حاصل ہے' خواہ وہ شاعری ہو یا تاریخ' لسانیات ہو یا معاشیات' مذہب ہو یا اساطیر (Mythology)۔

انجمن کے انتظامی معاملات میں میرا اور عالی جی کا اختلاف ایک یقینی امر ہے کیونکہ ہمارے مزاج اور تربیت مختلف ہیں۔ یہ بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ کوئی مسودہ لائے اور اپنی محنت کی طویل کہانی سنائے یہ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انجمن کے وسائل کم ہیں اس لئے میں زیادہ محتاط رویہ اختیار کرتا ہوں' لیکن

آخر کار سمجھوتا ہو جاتا ہے۔

عالی جی میں کچھ مقناطیسی صفت ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ مخالفت بھی کرتے ہیں اور ان کی مجلس احباب میں شامل بھی ہونا چاہتے ہیں۔ جتنا کام ادب اور ادیبوں کے لئے انہوں نے گلڈ اور انجمن کے ذریعے کیا ہے اس کا اعتراف ایک مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہ یہ ایک متنازع فیہ شخصیت ہیں' اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے لیکن جو شخص لگن کے ساتھ کام کرتا ہے اس کی قسمت میں حسد کا شکار ہونا یقینی ہے۔ لیکن عالی کی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ ہاں ان پر بہت سارے ناروا حملے ہوئے جن کو انہوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وقتی طور پر طول ضرور ہو جاتے ہیں۔

عالی صاحب ایک مخلص دوست ہیں' اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے وہ ممکن ہے کہ آپ کی خوشی میں شریک نہ ہوں لیکن اگر خدانخواستہ آپ کسی تکلیف یا مصیبت میں ہیں تو وہ تن' من' دھن سے آپ کا ساتھ دیں گے۔ یہ بڑی بات ہے۔ جذباتی ہیں' جو کچھ دل میں آئے گا وہ فوراً زبان سے ادا کر دیں گے۔ موقع محل کا خیال نہیں کرتے لیکن وہ کسی کے خلاف کوئی "Planing" نہیں کر سکتے' یہ ان کا مزاج نہیں ہے۔ بہت سی انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اب صحت اور مصروفیات کی وجہ سے اپنی ان صلاحیتوں کو پورے طور پر بروئے کار نہیں لا سکتے لیکن جتنا کام وہ کر چکے ہیں' اردو ادب اور انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں ان کا نام آ چکا ہے۔

انسانی سطح پر عالی جی کی دوستی مجھے بہت عزیز ہے۔

("جنگ" کے زیر اہتمام تقریب سپاس" میں خطبہ (۱۹۹۵)

ایس سہائے
(سابق چیف ایڈیٹر' اسٹیٹسمین دہلی / کلکتہ)
(ترجمہ از انگریزی)

عالی

مجھے اعتراف ہے کہ میرے دوست بہ آسانی نہیں بنتے' یہ صرف خدا کا فضل ہے کہ اتنی آسانی سے دوستوں میں کمی بھی واقع نہیں ہوتی۔ میرے پیارے دوستوں میں بیشتر اپنی آخری سانس تک میری دوستی نبھاتے رہے۔ بچھڑ جانے والوں میں ایک پیاری سی دلنواز یاد' حامدی بے (Hamdi Bay) کی ہے جو میرے پروفیشنل استاد تھے۔ بڑے وسیع القلب تھے' انہوں نے ہی مجھے ایک صحافی کے طور پر بھرتی کیا تھا اور جو اسٹیٹسمین (Statesman) میں میری شمولیت کے لئے بہت متحرک و ممد و معاون تھے۔ پھر ایسا واقعہ پیش آیا کہ ان کی جگہ میرا تقرر ہو گیا۔ ان کا فوری ردعمل ایک خط تھا جو مجھے گوہاٹی سے ارسال کیا گیا' جہاں وہ اس وقت تھے۔ انہوں نے لکھا تھا "جی' آپ کی ماتحتی میں کام کرنا سعادت سمجھوں گا" میں ان کی یاد کو سلام پیش کرتا ہوں۔

جمیل الدین عالی کے ساتھ میری دوستی ۱۹۶۳ سے ہے۔ برسابرس پر محیط اس دوستی میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ اس کا ثمر ہمیں ایک خوبصورت خاندانی دوستی کی صورت میں ملا ہے۔ میری رفیقہ حیات اور میں پہلے بھی ضیاء حکومت کی دعوت پر پاکستان جا چکے تھے۔ آپ کو ان صدر صاحب کے مخصوص تعلقات عامہ کا علم ہوگا کہ وہ کتنے اعلیٰ پایہ کے تھے' فرمایا کہ "سہائے صاحب (Sahay)' خاطر جمع رکھئے' آپ یہاں انتہائی اہم شخصیت ہیں۔ آپ ہمیں حکم کیجئے' تعمیل ہوگی۔" "جناب میں تو ایک ادنیٰ صحافی ہوں" اپنی پذیرائی پر ہم حکومت کے شکرگزار ہوئے تھے لیکن ایک خوشگوار یاد تازہ ہے۔ عالی فیملی نے کراچی پہنچنے پر ہمارا پرتپاک خیرمقدم کیا تھا۔ بھابھی ہم سے ملنے فوری طور پر ہوٹل آئیں۔ انہیں شاید علم تھا کہ میری بیوی صرف سبزی خور ہیں' چنانچہ ہم پسند کرتے یا نہ کرتے وہ خود سبزی ترکاری بناتیں اور اپنے صاحبزادے کے ہاتھ ہوٹل تک پہنچاتیں۔ ان کا یہ سلوک مذہبی پابندی کی طرح کراچی میں ہمارے تمام قیام کے دوران جاری رہا۔ بھابھی کو خوشگوار حد تک یہ

دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ مدیر اسٹیٹسمین کی بیوی ایک "تتلی" نہ تھی جیسا کہ انہوں نے فرض کرلیا تھا کہ ہوگی۔ (خیر یہ الگ معاملہ ہے)

عالی کے ہمراہ جب بھابھی دہلی آئی تھیں تو ہمیں بھی موقع ملا تھا کہ جو کچھ ہم ان کے لئے کرسکتے تھے کریں' ان کے بچے حیرا' ربیعہ اور اس کے شوہر بھی آئے تھے۔ میرے اور ان کے بچوں کے لئے اب بڑا وقت ہی وقت تھا۔ بلاشبہ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی مزید پروان چڑھے گی' حتیٰ کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی وہ جاری رہے گی۔ یہ مجھے امید ہی نہیں' یقین بھی ہے۔

بات ابتدا سے شروع کریں۔ مجھے اور عالی کو ۱۹۶۳ء میں ہارورڈ (Harward) کے بین الاقوامی سیمینار کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اس وقت تقابلی طور پر کم کم جانے پہچانے' ڈاکٹر ہنری کے سنجر (Henry Kissinger) سیمینار کے کرتا دھرتا تھے۔ اس سال تقریباً چالیس افراد دنیا بھر سے منتخب ہوئے تھے' جس میں ہندوستانی کوٹہ تین افراد کا تھا۔ دوسرے دو ہندوستانی جنہیں منتخب کیا گیا تھا ان میں سے ایک مس داوے (Miss Dave) تھیں جنہیں مسز گاندھی کی اشیرواد حاصل تھی اور جو کانگریس کی خواتین سیل میں سیکنڈ ان کمانڈ تھیں۔ (وہ ناگہانی طور پر وفات پاچکی ہیں) تیسرا ہندوستانی ٹی-وی کنہی کرشنن (T.V Kunhi Krishnan) تھا' جواب ناشرین کی ایک بہت بڑی تنظیم میں اعلیٰ عہدیدار ہے۔ (وہ جنوب کا تھا)

یہ سفر اس طرح ہوا کہ ایشیا اور یورپ سے آنے والے حضرات پہلے پیرس میں جمع ہوئے۔ ازاں بعد جہاز کے ذریعہ نیویارک پہنچے اور پھر وہاں سے گاڑیوں کے ذریعہ ہارورڈ روانہ ہوئے۔ جہاز کے پانچ روزہ سفر میں سب لوگ اپنے دیگر ساتھیوں سے گھل مل چکے تھے۔ عالی ان لوگوں کے درمیان موجود نہ تھے۔ میرے خیال میں انہوں نے پیسفک روٹ اختیار کیا ہوگا۔ وہ سیدھے ہوائی جہاز سے بوسٹن پہنچے' وہاں سے ہارورڈ آئے اور سیمینار کے تعارفی سیشن میں اپنی جھلک دکھائی۔ ایک خوش وضع وقطع اور خودشناس شخصیت' جیسی کہ ان کی ایک الگ دنیا ہے۔ بات تو سمجھ میں آتی ہے' عالی صدر ایوب کے پرسنل سیکریٹری☆ تھے' بھی ریونیو سروس سے تعلق رہ چکا تھا' اب ایک معروف اور نامور شاعر بھی تھے۔ ایک اہم بات کے بغیر یہ تذکرہ تشنہ رہے گا۔ ہم بھارتیوں کو کسی آٹھ ڈالر سے زیادہ ملک سے باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ عالی نے پاکستانی ضوابط کے مطابق سیمینار کے دوران اپنی نوکری کا وہ عرصہ یو ایس اے منتقل کرنے کا بندوبست کرلیا تھا۔ انہیں ڈالر کا ہماری طرح شدید مسئلہ نہ تھا۔ برسبیل تذکرہ مجھے ان کا مشورہ تھا کہ میں ایک نیا سوٹ سلوالوں' جس کی ادائیگی بعد کو کردی جائے۔ عالی ایک کریم النفس شخص تھے اور ہیں جیسا کہ میں نے انہیں بعد کو پایا۔ میں سوٹ نہیں سلواسکا۔ خرید بھی نہیں سکا۔

ہم نے اپنے طور پر بقائے باہمی کا سمجھوتہ کرلیا تھا' شاید اس لئے کہ زبان کا بندھن تھا اور غالباً" اس لئے بھی کہ میں اسٹیٹسمین کا چیف سب ایڈیٹر تھا۔ میں ایک خود اعتبار شخص تھا مگر ایک بھارتی اور پاکستانی کے درمیان یہ دوستی سیمینار میں شرکت کرنے والے بہتوں کے لئے سراسر الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ہمیشہ سب میں مقبول عالی نے اپنے بازو میری جانب

ہی کشادہ کر دیئے تھے۔ چنانچہ اپنی باری پر میں نے بھی انتہائی مسرت سے چپ چاپ ہی کیا' مگر عالی کے معاملہ میں ٹھیک ایسے ہی خیلات مس داوے کے نہیں تھے۔ گزشتہ حالات کے پیش نظر ان کی نظر میں میرا رویہ دونوں کے لئے غیر منصفانہ تھا۔ مس داوے کی پوری توجہ اپنی ذات پر مرکوز تھی۔ در حقیقت انہیں خود میرے خلاف ایک عامیانہ سی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ عامیانہ شکایت کیا تھی؟ عوامی یا نجی محفلوں کے دوران جب عالی شعر سناتے ہوتے تو شرکاء کی جانب سے متن کی زبان سمجھے بغیر مکرر' مکرر کی فرمائشیں آتیں پھر کسی قدر ترجمہ بھی ہوتا مگر زیادہ تاثر عالی کی شخصیت اور خوش الحانی اور خود اعتمادی کا ہوتا تھا۔ ان کے خیال میں میں حب الوطنی کے گیت کیوں نہیں گا سکتا تھا جبکہ عالی اپنے وطن کے لئے بھی لہرا لہرا کر گاتے تھے۔ وہ مزید ناخوش اس وقت ہوئیں' جب سیمینار کے کسی ایک اجلاس میں میں نے برملا بتایا کہ میرے ملک میں کتنا کرپشن پھیلا ہوا ہے۔ گو عالی چپ بیٹھے رہے مگر شاید مس داوے نے میری اس بات کو انتہائی غیر حب الوطنی پر محمول کیا۔ تاہم انہوں نے میرے قصور کو نظرانداز کر دیا۔ اور پھر ہماری دوستی ہندوستان واپسی پر ان کی اچانک موت تک جاری رہی۔ وہ ایک چار سنگ کنواری تھیں۔ عالی ایک شوقین شاعر کے طور پر مقامی خواتین میں تو بہت مقبول ہو گئے مگر دونوں نے ایک دوسرے سے ایک محترم فاصلہ رکھا۔ عالی نے ان کے متعلق کوئی غیر ذمہ دارانہ گفتگو بھی نہیں کی جبکہ وہ فقرہ بازی میں خاصے تیز اور معروف تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم نے سیمینار میں کیا بحث و مباحث کے یا سنے لیکن سیمینار میں شریک کچھ کرداروں نے ذہن پر انمٹ نقوش ثبت کر دیئے۔ ہاں غالباً مجھے ایک ایسے شخص کے بارے میں بھی بتانا چاہئے' جس نے سیمینار میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ معزز شخص جنوبی کوریا سے تعلق رکھتے تھے' جن کے پاس بیک وقت دو پیشکشیں تھیں: یا تو وہ سیمینار میں شرکت کریں ورنہ مقابلہ حسن میں منصف کے فرائض انجام دیں۔ انہوں نے موخرالذکر پیش کش قبول کرلی تھی۔ کیا آپ انہیں موردالزام ٹھہرا سکتے ہیں؟

سیمینار کے شرکاء میں ایک جناب ارہارڈ ایپلر (Erhard Eppler) نامی تھے جو بعد کو اپنے ملک مغربی جرمنی میں وزیر اقتصادیات بن گئے تھے۔ ایک اور صاحب لیو ٹنڈمان (Leo Tindemaan) تھے جو بیلجیم کے وزیراعظم بن گئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایک ہونہار سیاستدان اور عالی کے خاص دوست بن گئے تھے۔ ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رکھے گئے تھے اور شاید ان کے تیسرے ساتھی ایان میک آرتھر برطانوی ایم پی تھے۔ وہاں ایک (یونانی) ایسے سیاستدان بھی تھے جن کے بارے میں کہا گیا کہ جب ووٹنگ ہوئی تھی تو ان کے لئے انہی کا واحد ووٹ تھا۔ ان کی رفیقہ حیات کے بارے میں کیا خیال ہے؟ شاید اس نے ان کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ ایان میکارتھر (Ian Macarthur) ممبر برطانوی پارلیمنٹ تھے۔ کیا آپ انگریز ہیں؟ سوال ہوا "نہیں تو' میں تو ایک اسکاٹ ہوں" ٹھیک اسی وقت میکملن (Macmillain) ان کے لئے اپنے لمبے چاقو کا استعمال کر رہے تھے اور ایان (Ian) کو اپنی پارٹی کو ووٹ دینے کے لئے لندن پرواز کرنا تھی اور پھر ووٹ دے کر وہاں سے ہارورڈ واپس بھی آنا تھا۔

وہاں مارٹن بھی تھے جو این کاؤنٹر (Encounter) کے اسٹاف کے رکن تھے۔ وہ اور میں جہاز پر روم میٹ رہ چکے تھے۔ ان کا ایک مسئلہ یہ رہا کہ ان کا سوٹ کیس جہاز پر کہیں گم ہوگیا۔ صرف ان کے بدن پر کپڑے باقی بچے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر اس مسئلہ کا یہ حل نکالا تھا کہ وہ رات کو ننگے سویا کرتے تھے۔ مگر ان کی حالت اس وقت دیدنی تھی' جب جہاز پر ایک رسمی ڈنر میں انہیں شرکت کرنا تھی۔ میں نے فوری طور پر ایک نئی شرٹ اور نکٹائی دے کر ان کی مشکل حل کردی تھی۔ وہ ایک کنوارے شخص تھے۔ میں بعد ازیں ہارورڈ میں دیکھ چکا تھا کہ ایک پیاری سی "چیز" ناامیدی کے عالم میں انہیں متاثر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ گو کہ امریکنوں نے برٹش کے خلاف اعلان بغاوت کیا تھا لیکن معاشرتی اعتبار سے وہ ان کے ساتھ ایک قدر مشترک رکھتے ہیں۔ امریکی' برطانوی حضرات سے گو سرکشی پر مائل ہوں' لیکن تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے برطانوی امریکیوں پر ہنوز رعب جمانے سے باز نہیں آتے۔

بوجوہ میں نام نہیں بتا سکتا مگر بقول خود ایک شاعر صاحب بھی تھے۔ ہارورڈ میں میرے کمرے کے مشترکہ ساتھی جو سیمینار کا بندوبست کرنے والی لڑکیوں میں ایک کے ساتھ عشق فرمارہے تھے۔ یعنی فلرٹ کر رہے تھے اور میکس سلیون (Max Sullivan) کو کیوں کر بھلایا جاسکتا ہے جو اپنی بیوی کے ہمراہ سیمینار میں شرکت کر رہا تھا (وہ فیلا ٹائمز سے منسلک تھا) اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر کبھی اس کی بیوی نے پوچھا کہ کیا اس کا شوہر فلاں وقت میرے ساتھ رہ چکا تھا تو میرا جواب اثبات میں ہونا چاہیے۔ نیویارک میں ہماری رفاقت ختم ہوگئی تو میں نے اس سے دریافت کیا تھا کہ میرے چلے جانے کے بعد وہ کیا انتظام کرے گا؟ "وہ کسی دوسرے دوست کو تلاش کرے گا" اس نے کہا۔ وہاں گھانا سے آئے ہوئے ایک بھلے مانس بھی تھے۔ ہارورڈ پبلک ایڈریس کے لئے انہیں تیار کرنے میں مجھے گھنٹوں لگ گئے۔ انہوں نے ایڈریس کی شروعات تو صحیح طور پر کی تھی لیکن اچانک وہ چپ ہوگئے۔ سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے سفارت خانے کے ایک رکن کو ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ اینکرومہ کے دور کی بات ہے۔ وہ ہال اور سینکڑوں معزز سامعین' ایک بڑا بارعب ماحول ہوتا تھا۔ اجتماع ہر جمعے کی شام ہوتا جس میں سامعین دور دور سے آتے۔ میں نے بھی کام چلا لیا مگر عالی نے بڑی اچھی تقریر کی۔ برجستہ' بڑی ذہانت کے ساتھ' جوابات بھی دیئے۔ قیام پاکستان کے جواز پر تو بہت عمدہ تاثر پیدا کیا۔ مگر صدر ایوب خان کی آمریت کا جواز پیش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اس نے خود بھی ان کی چند صفات گنوانے کے علاوہ سیاسی کردار پر بات سے گریز کیا' سامعین بھی سمجھ گئے کیونکہ عمومی طور سے وہ اس کا انداز خطابت زبان' خود اعتمادی اور ادیبانہ شان پسند کر رہے تھے۔ وہ تعارف سے جان گئے تھے کہ وہ ایک سرکاری ملازم ہے۔

اب ذرا متانت و پیچیدگی کی طرف آیئے۔ سیمینار جو کئی ہفتوں پر محیط تھا' نہایت کارآمد تھا۔ سیمینار نے ہمیں یہ دیکھنے کا موقع فراہم کیا کہ امریکن سسٹم کیونکر اور کس طرح کام کرتا ہے اور امریکہ کیوں کر ایک آزاد ملک قرار پایا۔ نیگرو (سیاہ فام امریکن) لیڈروں نے ہم سے خطاب کیا اور صدر ولسن کو ایک متعصب شخص کہہ کر پکارا۔ جیمز ریسٹن (James Reston) نے کسنجر کو برا بھلا کہا' اس لئے کہ اس نے ایک رپورٹ کی اشاعت چوبیس گھنٹے روک لینے کو کہا

تھا کہ ایسا کرنا ملکی مفاد میں تھا۔ روبسٹن نے دعوے سے کہا کہ بحیثیت ایک فیلڈ رپورٹر اس کا کام رپورٹ کو انتہائی تیز رفتار ذرائع سے ارسال کر دینا ہے۔ بعد کو کیا پیش آتا ہے اس بات سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ یہ حقیقی پیشہ ورانہ اوصاف تھے۔

سیمینار کے ارکان بھی ڈاکٹر کسنجر کو غصہ دلانے میں کبھی نہیں ہچکچائے۔ عالی البتہ ہمیشہ ہر موقع پر کچھ تکلیف دہ مشاہدات یا تبصرے کو ہوا دیتے۔ یہ سیمینار اور دوسرے سیمیناروں کی طرح نہ تھا۔ ہم کو کسنجر کی رہائش گاہ پر لنچ کرنے اور ان کے ہمراہ چہل قدمی کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے' روشن خیال امریکی آپ کو اپنے اہل خانہ کے ہمراہ "ویک اینڈ" منانے کی دعوت دیتے ہیں۔ بیشتر امریکن ہم سے بات چیت کی خواہش رکھتے ہیں کہ ویک اینڈ کو باقاعدہ ایک فیچر کی شکل دیدی جائے بشرطیکہ ہم راضی ہوں۔

کسنجر نے سیمینار ختم ہونے کے بعد ایک طویل عرصہ تک سیمینارینز (Seminarians) سے مراسلت جاری رکھی اور خود آپ ان کے مراسلوں کا باقاعدہ اور نہایت وفاداری کے ساتھ جواب دیتے رہے' حتیٰ کہ صدر نکسن کا سیکورٹی ایڈوائزر مقرر ہونے کے بعد بھی ان کا یہ عمل تادیر جاری رہا۔ اس عمل سے انہیں بھی مدد ملی۔ مثال کے طور پر چین کے ساتھ خفیہ بات چیت جاری رکھتے ہوئے انہیں ایک سیمینارین بنگلہ دیش کے جناب کمال حسین کی خدمات کو استعمال کرنا پڑا۔ جب وہ دہلی آئے تھے تو انہوں نے مجھے بھی چائے پر مدعو کیا تھا۔ شمال مشرقی بھارت سے میں وہ واحد شخص تھا جسے یہ دعوت دی گئی تھی۔ انہوں نے پاکستان کے دورے پر جانے سے قبل بھی اس امر کی یقین دہانی کرلی تھی کہ عالی اس موقع پر اپنے ملک میں موجود ہوں گے' حالانکہ عالی ان کے اس سیمینار کے غالباً" سب سے زیادہ نافرمان اور مشکل کردار رہ چکے تھے۔ مضمون جاری رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے سیمینار سے واپسی پر اپنے اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ میں ایک آرٹیکل "میرا پاکستانی دوست" کے عنوان سے تحریر کیا تھا حالانکہ کچھ برسوں کے بعد ہم کم و بیش ایک دوسرے سے رابطے میں نہ رہے۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ۱۹۷۵ء میں اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے دہلی آنا ہوا۔ وہاں میرے ایک چچا سنہا ڈی سی ایم مشاعرے کے ناظم تھے۔ مارچ ۱۹۸۲ء کی ایک شام میں ان سے ملنے گیا تھا تو وہ مشاعرے کا ایک ٹیپ سن رہے تھے۔ آواز مجھے جانی پہچانی لگی۔ "یہ عالی ہیں کیا......" میں نے پوچھا۔ وہی تھے اور اس کے بعد ہماری دوستی کی تجدید ہو گئی بلکہ وہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گئی---------- یہ ان کا پہلا دورۂ ہند تھا۔ اس کے بعد وہ چند بار ہندوستان آچکے ہیں اور ہم بھی سال میں ایک دو خطوط کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔

مگر میں عالی سے ایک سوال پوچھنے اور اس پر اس کا تجزیہ سننے کی ہمت نہیں کرپایا۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر کیسنجر اپنے بقول امریکی سفارت خانوں اور اپنے روابط کے ذریعے ایسے افراد کا انتخاب کرتے (نجی اور سرکاری امریکی ملاحظہ کوائف کے علاوہ باقاعدہ تحریری امتحان اور سخت انٹرویو بھی کرتے تھے) جو ۳۵ برس سے کم اور چالیس برس سے زیادہ نہ ہوں اور آگے جاکر اپنے معاشرے میں کوئی بڑا اہم سیاسی یا سماجی مقام حاصل کرنے کے واضح امکانات رکھتے ہوں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے بیچ سے آگے جاکر لیو ٹنڈمان (Leo Tindemann) وزیراعظم اور ارہارڈ ایپلر (Erhard Eppler) وزیر ترقیات

ہوئے۔ افریقہ کے کندو نے سفارت کاری میں نام کمایا۔ ایان میکار تمر شیندہ وزیر رہے۔ میکسو ملی ون چیف ایڈیٹر ہو گئے... میں بھی بہرحال اتنے معزز اخبار کا ایڈیٹر ہو ہی گیا۔ چند ساتھی سیاسی مقتول و محبوس بھی ہوئے (جنوبی امریکہ اور اسپین کے حالات) بعض جلد مر گئے۔ عالی کی شاعرانہ شہرت اور اعلیٰ عہدہ داری تو مجھ تک 'ہم سب تک' پہنچی مگر ۱۹۶۲ء میں جو امکانات ان کی خو بو' چال ڈھال' لیاقت اور افکار سے پھٹے پڑتے تھے...... جن سے پورا سیمینار متاثر رہتا تھا اور جن کا مطالعہ اپنے بقول ڈاکٹر کیسنجر بغور کرتے تھے...... وہ کس حد تک پورے ہوئے؟ بہ ظاہر تو نہیں ہوئے۔ انہیں تو نہ جانے کیا بن جانا تھا... وہ ایک نئے' تازہ سیاسی معاشرے میں کہاں اور کیوں رک کر رہ گئے۔

مگر میں یہ سوال کر کے اپنے دوست کو معذرتی یا تلخ لہجے میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا۔ چپ ہو کر رہ جاتا ہوں...... وہ یوں بھی ایک حساس اور شاکی انسان ہیں۔ ہمت اور محنت کا بھی ایک اچھا نمونہ 'مگر ہر وقت کوئی نہ کوئی شکایت برلب۔ میں مزید کیوں ابھاروں۔

☆ عالی صاحب ۱۹۵۹ء میں محکمہ انکم ٹیکس سے ڈیپوٹیشن پر جاکر ۱۹۶۳ء تک ایوان صدر میں او۔ایس۔ڈی تعینات رہے تھے۔ صدر ایوب کے پرسنل سیکریٹری نہیں تھے۔ (ناشرین)

مختصر سوانح
ایس سہائے

ایس سہائے ہندوستان کے مشہور روزنامے (The Statesman) کے ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۷ء چیف ایڈیٹر رہے۔ یہ تمام عرصہ سولہ برسوں پر محیط ہے۔ انہوں نے اس اخبار میں ۱۹۵۵ء میں شمولیت اختیار کی اور کلکتہ میں بھی رہ چکے تھے۔ وہ ہندوستانی ایڈیٹرز گلڈ کے منتخب صدر رہ چکے ہیں۔

قانون کی طالبعلمی کے دوران انہوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ تین برس تک وہ قانون کی پریکٹس کرتے رہے۔ لیکن صحافت میں ان کی جدوجہد زیادہ پائیدار ثابت ہوئی۔ انہوں نے اسٹیٹسمین کلکتہ میں شمولیت اختیار کرلی اور وہاں مسلسل بیس برس تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ پھر بطور ایڈیٹر دہلی منتقل ہو گئے۔

اسٹیٹسمین سے سبکدوشی کے بعد ان کا اپنا کالم "اے کلوز لک" (A Close Look) ہنوز جاری ہے۔ جسے نصف درجن موقر روزنامے بشمول ہندوستان ٹائمز (دہلی اور پٹنہ)' دی ٹریبیون (پنجاب)' دی نیوز ٹائمز (آندھرا پردیش) دی کلیرین (آسام)' سوتنتر بھارت (اترپردیش اور دہلی)' پائنیر (دہلی اور لکھنؤ) اور ملکس سینٹر سے شائع ہونے والا بابن ایکسپریس

میل.... بھی شائع کرتے ہیں۔ ان روزناموں کی مشترکہ سرکولیشن ایک ملین (دس لاکھ) سے زیادہ ہے اور اگر اس تعداد کو چار قاری (ریڈرشپ) فی روزنامہ کی تعداد سے ضرب دے دی جائے تو یہ تعداد چار ملین سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

سائے کو صحافت میں "کلوزلک کالم" کے حوالہ سے فضیلت (Excellence) کے بی ڈی گوئنکا ایوارڈ (BD Goenka Award) سے نوازا گیا' اس لئے کہ کالم پیچیدہ قانونی اور دستوری مسائل باریک بینی اور وضاحت بیان کے ساتھ ہندوستان کی عوامی زندگی میں دوہرے معیار کی ریاکاری ومکاری کو بیدردی مگر مثالی حوصلہ مندی کے ساتھ طشت ازبام کرتا ہے۔

ان کے کالم "اے کلوزلک" کے پختہ کور ایڈیشن کی اشاعت کے موقع پر کچھ شخصیات کے تاثرات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں:

بھارت کے سابق چیف جسٹس جناب پی-این- بھگوتی فرماتے ہیں "جناب سائے کے تحریر کردہ مضامین سے ایک جرات مند اور نڈر شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے جو جمہوریت اور قانون کی عملداری کے مقصد کے لئے اٹل طریقہ سے مخصوص اصولوں پر کاربند ہے۔ انہوں نے اس کالم میں دلکش' صاف بیانی سے اپنے نظریات اجاگر کئے ہیں اور ان کی ترجمانی کی ہے بلکہ میں خود بھی ان کے اتنے پر خلوص جرات مند اظہار یے اور ان کے خیالات ونظریات کا احترام کرتا ہوں۔"

سپریم کورٹ کے سابق جج اور پریس کونسل کے چیئرمین اے-این- سین فرماتے ہیں۔ "شری سائے نے سوسائٹی اور ہماری قومی زندگی کے ہر ایک پہلو کا بڑی گہری زیرکی' منطق اور واقعیت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ان مضامین سے پریس کی سوشل ذمہ داریوں کی بڑی دور تک نشاندہی ہو جاتی ہے۔"

انڈیا انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر اور بعد کے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب اوپندر بخشی کہتے ہیں۔ "واضح طور پر ہم عصر بھارتی صحافت کی تاریخ میں یہ کالم ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مواد کا انتخاب ایک مشکل امر ثابت ہوا ہو گا جبکہ ہر ایک کالم میں کچھ نہ کچھ اہمیت کی حامل معنی خیز باتیں کی گئی ہیں' جو اس موقع سے بالاتر جس کے لئے اسے بروئے کار لایا گیا' دیرپا ثابت ہوتی ہیں۔"

سائے نے سپریم کورٹ کے جج راما سوامی کے اعتراض (مواخذہ) پر ایک کتاب ایڈٹ کی' ان کی کتاب "روحانی مرشد اگھوریشور بھگوان رام (Aghoreshwar Bhagwan Ram)" ماہ رواں کے دوران ریلیز کی جارہی ہے۔ سائے نے پٹنہ (بہار) کا ایوارڈ ایسی شخصیات کے ہمراہ حاصل کیا تھا' جیسے بسم اللہ خاں' ایل پی سنگھ اور جنرل ایس کے سنہا۔

ابن انشاء

(اقتباسات)

(۱)

عالی صاحب روس جا چکے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار اس کا سفرنامہ بھی رقم کر چکے ہیں۔ جس روز نیم شب کو ہمیں جانا تھا' آپ رات کو برستے پانی میں تشریف لائے۔ بولے وہاں کوئی لینے آئے گا؟ ہم نے کہا' ہاں یونیسکو کی میٹنگ ہے۔ ہم نے تار بھیج دیا ہے ان کا کوئی آدمی ہو گا۔ بولے ' تار وہاں جاتا ہی نہیں۔ ہم نے کہا' کیوں؟ پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر؟ فرمایا' تار ہفتہ بھر لیتا ہے' راستے میں ہمالیہ کا پہاڑ آتا ہے نا؟ ہم نے کہا' جی نہیں' پہنچ گیا ہو گا۔ اس کے علاوہ سجاد حیدر صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے جو ماسکو میں ہمارے سفیر ہیں اور جن سے ہمارا نیازمندی کا رشتہ ہے' وہ شاید کسی کو بھیج دیں۔ بولے' میاں' اتوار کے دن صبح کون اٹھے گا۔ اور تمہارا خط وہاں کہاں پہنچا ہو گا۔ ہم نے کہا' کوئی بیس دن پہلے ہم نے لکھ دیا تھا۔

بولے' ڈاک کا معاملہ گڑبڑ ہے۔

ہم نے سراسیمہ ہو کر کہا' آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ عمر میں ہم سے پانچ مہینے بڑے ہیں۔ آپ ہی بتائیں' کیا کریں۔ وہ ہمارے ہتھیار ڈالنے پر خوش ہوئے۔ بولے' بس تم پہلے تو ہوائی اڈے پر ڈالروں کو روبل میں بھنانا۔ جانتے ہو روبل کیا ہوتا ہے انہوں نے ہمیں روبل کی تاریخ بتائی۔ اور کوپک کی اوقات جتائی کہ ایک روبل میں سو ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا' ہوائی اڈے کے باہر آکر آواز دینا ٹاکسی' ٹیکسی مت کہہ دینا۔ تم گنوار ہو۔ اس لئے خبردار کر رہا ہوں۔ وہاں انگریزی کوئی نہیں سمجھتا' مل گئی ٹیکسی؟ اس سے کہنا' چلو پیکنگ ہوٹل۔ ہم نے ٹوکا کہ بالفرض ہمیں پیکنگ ہوٹل میں نہ ٹھہرانا ہو۔ فرمایا' میں کون سا ٹھہرا رہا ہوں' راستہ بتا رہا ہوں۔ وہاں جا کر یوں کھڑے ہونا۔ انہوں نے ہمیں ڈرل ماسٹر کے انداز میں کھڑے ہو کر دکھایا اور فرمایا۔ یہ رہا تمہارا داہنا ہاتھ اور یہ رہا تمہارا بایاں ہاتھ۔ ہم نے قطع کلام کیا کہ ہمارا تو داہنا اور بایاں ہاتھ دونوں ہمارے پاس ہیں۔ یہ آپ کے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ بہت ناخوش ہوئے۔ بولے' بچہ وہاں جا کر پریشان ہو گے تو ہمیں یاد کرو گے۔ اچھا

کپڑے کیا کیا لے کر جا رہے ہو۔ ہم نے بتایا کہ ایک ہلکا سوٹ لیں گے' ایک بھاری سوٹ اپنے بیچے میں باندھ لیں گے۔ بولے 'ستمبر کا آغاز ہے۔ وہاں تو گرمی ہوگی بلکہ تم تو جنوب میں الما آتا جا رہے ہو۔ وہاں تو بالکل یہاں کی سی گرمی ہوگی۔ نکالو گرم سوٹ باہر اور رکھو۔ میں بش شرٹ میں' تاشقند میں بش شرٹ ہی میں گھومتا تھا۔ ہم نے کہا' اچھی بات ہے۔ بولے' نہیں میرے سامنے نکالو سوٹ باہر۔ چنانچہ نکلوایا اور اس میں بش شرٹ پتلون رکھوائی جو افسوس یہاں ہمارے کسی کام نہ آئی۔ عالی صاحب کی باتوں میں سے ایک بات سچ نکلی۔ ہمارے سفیر صاحب کو ہمارا خط ملا ہی نہ تھا۔ ہمارے ماسکو پہنچنے کے چار روز بعد ملا۔ لیکن خیریت ہوئی۔ یونیسکو والوں کو تار مل گیا تھا۔ وہاں دو صاحبان لینے آ گئے تھے' نہ بھی آتے تو جہاز میں اکرم صاحب سے ملاقات ہو گئی تھی' جو ماسکو میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ چھٹی گزار کر ماسکو واپس جا رہے تھے۔ کسٹم والے ماسکو میں بھی کراچی والوں کی طرح شریف اور مہربان ثابت ہوئے۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ ننگا کر کے تلاشی لیں گے۔ سوٹ کیس کو ادھیڑ ڈالیں گے۔ جوتے کا تلا چاقو سے اتار کر دیکھیں گے۔ کچھ بھی نہ ہوا بلکہ افسوس ہوا کہ ہم اپنے ساتھ چرس اور کوکین وغیرہ کیوں نہ لیتے آئے۔

(۲)

ہمارے عالی صاحب خوش قسمت آدمی ہیں۔ "دنیا مرے آگے" میں ان کے ساتھ جو ترجمان تھا وہ اردو کے علاوہ ماسکو اور لینن گراڈ کی گلیوں سڑکوں کو بھی جانتا تھا اور پشکن سے زیادہ ان کی شاعری کا مداح تھا۔ حسین شاہ راشدی بھی خوش قسمت تھے۔ ان کی ترجمان بھی بہت اچھی تھی۔ صورت بھی اچھی پائی تھی۔ عمر میں بھی نتالیا سے چار برس چھوٹی تھی کہ حسین شاہ نے ہماری نتالیا کے لئے فرمایا' آج وہ تمہاری بڑھیا کیوں نہیں آئی۔ حسین شاہ کی ترجمان مس لڈمیلا جو فرینڈشپ ہاؤس نے مہیا کر رکھی تھی' ان کے سارے کام اسپتال سے لے کر دفتروں کے چکر تک خوش اسلوبی سے بھگتاتی تھیں اور ڈیوٹی کے اوقات کی بھی پروا نہ کرتی تھیں۔ حسین شاہ سے ان کی سنگت اور بیٹھک بھی ہر روز ہوتی تھی حتیٰ کہ ہمیں کچھ رشک بھی ہونے لگا (یہی لفظ زیادہ قرین مصلحت ہے) اور ہم نے اپنی دعا تیز کر دی کہ ان کے چچا اور ہمارے پیر حسام الدین راشدی جلد صحت یاب ہو کر وطن واپس جائیں تاکہ اس نوجوان کا جسے ہم پسند کرنے لگے تھے' اخلاق خراب ہونے کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ دو دن بعد یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہ تو اپنے منگیتر کے بارے میں ان سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ اس لڑکے کو اکثر اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ ایک روز ہمارے سامنے بھی وہ لڑکا آیا۔ واقعی اچھا تھا اور پیر حسین شاہ جلد از جلد لڈمیلا کو اپنے ہاتھ پیلے کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ حسین شاہ راشدی پیتے بھی نہیں۔ صرف سوڈے کے قدحے اور چائے کے سماوار پر ہماری ان کی شام سے رات ہو جاتی تھی۔ بعد میں انہوں نے کہا' میں سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے چھپ کر پیتے ہیں کیونکہ میرے چچا کے دوست ہیں۔ ہم نے کہا' میاں' ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم سے چھپا کر چسکی لگاتے ہو کیونکہ ہمارے دوست کے بھتیجے

ہو۔ سرجی ہوتے تو ان کے بارے میں بھی یہی کہتے کہ شمپین نہیں پیتا تو پھر یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا ہے۔

(۳)

ہمارے دوست ہم سے کچھ پہلے اپنی بیگم کے ہمراہ چین تشریف لے گئے تھے۔ ان کی آؤ بھگت ہم سے کچھ زیادہ ہی ہوئی لہٰذا ٹوسٹ تجویز کرتے کرتے ہلکان ہو گئے۔ رسم کے تقاضے سے کبھی ان کی بیگم کو بھی یہ قرض ادا کرنا ہوتا تھا۔ ان کی بیگم ان رسمیات کو جانتی تو ہیں لیکن ان کی قائل نہیں۔ ان کے ساتھ ایک نستعلیق اردو مترجم بھی ہوتا تھا لیکن جب کبھی وہ غیر حاضر ہوتا تب ان کے ٹوسٹ آب زر سے لکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ میاں کہتے بی بی 'اب تم ٹوسٹ تجویز کرو۔ ہم انگریزی میں اس کا ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ بی بی فرماتیں "اے نوج' یہ کیا کھڑاگ ہے' مجھ سے تقریریں نہیں ہوتیں۔ میاں اس کا ترجمہ کرتے کہ ہماری بی بی فرماتی ہیں کہ چین کی ترقی نے ان کو بہت متاثر کیا ہے اور آخر میں فتح حق کی ہوگی۔ کبھی کبھی بی بی جھلا کر کہتیں "میاں تم ہی بولے جاؤ' مجھے تو پان کی طلب ہو رہی ہے۔ اے ہے' کیسا ملک ہے جہاں پان بھی نہیں کھایا جاتا۔ انشاء اللہ ماشاء اللہ کا قوام تک نہیں ملتا۔ ان کے میاں اس کا ترجمہ فصیح انگریزی میں کرتے کہ یہاں کی عورتوں کے عزم و ہمت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے اے ماؤں' بہنو' بیٹیو' دنیا کی عزت تم سے ہے۔ بی بی انگریزی بھی جانتی ہیں' اگرچہ بولتی نہیں' فرماتیں "اے میاں' یہ تم کیا کا کیا کہے جا رہے ہو"! اس پر وہ کہتے 'بی بی' چپ رہو۔ میں تمہارے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ تمہاری ظاہری گفتگو سے مجھے مطلب نہیں۔

اقتباس

"چلتے ہو تو چین کو چلئے"

(۴)

وہ بھی خیریت سے ہیں' ہم بھی

کراچی میں ہم سے ہر کوئی پوچھ رہا ہے کہ لندن سے آئے ہو' عالی جی کی سناؤ کہ کہاں ہیں' کس طرف کو ہیں' کدھر ہیں؟ اگر کچھ نہیں کر رہے تو کیوں نہیں کر رہے اور کچھ کر رہے ہیں تو کیا کر رہے ہیں؟ بعضوں کا خیال ہے کہ ہم گئے ہی انہیں منانے تھے کہ آجاؤ' غصہ تھوک دو۔ قوم کا تمہارے غم میں برا حال ہے' ہچکیاں کھا رہی ہے وغیرہ۔ گزارش ہے کہ عالی صاحب لندن میں ہیں اور وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہم یہاں کر رہے ہیں۔ وہ بھی قوم کے درد سے بے حال ہو رہے ہیں۔ ہم بھی ملت کے غم میں نڈھال ہو رہے ہیں۔ وہ کالموں میں دشمنوں کو للکار رہے ہیں' ہم ریڈیو پر دشمن کو للکار رہے ہیں کہ اے برہمنی سامراج' ٹھہر تو سہی' تیری دم میں نمدہ' وطن کے سجیلے جوانوں کے لئے ان کے پاس بھی فقط نغمے ہیں' ہمارے پاس بھی' خندقیں نہ وہ کھود رہے ہیں' نہ ہم کھود رہے ہیں۔ بندوق کے قریب جانے وہ بھی ڈرتے ہیں' ہمیں بھی پرہیز ہے۔ القصہ وہ بھی خیریت سے

ہیں ' ہم بھی خیریت سے ہیں ' البتہ ایک کام ہے جو ہم کر رہے ہیں اور وہ نہیں کر رہے ہیں ' وہ چیز مہنگی نہیں کر رہے اور ذخیرہ اندوزی نہیں کر رہے۔ انگریزوں کے درمیان رہتے ہیں اور ان کے ہاں جنگ یا ایمرجنسی کے دنوں میں اس قسم کی باتوں کا رواج نہیں یہ سچ ہے کہ ہمارے حساب سے اہل فرنگ میں نیکی اور نیک چلنی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں ' گوشت بھی حلال یعنی ذبیحے کا نہیں کھاتے ' پردے کا بھی چنداں خیال نہیں ' دکانداروں کے ہاتھوں پر نماز کے گٹے اور ہاتھوں میں تسبیح بھی نہیں یعنی ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے۔ لیکن ملاوٹ کا کاروبار وہاں نہیں ہے۔ دودھ ' دہی اور مکھن مسکا سب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتی میں بھی چنے کا چھلکا نہیں ہوتا ' نہ ہلدی میں اینٹیں ہوتی ہیں۔ چینی دکانوں سے پلک جھپکنے میں غائب نہیں ہوتی ' نہ آٹا کہیں جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے۔

پیارے یہ ہمیں سے ہو ' ہر کارے وہر مردے

پیرس سے وہ ہمارے پیرس پہنچنے سے پہلے چل دیئے تھے۔ انگلستان میں ہم نے عالی صاحب کو جا پکڑا۔ بغل گیر ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ کسی ہمدم دیرینہ سے مدت بعد ملنے کا اثر ہونا لازمی تھا۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں اب ہم یہیں رہ جائیں گے۔ تم کو اداس نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے اس امکان سے خوف زدہ ہو کر کہا "نہیں ' یہ بات نہیں ہے" ہم نے کہا "پھر ملک کے حالات کا خیال آرہا ہو گا۔ آپ کے کالموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حالت واقعی تسلی بخش نہیں۔ مادی اور اخلاقی لحاظ سے اصلاح کی بڑی گنجائش ہے لیکن اس پر رونے دھونے سے کچھ نہیں بنتا۔ حوصلہ رکھو نیپکن سے آنسو پونچھ کر بولے "یہ قصہ بھی نہیں۔ بات یہ کہ میں باورچی خانہ میں کھڑا پیاز کاٹ رہا تھا۔" ہم نے کہا "وہ کیوں؟" بولے۔ "گو بھی گوشت میں ڈالنے کے لئے ' کھانا کھا کر جانا۔" ہم نے کہا۔ "خود پکایئے گا۔" بولے "دیکھتے جاؤ بلکہ اپنی کرسی باورچی خانہ میں لے آؤ۔"

ہمارے عالی صاحب جن کو یہاں ہر کوئی بے کار آدمی سمجھتا تھا ' ولایت جا کر کام کے آدمی بن گئے ہیں۔ ہم ایک دو راتیں ان کے ساتھ ایک ہی مکان کی چھت کے تلے رہے ہیں۔ ہم نے ان کو آدھا وقت وطن کی فکر میں غلطاں اور آدھا وقت امور خانہ داری میں مصروف پایا۔ کشیدہ کاری خیر انہوں نے نہیں سیکھی لیکن کھانا بڑے سگھڑاپے سے پکاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ولایت میں خانساموں ' نوکروں ' چاکروں ' ماماؤں اور اصیلوں اور آبداروں ' خاصداروں قسم کی چیزیں میں نہیں ہوتیں ہر شخص آپ ہی خادم آپ ہی مخدوم ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے جمعدار کے فرائض بھی خندہ پیشانی یا غیر خندہ پیشانی سے خود سرانجام دیتا ہے۔ اپنی قمیض اور موزہ بنیان خود دھوتا ہے ' اپنا آلو گوشت خود پکاتا ہے اور اپنا انڈا خود تلتا ہے۔ اپنا انڈا سے ہماری مراد ہے اپنا خریدا ہوا انڈا کیونکہ ولایت جا کر آدمی کتنا ہی بدل جائے ' اتنا بھی نہیں کہ انڈے دینے لگے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ عالی صاحب شعر لکھنے کے علاوہ کسی کام کے نہیں اور شعر لکھنا بھی کون سا کام ہے۔ ہمارے ملک میں ہر کوئی لکھ لیتا ہے اور لکھتا ہے۔ ہاں ' کھانا پکانے کو ہم کام بلکہ ہنر جانتے ہیں اور جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے۔ یورپ نے ساری ترقی ہنر کی وجہ سے کی ہے ہمیں ولایت جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارا انتظام تعلیم کتنا ناقص ہے۔ لوگ رفیع الوقتی کے

لئے یہاں پر سے کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں وہاں اوائل تعلیم ہی میں APTITUDE ٹیسٹ کے ذریعہ کی طبعی صلاحیت اد کو جانچتے ہیں ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ جو شخص اچھا خانساماں بن سکتا ہے اسے شاعری پر مامور کردیا اور جو اچھا شاعر بن سکتا ہے اس کے ہاتھ میں کڑچھا دیا جائے کہ چل دیگ پکا اور بگھار لگا۔ واضح رہے کہ ہم جو عالی صاحب کے ہاتھ کے کھانے کی تعریف کررہے ہیں۔ ان کی شاعری سے ملا کر نہیں' وہ شاعری بھی اچھی کرتے ہیں۔

اقتباس

کتاب: "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" سے

(۶)

اخبار یہاں کے آزاد ہیں اور کالم نگار تو جو جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو کہتے پایا کہ ایسی آزادی بھی کیا۔۔ بعضوں کے متعلق تو لوگوں نے انگشت نمائی بھی کی کہ ایسے رئیسانہ ٹھاٹھ کالم نگاری کے پیسے سے تھوڑا ہی ہیں' دست غیب کا طفیل ہے۔ جو لوگ ان کالموں میں اپنا ذکر نہیں چاہتے تاکہ ان کی خوش اعمالیوں پر پردہ پڑا رہے' وہ ان کی دامے درمے خدمت کرکے ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو بنک بنالیا ہے۔ دوسرے کے ٹھاٹھ راجاؤں مہاراجاؤں کے سے ہنے۔ اکثر کا یہی حال ہے۔ حکومت بھی ان کو راضی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک نامہ نگار کو فلم سنسر بورڈ کا صدر بنادیا ہے۔ دوسرے کو ایک اور بڑا عہدہ دے کر رام کر رکھا ہے اور ایک کو تو ایرپورٹ کا مینجر بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ایر پورٹ کے امور میں ان کا تجربہ بس یہی ہے کہ کئی بار ہوائی سفر کرچکے ہیں۔ سو یہ ہم بھی کرچکے ہیں۔ ایک صاحب نے پوچھا' کیا تمہارے ملک میں تمہیں ایرپورٹ منیجر بنادیں۔ ہم نے کہا ہرگز نہیں' ہمیں تو ایرپورٹ کے اندر جانے کے لئے بھی پاس لینا پڑتا ہے۔

لیکن سب کالم نگاروں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا۔ جے دی کروز ہی کو لے لیجئے' نہ حکومت وقت کی پروا کرتے ہیں نہ امریکہ کی۔ امریکی پالیسیوں' امریکی اڈوں اور امریکیوں کی ایسی کھنچائی کرتے رہتے ہیں کہ کسی اور امریکہ نواز ملک میں ہوں تو جان سے نہ سہی وہ آزادی سے ضرور جائیں۔ دوسرے جہانیاں جہان گشت میکسیمو سولیون ہیں۔ نوجوان ہیں اور بہت تیکھا لکھتے ہیں۔ ہم ان سے ملے تو وہ جمیل الدین عالی کی بات کرنے لگے کہ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہماری طرح منہ پھٹ ہے۔ ادھر بات جی میں آئی' ادھر زبان پر آگئی۔ ہم نے اتفاق رائے کیا اور کہا کہ بعض اوقات تو جی میں بعد میں آتی ہے' زبان پر پہلے۔ عالی صاحب سے ان کی ملاقات ہارورڈ کے سیمینار میں ہوئی تھی۔ ایک بار پاکستان بھی آچکے ہیں۔ غالباً ۱۹۶۳ء میں پھر آنے کا کہہ رہے تھے۔ دو سال ہوئے' یہ عوامی چین بھی گئے تھے۔ حکومت نے ان کا پاسپورٹ ضبط کرلیا۔ بہت لڑ جھگڑ کر انہوں نے دوسرا حاصل کیا ہے۔ ان کی لائبریری دیکھی۔ ہر ملک کے متعلق اتنی کتابیں اور تازہ سے تازہ کہ جی للچائے۔ ایک سیکریٹری بھی رکھ چھوڑی ہے۔ بہت رشک آیا ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ۔ ہم نے پوچھ ہی لیا کہ میاں میکس! کیا کالم سے

اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ یہ طرز زندگی نبھاؤ۔ اس نے کما' بہت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیلی ویژن کی آمدنی بھی تو ہے۔ یہ دیانت دار آدمی ہیں اور غریب گنے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کا سنئے۔ ایک نہیں' یہاں پانچ ہیں۔ ہر اخبار کا اپنا ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے اور اپنا ریڈیو ہے۔ پروگرام صبح سے شروع ہو تو آدھی رات تک۔

اقتباس

"دنیا گول ہے" (شہر نیلا)

☆ یہ عالی صاحب کا گھر نہیں' شہاب صاحب کا گھر تھا جو جنرل یحیٰی خان کے دور میں انگلستان چلے گئے تھے۔ ناشرین

انتظار حسین

ترجمہ

(روزنامہ ڈان بتاریخ ۳ مارچ ۱۹۹۷ء)

وہ کیا عوامل ہیں جو انہیں سینٹ تک لے گئے؟

جمیل الدین عالی نے اس بات کو ثابت کر دکھایا کہ ادیب محض ادیب نہیں' اور بہت کچھ بھی ہے

ایک بار پھر کلچرل اداروں اور اکیڈمی میں اہل قلم کے داخلے واخراج کا ڈرامہ حکومت کی چھتری کے نیچے جاری ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب نئی حکومت قائم ہوتی ہے۔ اس موقع پر ان کے طرف دار اہل قلم بھی یہی کچھ چاہتے ہیں اور جب کوئی حکومت ایوان سے باہر ہو جاتی ہے تو ان طرف داروں کو بھی جانا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال حکومت کی اس نئی تبدیلی کے موقع پر بھی دیکھنے میں آئی۔

وہ ادیب جنہوں نے سابقہ حکومت کا اعتماد حاصل کیا تھا یا جو اپنی "کرشماتی لیڈر" کے طفیل کسی عنوان بڑی بڑی ملازمتوں پر جم گئے تھے' اب وہ سب بھی اپنی پروقار کرسیاں نئے آنے والوں کے لئے خالی کر رہے ہیں۔

لیکن جمیل الدین عالی کا معاملہ مختلف ہے۔ انہوں نے سینٹ میں داخل ہونے کے لئے آزاد راستہ اختیار کیا۔ یہ عالی کے باب میں ایک تاریخی نوعیت کا واقعہ ہے۔

پچھلے پچیس برسوں میں وہ بہ حیثیت ادیب ایوان نمائندگان میں منتخب ہو کر داخل ہونے والے پہلے شخص ہیں۔ کیا ان کی نمائندگی ایسی نیک فال نہیں جس کا استقبال کیا جانا چاہئے۔ اب ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ایوان حکومت میں ایک ادیب بھی ہے جو سچائی سے فلاح ملک کے بارے میں محسوس کرتا ہے۔ یہ متوقع ہے کہ ایوان حکومت میں وہ ادب اور تعلیم و علم کے سلسلے میں پاس داری کریں گے جو عام طور پر نظرانداز ہوتے آئے ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ سینٹ میں وہ ایک اہم ادبی شخصیت کی حیثیت سے موجود ہیں' مجھے اس جمیل الدین عالی پر رحم آتا ہے جو ایک شاعر بھی ہے' اگرچہ عالی کے سلسلے میں میرے اندر اس طرح کے احساس کا ابھرنا' پہلا واقعہ نہیں۔ اس سے پہلے

مئی ۱۹۵۹ء میں میرے اندر اسی طرح کا احساس پیدا ہوا تھا جب پاکستان رائٹرز گلڈ نئی نئی قائم ہوئی تھی اور عالی ایک نمایاں شخصیت کے طور پر ظاہر ہوئے تھے۔ گلڈ ان کے ذہن کی پیداوار تھی جو اگرچہ اب بھی زندہ بہ مشکل مردہ ہے (ان کے تصورات میں) وہ اب بھی اس کے قیام پر فخر کرتے ہیں' اس کی پروا کیے بغیر کہ اس سے ان کی تخلیقی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

عالی قیام پاکستان کے ساتھ ہی ادبی فضا میں ایک ہونہار شاعر کے طور پر ابھرے۔ ان کی غزلیں نئے پن کی نمائندہ اور تجربوں کی تازہ کاری کی مظہر ہیں۔ غزل سے قطع نظر وہ شاعری کی ایک قدیم صنف 'دوہے' کی طرف بھی مائل ہوئے جو اردو شاعری میں فارسی کے غلبے کی وجہ سے تقریباً متروک ہو چکی تھی۔ عالی نے اس قدیم صنف "دوہے" کو اردو میں جدید حسیت کے برتاوے کے ساتھ زندہ کیا جلد ہی یہ دیکھنے میں آیا کہ دوہے جو ہندی کے مملوکہ سمجھے جانے لگے تھے' اردو کی شعری روایات میں ان کا احیا ہوا۔ عالی کے اس کارنمایاں کو محمد حسن عسکری کی آشیرباد بھی تعریفوں کی شکل میں حاصل ہو گئی جو انہوں نے ان کے پہلے شعری مجموعہ "غزلیں' دوہے' گیت" میں دیباچے کے طور پر رقم کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ "عالی غزلوں کے مقابلے میں اپنے دوہوں میں زیادہ بے ساختہ اور جذباتی تازگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ عالی نے اپنے ابتدائی دور میں صرف اور صرف شاعری تک خود کو محدود رکھا تھا مگر ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ اپنے شعری جوہر کے ظہور کے لئے نئے راستوں کے متلاشی تھے اور کچھ نئے' آفاقی اور تہہ دار شعری حقائق کو معرض وجود میں لانے کے خواہاں تھے۔ اس خواہش کی تکمیل میں ایک طویل نظم "انسان" لکھنے کا منصوبہ زیر غور تھا' ایک ایسا منصوبہ جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "غزلیں' دوہے' گیت" مطبوعہ ۱۹۵۷ء نہ صرف اس بات کا غماز ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کیا کچھ حاصل کیا بلکہ ایک اشارہ اس بات کا بھی تھا کہ مستقبل میں وہ کیا کچھ کرنے والے ہیں۔

لیکن جنوری ۱۹۵۹ء کے آخری ہفتے میں پاکستان رائٹرز گلڈ ان کی یک سوئی میں مخل ہو گیا اور اب وہ صرف شاعر ہونے پر اکتفا کرنے کے قابل نہیں رہے' ان کی زندگی میں شاعری کے علاوہ دیگر بھگتانے والے دفتری قسم کے معاملات بھی داخل ہو گئے

جن دنوں عالی رائٹرز گلڈ سے متعلق تھے تو ان کا زیادہ تر وقت ادیبوں کے مفاد کی خبر گیری میں صرف ہو جاتا تھا' نتیجتاً" شاعری کے لئے کم وقت ملتا۔ وہ اس معاملے میں صادق ہیں۔ انہوں نے ادیب برادری کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ سوچا اور انہیں فائدہ پہنچانے کا کام کیا ہے۔ لیکن رائٹرز گلڈ کی سرگرمی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ صدر ایوب کے اولین دور میں اس پر جو بہار آئی' بعد ازاں انہی کے دوسرے دور میں بڑی تیزی سے قعر زوال میں گر گئی۔

گلڈ کے ہونے نہ ہونے سے قطع نظر عالی ادیبوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں ہمہ وقت وہمہ دم کوشاں ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں گلڈ کی منتظمہ سے علیحدہ ہو گئے تھے مگر...... بینکنگ کونسل کو ۱۹۸۸ء میں رائٹرز کے لئے دو کروڑ روپے کے ریزرو فنڈ کے قیام

پر آمادہ کیا جس کے تحت اہل قلم اپنی کتب کی اشاعت کے لئے قرض لے سکتے تھے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے میں عالی کو رزمیہ نظموں کے لکھنے کی تحریک ہوئی' جنگ ختم ہو گئی لیکن ان کا کام ملی نظموں کی صورت میں اب بھی جاری ہے۔ ان کی ملی نظموں نے انہیں وافر شہرت فراہم کی جو دوہوں اور غزلوں کی شہرت سے کہیں زیادہ ہے۔

شاید ان کا قومی شعور و آگہی ان کے ملی نغموں کی وجہ پیداوار ہے۔ بالآخر ان کا یہ شعور اس نقطہ عروج تک پہنچا کہ انہوں نے اس کے اظہار کے لئے نثر کا سہارا لیا اور اظہاریہ کے عنوان سے ایک اردو روزنامے میں لکھنے لگے۔

بلاشبہ عالی اس وقت شاعر کے علاوہ بہت کچھ ہیں لیکن ان کے اندر کا شاعر اتنا قوی ہے کہ انہیں ان کے شاعرانہ مرکز سے غافل ہونے نہیں دیتا اور ان کا یہ ذوق ان کی دیگر شاعری مخالف ترغیبات کے باوجود قائم و دائم ہے۔

عالی کا تازہ شعری مجموعہ "اے مرے دشت سخن" مطبوعہ ۱۹۹۵ء میرے پیش نظر ہے۔ جب میں اس کے مطالعہ سے گزرا تو ان کی طویل نامکمل نظم "انسان" نے میری توجہ کا دامن تھام لیا۔ ان کی اطلاع کے مطابق اس نظم کا آغاز انہوں نے چالیس کی دہائی کے اواخر میں کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی اشاعت ممتاز شیریں کے زیر ادارت شائع ہونے والے جریدہ "نیا دور" میں بھی ہوئی تھی۔ اور تاحال نامکمل ہے۔ میں نے اس بارے میں عالی سے فون پر رابطہ کیا "اس شعری مجموعے سے وہاں پہنچ گئے ہو جہاں پہنچنا چاہتے تھے لیکن تمہاری نامکمل نظم "انسان" کس مرحلے میں ہے؟ کیا تمہارا اب بھی اسے آگے بڑھاتے رہنے کا ارادہ ہے اور کیا پاکستانی سیاست تمہیں اس بات کی اجازت دے گی؟"

عالی نے اپنے سابقہ انداز میں سیاسی کھیل کے متعلق ناقابل رشک احساسات کا اظہار کیا جس کا اب وہ ایک حصہ ہیں مگر انہوں نے کہا کہ وہ سینٹ کی ممبری کے مقابلے میں شاعری کی زیادہ پروا کرتے ہیں۔ وہ "انسان" کی تکمیل کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں کیا وہ کر سکیں گے؟ ہمیں اس کا انتظار کرنا ہے۔

مترجم

ادیب سہیل

جولائی ۱۹۹۷ء

ایم - ایچ - عسکری (ابن سعید)

(ترجمہ از روزنامہ ڈان پروفائل بتاریخ دس فروری ۱۹۹۸)

جمیل الدین عالی
(ایک مستعد روح)

جمیل الدین عالی کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے قراری ہے، جس کو ان سے ہر ملنے والا محسوس کرلیتا ہے۔ وہ بہ مشکل چند منٹ خاموش بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کا بشرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ذہن ہجومِ افکار کی آماجگاہ ہے۔ ان کی پہلی محبت شاعری تھی۔ ان کا کمٹ منٹ جسے وہ سوسائٹی کی دین سمجھتے ہیں ان کا مختلف اداروں سے تعلق ہے۔ مثلاً" انجمن ترقیِ اردو پاکستان اور اردو آرٹس اور اردو سائنس کالج جن سے وہ کئی دہائیوں تک وابستہ رہے ہیں' پاکستان رائٹرز گلڈ جس کے وہ بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کا ہفتہ واری کالم جو وہ "جنگ" کے لیئے لکھتے ہیں اور ان کا وہ مقام جو سینٹ میں حاصل ہے اور ان کی اپنی صحت۔ ہاں! چونکہ وہ اپنے ہجوم کار سے صحت و فراغ حاصل کرنے کو مستحسن فعل نہیں سمجھتے اس لیے ہر طرح کی ثقافتی سرگرمیوں میں خود کو گھرا رکھتے ہیں اور اس بات پر دھیان نہیں دھرتے کہ کچھ برسوں سے وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں اس سسٹم سے جو ہمیشہ سازگار نہیں ہوتا پریشانیاں اور دباؤ ملا ہے۔ برصغیر کی تقسیم اور پاکستان میں ہجرت سے عالی کو (ان کی طرح کے لاتعداد انسانوں کو) معاشرتی' اخلاقی اور تہذیبی سطح پر ٹوٹ پھوٹ سے گزرنا پڑا جو اگر ان کے حصے میں نہ آتی تو ان کی اٹھان کچھ مختلف ہوتی۔

اگرچہ جمیل ادین عالی کے والد (نواب) سر امیرالدین احمد خاں فرخ مرزا راج (برٹش) کی ایک (شاہانہ) خودمختار" ریاست کے والی تھے (اور عالی کا تعلق ننھیال کی طرف سے صوفی شاعر خواجہ میردرد کے گھرانے سے ملتا ہے) اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہمیشہ ایک متمول آغوش میں پروان چڑھے اور ابتدائی دنوں میں انھیں محرومیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ ان کی والدہ جنھیں اللہ نے ایک اکلوتے بیٹے سے نوازا' وہ نواب صاحب کی چوتھی بیوی تھیں(ا) اور دونوں کی عمروں میں تقریبا چالیس برس کا فرق تھا۔ وہ اس وقت بیوہ ہوئیں جب عالی کی عمر گیارہ برس تھی۔ اور انھیں برٹش سرکار کی نگرانی میں ریاست سے ایک معمولی وظیفہ گزر بسر کے لیے ملنے لگا۔ ایک دل کو چھولینے والے انٹرویو (ڈان 1993) میں عالی نے بہت کچھ منکشف کیا۔ یہ پانچ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اس میں عالی نے بڑی صاف گوئی

سے اس معمولی یافت اور صورتِ حال کا ذکر کیا جس سے ان کی والدہ کو گزرنا پڑا۔

عالی کو اپنے بڑے بھائیوں سے برائے نام تعاون حاصل ہوا جو نسبتاً خوش حال زندگی گزار رہے تھے اور ان کے ننھیالی قرابت دار سید اس کے اہل نہیں تھے کہ عالی کے خاندان کو بہت زیادہ مدد پہنچا سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عالی کے لڑکپن کے زمانے میں ان کی والدہ کو ناسازگار حالات کے خلاف بہت ذہنی کشمکش سے گزرنا پڑا۔ پھر ان پر ایسا وقت بھی پڑا جب انھیں اپنے زیورات بھی بیچنے اور (دو) بیٹیوں کی پرورش و پرداخت کے لیے فروخت کرنے پڑتے۔ اس زمانے کی یادیں عالی کے لیے خوش گوار نہیں، لیکن اس کی تلافی ان کی والدہ کی بے پناہ محبت کی وجہ سے ہو جاتی تھی۔ عالی نے گریجویشن کے بعد اپنے انداز میں جینے کا فیصلہ کیا۔ مزید اعلیٰ تعلیم کے ارادے کو خیرباد کہتے ہوئے ایک سرکاری ملازمت اختیار کرلی جو ماتحتی کی چاکری تھی۔ وہ بڑی صاف گوئی سے ابتدائی زندگی کو اظہار میں لاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح وہ زمانہ بھی یاد ہے جب عالی نے پاکستان کے لیے "آپٹ کیا تھا (اگست 1947) اور سامان سفر کراچی کے لیے باندھ چکے تھے کہ اچانک دہلی میں اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر میرے ساتھ آگرہ کے مختصر دورے پر جانے کو تیار ہوگئے۔ دو دن بعد جب ہم آگرے سے دہلی واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ دلی میں فرقہ وارانہ فساد کے پھوٹ پڑنے سے عالی کے سارے اثاثے لوٹے جا چکے ہیں؛ جو پاکستان جانے والے آپٹیز (optees) کے سامان کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ واپسی پر انھیں اپنے افراد خاندان کا بھی پتہ چلانا پڑا کہ وہ اس افراتفری میں کہاں اقامت گزیں ہیں۔

کراچی آنے کے بعد انھیں ازسرِنو زندگی کے آغاز میں جو مصائب درپیش ہوئے اُس سے عالی دل برداشتہ نہیں ہوئے اور وفاقی سپیریر سروسز کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے۔ قسمت نے یاوری کی اور وہ ٹیکسیشن سروس کے لیے منتخب ہوگئے۔ پھر اپنی بے اعتنا رفتارِ زندگی کے باوجود اپنی مساعی سے سرکاری ملازمت کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہونے میں کامیاب بھی ہوتے رہے۔

شعر کہنا کئی پشتوں سے عالی کی خاندانی روایت میں داخل تھا، کم و بیش اس وقت سے جب غالب لوہارو خاندان سے ہم رشتہ ہوئے۔ روایت کا اتباع کرتے ہوئے عالی نے بھی شاعر ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ ابھی اسکول میں تھے کہ میرا اور ان کا پہلے پہل اسی زمانے میں ساتھ ہوا۔ تقسیم برصغیر کے وقت تک جب انھوں نے نوجوانی سے آگے کے مرحلے میں قدم رکھا تو ان کی شاعرانہ شخصیت نہ صرف مستحکم ہو چکی تھی بلکہ فن بحور سے بھی واقف تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے خاندانی بزرگ نواب سراج الدین سائل سے بھی رہنمائی حاصل کی، جن کا شمار اس وقت دہلی کے دو تین نمائندہ غزل گوؤں میں ہوتا تھا۔ بہرحال شاعری میں عالی نے روشن خیال ہوتے ہوئے بھی خود کو غزل کی روایت تک محدود رکھا۔ البتہ تلافی کے طور پر دوہے کی صنف کا انتخاب کیا۔ ان کے دوہے کی موسیقی اور قرأت کے انداز نے اس صنف کی مقبولیت کو عام کیا۔ وہ جلد نوجوان شعرا میں مقبول ہوگئے۔ مشاعروں اور دوسری ادبی محفلوں میں بلائے جانے لگے۔

1959ء عالی کے باب میں ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے ایک بڑی شہرت کا سال ہے، جس کی بازگشت بیرون ملک بھی سنی گئی لیکن یہ بھی ہوا کہ ان کی شخصیت ادبی نزاع کا مرکز بن گئی، جو تاحال جاری ہے اور ختم ہونے

کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں عالی کے قریبی ساتھی ہونے کے ناتے جب پس پردہ واقعات پر نگاہ ڈالتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اس واقعے کو صراحت سے بیان کروں جو نزاع کا سبب بنا! حقیقت اس قدر ہے کہ ایک شام 1958ء کے اواخر اکتوبر یا اوائل(۲) نومبر میں عالی اور ہمارے مشترکہ دوست ابن الحسن جو بعد میں نیشنل بینک کے پبلک ریلیشن کے ادارے میں مینیجر تعینات ہوئے' خداداد ادبی صلاحیت کے مالک تھے اور جن کی مختصر کہانیاں ان دنوں کراچی اور لاہور کے موقر جرائد میں پابندی کے ساتھ شائع ہو رہی تھیں' میرے گھر میں مل بیٹھے(میں بھی ان دنوں ڈیفینس پی۔ آر۔ڈائرکٹوریٹ میں ابن الحسن کا رفیقِ کار تھا) ہم لوگوں نے محسوس کیا'وقت آگیا ہے کہ قلم کاروں کی خدمات کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسی نوعیت کا ایک اعلان نامہ مشتہر ہو'جو میں نے ہی ٹائپ کیا تھا'جس میں پاکستان کی تمام زبانوں کے اہل قلم کو کراچی میں مجتمع ہونے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ پاکستانی قلم کاروں کے پیشہ ورانہ مسائل کو زیر بحث لایا جائے اور اگر ممکن ہوسکے تو کسی عنوان رائٹرز ٹریڈیونین یا گلڈ کے قیام کا ڈول ڈالا جائے جو ایک طرف اہل قلم کو سماجی تحفظ فراہم کرے'دوسری طرف ان کی تخلیقات نثر ونظم کا معقول معاوضہ دلاسکے۔

اعلان نامے پر ہم تینوں کے علاوہ مشہور ناول نگار قرۃ العین حیدر اور نمائندہ فکشن نگار' غلام عباس ' قابل احترام جریدے ''ساقی'' کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی (۳) اور افسانہ نویس ضمیرالدین احمد کے دستخط ثبت تھے۔ اس اعلان نامے کو اخبارات کے ذریعے خاصی تشہیر دی گئی۔ پاکستان کے تمام علاقے کے ادیبوں نے اس اعلان کا (مشرقی پاکستان سمیت) توقع سے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ ابن انشاء اور شوکت صدیقی ان میں سے تھے جو شروع ہی میں اس موقف کے ساتھ ہوگئے تھے۔ اور بعد کے چند ہفتوں میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شمولیت کی حامی بھرلی۔ اس گروہ ادیباں میں قدرت اللہ شہاب بھی تھے (۳)جن کا تعلق نہ صرف سول ملازمتوں سے تھا بلکہ وہ اردو کے مشہور معاصر ادیب تھے۔ان کے علاوہ اس کنونشن کو ان سینکڑوں اہل قلم کی تائید حاصل تھی جن کا سرکاری اعلیٰ دفاتر سے تعلق تھا اور وہ بھی تھے جن کا نظری اعتبار سے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ تھا اور وہ بھی تھے جو کسی نظریہ سے منسلک نہ تھے' آزاد خیال تھے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کنونشن کے انعقاد پر جو رقم صرف ہوئی'اس کا کسی خفیہ فنڈ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کنونشن کے افتتاحی اجلاس کی (۳) صدارت بابائے اردو مولوی عبد الحق نے فرمائی۔ کنونشن کا افتتاح پروفیسر مرزا محمد سعید مرحوم نے کیا ۔وہ ان تمام ادیبوں 'دانشوروں اور شاعروں میں شامل تھے جو ملک کے مختلف حصے سے اس کنونشن میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ انکی فہرست بڑی موقر ہے۔بعد میں رکنیت اختیار کرنے والے ادباؤ شعرا' میں وہ حضرات جنھوں نے ازخود پاکستان رائٹرز گلڈ کی ممبری کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تھا(جس کا قیام کنونشن منعقد ہونے سے ہو چکا تھا) ' ان میں فیض احمد فیض' شیخ ایاز احمد ندیم قاسمی' حمزہ شنواری اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا وہ پورا گروپ تھا جو سابق مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا تھا(ان میں سے چند بنگالی دانشور 1971ء میں پراسرار طور پر قتل کردیئے گئے)

قدرت اللہ شہاب کے ایما پر صدر ایوب افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے۔ لیکن ان کی نشست عام حاضرین کے ساتھ پہلی صف میں رکھی گئی تھی۔ بہر حال اس اجتماع کے نتیجے میں رائٹرز گلڈ کو مارشل لا کی پیداوار کہا گیا' حالاں کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں۔ صداقت وہی ہے جس کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ فی الحقیقت بادی النظر میں یہ غیر منطقی محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ شہاب صاحب گلڈ کے پہلے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے (کنونشن کے اجلاس میں شرکا کی مکمل تائید سے) اور اس حیثیت سے انھوں نے چند برس خدمات بھی انجام دیں' گلڈ مارشل لا حکومت کا آلۂ کار نہ بن سکا۔ کیا یہ قول کہ شہاب نے اپنی پیشہ ورانہ ترقی کے لیے اسے کسی نہ کسی عنوان سہارا بنایا؟ اس بات کا مجھے مطلق علم نہیں۔ گلڈ کے قیام کے بعد میں اور ابن الحسن گلڈ کا زیادہ ساتھ نہ دے سکے کہ جلد ہی فوجی اہلکاروں میں گلڈ کی ممبر شپ پر(۳) پابندی لگا دی گئی۔ اس کا اطلاق نہ صرف گلڈ بلکہ دوسرے ادبی وثقافتی اداروں پر بھی ہوا۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گلڈ کا وجود اس دوران بھی باقی رہا جب صدر ایوب کی مارشل لا سرکار کے خلاف نفرت اپنے عروج پر تھی اور عوام اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد اس کی حیثیت کے بارے میں مشکوک نظر آتی تھی۔ اس کے باوجود ہم (یعنی میں اور عالی) گلڈ کی آزاد حیثیت کی مسلسل وضاحت کرتے رہے۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دوران میں عالی بھی شاید اپنے پیشے کی فلاح (۴) میں لگ گئے اور مالِ کار ایوب خاں کے ایوان میں افسر بکار خاص(OSD) کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی ابتدائی ذمے داری یہ ٹھہری تھی کہ صدر کے عوام سے رابطے میں تعاون کریں۔ اس باب میں میرا رویّہ صرف یہ تھا کہ میں گلڈ سے اپنے تعلقات کو بحال رکھنا چاہتا تھا کہ میں اس کے بانی ممبروں میں تھا۔ اگرچہ یہ تعلق برائے نام ہی رہ گیا تھا۔

عالی گلڈ کی سرگرمیوں کے توسط سے زیادہ سے زیادہ عوام الناس کے قریب تر ہوتے گئے۔ خاص طور پر جہاں معاملہ ادیبوں کا آن پڑتا وہ اپنے موقف سے منحرف نہیں ہوتے تھے اور بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے۔ عالی نے ادیبوں کے مفاد میں بہت سے اچھے کام کیے۔ پاکستانی ادیبوں کو بیرونی دنیا سے متعارف کرانے کی سبیل پیدا کی' کچھ براہ راست اور کچھ یونیسکو کی مدد سے۔ انھوں نے گنار مرڈال(Gunnar Myrdal) کی عنایت کے طفیل "نوبل پرائز ایوارڈ" کی تقریب میں بھی شرکت کی (۵) اس امید پر کہ وہ سویڈش اکاڈمی کو ان کے نوبل ایوارڈ میں پاکستانی مصنفین کے استحقاق کی بات کرسکیں گے۔ گو میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ "نوبل پرائز" کی تقسیم میں پبلک اثر ورسوخ کارآمد ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ عالی نے دور دراز ممالک کی سیاحی کی ہے۔ اور اکثر عالمی شہرت کے ادبا' ادبی اداروں' انجمنوں اور گلڈ کے رابطے میں بھی رہے ہیں۔

ایک تفصیلی فہرست ان مختلف ادبی ثقافتی اداروں اور ان کے مشاہیر کی تیار کرنی آسان نہیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی سطح پر متعلق رہے۔ یہ سلسلہ رائٹرز گلڈ سے شروع ہو کر انجمن ترقی اردو پاکستان' سنٹرل اردو بورڈ' اردو ڈکشنری بورڈ' مقتدرہ قومی زبان' نیشنل بک کونسل' افکار ٹرسٹ' نظر حیدر آبادی ٹرسٹ' ادیب سہارنپوری ٹرسٹ اور سلیم احمد ٹرسٹ تک جاتا ہے۔ شاعر اور ادبی شخصیت کی حیثیت سے عالی بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ان بیرونی ممالک

میں اچھی طرح متعارف ہیں جہاں جہاں پاکستانی آباد ہیں۔ وہ اپنے دوہے اور اس کے خاص ترنم کی وجہ سے بھی مقبول ہیں۔مشاعرے میں ان کی پذیرائی مثالی ہے۔ اس سے قطع نظر عالی کی شاعری اور شخصیت سے ادبی حلقوں میں سنجیدگی سے دلچسپی لی جاتی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ کی سطح کے بہت سے کام کرلیے ۔ انھوں نے 1967ء میں کالم نگاری شروع کی اور شروع سے اب تک تقریباً سات ہزار صفحات کے کالم روزنامہ "جنگ" کے لیے لکھ چکے ہیں۔ ان سے بہ مشکل ہی کوئی ایسا موضوع نظر انداز ہوا ہو جسے حیطۂ ذکر میں آنا تھا۔ وہ اس ہفتہ واری کالم میں دنیا جہان کے موضوعات پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور انجمن ترقی اردو کی مطبوعات کے لیے "حرفے چند" کے عنوان سے مقدمے لکھتے رہتے ہیں ان میں سے 150 "حرفِ چند" انجمن نے تین جلدوں میں چھاپے ہیں۔

یہ محض چند رُخ ہیں اس عالی کے جو ہمہ وقت ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں معروف رہتے ہیں۔ انھوں نے قومی ترانے، ملی نغمے، اور رجزیہ گیت لکھے اور G.H.Q میوزک کمیٹی کے ممبر بھی رہے ہیں جو رزمیہ دھنوں اور فوجی ترانوں کی نگرانی تخلیق اور اشاعت کرتی ہے۔ انھوں نے ایک قومی نغمہ "اے وطن کے سجیلے جوانو" لکھاتھا جو پاک بھارت تنازع (1965) سے چند مہینے پہلے ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں صدا بند ہوا ۔ جیسے عالی کو اس بات کی قبل از وقت خبر ہوگئی ہو کہ جلد ہی پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازع کھڑا ہونے والا ہے۔ ان کا "جیوے جیوے پاکستان" اپنی شہرت کے اعتبار سے پاکستان کے قومی ترانے کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ بہت سے ناک بھوں چڑھانے والے ناقدین اسے ادبی سرگرمی میں شمار نہیں کرتے لیکن عالی کو اپنی اس خدمت پر فخر ہے۔

عالی سیاست کی طرف کیوں منتقل ہوئے؟ اس کے لیے ان کے پاس کوئی خاص جواب نہیں، لیکن ان کا ایقان ہے کہ ایک دانشور کی حیثیت سے عوام الناس سے متعلق کاموں میں دلچسپی لینا ان پر لازم آتا ہے۔ ان کو قدرت نے اس باب میں بے انتہا لگن، دلچسپی اور قوت فراہم کی ہے۔ وہ کام کرتے ہیں، محض تماشبین نہیں ہیں۔

وہ اس بات کا سختی سے اعادہ کرتے ہیں کہ 1977ء میں قومی اسمبلی کی نمائندگی کے لیے پیپلز پارٹی نے جو اپنا ٹکٹ ان کو پیش کیا تھا اس بارے میں ان کی اپنی پہل کا دخل نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی اس وقت کراچی میں بہت زیادہ مقبول نہیں تھی، نتیجتاً عالی صاحب کو شکست کا (٦) سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے میں وہ نیشنل بینک آف پاکستان میں سینئر ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ تھے۔ چنانچہ انھیں اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے میں عارضی طور پر کچھ مسئلہ پیش آیا لیکن وہ اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ فی الحقیقت بینک میں وہ ہمیشہ سے نیک نام اور خدمات اور کارکردگی کے حوالے سے باتوقیر تھے۔ اور (1988ء میں) ملازمت سے سبک دوشی سے پہلے وہ نیشنل بینک ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبر کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔

عالی صاحب کی سیاست میں حالیہ جسارت پر رائے زنی کچھ آسان نہیں ۔ ان کا قلم فعال ہے اور وہ مسلسل کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر جنگ کے کالم کے کام آتا ہے۔ کالم میں لکھے جانے والے موضوعات قومی مسائل اور آئے دن وقوع پزیر ہونے والے واقعات ہوتے ہیں۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ عالی نمایاں ہونا چاہتے تھے،

س کے لیے انھوں نے سینٹ میں داخل ہونے کا سوچا، اس (۷) نشست پر جو "ٹیکنوکریٹ" کے لیے مختص ہے۔ بہر حال انھوں نے ایک تقریب میں خود کہا کہ میں نے پچھلے انتخابات کے بعد کسی حد تک جذباتی انداز میں کراچی کے مہاجرین کی حالت زار پر اظہار خیال کیا اور اس غیر معقول رویے کی نشان دہی کی جو ان کے ساتھ روا رکھا جارہا تھا۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا یہ اظہار یہ لندن ریلے کیا جارہا ہے۔ وہاں ایم۔ کیو۔ ایم کے رہنما الطاف حسین نے بہ نفس نفیس اس کو سنا اور اس سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً یہ تجویز پیش کی کہ عالی کو سینٹ کے لیے آزادانہ انتخاب کی درخواست داخل کرنی چاہیے۔ بہر حال عالی کسی پارٹی ٹکٹ کے طلب گار نہیں تھے۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔ ایم۔ کیو۔ ایم نے ان کے حق میں بھرپور تائید کا فیصلہ کیا۔ عالی کا اصرار ہے کہ انھیں سینٹ کے آزاد ممبر کے طور پر شمار کرنا چاہیے۔(۸)

تاہم ابھی یہ کہنا شاید قبل ازوقت ہو گا کہ مجلس قانون ساز میں انھوں نے کیا کارگزاری انجام دی۔ اس کا جائزہ لیا جائے گا لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی ذمے داری پورے انہماک سے نباہ رہے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی بیشتر سرگرمیاں فروغ تعلیم کے لیے مختص ہوں گی۔ اور شاید ان کے اسی موقف کی وجہ سے انھیں سینٹ کمیٹی برائے تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ہے۔ کم عرصے میں انہوں نے 14 تحریکیں اور 21 قراردادیں اس سلسلے میں پیش کی ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں بھی ہیں کہ اہل قلم کو ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے حکومت کی طرف سے قرضِ حسنہ دیے جائیں جسے حکومت نے اصولی طور پر منظور بھی کر لیا ہے۔ وہ اس بات کے طرف دار نہیں کہ قانون سازی کے معاملے میں وہ کسی خاص حلقۂ کار تک خود کو محدود کر لیں۔ اس کے برعکس وہ حکومتی سرگرمیوں کے ہر شعبے میں اپنی دلچسپی کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ ایم۔ کیو۔ ایم (متحدہ قومی موومنٹ) کی تائید سے سینٹ میں آئے ہیں اس لیے عالی کے لیے آسان نہ ہو گا کہ وہ اپنی مکمل آزاد حیثیت کو برقرار رکھ سکیں۔ لیکن یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں کہ وہ اپنی آزاد حیثیت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

— — — — — — — —

۱۔ یہ شادی ہوئی پہلی تین بیگمات موجود نہیں تھیں۔ دو کا انتقال ہو چکا تھا، ایک (نمبر ۳) کو طلاق۔ ایک شادی عالی صاحب کی والدہ سے شادی کے بعد بھی کی۔ عالی صاحب کے نانا خواجہ ناصر وحید خواجہ ناصر وزیر (سجادہ نشیں خواجہ میر درد) کے بیٹے اور نواب فرخ مرزا کے چوپھی زاد بھائی تھے، اس طرح کہ خواجہ ناصر وحید کی والدہ مریم زمانی بیگم جو خواجہ ناصر وزیر کو بیاہیں، نواب فرخ مرزا کے دادا نواب امین الدین خان (بن نواب احمد بخش خاں) کی صاحبزادی تھیں۔

۲۔ در حقیقت دسمبر کا پہلا ہفتہ کیونکہ ادیبوں کا اعلان چار دسمبر کو چھپا تھا۔

۳۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم ابتدائی دستخط کنندگان میں نہیں تھے اعلان کے چند دن بعد جب مجلسِ عمل بنی تو دستخط کنندگان کی درخواست پر انھوں نے مجلسِ عمل کی صدارت قبول کی۔ اولا" دو مزید دستخط کنندگان عباس احمد عباسی مرحوم اور قدرت اللہ شہاب مرحوم تھے۔ بابائے اردو نے آخری اجلاس کی صدارت کی تھی۔ ترتیب تواریخ میں عسکری صاحب کو کسی قدر سہو تسامح ہوا تھا جس کی تصحیح خود انھوں نے "ڈان" کے اگلے سے اگلے صحت نامے میں کر رکھی ہے۔ بقول عالی صاحب، جی۔ ایچ۔ کیو کو خود بعض شرکاء نے یہ تاثر

دیا کہ اس ادارے پر بائیں بازو کا قبضہ ہے۔ جناب شہاب صاحب کی بعض تقریروں اور اب مطبوعہ تحریروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔

۴۔ بقول عالی ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔

۵۔ مگر یہ واقعہ ۱۹۷۸ء کا ہے جب ان کا گلڈ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

۶۔ کراچی میں شہری علاقوں کے سبھی امیدوار متحدہ قومی محاذ سے شکست کھا گئے تھے۔ عالی صاحب کو ہارنے والوں میں سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ ان ہارنے والوں میں حکیم سعید، اکبر لیاقت فرزند لیاقت علی خان مرحوم وغیرہ شامل تھے جنہیں پی پی پی نے ٹکٹ دیا تھا۔

۷۔ یہ درست نہیں، وہ عام نشست پر منتخب ہوئے ہیں۔

۸۔ انہوں نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی آزاد امیدوار کی حیثیت سے داخل کئے۔ وہ ایم کیو ایم (متحدہ) کے حمایت یافتہ امیدوار تھے۔ الیکشن کمیشن کے ریکارڈ کے مطابق آزاد منتخب ہوئے۔ سینٹ میں بھی آزاد اراکین کے ساتھ نشست دی گئی ہے۔ ایم کیو ایم (متحدہ قومی موومنٹ) سے باہمی احترام کا واسطہ ہے۔ ناشرین

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

جمیل الدین عالی

(اقتباسات)

آزادی کے فوراً بعد کی بات ہے، جمیل الدین عالی سے میری پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی۔ اب ٹھیک سے نہ تو مجھے مہینہ یاد ہے نہ سال، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ جمیل الدین عالی دہلی کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تھے یا کسی نجی کام کے سلسلے میں اور یہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں کہ ملاقات کنور مہندر سنگھ بیدی کے گھر میں ہوئی یا آپا حمیدہ سلطان کے گھر علی منزل میں۔لیکن ملاقات ہوئی ان دونوں میں سے کسی ایک جگہ پر۔ میں اس وقت تک جمیل الدین عالی کے نام سے تو واقف تھا لیکن ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب اتنا یاد آرہا ہے کہ حمیدہ آپا نے جب تعارف کرایا تو لوہارو خاندان کے حوالے سے۔ نوابانِ لوہارو کا ذکر سنتے ہی میں چونکا اور لوہارو خاندان کے علمی اور ادبی کارنامے غالبیات کے پس منظر سمیت میری نظر کے سامنے پھر گئے اور اس وقت میرے روبرو صرف شاعر جمیل الدین عالی ہی نہیں تھے بلکہ شاعر جمیل الدین عالی میں سارا لوہارو خاندان مجھے نظر آرہا تھا، اس حقیقت کے ساتھ کہ یہ خاندان لوہارو کے آخری شاعر ہیں۔

عالی کے اس قیام دہلی کے دوران میں ان کے ساتھ تین چار بار ملنے کا اتفاق ہوا اور انہی گنتی کی چند ملاقاتوں ہی میں عالی صاحب نے مجھے جگن بھائی کہہ کر خطاب کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جمیل الدین عالی کے سفر کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ جب پاکستان واپس جانے لگے تو میں انہیں اسٹیشن پر پہنچانے گیا۔ ریل بہت دیر بعد چلی اور میں ریل کے چلنے تک ان کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہا۔ اس وقت تک ابھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوائی جہازوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی ☆ جو چند برس کے بعد دونوں ملکوں کی زندگی کا معمول بن گئی۔

یہ غالباً ۴۸ء تا ۴۹ء کی بات ہے اور اس وقت صورت یہ تھی کہ عالی کی شاعری کہیں نظر آجاتی تھی تو میں اسے شوق سے پڑھتا تھا۔ خاص طور سے اس کی تلاش نہیں تھی جیسے جوش، جگر، فراق، حفیظ اور فیض کا کلام میں رسائل میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتا تھا۔ عالی ان سب سے عمر میں بھی کم تھے بلکہ مجھ سے بھی عمر میں کم ہیں،لیکن مذکورہ

ملاقات (جو تین چار چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں پر مشتمل تھی) ایک ایسے تعلق کا باعث بنی کہ میں عالی کا کلام بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھنے لگا۔ اور ان کے کلام میں مجھے وہی دلکشی نظر آئی جو میں نے ان کی شخصیت میں دیکھی تھی۔ اس وقت عالی کی شاعری کی ابتدا تھی؛ لیکن اس ابتدائی دور میں بھی اس طرح کے اشعار وہ کہہ رہے تھے۔

ہائے یہ سیلِ رنگ و نور ہائے یہ لذتِ حضور
کچھ ترے نام کا سرور کچھ میری گرمیٔ کلام
اب جو یہ اعتراض ہے اتنے برس میں کیا کیا
تیرے بغیر صبح و شام اپنے کہاں تھے صبح و شام
تم جو فقیر دوست ہو، تم جو ہو صاحب نگاہ
ہم بھی ہیں آلِ میردرد، ہم بھی ہیں صاحب مقام
ذہن تمام بے بسی، روح تمام تشنگی
سو، یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

وہ آئے حضرتِ عالی بہ جیب و دامن چاک
بہ زعمِ خود بڑے باہوش و صاحبِ ادراک
رہی خزاں میں تمنا کہ پھول چن لیتے
بہار آئی تو ہے دامنِ تمنا چاک
وہی تعلقِ خاطر ہے آج بھی تجھ سے
بہ ایں حوادثِ ایام و گردشِ افلاک
ادا نہیں ہے یہ ہی زندگی ان آنکھوں میں
بہت حسین، بہت مضطرب، بہت غم ناک
ترے نثار مرے فن کی یوں نہ کر توصیف
مرے یہ نقد و جواہر ترے خس و خاشاک

گویا۔۔۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

اور مجھے اس وقت یہ اشعار اس لیے بھی پسند آئے تھے کہ ان میں اقبال کے آہنگ کی جھلک موجود تھی۔ میں آج بھی کلام اقبال کے سحر دلکشی کا اسیر ہوں لیکن اس وقت میں اس بات کی اہمیت سے نا آشنا تھا کہ کسی شاعر کے کلام سے متاثر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی جائے۔ یہ راز بعد میں مجھ پر کھلا کہ

شاعر کو اپنی آواز اور اپنا لہجہ دریافت کرنا چاہیے۔گویا اقبال کے اس مشورے کی اہمیت مجھے ذرا بعد میں آ کے معلوم ہوئی کہ ؎

تراش از تیشۂ خود جادہ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

لیکن عالی جی جادہ نو کی تلاش میں شروع ہی سے مصروف رہے اور انہیں اپنا لہجہ اور اپنی آواز دریافت کرنے میں دیر نہ لگی۔ ان کے اسی زمانے کا شعر ہے۔

اکتا گیا ہوں جادۂ نو کی تلاش سے
ہر راہ میں کوئی نہ کوئی کارواں ملا

اور بعد میں تو وہ دور آگیا جب عالی جی کا لہجہ ہی ان کی اور ان کی شناخت بن گیا، خواہ ان کی غزل ہو یا نظم یا دوہے یا گیت۔

عالی جی کے ساتھ کراچی کی ایک اور ملاقات میرے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ میں انجمنِ ساداتِ امروہہ کی ایک دعوت پر ایک مشاعرے اور سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی گیا۔ عالی صاحب نے اس موقع پر اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ وہاں جا کر دیکھا تو کوئی ستر' اسی یا سو کے قریب مہمان تھے۔ کراچی کے تمام برگزیدہ اہلِ قلم حضرات' شعراء' نثر نگار' یونیورسٹی کے اساتذہ' گویا مشاعرے اور سیمنار میں جن حضرات سے ملاقات نہیں ہو سکی ان سب سے ملاقات اس ڈنر میں ہو گئی۔

امریکا کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ میں ویسٹ یونی ورسٹی شکاگو کی دعوت پر لیکچروں کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔شکاگو کے دوران قیام میں امریکا کی اردو سوسائٹی کے سیکریٹری احمد خان صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے شعرا جمیل الدین عالی' قتیل شفائی' سید ضمیر جعفری' حمایت علی شاعر' پروین فنا سید' صہبا اختر اور چند اور شعرا مشاعروں میں شرکت کے لیے امریکا اور کینیڈا کے دورے پر ہیں ۔ اس سلسلے میں فلاں تاریخ کو شکاگو میں مشاعرہ ہے جس کا انتظام میں نے کیا ہے۔ انہوں نے مجھے اس مشاعرے میں شرکت اور اس کی صدارت قبول کرنے کی دعوت دی۔ میرے لیے تو یہ مسرت کا مقام بھی تھا اور اعزاز کا بھی ۔چنانچہ وقتِ مقررہ پر میں ڈاکٹر خورشید ملک کی معیت میں وہاں پہنچ گیا۔اس مشاعرے کی قدرے مفصل روداد میں اپنے امریکا کے سفرنامے نمبرا میں بیان کر چکا ہوں' یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ سامعین میں ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں موجود تھے۔اب مجھے الگ الگ تو اندازہ نہیں کہ ہندوستانی کتنے تھے اور پاکستانی کتنے' لیکن چوں کہ بنیادی طور پر اس مشاعرے میں پاکستانی شعرا ہی شریک تھے

اور ان کا انتظام بھی پاکستان کے ایک ادارے نے کیا تھا اس لیے ہو سکتا ہے کہ پاکستانی سامعین کی تعداد ہندوستانی سامعین سے زیادہ ہو۔ اس میں جمیل الدین عالی نے اپنی نظم "جیوے جیوے پاکستان" پڑھی جسے سامعین نے بہت پسند یا۔ یہ نظم یا گیت جب خاتمے کے قریب پہنچا تو عالی صاحب نے کہا کہ جس قدر پاکستانی یہاں ہیں وہ میرے ساتھ اس نظم کے مصرع (ٹیپ) دہرائیں چنانچہ یہی ہوا اور ہال " جیوے جیوے پاکستان" کی مترنم آوازوں سے گونج اٹھا۔ جب عالی صاحب نظم پڑھ کر ڈائس پر آئے تو میں مائکروفون پر گیا اور وہاں اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ عالی صاحب نے یہ مطالبہ صرف پاکستانی سامعین سے کیوں کیا ہے کہ وہ اس نظم کے مصرعے ان کے ساتھ دہرائیں۔ میں بطور ایک ہندوستانی کے اس بات کے لیے دعاگو ہوں کہ پاکستان زندہ و پائندہ رہے اور میں تو اس ہندوستانی کو ہندوستانی نہیں سمجھتا جو پاکستان کی ترقی' خوشحالی اور پائندگی کا آرزومند نہیں۔۔۔۔۔ شاید یہ فقرہ ابھی میں نے مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ عالی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور آکر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے۔ اور کافی دیر تک اسی عالم میں رہے۔ اس وقت کا عالم قابلِ دید تھا۔ اب میں شاید اسے لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ ہال تو خیر کافی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالی صاحب نے امریکہ کی سرزمین پر ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو ابھی تک میرے دل پر ثبت ہے اور امریکہ کے اکثر پاکستانی اور ہندوستانی گھروں میں اور لائبریریوں میں ویڈیو ٹیپ کی صورت میں بھی موجود ہے۔

دو ایک برس بعد پھر امریکہ میں ملاقات ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر جب میں لندن پہنچا تو بی بی سی ٹیلی ویژن برمنگھم کی طرف سے انٹرویو ریکارڈ کرنے کی دعوت ملی۔ برمنگھم جانا میرے لیے دشوار تھا کیوں کہ مجھے دوسرے دن اپنی بیٹی' داماد اور بچوں سے ملنے فرودشم جانا تھا اس لیے بی بی سی ٹیلی ویژن برمنگھم نے کہا کہ ہم آپ کے انٹرویو کا انتظام بی بی سی ٹیلی ویژن لندن کے اسٹوڈیو میں کریں گے اور وہیں آپ کو بلا لیں گے۔ یہ بات میرے لیے آسان تھی کیوں کہ اس سے میرے فرودشم کے پروگرام میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عالی جی بھی موجود ہیں' بلکہ ان کا انٹرویو شروع ہی ہونے والا تھا۔ انٹرویو شروع ہوا تو اس کی آواز باہر اس کمرے میں بھی اسپیکر پر آرہی تھی جس میں بیٹھا تھا۔ ایک سوال عالی جی کے دوہوں کے بارے میں تھا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ ہندی آپ نے کہاں پڑھی تھی۔ لیکن عالی جی کا جواب یہ تھا کہ میں ہندی سے ناآشنا ہوں۔ ان کے دوہوں کی زبان پر بات ہوئی تو عالی جی نے کہا کہ یہ میرا اپنا لہجہ ہے۔ میں دوہوں میں یہی زبان استعمال کرتا ہوں۔ یہ بات میرے لیے بھی حیرت انگیز تھی کیوں کہ اس سے شاعری کی زبان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی اور ساتھ ہی عالی جی کی قادر الکلامی کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔

کچھ برس بعد عرب امارات میں ملاقات کا موقع ملا۔ تقریب تھی فیض صاحب کی یاد میں مشاعرہ' جو خلیل الرحمن صاحب کے تعاون سے عزیز محترم سلیم جعفری نے منعقد کیا تھا۔ مشاعرے کے بعد ابوظبی' دوبئی اور شارجہ کی مختلف

نشستوں میں اور زیادہ مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ روانگی سے قبل "خلیج ٹائمز" نے ہم میں سے اکثر شعراء کے انٹرویو لیے۔ عالی نے اپنے انٹرویو میں ہندوستان اور پاکستان سے باہر منعقد ہونے والے اردو مشاعروں' یہاں کی اردو تحریکوں ان کی افادیت اور ان کے سامنے آنے والی مشکلات پر انتہائی عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ میں چوں کہ اپنا انٹرویو دینے کے بعد قریب ہی بیٹھا تھا اور ایک ایک لفظ سن رہا تھا اس لیے اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہ لگی کہ اس قدر پر مغز اور دانشورانہ انٹرویو ہم میں سے شاید کسی اور شاعر نے نہیں دیا تھا۔

آخر ہندوستان واپس روانہ ہونے سے قبل عالی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے دوسرے دن کے لیے کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ میں خود آکر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔

دوسرے دن میں ان کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی' عالی جی کا ٹیلی فون تھا۔ کہنے لگے' میں آگیا ہوں۔ ہوٹل ہی سے بات کر رہا ہوں' نیچے بیٹھا ہوں۔ میں فوراً نیچے گیا۔ کہنے لگے' بھئی طبیعت اچھی نہیں ہے اس لیے میں اوپر نہیں آیا۔ ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ عالی واقعی بیمار ہیں۔ میں نے کہا' اس عالم میں تو آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ مجھ میں آپ میں کوئی ایسا تکلف تو ہے نہیں بلکہ آپ کو دفتر سے دو ایک دن کی چھٹی لے کر گھر پر رہنا چاہیے۔ اس پر انہوں نے علالت کی تفصیل سنائی۔ عالی واقعی بیمار تھے' نہ معلوم اس عالم میں وہ صبح سے شام تک دفتر کی ڈیوٹی کیسے انجام دے رہے تھے۔

وہ مجھے کراچی کے ایک بہت عمدہ ہوٹل میں لے گئے نام تو یاد نہیں لیکن یہ REVOLVING ہوٹل تھا۔ اس میں ایک بار پہلے بھی میں جا چکا تھا۔ ایک برس قبل پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے اسی میں دعوت کی تھی۔ وہاں پہنچے تو مشفق خواجہ ہم لوگوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم تینوں اوپر گئے' لفٹ کے بعد ہوٹل کی بالائی منزل میں جانے کے لیے' جو گھومتی رہتی ہے' چار پانچ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ چار پانچ سیڑھیاں چڑھنا بھی عالی صاحب کے لیے دشوار تھا۔ اس عالم میں انہوں نے مجھ سے ملنے کی زحمت کی تھی اور ایک ایسے ریسٹورنٹ میں کھانے کا اہتمام کیا تھا جہاں انہیں چند سیڑھیاں بھی چڑھنا پڑتی تھیں۔ مجھے اس بات پر خوشی بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ بہر طور کھانے پر کوئی دو گھنٹے کی محفل رہی اور میں سمجھتا ہوں اس محفلِ یاراں میں عالی صاحب کی طبیعت تھوڑی دیر کے لیے بحال ہو گئی۔

ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے دو نامی فن کار' منور سعید اور قوی جو میرے پسندیدہ بلکہ محبوب فن کار ہیں' غالباً عالی صاحب سے ملنے ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ ان سے ملاقات ہوئی' جی خوش ہوا۔ گویا عالی صاحب کی بدولت منور سعید صاحب اور قوی صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی اور یہ بھی کراچی کے سفر کا حاصل تھا۔

یہ آزاد صاحب کا سہو ہے۔ عالی جی ۱۹۴۷ کے بعد پہلی بار اپنی ایک بڑی سوتیلی بہن بیگم نواب ابراہیم خاں برادر نواب محمد اسمٰعیل خاں کے انتقال پر تعزیت کے لیے ۱۹۵۵ میں براہ دہلی میرٹھ گئے تھے۔ اسکے بعد وہ ۱۹۸۲ میں پہلی بار ہندوستان گئے ہیں۔ ناشرین

(از "عالی' فن اور شخصیت")   ایم حبیب خاں' علمی مجلس دہلی' ۱۹۸۸

محمد عمر

جمیل - میرا نیک نام بدنام یار

یہ مضمون ایک ایسی شخصیت کے بارے میں ہے جو بہت دنوں سے ادب اور صحافت میں ایک خاص حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس پر پاک و ہند و دنیائے ادب کے بڑے بڑے لوگ بہت کچھ لکھتے اور بولتے آئے ہیں؛ جس کے جشن امارات' سعودی عرب اور امریکہ کے کئی شہروں میں منائے جا چکے ہیں' جس کے کئی منفرد قومی نغمے پاکستان اور دنیائے اسلام میں (ترجمہ ہو کر) مقبول ہو چکے ہیں۔ ایک ایسی مترنم آواز اور خوبصورت انداز کا شاعر جسے جنوبی ایشیا میں دوہا گوئی کو کئی سو برس بعد مقبول کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جو کثیر التصنیف' کثیر الاحباب (اور کثیر الاغیار بھی) ہے۔ جس نے کئی فلاحی سمتوں میں اَن تھک اور ٹھوس رضاکارانہ کام کیا ہے' جس نے ادبی اور ثقافتی ادارے بنائے اور چلائے ہیں؛ جو انسانوں کا ہمدرد' ادیبوں کا مونس و غم خوار اور دوستوں کا دوست ہے۔ عالی جو اپنی ذات میں ایک انجمن ہے؛ جسے بات کرنے اور اسے سجانے کا فن آتا ہے' اس شخصیت کی جتنی قدر منزلت اور ساتھ ہی کبھی کھلی اور کبھی خاموش مخالفت ہوتی رہی اس نے اسے ہمارے ادب اور ادیبوں میں ایک منفرد حیثیت عطا کر رکھی ہے۔ عوام میں انتہائی مقبولیت کے باوجود ایسے لوگوں کی اصل پرکھ عموماً ان کے گزر جانے کے بعد ہوتی ہے کیونکہ معاصر تاریخ اپنے تاثرات اور تعصبات سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ بعض عارضی قسم کے قضیئے اور معیار اور پھر بدلتے ہوئے سیاسی حالات ان کی شخصیت پر اپنے سائے پھیلا دیتے ہیں اور بعض لوگ صوبائی تنگ نظری اور گروپ بندی کی وجہ سے انھیں ان کا حق نہیں ملنے دیتے۔ پھر کوئی اہلِ دل اہلِ نظر آتا ہے اور سو فی صد نہ سہی بہت بڑی حد تک مختلف قومی' سیاسی اور فکری مناظر سامنے رکھتے ہوئے ان کی "اناٹومی" کرتا ہے۔ اس میں بھی اپنے اپنے Perspective کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن بالآخر اگر شخصیت میں جان ہے تو دو تین ادوار میں اس کا مقام کسی حد تک متعین ہو ہی جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کوئی نقاد اور مورخ نہیں۔ مجھے اس شمارے میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ تو بس جمیل سے دوستی کا تقاضا اور عزیزی گلزار جاوید مدیر "چہار سو" کی خواہش کا بھرم ہے؛ جو مجھے یہ مضمون اپنے یار پر لکھنا ہے۔ ورنہ کہاں عالی' دلی کی تہذیب میں پلا ہوا اور بگڑا ہوا نواب زادہ اور ادھر میں ایک سیدھا سادہ پنجابی' مجھے تو صرف اپنے یار کے بارے میں چند سچی سچی باتیں کرنی ہیں' اگر یہ باتیں میں نہیں کروں گا تو پھر اور کون کرے گا' کیونکہ مجھے یہ زعم ہے کہ مجھ سے زیادہ اسے اور

کوئی نہیں جانتا۔

لیکن ذرا ٹھہریئے' عام لوگوں کی تو بات ہی نہیں' مجھے دنیائے ادب میں بہت کم قارئین جانتے ہیں۔ میں نے بھی دلی یونیورسٹی سے فارسی میں بی اے آنرز کرنے کے بعد لکھنا شروع کیا تھا۔چالیس کی دہائی میں ساقی اور ادبی دنیا میں چند افسانے شائع بھی ہوتے رہے۔

دھرمسالہ' ضلع کانگڑہ (مشرقی پنجاب) میں مسلم لیگ کا جنرل سیکریٹری تھا اور اس طرح تحریک پاکستان میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ (قومی خدمات کے سلسلہ میں مجھے تحریک پاکستان ٹرسٹ نے اب ۴۸ سال بعد ۱۹۹۴ء میں تحریک پاکستان گولڈ میڈل سے نوازا ہے۔) پھر آزادی آتے آتے گھر' جائیداد' کتابیں' مسودے' سب راکھ ہو گئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کیا کم ہے کہ پاکستان بن گیا' جس کی بدولت آج ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں۔ پاکستان آکر زندہ رہنے اور بچے پالنے کی مشقت نے وہ ذوق شوق بھی چھین لیا۔ جو اینگلو عربک کالج دلی کے محترم اساتذہ جناب منظور حسین موسوی' جناب آفتاب احمد اور جناب ڈاکٹر عبدالشکور احسن جیسے استادوں نے عطا کیا تھا۔ جہاں اختر الایمان بھی ہمت بڑھاتے تھے۔ جمیل الدین عالی لہرا لہرا کر اپنی کچی پکی غزلیں سناتا تھا۔ ملک نسیم انتظر بھی اپنے سخن فہمی کے جوہر دکھاتا تھا۔ محمد اطہر سب کا مذاق اڑاتا تھا۔ الحمد للہ کہ ہمیں پاکستان نے عزت و آبرو دی۔ لیکن مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں نے ۱۹۴۹ء میں Emile Bronte کے شہرۂ آفاق ناول "وودرنگ ہائیٹس" کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کا نام جمیل نے "ویران سرائے" رکھا تھا مگر بدقسمتی سے کراچی کے جس ناشر نے یہ مسودہ مجھ سے لیا تھا۔اس سے یہ مسودہ گم ہو گیا۔ پھر روسی ناولسٹ Turgenive کے ناول On the Eve کا ترجمہ "سرشام" کے عنوان سے کیا۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کی اور ۱۹۸۵ء میں ریٹائر ہوا۔ اس دوران میں بھی گاہے گاہے میرے افسانے اور ڈرامے ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ریڈیو کی ملازمت میں زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے مگر اس میں ایک بڑی خوبی بھی ہے جو دوسری جگہ نہیں وہ یہ کہ اس میں یقینی طور پر چند اچھے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے' فن کار' ادیب' پڑھے لکھے ساتھی جو آخر تک نبھاتے ہیں۔ خیر' مضمون لکھنا تھا اپنے یار جمیل الدین عالی پر...... بات اپنی شروع کر دی۔ لیکن ان کے لئے جو مجھے نہیں جانتے'تھوڑا سا اپنا تعارف بھی ضروری ہے۔

اگر دوستیوں کی تہہ میں جائیں تو اصل دوستی وہ ہے جو غرض سے پاک ہو۔ بادی النظر میں شاید یہ پیمانہ غلط لگے کیونکہ انسان بنیادی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے' مگر کیا کبھی آپ نے یہ نہیں سنا کہ فلاں شخص نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے دوست کی جان بچالی۔ جان سے زیادہ تو کسی کو کوئی چیز پیاری نہیں ہوتی! اصلی دوستی اور پیار ایک ایسا ہی اندھا جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "عالی جی" سے میری دوستی پچھلے ۵۵ برسوں سے قائم ہے۔ عالی جو ایک شاعر ہے' ایک ادیب' ایک دانشور' ایک کالم نگار اور بڑا بچہ ..... جس کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ان پر کہنے والے اور بہت ہوں گے مگر مجھے ان سب کچھ کے علاوہ اپنا دوست اس لئے عزیز ہے کہ وہ ایک بڑا انسان ہے' ایک عظیم پاکستانی۔ پاکستان اس کا ایک عجیب رومانس اور ہمیشہ ایک مستقل آئیڈیل رہا ہے' وہ پاکستان جو بنتے بنتے ٹوٹنے لگتا ہے اور پھر جڑنے بھی لگتا

ہے۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتا جب پاکستان دولخت ہوا تھا تو عالی بچوں کی طرح بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ میرا دوست اس لئے بھی عظیم ہے کہ اس نے اس وقت جیوے جیوے پاکستان لکھا جب جئے سندھ ' جئے بنگال ' جئے پنجاب کے نعرے گونج رہے تھے ' جس نے اس وقت ملک کی یکجہتی کے لئے جدوجہد کی جب ملک کے رگ و پے میں صوبائیت اور لسانیت کا زہر گھل رہا تھا اور جب مشرقی پاکستان میں کھلی بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے بے شمار اخباری کالم گواہ ہیں اور میں خود گواہی دیتا ہوں کہ جب سندھ کی علیحدگی پسند طاقتوں نے اسے اپنے ساتھ ملانا چاہا تو وہ چیخ اٹھا تھا کہ جو شخص ملک میں پانچ صوبوں کا دل سے قائل نہ رہا ہو وہ بھلا چھٹے صوبے کے قیام پر کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ میں کسی صوبے کو نہیں مانتا' میرا صوبہ تو صرف پاکستان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل کراچی کے حالات پر اس کی آنکھیں ہمیشہ اشکبار رہتی ہیں اس لئے وہ کراچی میں بسنے والوں کی محرومیوں پر مستقل لکھ رہا ہے۔ یقیناً وہ ہمارے صوبائی حوالوں کے خلاف ایک آئیڈیلسٹ انسان ہے' ایسا بھی کوئی تو ہو' وہ تو پوری دنیا میں انسانیت کو ایک دیکھنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' مجھے اس کی علمی' ادبی حیثیت پر کچھ نہیں کہنا۔ وہ میرا یار ہے لیکن یہ اس کی کوئی علمی ادبی حیثیت ہی ہے کہ اس پر موقر جریدے گوشے بناتے ہیں۔ دنیا میں کئی مقامات پر جشن ہوتے ہیں۔ بھارت میں اس پر کتاب چھپتی ہے۔ قومی سطح پر تقریب سپاس منعقد ہوتی ہے تو وزیر اعظم' قائد حزب اختلاف' کئی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے سربراہ' مداحانہ پیغامات بھیجتے ہیں' ہر صوبے' ہر مکتب فکر کے لوگ تقریب میں شریک ہو کر اعتراف خدمت میں تقریریں کرتے ہیں۔

جمیل اور میں ۱۹۴۰ء سے ساتھ رہے۔ بی اے تک ساتھ پڑھا' بی اے کے بعد میں دھرمسالہ (مشرقی پنجاب) چلا گیا۔ اس نے چند دوستوں کے ساتھ تعلیم کے دوران میں میرے ساتھ دھرمسالہ کے صحت افزا مقام پر قیام بھی کیا تھا جہاں وہ کوہ ہمالیہ کی دھرتی دھار کے برفانی سلسلوں کے خوبصورت مناظر سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ پھر آزادی ملنے پر ۱۹۴۷ء میں وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں کراچی مقیم ہوا اور میں پنڈی آ گیا۔ مگر ہمارا ایک دوسرے کے پاس آنے جانے کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا اور جب سے وہ مشہور ہوا مشاعروں میں بار بار اس کا آنا ہوا۔ ایوانِ صدر میں نوکری کے بعد تو مہینے میں دس بارہ دن یہیں آ کر رہتا۔ پھر جب میری پوسٹنگ کراچی میں ہوئی تو برسوں تک روز کا ساتھ رہا۔ ایوان صدر کے بعد اسے جتنی بھی نوکریاں ملیں' سب ایسی تھیں کہ اسلام آباد کے مسلسل دورے کرنے پڑتے تھے۔ یہاں پر تقریباً سب فاضل وقت ہم ساتھ گزارتے۔ اب بھی وہ برابر ادھر آتا رہتا ہے۔ یہ اس لئے بتانا پڑا کہ ایک بات واضح ہو جائے' ہماری ملاقاتوں میں کوئی قابل ذکر وقفہ نہیں آیا ہے۔ بعض لوگ دوستی سے شروع کرتے ہیں' کبھی مقابلے میں مبتلا ہو کر دشمن یا بدگمان ہو جاتے ہیں' کبھی یہ ہوتا ہے کہ حالات انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں اور وہ صرف ملاقاتی رہ جاتے ہیں یا ایک دوسرے کے لئے اجنبی۔ ایسے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں کوئی بھرپور رائے دینے کے قابل نہیں رہتے۔ ناپختہ تبصرہ تو ہر کوئی دوسرے پر کر سکتا ہے۔ میں اور جمیل آج تک ایک دوسرے سے اسی طرح منسلک ہیں جیسے

۱۹۴۰ء میں ہوتے تھے۔ اب نصف صدی سے زیادہ وقت گزارنے کے بعد ہم سے ایک دوسرے کی زندگیوں کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں۔ جمیل ایک نہایت ذہین و فطین اور بے باک لڑکا تھا۔ ویسا ہی آج بھی ہے۔ میں یاد کرتا ہوں تو ایک تیز مزاج 'فقرہ باز' نصابی تعلیم سے جی چرانے والا، مگر بہت پڑھنے والا، ایک خوش شکل، خوش پوش، چنچل نوجوان تھا، جو بے حد حساس اور جلد ناخوش ہونے والا ساتھی تھا۔ ہمارا کالج متوسط مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ تھا۔ کتنے تھے جو علی گڑھ نہیں جا سکتے تھے 'ادھر' آجاتے۔ وہاں ہمارے زمانے میں ایک ہندو استاد شنکر صاحب تو تھے جو ریاضی پڑھاتے تھے مگر کوئی ہندو طالب علم نہیں تھا۔ کوئی پابندی تو نہیں تھی مگر ہندوؤں نے ہندو کالج کو اپنا رکھا تھا۔ سینٹ اسٹیفنس کالج بھی تھا مگر وہاں اونچی 'تمدن والے' مسلمان بھی جو پکی مذہبی روش پر قائم ہوتے اپنے بچوں کو اس ادارے میں جانے نہیں دیتے تھے کیونکہ کہا جاتا تھا کہ وہاں کسی نہ کسی بہانے عیسائیت کی تبلیغ بھی ہوتی ہے اور لڑکے لڑکیوں کا آپس میں میل جول مخرب اخلاق ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت کی دلّی بس ایسی ہی تھی۔ ہمارے کالج کی بڑی شاندار تاریخ ہے۔ پہلے یہ دہلی کالج تھا اس سے پہلے اعتماد الدولہ ٹرسٹ کا مدرسہ تھا (غالباً اٹھارویں صدی کے اواخر سے) میں یہاں اس کی تاریخ نہیں دہراؤں گا' اتنا بتانا ضروری ہے کہ اس قومی درسگاہ سے سرسید' ماسٹر رام چند' مولانا حالی' مولانا محمد حسین آزاد جیسے بے شمار مشاہیر وابستہ رہ چکے تھے۔ غالب نے بھی یہیں فارسی پڑھانے کی درخواست دی تھی' ہمارے اولڈ بوائز میں بھی بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ جدید شعراء میں علی سردار جعفری اور اختر الایمان تو ہمارے ہی سینئرز تھے۔ ہمارے اساتذہ' دہلی' یوپی اور پنجاب سے تعلق رکھتے تھے طلبہ دہلی' مغربی یوپی اور گورنمنٹ آف انڈیا میں کام کرنے والے کئی صوبوں کے مسلمانوں کے بچے ہوتے تھے' جن میں پنجابیوں کی تعداد خاصی ہوتی تھی۔ سب کے سب کالج کی ثقافتی روایات میں رنگ کر ایک ہو جاتے تھے۔ ہمارا یہ کالج پاکستان مسلم لیگ کا بھی گڑھ تھا۔ جہاں مسلم لیگ سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس منعقد ہوتے اور اس طرح ہمیں قائد اعظم اور دیگر قومی رہنماؤں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملتا تھا۔ قائد ملت لیاقت علی خاں تو ایک عرصہ تک ہمارے کالج کے چیف پیٹرن بھی رہے تھے۔ جمیل ہمارے اساتذہ کی یاد میں غالباً پہلا طالب علم تھا جو ایک والیٔ ریاست کا فرزند تھا اور ہمارے کالج میں پڑھنے آیا ہو۔ (اس ریاست کا نام لوہارو تھا)۔ کیونکہ والیان ریاست کے بیٹے یا تو چیفس کالج لاہور جاتے یا میو کالج اجمیر یا ڈیرہ دون یا پھر انگلستان۔ یہ میں شمالی ہند کی بات کر رہا ہوں۔ وسطی اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جمیل ہمارے کالج میں اس لئے داخل کرا دیا گیا کہ اس کے والد اس کے لڑکپن میں ہی انتقال کر چکے تھے۔ والیٔ ریاست ان کے ایک پوتے تھے۔ ریاست چھوٹی بھی تھی اور والیٔ ریاست کو اسے شاہانہ تعلیم دلوانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' والدہ دہلی کی ایک سیدانی' خواجہ میر درد دہلویؒ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں مگر نواب صاحب کی چوتھی بیگم' ان سے پہلے تین بیگمات مر چکی تھیں۔ جمیل اپنی دو بہنوں سے بڑا ان کا اکلوتا بیٹا تھا ایک بیٹا مر چکا تھا وہ اسے اپنے سے جدا بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد اسے اپنے گھر گلی قاسم جان سے اپنی ننھیال کوچہ چیلان (دلّی) میں منتقل ہونا پڑا تھا جہاں اس کے ماموں اس کی نگرانی کرتے تھے۔ وہ' والدہ اور بہنیں ریزیڈنٹ پنجاب کے مقررہ کردہ ریاستی الاؤنس پر گزارہ کرتے تھے جو ٹھیک ٹھاک ہو کر بھی ان کے

معیار کا نہیں تھا۔ جمیل سال میں دو مرتبہ ریاست اس لئے جاتا تاکہ عید اور دوسرے تہواروں پر نامزد دیہات سے "نذر" بھی لے سکے۔ کبھی یہ رقم اچھی ہو جاتی تھی اور کبھی کم۔ مگر یہ ایک ظالمانہ روایت تھی۔ تھرڈ ایئر کے بعد اس نے اس مقصد کے لئے ریاست جانا چھوڑ دیا' کیونکہ ہمارے ساتھ رہ کر اپنے دوسرے عزیزوں کی نسبت روشن خیال اور حمید ہاشمی مرحوم کے زیر اثر کسی قدر انقلابی بھی ہو گیا تھا۔ جب کیمونسٹ پارٹی پر Ban تھا تو حمید ہاشمی اس سے کچھ کیمونسٹ لٹریچر بھی تقسیم کرواتا رہتا تھا کیونکہ اس پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بچپن کی یتیمی اور والدہ کے لاڈ پیار نے اسے پوری طرح نارمل نہیں رہنے دیا۔ شکر ہے کہ بعد میں اس پر یتیمی کے اثرات مثبت طور پر مرتب ہوئے ورنہ تو وہ جلد تباہ ہو جاتا۔ میرے خیال میں اس کو تباہی سے بچانے میں اس کی والدہ کی دعاؤں کے ساتھ ہمارے کالج کی دینی اور ثقافتی روایات کا بڑا دخل ہے جہاں اسے ایک عام لڑکے کی طرح رہنا پڑا' بلکہ جیسا کہ اس نے اختر الایمان کے خاکے میں بتایا ہے کہ کالج میں داخل ہونے آیا تو اپنے خاندان کی شاہی ٹوپی پہنے ہوا تھا جسکی اجازت اس کے بزرگوں کو شاہ دہلی نے دی تھی۔ اختر الایمان تھرڈ ایئر کے سینئر اور کالج کے لیڈر تھے۔ انہوں نے جمیل کو اپنے پاس بلایا اور اسے "مرغ زریں" کا خطاب دیا۔ ایک جونیئر حاضر باش سے اس کی ٹوپی اتروائی اور ہدایت کی کہ آئندہ یہ ٹوپی پہن کر کالج نہ آئے۔ پھر ہم جیسے ہم جولیوں کی صحبت میسر آئی۔ شروع شروع میں ہم نے اس کا مذاق اڑایا' لطیفہ بازی کی' مگر جلد ہی وہ ہم میں گھل مل گیا۔ پھر میں اور جمیل اپنی کلاس کے ایک نہایت ذہین طالب علم محمد اطہر سے ایک ساتھ محبت کرنے لگے۔ وہ ایک سانولا سلونا لڑکا تھا جس کا تعلق سہارنپور سے تھا۔ اس نے بٹلر اسکول شملہ سے میٹرک میں پنجاب بھر میں فرسٹ کلاس فرسٹ کیا تھا۔ اس لئے ہم سب اس سے بہت مرعوب تھے۔ وہ جمیل کے ساتھ ڈیسک میں شرکت کرتا تھا۔ میں اکثر اطہر کو اپنی سائیکل پر اس کے گھر چھوڑنے جاتا تھا جس پر جمیل مجھ پر لال پیلا ہوتا۔ لڑکپن کے اس عشق کی کہانی بڑی دلچسپ ہے' ہم دوست بھی تھے اور ایک دوسرے کے رقیب بھی۔ اس دور کے نفسیاتی تجزیے بہت ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ بہرحال ہمارے تینوں کے لئے نیک شگون ثابت ہوا۔ جب تک اطہر زندہ رہا ہم تینوں کی دوستی مثالی رہی۔ جمیل نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تعلقات وسیع ہوتے گئے' بڑے بڑے لوگوں سے واسطہ پڑنے لگا تھا مگر ۱۹۵۸ء میں اس کے شعری مجموعے کی پہلی کتاب آئی تو اس نے اسے اطہر کے نام ہی معنون کیا تھا۔ دو نثری کتابیں آئیں تو ایک میرے نام اور ایک نور الحسن جعفری کے نام معنون کی' سفرنامے بیوی کے نام۔

جمیل محبت کرنے والا ایک باوفا شخص ہے۔ حوصلہ مند اور آگے بڑھنے والا آدمی بھی۔ مگر اپنی وفا ترک نہیں کرتا۔ جن سے اپنے اور ان کے جس دور میں ملا ہے وہیں رہنا چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کی جدوجہد اور اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے کسی کو پہلے کی طرح وقت دینے کا موقع نہیں مل سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں جبکہ کبھی بعض احباب اسے Monopolise بھی کرنا چاہتے تھے' ان کی زندگی محدود تھی۔ یہ اپنی جگہ بہت مصروف۔ ان میں سے کچھ اس سے خفا ہو گئے۔ کچھ جلنے لگے۔ یہ سہتا رہا۔ اپنی طرف سے پھر بھی اس نے تعلقات نبھانے کی کوشش کی۔ جب ملا اس طرح ملا جیسے پہلے ملتا تھا یہاں راولپنڈی میں بھی جن لوگوں سے ابتدائی دور میں ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں مثلاً جمیل ملک' احمد

شمیم مرحوم' انہیں کبھی نہیں بھولا۔ اس کی مصروفیتیں بدل گئی تھیں مگر جب بھی ممکن ہوتا مجھے ساتھ لے کر احمد شمیم کے گھر ضرور جاتا۔ جمیل ملک کے پاس اب بھی جاتا ہے۔ سید ضمیر جعفری کے گھٹنے چھوتا تھا۔ اب بھی چھوتا ہے۔ جب شہاب اس کے افسر نہ رہے اور ان کا رائٹرز گلڈ سے بھی تعلق چھوٹ گیا' ریٹائر بھی ہو گئے' تب بھی ہمیشہ سے اس طرح نیاز مندانہ ملتا رہا جیسے پہلے ملتا تھا جب کہ اسے ان کی روحانیت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ ان دونوں میں یہ ایک طرح کا سمجھوتہ تھا کہ دنیا بھر کی بات کریں گے مگر شہاب صاحب کی روحانی شخصیت زیر بحث نہیں آئے گی۔ جب یحیٰی خان کے زمانے میں شہاب صاحب از خود جلاوطن ہو کر برطانیہ چلے گئے تو ایک مرتبہ وہاں سے کسی رپورٹر نے پاکستان کے ایک روزنامہ میں اس مطلب کی رپورٹ بھیجی جیسے خدانخواستہ شہاب صاحب اسرائیل سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ اس وقت یحیٰی خان کا سخت مارشل لاء نافذ تھا اور شہاب صاحب یحیٰی خان ٹولے کے معتوب کہلاتے تھے۔ جمیل سرکاری نیشنل بینک میں ملازم تھا مگر اس نے اپنے کالم میں سخت جواب لکھا اور کہا کہ جس نے شہاب جیسے عاشق رسولؐ پر حملہ کیا ہے وہ پہلے مجھ گنہگار سے تو نمٹ لے۔ بعد میں جب اس کی نوکری چھوٹ گئی تو اسے اپنے ایک وراثتی اثاثے کو عدالتی کارروائی کے ذریعہ وصول کرنے لندن جانا پڑا۔ شہاب صاحب لندن سے دور رہتے تھے۔ یہ ان کے پاس جاتا رہا۔ دراصل شہاب صاحب اس سے زیادہ متاثر اپنے اسی دور میں ہوئے۔ وہ وہاں خاصی بدحالی میں گزارہ کرتے تھے۔ ان کے بہت سے سابق ممنون جو اس وقت ہائی کمیشن میں تھے' ان سے ملنے کے روادار نہیں تھے۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتے تھے مگر جمیل نے ان سے تعلقات کم نہیں کئے۔ انہیں اکثر اپنے ساتھ کھینچ کر محفلوں میں لے جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ شہاب صاحب مرتے دم تک علی کی وفا کے ہمیشہ قائل رہے مگر جمیل کا یہ رویہ اپنے ان ملاقاتیوں اور ماتحتوں تک سے یہی رہا ہے جو نہ مشہور ہیں اور نہ کوئی زور آور' نہ بااثر۔

جمیل نے جانے کتنوں کی کتنی مدد کی ہے' مجھے بہت کچھ معلوم ہے لیکن وہ مروتیں گنوا کر ان لوگوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ ان کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ وہ اچھی اچھی جگہوں تک پہنچے۔ اکثر نے اس کے احسانات فراموش کر دیئے یا نئے تعلقات نے انہیں وقت نہیں دیا کہ کراچی جائیں تو اس سے ضرور ملیں۔ یہ اسے محسوس ضرور کرتا ہے جتاتا نہیں بلکہ جب اسلام آباد آتا ہے تو اپنی روایت کے مطابق فون پر ان کی خیریت ضرور دریافت کرتا ہے ...... اس قسم کی مروتیں اس امداد کے علاوہ ہیں جو ٹرسٹ اس نے نادار اور ضرورت مند ادیبوں کے لئے چند شہروں میں قائم کرا دیئے تھے۔

میں کیسے مانوں کہ وہ انا کا مارا ہوا ہے۔ ساری عمر فیض کا شیدائی رہا۔ ممتاز مفتی' احمد ندیم قاسمی' سید ضمیر جعفری' بزرگ اور عظیم ادیبوں کی پوری پوری عزت افزائی کرتا رہا۔ انہیں انجمن ترقی اردو سے اعزاز دلوائے۔ بے شمار حق دار ادیبوں کو گلڈ اور آدم جی ایوارڈ جیسے کئی انعامات دلوائے اور انعاموں پر اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو خود انعامی ضوابط بنا کر ہمیشہ کے لئے ایسے مالیاتی انعاموں سے محروم کر دیا۔ ایسا بے لوث خدمت کرنے والا ادیب آپ کو آج کے زمانے میں کہاں ملے گا۔ افسوس ہم کسی کو مختلف ماننے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔

جمیل نے اپنی ملازمت میں ڈسپلن کی پابندی تو کی مگر کسی افسر سے دب کر نہیں رہا۔ صاف گوئی اور بات ہے مگر اس کی گفتگو میں ایک تہ داری اور کاٹ ہے جو ہر افسر سے برداشت نہیں ہو سکتی اسی وجہ سے اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ٹی وی پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو اس کے کالمی مجموعوں پر کسی کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا۔ ڈاکٹر فرمان نے اس کی شخصیت کا یہ پہلو بڑی خوبی سے ایک فقرہ میں بیان کردیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ یہ چھوٹوں میں تو ان سے بھی چھوٹے ہو کر رہتے ہیں۔ مگر کسی بڑے سے بڑے سے بھی آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں۔ جمیل ایسا ہی ہے۔ مگر بے چارے چھوٹے تو خاموش محبت و احترام کے سوا اور کچھ دے نہیں سکتے۔ بڑے آن کی آن میں بڑے بڑے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرے دوست کے ساتھ یہی ہوتا رہا لیکن وہ سب ہنسی خوشی جھیل گیا۔ گلڈ کی وجہ سے اپنی پکی سروس سے استعفیٰ دیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ بھی چھوڑنا پڑا۔ ایک مرتبہ نیشنل بینک کی نوکری بھی چھوٹی تو اس وجہ سے کہ وہ بعض بڑوں کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا۔ وہ ادوار اس نے اپنے بچوں کے ساتھ بڑی سختیوں میں گزارے ہیں۔

جمیل کالج میں نصاب کی حد تک ایک بدشوق طالب علم تھا۔ مگر دوسری کتابیں بہت پڑھتا تھا۔ اساتذہ اسے ڈانٹتے رہے۔ اس کی والہانہ طبیعت کی وجہ سے اس سے محبت بھی بہت کرتے تھے اس شاعرانہ مزاج نے اسے نتائج کے لحاظ سے ایک "کامیاب" طالب علم نہیں بننے دیا۔ شادی اس نے انیس برس کی عمر میں کی' اپنے ہی خاندان میں۔ مگر ان لوگوں کا خاندان بہت بڑا ہے۔ آپس کے چھوٹے چھوٹے جھوٹی انا پر مبنی جھگڑے بہت تھے۔ اور یہ کالج میں رہ کر ویسے ہی ریاستی نظام کا باغی ہو چکا تھا۔ شادی پر والئی ریاست نے حکم دیا فلاں فلاں رشتہ دار نہ بلائے جائیں ورنہ ریاست خرچ برداشت نہیں کرے گی ان رشتہ داروں میں اس کے سوتیلے مگر بڑے مشفق بھائی مرزا اعتزاز الدین شامل تھے (جو پنجاب کے DIG رہ چکے ہیں۔) مرزا صاحب رئیس کے خسر بھی تھے اور ان کی بیٹی کی علیحدگی کا کیس چل رہا تھا کیونکہ ان خاتون سے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور نواب صاحب اپنا جانشین چاہتے تھے۔ جمیل نے لکھا کہ میں اپنے محسن بھائی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ نواب نے مقررہ امداد بھی نہیں دی۔ اس نے ریاست سے جھگڑا کرلیا اور انہیں بھی نہیں بلایا۔ مگر بس وہاں سے جمیل کی سخت کوشی کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ان تھک آدمی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا آدمی کام کرنے پر آئے تو جن ہوتا ہے۔ بیک وقت نوکری' رائٹرز گلڈ' انجمن ترقی اردو' اردو کالج' کئی سمتوں میں سولہ سولہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اب دل کا دورہ پڑنے کے بعد تین برس سے کسی نئے کام میں ہاتھ نہیں ڈالا مگر پھر بھی ہفتے میں ایک نہیں بلکہ دو کالم لکھتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کا کام کرتا ہے۔ اردو سائنس کالج پر پوری نظر ہے' مختلف موضوعات پر سینکڑوں کتابیں پڑھتا ہے۔ کئی شعبوں اور اداروں کے لوگ دن رات اس سے مشورے لینے آتے ہیں اور کبھی مسودہ سازی بھی کراتے ہیں' وہ ایک ریٹائرڈ آدمی نہیں لگتا۔ جب سے گلڈ سنبھالا اسے سب لہو و لعب بھول گئے' اس سے پہلے اپنی انکم ٹیکس کی افسری کے بعد وہ کراچی کی اونچی سوسائٹی میں اپنی بال روم ڈانسنگ کی وجہ سے بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے بڑے قصے ہیں مگر اس نے اپنی بیوی کو ہمیشہ چاہا۔ جب بچے ذرا بڑے ہو گئے تھے تو پارٹیوں میں بھابی کو لازماً ساتھ ملے

جانے لگا۔ آج بھی مکسڈ جلسوں اور تقریبات میں دونوں ساتھ جاتے ہیں۔ بھابی عمر میں جمیل سے بڑی ہیں' بیمار بھی رہنے لگی ہیں مگر اب یہ اپنے اکثر بیرونی سفروں میں انہیں بچوں کے پاس چھوڑ کر نہیں جاتا جبکہ ماشاء اللہ اس کے بیٹے' بہو' بیٹی داماد ایک ہی عمارت میں رہتے ہیں اور ماں کا خیال رکھتے ہیں' یہ بات میں اس کے کمٹمنٹ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ جب چین گیا' یورپ' شمالی افریقہ اور عرب دنیا کی سیر کی تو بھابی اکثر اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کہتا ہے' جس نے میرے ساتھ میرے برے دنوں میں اتنے دکھ جھیلے اسے اچھے وقتوں میں کیسے شریک نہ کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ بھابی کے بغیر جمیل اتنی ذمہ داریاں نبھا بھی نہیں سکتا تھا۔

ذرا اپنے معاشرے پر نظر کیجئے اور پھر اس کی ایک صفت دیکھئے۔ پاکستان میں اس کے ابتدائی تین چار سال سخت مالی دشواریوں میں گزرے۔ وہ محض ایک اسسٹنٹ تھا۔ والدہ کو نواب صاحب بہاولپور اس کے والد سے پرانے تعلقات کی وجہ سے کوئی الاؤنس بھیج دیتے تھے جو بعد میں یہ ریاست ختم ہونے سے بند ہو گئے۔ کل آمدنی ماہانہ تنخواہ تھی اور باقی زیورات۔ مگر پاکستان بننے کے بعد جو اس کے رشتہ داروں کا رش کراچی پر ہوا تو ایک وقت میں اس کے گھر میں کم و بیش چالیس افراد جمع ہو گئے اور اس کے پاس صرف دو کمروں اور ایک برآمدے کے کوارٹر میں جو اسی سینیالائز کراچی میں واقع تھا' دو ڈھائی برس ہجوم رہا۔ پھر لوگ آہستہ آہستہ Settle ہو کر رخصت ہوتے رہے' رشتہ دار بھارت سے سب کچھ چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ان میں سبھی قریبی عزیز نہ تھے۔ دور پار کے بھی تھے' چلئے اس وقت شاید وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسی ہنگامی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے' لیکن پھر یہ ہوا کہ اس نے اپنی خوش دامن اور دو سالوں کو مستقلاً اپنے پاس رکھا۔ جب تک لڑکے بڑے ہو کر کام پر لگ نہیں گئے' اسی کے ساتھ رہے۔ خوش دامن تو مرتے دم تک' کوئی بیس سال' اسی کے گھر پر رہیں۔ ماں سے کون محبت نہیں کرتا مگر جب جمیل کی والدہ آخری بار بیمار پڑیں تو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ بروقت طبی امداد اور اللہ کی رضا سے بچ گئیں۔ اس وقت وہ بہت ضعیف ہو گئی تھیں' اس لئے ان کی نگہداشت کی فکر بڑھ گئی۔ جمیل انہیں ہسپتال سے گھر نہیں لایا۔ ہسپتال میں ایک بڑا کمرہ لیا گیا۔ ایک بہن کو بھی بلا لیا۔ دو پرائیویٹ نرسیں رکھیں اور خود بھی وہیں رہنے لگا۔ سخت برآمدے میں فرش پر سو جاتا تھا۔ رات کو خود اٹھ کر والدہ کی حالت چیک کرتا اور یہ سلسلہ مہینے دو مہینے نہیں پورے ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ میں خود اسے ملنے دو بار کراچی گیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے' اب آپ والدہ کو گھر لے جا سکتے ہیں مگر جمیل ہمیشہ ایمرجنسی سے ڈرتا رہا۔ اسے ایک عجیب سا احساس بھی تھا' کہتا تھا کہ جب اب تک بچی ہوئی ہیں تو بھرپور پوری نگہداشت' بہترین دواؤں' غذا اور دعاؤں سے اور دیر تک سلامت رہیں گی۔ ڈاکٹر احترام میں کچھ نہ کہتے تھے۔ ایک دن ایک بڑے ماہرِ قلب نے دبی زبان سے کہہ دیا' اللہ انہیں آپ کے سر پر سلامت رکھے مگر ایک عمرِ طبعی بھی ہوتی ہے۔ اس بات کا ایسا برا مانا کہ ڈاکٹر سے مہینوں بات نہیں کی۔ اس کا خیال ہے کہ سائنس زندگی کو سینکڑوں برس تک لے جا سکتی ہے۔ ایک ایسا سمجھدار آدمی ماں کی محبت میں اس قدر دیوانہ ہو جائے مگر یہ ہو گیا تھا۔ میں بھی چپ رہا۔ ماں کی عمر اس وقت نوے سے اوپر تھی۔ دن رات کی خدمت نے اسے بہت پژمردہ کر دیا تھا' ایک دن خود اس پر دل کا دورہ پڑا' اسے امراضِ قلب کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ پچ

گیا۔ وہاں پڑا روتا تھا کہ ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اسے چھ ہفتے بعد فارغ کردیا گیا تو بچے اسے بتلائے بغیر اسکی والدہ کو بھی ہسپتال سے گھر لے گئے۔ پھر وہ چار پانچ ماہ اور زندہ رہیں۔ اس کے وہ دن بھی جاگتے اور سخت پریشانی میں گزرے۔ تین برس گزر گئے مگر یہ ماں کا دیوانہ آج تک اس کی وفات پر کچھ نہیں لکھ سکا ہے۔ یہ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے، کچھ نہ کچھ بولتے رہنے والا آدمی اپنے ایسے شدید احساسات کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ ہے نا عجیب بات۔ کہتا ہے کہ اس غم کے بیان کے لئے آج تک اسے الفاظ نہیں مل سکے۔ ابھی اسے صبر بھی نہیں آیا۔ اپنے سامنے ان کا ذکر ایسے نہیں ہونے دیتا جیسے وہ جا چکی ہیں، بیوی، بہنیں، بچے اور مجھ جیسے دو ڈھائی دوست اس کے دکھ کو سمجھتے ہیں مگر بات نہیں کرتے۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کسی کو دانستہ کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کے ماتحتوں کی تعداد سینکڑوں میں رہی۔ کسی کو بالکل ہی بیکار۔ نااہل یا بے ایمان پاتا تھا تو کہتا تھا کہ بھائی اپنا ٹرانسفر کرالو۔ میں انسانی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ تم بھی کسی کمزوری کا شکار ہوگے۔ سو میں تمہیں کوئی سزا نہیں دلواتا لیکن کام کا نقصان بھی نہیں ہونے دوں گا' اس نے لوگوں پر ان گنت احسان کئے ہوں گے' کسی سے کسی "جوابی خدمت" کی توقع نہیں کی۔ مگر وہ اس معاملہ میں بڑا بدقسمت آدمی ہے' اس کے کچھ ممنونین ایسے بھی نکلے جنھوں نے اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس کے احسانات کا جواب اس کے لئے بدگوئی بلکہ کھلی دشمنی میں دیا ہے۔ اس کے پاس ایسے لوگوں کے خلاف لڑنے کے لئے طاقت کی کمی نہیں تھی' قلم تو اس کے ہاتھ میں ہے ہی مگر وہ انہیں جواب نہیں دیتا۔ کہتا ہے' جو میرے بس میں تھا میں نے کیا' جو ان کے بس میں ہے وہ کرتے رہیں۔ انسانی نفسیات کا نظام بڑا پیچیدہ ہے' کوئی احسان کا بدلہ اچھا دیتا ہے کوئی اس بات کا برا مانتا ہے کہ اس پر احسان ہوا ہی کیوں؟ اور پھر محسن کے پیچھے پڑ جاتا ہے' وقت سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے کہتا ہے جواب پر جو وقت ضائع ہوگا وہ کسی بہتر کام میں کیوں نہ لگاؤں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ بعد میں بھی اسکی مدد کے محتاج ہوئے تو وہ شکوہ کئے بغیر ان کے کام آیا۔ یہی وہ اب بھی کرتا ہے۔ اب تو اس رویئے کا تجزیہ بھی ضروری نہیں۔ یہ اس کی عادت بن چکی ہے۔ میں ایسے چند ہی آدمیوں کو جانتا ہوں جو اس کی مدد کا ذکر بھی کرتے ہیں اور کبھی نہ کبھی اس کی معمولی سی تعریف بھی کردیتے ہیں۔ اس کے پرانے ماتحتوں میں قریباً سبھی اس کے دلدادہ ہیں مگر وہ تا صرف تین آدمی نبھاتے ہیں وہ اسے بھی غنیمت جانتا ہے۔

جمیل مزاجاً ایک عاشق آدمی ہے مگر اطہر کا عشق تو لڑکپن اور نوجوانی کی یک طرفہ جذباتیت سمجھئے..... جو مجھ میں بھی تھی' لیکن اسکے عشق کرنے کی صلاحیت میں ایک عیب ہے۔ اس کا عشق عملاً اس بات سے مشروط رہا کہ اسے بھی اتنا ہی چاہا جائے' خود اس کے اندر ایک مستقل محبوب جو بیٹھا رہتا ہے۔ شاید یہ غالب سے دور کی رشتہ داری اور یا ان کے غلط مطالعے کا اثر ہے' جو بھی ہے وہ کوئی ایسا عشق نہیں کر پایا جو اسے ڈھا کے رکھ دیتا۔ شاید وہ اس گداز سے آشنا ہی نہیں ہو سکا جو یک طرفہ ناکام محبتیں دے جاتی ہیں' سچ یہ ہے کہ وہ انیس برس کی عمر میں ہی شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی بھی ایسی خاتون جو اس کے بقول اس کا کمٹ منٹ تھی۔ یعنی اس نے خود پسند کی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ ایسے آدمی سے کوئی معقول خاتون توقع بھی کیا کر سکتی تھی جو اپنی بیوی کو بھی چاہے جائے۔ بہر حال' اس کی ایک

جذباتی زندگی بھی گزری لیکن یہاں پر اس ذکر کا موقع نہیں۔ اپنی خوش گوئی' ذہانت' خوش آوازی' خوش صورت' خوش لباسی اور شہرت کی وجہ سے وہ بعض "بڑی" خواتین کا محبوب بھی رہا۔ مگر اس نے کسی لمحہ بھی اپنے بیوی کو فراموش نہیں کیا اور پھر جوانی میں تو ایک عرصہ تک پاکستان رائٹرز گلڈ اس کا واحد عشق ہو گیا تھا ساتھ ہی انجمن ترقی اردو اور اردو کالج اس کی زندگی میں آگئے تھے۔ کسی اور عشق کے لئے دل میں جگہ ہی کب رہی تھی۔ عشق وقت بھی تو مانگتا ہے۔ ہاں' یقیناً بھابی ہی کے حوالے سے اس کی ایک تازہ غزل میں یہ شعر ضرور آیا ہے۔

پچاس سال جو ہم نے بھی گزار دیئے
تو ملک ملک کے عشاق آکے دیکھتے ہیں

اتنا کچھ لکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو بات تشنہ ہے میں جمیل کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکا۔ مجھے نہ جانے کیا کچھ کہنا تھا۔ نہ معلوم اب وہ میں کبھی کہہ بھی سکوں گا یا نہیں۔ آخر میں اتنا بتا دوں کہ وہ حیران کن حد تک ایک منفرد شخصیت ہے۔ اس میں عیب بھی ہیں تو ایسے جو خود اسے نقصان پہنچاتے رہتے ہیں لیکن دوسروں کو نقصان پہنچانے کا عیب اس میں قطعی نہیں۔ اس زمانے میں ایک ایسے صد جہات چلنے والے اور دنیا بھر میں "کامیاب" کہلانے والے آدمی میں ایسی بے عیبی ناقابل یقین لگے گی کیونکہ کامیاب لوگوں کو چند لاشوں پر تو چلنا ہی پڑتا ہے مگر اس نے کسی کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔ ہاں' جذباتی زندگی میں' گو دوسری پارٹی کے دباؤ پر' ایک وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ شاعر لوگ ایسے ہزار وعدے کرتے ہیں لیکن یہ اسے غیر ضروری اہمیت دے کر رنج کرتا رہا اور اس کا کفارہ بھی پورا پورا ادا کر چکا ہے۔ متعلقہ فرد کے لئے عمر بھر کے واسطے اپنے تعلقات سے ایسا انتظام کرا دیا ہے کہ اگر وہ وعدہ پورا بھی کرتا تب بھی انہیں اتنی خوش حال زندگی میسر نہ ہوتی...... بہر حال! وہ اس "ناکامی عشق" کو اپنی وعدہ خلافی ہی سمجھتا ہے۔ مگر! میرا خیال ہے مجھے کبھی نہ کبھی اس پر ایک اور مضمون لکھنا پڑے گا......

ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی

نومبر' دسمبر سنہ ۹۵ء

زاہدہ حنا

دشتِ مستقبل کا غزال

یہی کوئی تیس بتیس برس ادھر کا قصہ ہے جب روزنامہ "جنگ" میں عالی صاحب کا سفرنامہ انگلستان، جین ڈونگر کا حسنِ حشر سامان اور مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کا درس قرآن، سب ہی پابندی سے چھپ رہے تھے۔ درس قرآن نے عاقبت سنواری یا نہیں، یہ تو کراماً کاتبین جانیں، لیکن جنگل جنگل، صحرا صحرا، مہم جوئی کا ڈول ڈالتی ہوئی مس ڈونگر کی رہزنِ ہوش و ایمان تصویروں نے یہ ضرور سمجھا دیا کہ انیسویں صدی میں میرزا اسد اللہ خان غالب، عاشق کے گریبان کے جس چار گرہ کپڑے کو روتے رہے تھے، وہ بیسویں صدی میں اپنے نصیبوں پر ناز کرتا ہے اور اس نازنین، مہ جبین کے تن پر سجتا ہے۔ رہ گئے نواب سر امیر الدین والئی لوہارو کے فرزند دلبند، میرزا جمیل الدین عالی۔ سو وہ میر خلیل الرحمن کے اخبار کے لئے خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اپنی لٹی ہوئی شاہی کے آثار برطانیہ کے شاہی جواہر خانوں اور عوامی کتب خانوں میں ڈھونڈتے ہیں اور ان کے پڑھنے والے کبھی "کوہ نور" کے لئے ہمکتے ہیں اور کبھی انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطوں کے لئے ترستے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مشاعروں میں جانے کی اجازت نہ تھی، اسی لئے عالی صاحب کے دوہے، غزلیں، گیت نہیں سنے تھے۔ ایک ان کی نثر تھی جو دل میں گھر کئے لیتی تھی چنانچہ ان کا سفرنامۂ انگلستان پڑھ کر ان کی شان میں ایک نثری قصیدہ تصنیف کیا۔ بغرضِ اشاعت جب وہ ایک دوسرے شاعر تک پہنچا تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے چاک کیا کہ برطانوی استعمار کو برا بھلا کہنے کے بہانے، اس تحریر میں حاکم وقت کی چٹکیاں لی گئی ہیں۔ ایوب خانی زمانہ ہے۔ عالی صاحب بڑے منصب دار ہیں، سرکاری دربار میں بلائے جاتے ہیں، بار پاتے ہیں۔ ان کا ستارہ کہیں گردش میں نہ آجائے۔ اس وقت گمان بھی نہ

گزرا لیکن اب جب کہ پلوں کے نیچے سے پانی تو کیا دریا گزر چکے ہیں' جانتی ہوں کہ اصل معاملہ شاعرانہ چشمک کا تھا۔

گزشتہ بیس پچیس برس سے عالی صاحب شاعر' سفرنامے اور کالم نویسی کے مراحل سے گزر کر دانش و بینش کی سلطنت میں قدم رکھ چکے اور ان کا شمار ملک کے ممتاز دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اور میرے نظریاتی سلسلے جدا جدا ہیں لیکن ادب اور پھر کالم نویسی کے حوالے سے ہم ہیں تو ایک ہی برادری کے' اسی لئے کبھی کبھی کسی معاملے پر ایک دوسرے سے الجھنے اور طعنے الاہنے دینے کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے ہیں۔ وہ بہت بیمار ہوئے تو طیبہ بھابھی کا فون آیا "عالی جی یاد کررہے ہیں" میں دوڑی چلی گئی۔ میری والدہ رخصت ہوئیں۔ عالی صاحب ڈرائیور کو غلط راستہ بتا کر' خلق خدا سے میرا پتہ پوچھتے ہوئے گھر تک آئے' پتے سے اکھڑے ہوئے۔ پرسہ کرنے کی بجائے ڈانٹ رہے ہیں "عجب نالائق ہو۔ اپنے گھر کا پتا غلط بتاتی ہو" طیبہ بھابھی میری وکالت کررہی ہیں "پتا تو تم ٹیلی فون کے پاس بھول آئے تھے۔ اب تو انکل سے پہنچے ہو۔ اس میں زاہدہ کی کیا خطا"۔

عالی صاحب اور طیبہ بھابھی سے محبت و مروت کے جو رشتے ہیں' ان دونوں کی جو وضع داریاں اور ناز برداریاں ہیں' ان کا یہی تقاضا تھا کہ میں لاہور میں اپنے کام ادھورے چھوڑ کر یہاں چلی آؤں اور اس تقریب سپاس میں سپاس گزاری کو اپنا اعزاز سمجھوں۔

آج یہاں پاکستانی سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ذہانتیں موجود ہیں۔ وہ مجھ سے کہیں بہتر طور پر عالی صاحب کی ذاتی زندگی' بینکاری' شاعری' نغمہ نگاری اور کالم نویسی کے بارے میں باتیں کریں گی۔ میں تو مختصراً اس موضوع کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں جسے عوامی سطح پر پاکستان میں متعارف کرانے کا سہرا عالی صاحب کے سر ہے۔ یہ موضوع مستقبلیات یا Futurism کے نام سے آج پاکستان کے مختلف علمی اور ادبی حلقوں میں زیر بحث آتا ہے۔

اس بارے میں ابتداً یہ عرض کردوں کہ اسے ۱۹۰۹ء میں پیرس میں پیش کئے جانے والے اس فیوچر ازم سے گڈمڈ نہ کیا جائے جس کا مین فیسٹو مسولینی کے ایک قریبی دوست اور اطالوی نژاد ادیب اور مصور Marinette نے پیش کیا تھا اور جس میں تشدد اور جنگ کی تبلیغ کی گئی تھی۔ اس فیوچر ازم کا خاتمہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہوگیا تھا۔ جس فیوچر ازم کی بات عالی صاحب کرتے ہیں' وہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ کمپیوٹر' الیکٹرونکس' اطلاعاتی انقلاب' بائیو ٹیکنولوجی' تجارت' صنعت' سیاست' اقتصادیات' معاشیات وہ شعبے ہیں جن کے لئے اس وقت مستقبل بینی کی وہی حیثیت ہے جو انسانی زندگی کے لئے آکسیجن کی۔ آج علم و دانش کا طاقت و اقتدار کے ساتھ تعلق اور کردار' مستقبلیات کے اہم ترین موضوعات ہیں۔ اس علم کو مغرب اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ امریکی صدر Futurist یا مستقبل بین افراد سے خصوصی ملاقاتیں کرتے ہیں اور امریکہ کے بعید مستقبل کے بارے میں بحث مباحثہ اور معاملہ ہوتا ہے۔ ان امریکی ماہرین مستقبلیات کو اپنی نوکر شاہی اور انتظامیہ سے بے حد شکایتیں ہیں' وہ انہیں مشورے دیئے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف لکھتے اور بولتے بھی ہیں' اس کے باوجود نہ کوئی ٹیکس چوری

میں گرفتار ہوتا ہے' نہ کسی کے کھیتوں کا پانی بند ہوتا ہے ' نہ ان کے خیالات کو یکسر رد کیا جاتا ہے جن شعبوں میں ان کی رائے مسترد کی جاتی ہے' ان میں پھر انجام بھی وہی ہوتا ہے جو ان دنوں امریکہ کے بدترین مالی بحران کی صورت میں ہمیں نظر آرہا ہے۔

عالی صاحب اپنے کالموں میں Think Tank کے تذکرے سے چلے تھے' اور اگر میں غلطی پر نہیں تو 1977-78 کے دوران' اور فیوچرازم تک آگئے اور انہوں نے فیوچرسٹ سوسائٹی آف امریکہ کا تذکرہ شروع کردیا تھا۔ یہ عالی صاحب کی پیدا کردہ دلچسپی تھی جس نے مجھے ورلڈ فیوچر سوسائٹی کی رکنیت لینے پر اکسایا اور علم کا ایک بالکل نیا شعبہ کتابوں اور جرائد کے ذریعے میرے مطالعے میں آیا۔ عالی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میرا موضوع "مستقبل" تو ایک لمبی سڑک ہے' جو میں دور تک جاتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ اس میں گڑھے بھی ہیں اور کچھ خطرناک موڑ بھی مگر میں بار بار یہ صاف دیکھتا ہوں کہ وہ سڑک چلے چلی جاتی ہے"۔

عالی صاحب نے مستقبل کو ایک لمبی سڑک قرار دیا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اس لمبی سڑک پر چلنے کے' ہر ملک کے اپنے انداز تھے لیکن اب جبکہ دنیا ایک "عالمی گاؤں" کی بجائے ایک "عالمی شہر" میں تبدیل ہوتی جارہی ہے' سب کا مستقبل ایک دوسرے سے جڑ گیا ہے آج امیر ملکوں کا مستقبل' غریب ملکوں کے مستقبل سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا اور غریب یا نظریاتی راسخ العقیدگی کا نعرہ بلند کرنے والے' عالمی برادری کے اجتماعی مستقبل سے کٹ کر اپنے لئے کوئی نیا آئین ایجاد نہیں کرسکتے۔ اب سب ہی کو ایک ساتھ' اچھی طرح یا بری طرح' خوشحالی سے یا غربت میں' امن سے یا حالت جنگ میں' زندہ رہنا یا فنا ہوجانا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ مستقبل کے بارے میں تجزیہ کرنے کے پرانے پیمانے یکسر تبدیل' ہوچکے ہیں' اب اگر پرانے پیمانوں سے کسی بھی مسئلے کا تجزیہ کیا جائے گا تو نتیجہ قطعاً غلط نکلے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی ملک بہت بڑی اقتصادی اور فوجی طاقت ہے تو اس کی بالادستی یقینی رہے گی۔ اس ضمن میں برطانیہ کی مثال دی جاتی تھی جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا لیکن پھر اسی برطانیہ کو ہم نے ایک جزیرہ نما میں سمٹتے اور سکڑتے ہوئے دیکھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا امریکہ تھا کہ جس کے اشارۂ ابرو پر ہمارے ایسے ملکوں کے حکمران تخت پر بٹھائے یا تخت سے اتارے جاتے تھے۔ جس کی امداد کا شکریہ ہمارے غریب غرباہی نہیں' ہمارے اونٹ بھی ادا کیا کرتے تھے۔ آج وہی امریکہ پانچ ہزار بلین ڈالر کا مقروض ہے۔ معاشی کساد بازاری اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ گزشتہ پانچ دن سے اس عظیم الشان مملکت کے آٹھ لاکھ سرکاری ملازمین گھر بیٹھے ہیں' ساری دنیا میں امریکی ویزا آفس بند ہیں اور ملازمین کی چھانٹی شروع ہوچکی ہے۔

تیسری مثال مرحوم و مغفور سوویت یونین کی ہے جو ایک یوٹوپین سوسائٹی تھا اور جس کے بارے میں مجھ سے ایسے خواب دیکھنے والوں کا دعویٰ تھا کہ اگر انسانوں کے معاشی مسائل حل کردیئے جائیں تو تمام طبقاتی' سماجی' صنعتی' لسانی' قوتیں اور تخلیقی تضادات ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن پھر ہماری ہی گنہگار اور خوں بار آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہمارے

خوابوں کی وہ سلطنت مسمار ہوئی اور تمام مفروضے اور کلیئے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اسی طرح طب اور نفسیات کی دنیا اور سیاست و معاشیات کے مستقبل کا تعین چند مخصوص نظریات اور اصولوں کی روشنی میں ہوتا تھا لیکن جنیٹک اور بائیو انجینئرنگ نے دنیا بدل کر رکھ دی۔ اب سے پہلے دنیا میں تمام جنگوں کا سبب ملکوں پر تسلط یا غلبہ حاصل کرنے کے عوامل' معدنی ذخائر' زرعی اجناس پیدا کرنے والے وسیع و عریض علاقے اور ملکوں سے حاصل ہونے والا خام مال ہوتا تھا لیکن یہ عوامل بھی اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب نے جدید معاشی نظام کے لئے اپنا صنعتی خام مال خود پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ عظیم الشان فوجوں کی اب ضرورت نہیں رہی ہے۔ نیوکلیائی ہتھیاروں کے ڈھیر ختم کرنے کے لئے معاہدے ہو رہے ہیں اور انہیں Defuse کرنے پر اربوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ غرض اگر بیس اور تیس برس پہلے دنیا کا مستقبل ایک زاویے سے متعین کیا جا رہا تھا تو آج اس مستقبل بینی کے زاویے یکسر بدل چکے ہیں اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا شاید سر کے بل کھڑی ہو گئی ہے۔

دشتِ مستقبل کا غزال بن کر عالی صاحب اپنے کالموں میں جس مستقبل بینی اور مستقبل شناسی پر اصرار کرتے رہے' افسوس کہ ہمارے یہاں کسی نے ان باتوں پر کان ہی نہیں دھرا۔ ہمارے حکمراں' ہماری نوکر شاہی اور اقتدار میں شامل دیگر ادارے بھی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور ملک کو درپیش مسائل کو پرانے طریقوں سے حل کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں۔ ملک کو آج ایک صنعتی انقلاب کی ضرورت ہے لیکن اقتدار پر جاگیردار' اشرافیہ اور نوکر شاہی کا قبضہ ہے۔ بدلی ہوئی دنیا کا اگر ہمیں ادراک ہوتا تو ہم جدید دور کی جمہوریت سے ہم آہنگ نظام قائم کر چکے ہوتے۔ آج ہمارا ملک جس بحران میں مبتلا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ نہیں جانا کہ جب سرد جنگ ختم ہو جائے گی اور ہر طرف جمہوریت کا بول بالا ہو گا تو ہم پر یہ ستم ہو گا کہ آمریت ہمارے یہاں جمہورت کے لبادے میں آ جائے گی۔ یہ تو ہماری سمجھ میں بہت دیر سے آیا کہ ہر منتخب حکومت' لازمی طور پر جمہوری حکومت نہیں ہوتی۔ یوں تو ہٹلر کی حکومت بھی ایک منتخب حکومت تھی لیکن اسے جمہوری حکومت کیسے قرار دیا جائے؟ انتخابات کے ذریعے فاشسٹ' نوکر شاہی کے نمائندے یا جاگیردار اگر اقتدار میں آ جائیں تو وہ جمہوری اداروں کو پامال تو کر سکتے ہیں' ان کی آبرو نہیں بحال کر سکتے۔ وہ آئین اور قانون کو روند سکتے ہیں' ریاستی جبر' تشدد اور دہشت گردی کا ایسا مظاہرہ کر سکتے ہیں جو کسی پرانی آمریت میں بھی نہیں ہوا ہو۔ حیف صد حیف کہ ہمارے درمیان مستقبل بین موجود نہ تھے جو ان باتوں کا ادراک کر سکتے۔

کراچی کا آتش فشاں آج جس طرح لاوا اگل رہا ہے' اس کے وجود میں آنے اور اس کے اندر لاوے کے پکنے کے تمام آثار و شواہد عالی صاحب کے گزشتہ بیس بائیس برس کے کالموں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اب سے اٹھارہ برس پہلے انہوں نے جولائی ۱۹۷۷ء میں لکھا :

"سول لائف دراصل شہریوں اور سول حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس میں بہت سی ذیلی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شہری نظام جوابدہ شہریوں کے سپرد ہو تاکہ وہ مسلسل اپنے شہر کے سامنے' اپنے حلقوں کے

سامنے جوابدہ ہیں۔ کراچی ایک پھیلتا ہوا شہر ہے۔ وقت آگیا ہے کہ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کو ایک نمائندہ ادارہ بنادیا جائے۔ اس سے کراچی کے نہ صرف کئی مادی مسائل حل ہونے کا امکان پیدا ہوگا بلکہ کراچی کی مجموعی نفسیات پر بھی اس کے اثرات مثبت ہوں گے۔ سب کو مان لینا چاہئے کہ کراچی ایک خاص محرومی کا شکار ہے۔ یہ ایک چھوٹے موٹے ملک برابر شہر ہے' جس میں مقامی' پاکستان کے سب صوبوں سے آئے ہوئے لوگ اور مہاجر طبقاتی فرق کے ساتھ ایک ہی طرح رہتے ہیں اور ایک ہی جیسے طبقاتی مسائل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جب کراچی چار لاکھ کا بھی شہر نہیں تھا تو کراچی کارپوریشن میں منتخب افراد بیٹھ کر شہر کا کام چلاتے تھے' اب تو اس کی آبادی چالیس لاکھ سے اوپر جاچکی ہے۔ اب تو یہ انتہائی ضروری ہے کہ شہری مسائل کی ذمہ داری افسروں پر نہیں' بلکہ منتخب نمائندوں پر ڈالی جائے۔"

اٹھارہ برس پہلے کی یہ تحریر آپ نے سنی اور اب جبکہ یہ شہر ایک کروڑ سے زیادہ کا ہوچکا ہے' اس کے لئے نسخۂ شفا لکھنے والی ہستی نے چند مہینوں پہلے "نیوز ویک" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم یہاں تین برس تک لوکل باڈیز الیکشن نہیں کرائیں گے۔ ایسے مستقبل بینوں کے ہاتھوں میں ملک اور شہر کی باگ ڈور ہو' تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے' جو ہو رہا ہے۔

آخر میں صرف یہ عرض کروں گی کہ اگر یہ پہلے کا شاد آباد کراچی ہوتا تو میں عالی صاحب کو آج کے دن کی مبارکباد دیتی لیکن جس شہر میں آہوں کا دھواں ہو اور جس کے آنگن خون میں تربتر ہوں' وہاں کیسا جشن اور کیسی مبارک باد۔ عالی صاحب کے لئے یہی دعا ہے کہ ان کی عمر' صحت و سلامتی کے ساتھ دراز ہو اور ان کا وہ ملک' جس کے لئے وہ گزشتہ پچیس برس سے "جیوے جیوے" گاتے ہیں' اس کے بارے میں بیشتر مستقبل بینوں کی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوں اور وہ واقعی جیتا رہے' قائم و دائم رہے۔

روزنامہ "جنگ" کراچی کی تقریب سپاس
برائے جمیل الدین عالی' ۷ نومبر سنہ ۹۵ میں پڑھا گیا

امجد اسلام امجد

جمیل الدین عالی

کہتے ہیں کہ کسی شخص کا اصل پتہ اس کے ساتھ سفر کرنے سے چلتا ہے۔ میں نے عالی کے ساتھ کئی بار سفر کیا ہے۔ سو، اس اصول کے مطابق مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہئے مگر اب جو میں ان کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو یوں لگتا ہے، جیسے وہ ایک آئس برگ ہوں جس کا صرف دسواں حصہ سطح پر رہتا ہے۔ آئس برگ اور عالی کی یہ مماثلت بس یہیں تک ہے کیونکہ ان کی شخصیت میں جو تحرک، گرمی، گرمجوشی، پھیلاؤ اور وارفتگی ہے۔ اس کا سلسلہ نسب کچھ اور چیزوں سے ملتا ہے، ایسی چیزیں جو صرف اعلیٰ انسانوں سے مخصوص ہوتی ہیں۔

عالی سے میرا ادبی تعارف تقریباً پچیس برس پرانا ہے۔ انہیں دیکھنے، ملنے اور بالمشافہ سننے سے پہلے ان کے دوہے ہمارے نوجوانی کے رومانوی دھندلکوں سے بھرپور خوابوں کا ایک مستقل حصہ بن چکے تھے اور ان کے:

ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

ٹائپ مصرعے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضاؤں میں روز مرہ گفتگو کا اٹوٹ انگ تھے۔

ایسے میں ان کا ایک شعر پتہ نہیں کہاں سے گھومتا گھومتا مجھ تک پہنچا اور پھر مجھے دیر تک اور دور تک ساتھ لئے لئے پھرا۔ شعر یہ تھا:

کچھ نہ تھا یاد بجز کار محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

یہ شعر جدید اردو غزل کے ان چند شعروں میں سے ہے جو قاری کی عمر کے ساتھ ساتھ Grow کرتے ہیں لیکن کبھی بوڑھے نہیں ہوتے، پھر ایک اور شعر آیا:

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے
امید بھی نہ رکھوں ناامید بھی نہ رہوں

اقبال کی ایسی زبردست زمین میں ایسا زندہ شعر لکھنے والا شاعر جمیل الدین عالی اب ان چند شعراء میں داخل ہو چکا تھا جن کا کلام میں ادبی رسائل میں سب سے پہلے ڈھونڈ کر پڑھا کرتا تھا۔ یہ میری شاعری کی ابتدائی دن تھے ادبی صورتحال اور ادیبوں کی سیاست کے بارے میں میری معلومات بہت محدود تھیں چنانچہ بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ پاکستان رائٹرز گلڈ اور جمیل الدین عالی کا نام ایک ساتھ کیوں لیتے ہیں اور یہ شخص ہے کیا شے!

ابتدائی چند ملاقاتوں میں عالی جی سے پنجابی محاورے کے مطابق ہمارا "کھل کھلا" نہ ہو سکا۔ مشاعروں کی نشستوں اور ان سے متعلق کھانے وغیرہ کی دعوتوں میں گفتگو سلام دعا کی حد سے آگے نہ بڑھی اور یوں عالی میرے نزدیک ایک ایسے سینئر ہم عصر بنے رہتے جن سے دیگر کئی سینئر شعراء کی طرح ایک دنیاداری کا رشتہ چل رہا تھا۔ پھر اچانک ان کی شخصیت کا ایک انوکھا رخ میرے سامنے آیا۔ واہ کینٹ کے ایک کم معروف شاعر سبط علی صبا کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک غریب اور ایماندار شخص تھا۔ ادبی برادری نے اس کی موت پر بھی حسب معمول دو چار رسمی اور روایتی تعزیت کی باتیں کیں اور اس کے قل سے پہلے پہلے اپنے کام سے فارغ ہو گئی۔ چند دن بعد عالی' احمد ندیم قاسمی کے دفتر آئے۔ میں بھی اتفاق سے وہاں تھا۔ پتہ چلا کہ موصوف نے سبط علی صبا مرحوم کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ اپنی انفرادی کوشش سے اس میں ایک معقول رقم جمع کر دی ہے اور اب ادیب برادری سے اس ٹرسٹ میں چندہ دینے کی اپیلیں کرتے پھر رہے ہیں۔ میں حیران کہ یا الٰہی اس شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک طرف یہ کہتا ہے کہ مرحوم سے میری جان پہچان بھی نہیں تھی' کوئی رشتہ داری نہیں' یہ اہل زبان' وہ پنجابی' یہ بڑا افسر' وہ ایک معمولی اہلکار' نہ اس کام میں کوئی دنیاوی فائدہ' نہ شہرت..... یہ کرتا کیا پھر رہا ہے.....!

ان کے جانے کے بعد ندیم صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ پہلا موقع نہیں' مرحوم ادیبوں کے بے یار و مددگار خاندانوں کی مدد اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے وہ برسوں سے اس طرح کی مہمات چلاتے آرہے ہیں۔ اس کار خیر کے لئے وہ اپنی سماجی حیثیت بھی استعمال کرتے ہیں اور ذاتی کاوش بھی۔ چنانچہ کسی قسم کی پبلسٹی کئے بغیر وہ درجنوں ایسے خاندانوں کی مدد کرتے اور کرواتے چلے آرہے ہیں۔ عالی کے اس روپ نے ان کی شخصیت کے در و دیوار سے لپٹے ہوئے اصلی اور نقلی جالوں کو آندھی کے ایک جھونکے کی طرح جیسے اڑا کر رکھ دیا اور میں ایک ایسے جمیل الدین عالی..... سے متعارف ہوا جس کا دل سونے کا تھا' اس کی روح میں اس ساز ازل کی بازگشت تھی جس نے خدا کو انسان کی تخلیق پر اکسایا تھا۔

۱۹۸۳ء کے نومبر میں مجھے عالی کے ساتھ شمالی امریکہ کے ایک مشاعراتی پروگرام میں سفر کرنے کا موقع ملا جس کی مفصل روداد میں نے اپنے سفرنامے "شہر در شہر" میں لکھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کا خیال ہے کہ اس سفرنامے سے عالی جی سے متعلق حصوں کو اگر علیحدہ کر لیا جائے تو یہ ان کا ایک طویل مختصر خاکہ بن سکتا ہے مگر یہ محفل چونکہ کسی مفصل گفتگو کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اس لئے میں نے اس آئیڈیے پر عمل درآمد ملتوی کر دیا ہے۔ یوں بھی آج ہم ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور ابھی کئی احباب کو

اظہار خیال بھی کرنا ہے۔ چنانچہ میں اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے اس کتاب میں سے صرف دو تین اقتباسات پیش کروں گا، جن سے عالی کی شخصیت کے کچھ ایسے دلکش پہلو نمایاں ہوتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

"چلتے چلتے طیبہ بھابھی نے مجھے روکا اور عالی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو بھئی' اب میرا میاں تمہارے حوالے ہے۔ اس کا خیال رکھنا واپسی پر میں نے تم سے پوری رپورٹ لینی ہے۔"

میں نے عالی کی طرف دیکھا' بولے۔

"کوئی نئی بات نہیں۔ "میاں" چالیس برس سے یہ اسی طرح ہماری "جسوسی" کرا رہی ہیں۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں مگر ان کے وسوسے کم نہیں ہوتے' انہیں اب بھی شبہ ہے کہ ذرا موقع ملا اور ہم نے کسی میم سے نکاح ثانی پڑھوا لینا ہے۔"

طیبہ بھابھی مسکرائیں اور بولیں "تم نے کوئی کم کوشش نہیں کی میاں' میں روک کر نہ رکھتی تو اب تک پتہ نہیں تم کیا کیا کر چکے ہوتے"۔

میاں بیوی کی اس مزیدار نوک جھونک کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ محبت اور رفاقت کا گھنا اور سر سبز پیڑ وقت کے طوفانوں کو کتنی آسانی سے روک لیتا ہے۔

"کوئی پانچ منٹ کے بعد وہ نیک دل اور چالاک بدن حسینہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ لٹیں لہراتی ہوئی کیبن سے باہر آئی اور ہمیں اطلاع دی کہ ایک فلائٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔"

میں نے سوالیہ انداز میں عالی کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا..... عالی جی۔ انہیں کے جہاز پر چلتے ہیں۔

عالی نے بھی اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا۔

یہ گراؤنڈ اسٹاف ہے بھئی۔ اس نے یہیں رہنا ہے۔

"اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آواز تھی۔ تیز' کرخت اور میکینکل قسم کی آواز' جس کے بارے میں واشنگٹن کے لئے روانگی کے وقت عالی نے ایک یادگار جملہ کہا' رخصتی معانقہ کرتے ہوئے بولے۔

"آپ کی آواز کمال کی ہے شہباز صاحب' جب آپ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ٹائپ کر رہے ہیں۔

ڈزنی لینڈ کی جس چیز نے ہمیں لوٹ لیا وہ دنیا بھر کے بچوں کا ایک گیت ہے جس کے بول اور ساز بدلتے رہتے ہیں مگر ایک ہی جذبہ اور دھن خون کی طرح بدن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور خودکار کشتیوں کے ذریعے سطح زمین سے نیچے ہم نے ایک ایسی دنیا کی سیر کی جس میں نوع انسانی کے سارے خوبصورت خواب گیت' افکار اور رنگ ایک چھوٹی سی دنیا میں جمع ہوئے تھے۔ اس جادوگری کا نام بھی Its a Small World تھا..... پتہ نہیں کس جذبے کے تحت ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر روانگی کے پلیٹ فارم پر آ گئے اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دوبارہ اسی روح پرور سفر پر روانہ ہو گئے.......

عالی کے عینک کے شیشے بھیگنے کی وجہ سے دھندلے ہو رہے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس کا سبب پانی کے وہ آوارہ چھینٹے

ہیں جو کبھی کبھی اچھل کر کشتی کے اندر آجاتے ہیں مگر جب ہم دوسرا چکر مکمل کر کے باہر نکلے تو ان کی آنکھوں اور ہمارے دلوں کی طرح ان کی آواز بھی بھیگ چکی تھی۔ انہوں نے ایک اداس اور حیرت بھری نظر Its a Small World کی اس عمارت پر ڈالی جو اس عمارت کی پیشانی پر چمک رہی تھی اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے رقت بھرے لہجے میں بولے۔

"ہم سے تو اپنی عمروں میں کچھ نہ ہو سکا' خدا کرے ہمارے بچے ہی اس گیت کو سچ کر دکھائیں۔"

خواتین و حضرات' ایسے دردمند دل اور ایسے خوبصورت خواب دیکھنے والا' ہمارے عہد کا ایک بڑا تخلیقی فنکار آج ہمارے درمیان ہے' وطن سے دور ان اجنبی ہواؤں میں اس کی یہ پذیرائی اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کو ابھی ان آنکھوں کی ضرورت ہے جن میں ان کے اپنے خواب جاگتے ہیں اور آپ سب لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس محفل کا اہتمام کیا اور اس قرض کو ادا کرنے کی ایک بڑی سعی کی جو جمیل الدین عالی کی طرف سے ہم سب پر بہت دیر سے واجب تھا۔

جشن عالی۔ ابو ظہبی ۱۹۸۹ء

عطاء الحق قاسمی

جمیل الدین عالی

ایک عرصے سے میرا جی جمیل الدین عالی پر کچھ لکھنے کو بالکل اسی طرح چاہ رہا تھا جس طرح ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر سبحان اللہ (یا انشاء اللہ) کہنے کو جی چاہتا ہے مگر میں اپنی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔ تاہم اب کہیں جا کر یہ موقع ملا ہے کہ عالی صاحب کو جیسا پایا ہے' ویسا بیان کروں کہ خود بقول عالی۔

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

دراصل عالی صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور میں ایک محتاط اندازے کے مطابق سبحان اللہ یا انشاء اللہ کہنے کے شغل سے تائب ہو گیا ہوں۔ امجد اسلام امجد کا کہنا ہے کہ میں یہ تائب ہونے والی باتیں محض خلقِ خدا کو "جھاکا" دینے کے لئے کرتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس مردِ ستم ظریف کے اس بیان کی تصدیق یا تردید کروں کیونکہ ان سطور سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اب میں عالی صاحب کے فن اور شخصیت پر پوری یکسوئی سے سبحان اللہ کہہ سکتا ہوں اور وہ پوری فراغت کے ساتھ سن سکتے ہیں۔ ممکن ہے' آپ کہیں کہ یہ تو آپ دو حضرات کے درمیان باتیں ہوئیں' اس سارے قصے میں ہم کہاں ہیں تو خواتین و حضرات! آپ ٹھیک کہتے ہیں' مگر بات دراصل یہ ہے کہ ان دنوں ادیب اور نقاد جو کچھ لکھتے ہیں وہ ایک دوسرے ہی کے لئے لکھتے ہیں' یہ سادہ لوح قاری تو درمیان میں بن بلائے آ ٹپکتا ہے۔ ثبوت کے لئے آپ برادرم ڈاکٹر انور سجاد کے افسانے' اس پر محترم بلراج مینرا کے مضامین ملاحظہ فرما سکتے ہیں یا پھر "وائس ورسا" کے طور پر بلراج مینرا کے افسانے اور انور سجاد کے مضامین دیکھے جا سکتے ہیں' مجال ہے ان دو ہاتھوں کے اس لین دین کے دوران کسی تیسرے ہاتھ کو خبر ہو۔

میرے خیال میں عالی صاحب کے بارے میں جس گفتگو کی تیاری میں کر رہا ہوں' اس کی تمہید ذرا لمبی ہو گئی ہے۔

حالانکہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے کسی تمہید کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے بارے میں مجھے پہلی اور غالباً سب سے اہم بات یہ کہنا ہے کہ وہ ایک بہترین انسان ہیں یہ بات میرے نزدیک اہم اس لئے ہے کہ آج کے دور میں انسانوں کی باتیں کرنے والے بہت ہیں' انسان کم ہیں' بلکہ انسان ہونا بھی فی زمانہ اتنی بڑی کوالیفکیشن نہیں سمجھی جاتی' میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کسی شاعر کے کلام کی تعریف کی جائے اور اس کے بعد اس کی ذات میں موجود انسانی عیوب کا وائٹ پیپر بھی شائع کردیا جائے تو وہ اگلے دن گھر شکریہ ادا کرنے کے لئے چلا آتا ہے کہ آپ نے شاعر تو مانا' باقی رہا انسان ونسان ہونا تو اس نوع کے شعراء کا کہنا ہے کہ شاعر کو صرف شاعر ہونا چاہئے' انسان نہیں! خدا کا شکر ہے کہ عالی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی شعری اور انسانی خوبیاں یکساں ہیں اور یوں انہیں منہا مارنے کی گنجائش دونوں اطراف سے بہت کم رہ جاتی ہے۔ وہ خاندانی طور پر نوابزادے ہیں' یہ نوابزادہ بھی ان کے اندر موجود ہے لیکن ایک گوتم بدھ کی پرچھائیں بھی ان کی ذات کے برگد تلے گیان دھیان میں مشغول ہے۔ وہ پوری دنیا کے پسے ہوئے انسانوں کے لئے اپنے دل میں ایک کسک تو محسوس کرتے ہی ہیں تاہم اپنی ادیب برادری کے محروم اور نادار طبقوں کے لئے بے چینی کا گراف شاید اس عہد کے ہر درد مند ادیب اور شاعر سے کہیں بلند ہے کیونکہ عالی صاحب نے اس طبقے کے لئے عملی طور پر بہت کچھ کر دکھایا ہے۔ انہیں اگر خبر ملتی ہے کہ پاکستان کے کسی دور دراز گوشے میں لکھنے والا کوئی بے یار و مددگار پڑا ہے تو وہ میلوں مسافت طے کر کے اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کے دکھ کا مداوا کرتے ہیں۔ عالی صاحب نے ادیب برادری کے دکھوں ہی کو اپنی ذات کا دکھ نہیں بنایا بلکہ معاشرے میں انہیں وی آئی پی کا درجہ دینے کے لئے وہ کچھ کیا جس کی توفیق تائید ایزدی سے ابھی تک کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ وہ یونیسکو کے فیلو ہیں۔ انہوں نے ایک سال اسکی تربیت حاصل کی اور پھر پاکستان میں بعض بڑے اداروں کے خاکے تیار کئے۔ جن میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز بھی شامل ہے اسی طرح رائٹرز گلڈ کو بنانے اور بگاڑنے والے بھی وہی ہیں کیونکہ عالی صاحب نے اپنے جانشین ویسے ہی چھوڑے جیسے جانشین اورنگ زیب عالمگیر نے چھوڑے تھے۔ بہرحال ان اداروں نے ادیبوں کے بعض اہم کارنامے برقرار رکھے جن میں سے ایک ان پانچ ادبی ایوارڈز کا سلسلہ بھی ہے جو عالی صاحب نے نجی اداروں سے قائم کرائے تھے۔ عالی صاحب نے اس ضمن میں قربانی یہ دی کہ خود کو ہمیشہ کے لئے ان انعامات سے محروم کردیا اور اس کے لئے باقاعدہ ان ضابطوں میں لکھوادیا کہ گلڈ کے زیر اہتمام ان انعاموں کے لئے ان کی کسی کتاب کو انعام کا مستحق قرار نہ دیا جائے۔

عالی صاحب کے ضمن میں بیان کرنے کی دوسری بات ان کی پاکستان سے محبت ہے۔ میں عالی صاحب اور محفل کے دوسرے روشن خیال سامعین سے معذرت خواہ ہوں کہ اپنے اس بیان سے عالی صاحب کی بین الاقوامیت کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ ابھی میں نے گزشتہ دنوں اپنے ایک محبوب پاکستانی مصنف کی کتاب دیکھی جو باہر کے کسی ملک سے شائع ہوئی تھی' اس میں پاکستانی مصنف کی قومیت والے خانے میں درج تھا کہ آپ پاکستان' انڈیا' بنگلہ دیش اور انگلینڈ میں رہے۔ اس طرح سے قارئین کی نظروں میں ان کی ہتک ہوتے ہوتے رہ گئی کیونکہ رائٹر کا کوئی وطن نہیں ہوتا وہ تو خلاء میں رہتا ہے' البتہ عالی صاحب اپنے پاکستانی ہونے پر اصرار کرتے ہوئے جیوے جیوے پاکستان کی صورت میں بھی' اپنے

کالموں کی صورت میں بھی' اور دیارِ غیر میں اپنے عمل سے بھی۔ فیض صاحب کا بھی یہی وطیرہ تھا' ندیم صاحب کا بھی یہی طرزِ عمل ہے اور اب عالی صاحب بھی فیض اور ندیم کی طرح خود کو محدود کرنے پر تلے ہوئے ہیں' اس لئے شبہ گزرتا ہے کہ شاید سچے شعراء ساری دنیا کے انسانوں کو اپنے دل کی ریاست کا مکین سمجھتے ہیں لیکن وہ اس ریاست کے وفادار بھی ہوتے ہیں جس میں وہ خود بھی رہتے ہیں۔ عالی صاحب کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اس کا خمیازہ کچھ تو انہوں نے بھگتا ہے' کچھ ابھی مزید بھگتیں گے۔ بھگتتے پھریں' میرا کیا جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! میرے ایک دوست کی نظر اتنی کمزور ہوئی ہے کہ بقول شخصے وہ اگر عینک اتار کر دیکھے تو اسے اپنی بیوی بھی خوبصورت لگتی ہے۔ بحمد اللہ میری نظر ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی مگر ایک معاملے میں عالی صاحب کی نظر خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ آپ ان کی کم نظری کا اندازہ لگائیں کہ انہیں پنجابی' سندھی' پٹھان' بلوچ اور مہاجر سبھی خوبصورت لگتے ہیں چنانچہ انہیں ایک دوسرے کا خون بہانا بھی اچھا نہیں لگتا' عجیب آدمی ہیں اپنے عالی صاحب بھی۔ ان کی علاقائی عصبیت جاگتی ہی نہیں' پاکستان کو چھوڑ کر دنیا کے بیشتر ملکوں میں وہ عالی صاحب کے ہی انداز میں سوچتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو پر امن بنا کر وہ پلنے جھپٹنے کی لذت سے محروم ہو چکے ہیں اور تو اور گزشتہ رات کو ابوظہبی میں کورنش پر رات دو بجے دوستوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ کہیں ایسا تو ممکن نہیں کہ ابھی کوئی کار نمودار ہو اور اس میں بیٹھے ہوئے نقاب پوش ہم پر فائر کھول دیں۔ اس پر ایک دوست نے کہا کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں' یہاں ہر شخص کی جان مال محفوظ ہے بلکہ یہاں شعراء جب تک اپنا کلام نہ سنائیں' ان کی عزت بھی محفوظ ہے۔

عالی صاحب کے بارے میں بتانے کی ایک بات ان کی اردو سے محبت بھی ہے۔ اردو سے محبت مجھے بھی ہے اور اس محبت میں بیٹھے بٹھائے اچانک اضافہ ہو سکتا ہے' اگر مجھے فروغِ اردو کے لئے قائم کسی ادارے کا سربراہ بنا دیا جائے۔ عالی صاحب بھی اردو کے فروغ کے لئے ۱۹۰۳ء سے قائم انجمن ترقی اردو پاکستان سے گزشتہ ۳۰ برس سے وابستہ ہیں' مگر عجیب بے لوث انسان ہیں کہ آج تک مشاہرہ تو کیا کنوینس کے نام پر بھی ایک پائی وصول نہیں کی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق' ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا صلاح الدین کے بعد یہ بے لوثی اپنے جمیل الدین عالی کے ہاں نظر آتی ہے۔ عالی صاحب نے کراچی میں اردو سائنس کالج کی بنیاد تو نہیں رکھی البتہ اس کی بنیادیں مستحکم ضرور کی ہیں۔ لاکھوں روپے کی لاگت سے نئی عمارت تعمیر کرائی اور اس کا معیار اتنا بلند کیا کہ پورے پاکستان میں اپنی نوعیت کا یہ واحد ادارہ ہے جس کا ثانی کوئی نہیں۔ ہماری مارشل لائی حکومتیں ادارے توڑتی رہی ہیں اور عالی جیسے سرپھرے ادارے بناتے رہے ہیں۔ ایک کام تعمیری ہے' ایک تخریبی ہے۔ تعمیری کام معمار کرتے ہیں اور یا پھر وہ لوگ جو تخریبی کام کرنے کے اہل ہی نہیں' لہٰذا میں عالی صاحب کو داد کیا دوں کہ تخریب ان کے مزاج کا حصہ ہی نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! میں معذرت خواہ ہوں کہ عالی صاحب کی فنی زندگی کے بارے میں ابھی تک گفتگو نہیں کر سکا اور آپ کو مژدہ ہو کہ کر بھی نہیں سکوں گا کیونکہ میں یہ مضمون عالی صاحب پر منعقد ہونے والے سیمینار سے ذرا دیر پہلے لکھنے بیٹھا ہوں۔ سیمینار تھوڑی دیر میں شروع ہو جائے گا اور یوں میں نے عالی صاحب کی شاعری' سفرنامہ نگاری' کالم

نویسی اور ان کے دوسرے تحریری مشاغل کے بارے میں جو اظہار خیال کرنا تھا' وہ نہیں کر سکوں گا بس چلتے چلتے اتنا ضرور کہوں گا کہ عالی صاحب کثیر الجہات ادیب ہیں' نظم' غزل' دوہے' گیت' قومی گیت' سفرنامے اور کالم لکھنے کے علاوہ ادیبوں کے مسائل حل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے گزشتہ دنوں اپنے ایک مضمون میں جو لطیفہ لکھا تھا اسے دہرا کر آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ گزشتہ برس دوبئی آتے ہوئے میرے برابر والی سیٹ پر ایک سیدھا سادھا سا دیہاتی نوجوان بیٹھا تھا جو ملازمت کے لئے دوبئی جا رہا تھا۔ جب جہاز دوبئی ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے کے لئے فضاء کے چکر لگا رہا تھا' اس نے مجھ سے معصومیت سے پوچھا "بھائی صاحب! دوبئی کس طرف آئے گا؟" عالی صاحب کے کالم کی وسعت کو دیکھتے ہوئے میرا جی بھی ان سے یہی پوچھنے کو چاہتا ہے۔

(ابوظبی میں منعقدہ جشن عالی ۱۹۹۵ء میں پڑھا گیا)

۱۹۹۰ء

ایک تاریخی تقریب سپاس

ادارۂ "جنگ" کراچی

آنکھوں دیکھا حال

کراچی ۱۷ نومبر ۱۹۹۵ء ادارہ "جنگ"

خطبات و پیغامات

جناب وسیم سجاد	چیئرمین سینٹ آف پاکستان	صدر جلسہ
مولانا عبدالستار ایدھی	مشہور سماجی کارکن	قائم مقام صدر جلسہ

پیغامات

محترمہ بے نظیر بھٹو	وزیر اعظم پاکستان
جناب محمد نواز شریف	(قائد حزب اختلاف)
جناب الطاف حسین	(قائد تحریک متحدہ قومی محاذ)
جناب قاضی حسین احمد	(صدر جماعت اسلامی)
جناب مولانا فضل الرحمن	(امیر جماعت علمائے پاکستان)
عمران خان	سماجی کارکن (بعد میں صدر تحریک انصاف)

گورنرز

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) راجہ سروپ خان	گورنر پنجاب
کمال الدین اظفر	گورنر صوبہ سندھ
خورشید علی خان	گورنر صوبہ سرحد
لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) عمران اللہ خان	گورنر صوبہ بلوچستان

وزرائے اعلیٰ

سردار احمد عارف نکئی	وزیر اعلیٰ صوبہ پنجاب
سید عبداللہ شاہ	وزیر اعلیٰ صوبہ سندھ
نواب ذوالفقار علی مگسی	وزیر اعلیٰ صوبہ بلوچستان
ڈاکٹر شیخ عوض محمد	صدر سندھ بلوچستان فیڈریشن' امارات متحدہ' ابو ظہبی

مقررین

جناب محمود شام	سپاسنامہ
ایس ایم ظفر	مسلم لیگ' سابق وزیر قانون
مخدوم امین فہیم	سندھی زبان کے شاعر سجادہ نشین' وفاقی وزیر پی پی پی
جناب پروفیسر غفور احمد	نائب امیر جماعت اسلامی
ڈاکٹر عبدالوہاب	شیخ الجامعہ کراچی
سینیٹر حسین شاہ راشدی	پی پی پی
ڈاکٹر پیرزادہ قاسم	ممتاز سائنس دان' جامعہ کراچی
جناب اجمل دہلوی	سربراہ مذاکراتی ٹیم متحدہ قومی موومنٹ
ماجد سلطان خواجہ	نمائندہ وفاق ایوان ہائے صنعت و تجارت
غلام ربانی آگرو	صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان
جناب عطا شاد	انفارمیشن سیکریٹری حکومت بلوچستان اور مشہور شاعر
عابد شاہ عابد	پشتو کے ممتاز شاعر' پشاور

جمیل الدین عالی

"جنگ" اور عالی جی

تقریبِ سپاس کا آنکھوں دیکھا حال

"مختلف سیاسی جماعتوں اور مکتبہ ہائے فکر کی جانب سے ایک زندہ شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے کی منفرد مثال"

("جنگ" رپورٹ) ۷ انومبر ۱۹۹۳ء

"ادارۂ جنگ" کو پاکستان کی اردو صحافت میں ہمیشہ سے ایک روایت ساز ادارے کا اعزاز حاصل ہے۔ گزشتہ جمعہ کو "ادارہ جنگ" کی جانب سے ایک اور روشن مثال قائم کی گئی جب اردو کے نامور شاعر' ادیب' کالم نگار' مفکر اور محقق جناب جمیل الدین عالی کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب سپاس کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر "جنگ" سے جناب جمیل الدین عالی کی ۳۲ سالہ طویل رفاقت کے اعتراف میں "نشانِ سپاس" بھی پیش کیا گیا۔ تقریب میں ملک کے طول و عرض سے سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے شرکت کی۔ تقریب کے لئے ایک عالیشان اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر دائیں جانب بانئ جنگ جناب میر خلیل الرحمان اور بائیں جانب جناب جمیل الدین عالی کے اسکیچ آویزاں تھے۔ درمیان میں جناب عالی کے مختلف کالموں کے عنوانات رنگین حروف میں بہاریں دکھا رہے تھے۔

تقریب کے لئے شام ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا مگر وقت سے پہلے ہی حاضرین کی آمد شروع ہو گئی تھی اور ساڑھے چار بجے تک تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ اگرچہ تقریب کے لئے داخلہ بذریعہ کارڈ تھا' اس کے باوجود بہت سے افراد جناب جمیل الدین عالی سے عقیدت اور پورے ملک سے آنے والے دانشوروں اور سیاستدانوں کی فکر انگیز گفتگو سننے کے لئے جوق در جوق آئے ہوئے تھے' جس کے باعث شام ساڑھے پانچ بجے تک ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔

تقریب کا آغاز قاری وحید ظفر قاسمی کی وجد آفریں تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ قبل ازیں جامعہ کراچی میں شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر ہما میر نے نظامت کے فرائض سنبھالتے ہوئے' مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد قاری فصیح الدین سہروردی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا اس کے بعد روزنامہ "جنگ" کے ایڈیٹر جناب محمود شام نے خطبۂ سپاس پیش کیا کہ "ادارۂ جنگ" آئندہ بھی اہل علم و دانش کی خدمات کے اعتراف کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ اس موقع پر روزنامہ "جنگ" کے ایڈیٹر انچیف' میر شکیل الرحمان نے صدر محفل چیئرمین سینیٹ آف پاکستان جناب وسیم سجاد کو "ادارۂ جنگ" کی جانب سے "نشان سپاس" پیش کیا۔ قبل ازیں تقریب کے آغاز میں جناب وسیم سجاد نے "ادارۂ جنگ" کی جانب سے جناب جمیل الدین عالی کو وہ پروقار "نشانِ سپاس" پیش کیا جو ابتدا ہی سے حاضرینِ محفل کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس موقع پر تمام حاضرین محفل نے کھڑے ہو کر جناب جمیل الدین عالی کو زبردست تالیوں کی گونج میں خراج تحسین پیش کیا۔ پرجوش تالیوں کی گونج نے محفل کو بارہا گرمایا اور مقررین کی فکر انگیز باتوں نے متعدد مقامات پر حاضرین محفل کو سنجیدہ کردیا تو کبھی کبھی دبے دبے تبسم اور فلک شگاف قہقہے بھی حاضرین میں زندگی کی لہریں دوڑاتے رہے۔

جناب وسیم سجاد کی بوجہ معروفیت قبل از وقت رخصت برائے لاہور کے باعث معروف سماجی کارکن جناب عبدالستار ایدھی نے تقریب کی صدارت سنبھالی اور انہوں نے بیگم جمیل الدین عالی کو ایک گلدستہ بھی پیش کیا۔ نوجوان مصور شاہد رسام نے جناب جمیل الدین عالی کا ایک خوبصورت اسکیچ ان کی نذر کیا' جبکہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے علاقائی ناظم ڈاکٹر نظر کامرانی نے جناب جمیل الدین عالی کو تحائف پیش کئے۔ "جنگ" ایمپلائز یونین کے صدر خالد محبوب نے بھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پانچ گھنٹے جاری رہنے والی اس تقریب میں حاضرین کی دلچسپی آخر تک برقرار رہی اور عشائیے کے دوران بھی حاضرین اور مقررین کے درمیان سنجیدہ مباحثے کا سماں بندھا رہا۔ شہر کے علمی اور ادبی حلقوں نے ادارۂ "جنگ" کی جانب سے اس منفرد اور عظیم الشان تقریب کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ اس تقریب میں پڑھے جانے والے پیغامات اور تقاریر کے اقتباسات نذر قارئین ہیں۔

محمود شام ایڈیٹر "جنگ"

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تاریخ نے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے کہ "جنگ" کی طرف سے آج کے مقبول اور دل نواز شاعر' پاکستانیت کے مبلغ' عوام کے درد میں ڈوبے ہوئے کالم نویس' صاحب طرز نثر نگار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۳۲ سال سے مسلسل "جنگ" کے قلمی رفیق جناب جمیل الدین عالی کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کروں۔

"جنگ" گروپ آف نیوز پیپرز کے بانی میر خلیل الرحمن اگر آج ہمارے درمیان ہوتے تو وہ کتنے خوش ہوتے۔ اردو صحافت کے یہ عظیم محسن اردو اخبار نویسی کو جدید ترین ٹیکنالوجی سے روشناس کرانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آفسٹ طریقۂ طباعت' رنگارنگ تصاویر سے لے کر لیزر کامپ تک "جنگ" نے ہی اولیت حاصل کی۔

جناب عالی کو "جنگ" میں لکھنے کی دعوت بھی میر خلیل الرحمٰن مرحوم نے ہی دی تھی اور ادارۂ جنگ" جناب عالی کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس دعوت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے مسلسل جاری رکھا۔ حالات بدلے' حکومتیں تبدیل ہوئیں' امتحان آئے لیکن "جنگ" سے عالی صاحب کی رفاقت پر کسی موسم کی سختی اثر انداز نہیں ہوئی۔

پاکستان' اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر اسے انسانوں کے ہاتھوں گزشتہ ۴۸ برس میں جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جن ابتلاؤں سے گزرنا پڑا ہے' ان کو جب ہم پیش نظر رکھتے ہیں تو کسی بھی ادارے کا تسلسل' کسی بھی روایت کا دوام' انتہائی غنیمت معلوم ہوتا ہے' اس لئے اس تسلسل کا اعتراف اس تسلسل کو برقرار رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرسکتا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایک عجیب و غریب کیفیت سے گزرتا رہا ہے اور گزر رہا ہے۔ ہم میں سے اکثر تسلسل اور دوام سے خوف کھاتے ہیں اور اس خوف کے زیر اثر ایسی مساعی پر مجبور رہتے ہیں کہ کوئی ایسا سلسلہ نہ چلنے پائے' ایسا واقعہ نہ رونما ہونے پائے جو ہمیں ہمارے معاشرے کو ہمارے وطن کو بقا اور دوام کے راستے پر ڈال سکے۔ اسی لئے کم کم اداروں کی طرف سے اپنے دیرینہ وابستگان کے لئے اعترافِ رفاقت کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اسی لئے ہر ادارے میں چل چلاؤ رہتا ہے۔ حکومتوں کی بساط بھی اسی لئے جلد سمیٹ دی جاتی ہے۔

ماضی' حال اور مستقبل سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ آتی رُتوں سے ہم اسی وقت کچھ لے سکتے ہیں' جب جاتی رُتوں پر بھی ہماری نظر ہو۔ جناب جمیل الدین عالی "جنگ" کے لئے جو اظہاریے لکھتے ہیں' ان میں ماضی' حال اور مستقبل ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔ شاعری میں ان کا محبوب کوئی بھی ہو' نثر میں ان کا محبوب پاکستان کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ہمارے زیادہ تر کالم نویس لمحۂ موجود کی کشاکش میں الجھے رہتے ہیں لیکن عالی جی قاری کو ماضی کے تجربے اور حال کے مشاہدے کے حوالے سے مستقبل کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ اردو نثر میں' اخباری کالم نویسی میں عالی صاحب ہمارے خیال میں پہلے اور اب تک واحد قلم کار ہیں جنھوں نے اردو کے قارئین کو شعبۂ مستقبلیات سے روشناس کرایا ہے اور اس حوالے سے پاکستانیوں میں مستقبل کے بارے میں تعین کی راہ ہموار کی ہے۔

"جنگ" سے ان کی قلمی رفاقت کا آغاز ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء سے ہوتا ہے' جب ان کے سفرنامے "دنیا مرے آگے" کی پہلی قسط اشاعت پذیر ہوئی۔ جب ان کے سفرنامے "دنیا مرے آگے" کی پہلی قسط اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ سفرنامہ اپنے پرکشش اسلوب' جرأت رندانہ اور پُر اثر منظر نویسی کے باعث مقبولِ خاص و عام رہا۔ سفر وہ دیارِ غیر کا کرتے تھے' عشق اپنے دیار سے کرتے تھے۔ ذکرِ غیر میں بھی ذکرِ یار در آتا تھا۔ یہی ادا ان کے قارئین کو ان کا گرویدہ رکھتی تھی۔ قدرت اللہ شہاب نے اسی لئے کہا تھا۔

"عالی جہاں بھی جائیں' پاکستان ساتھ جاتا ہے!"

عالی صاحب کا اسلوبِ نگارش اور "جنگ" کی کثیر اشاعت' جب بہم ہوئے تو جدید سفرنامے کے لئے نئے رجحانات کی طرح پڑی۔ "نقار خانے میں" کا آغاز ۱۹۶۷ء سے ہوتا ہے' جو اب تک جاری ہے۔ ایک دو مرتبہ اس میں صرف طویل بیماری آڑے آئی۔ کوئی دوسری مصروفیت اس کارِ جاریہ میں حائل نہیں ہو سکی۔ مالیاتی اداروں میں اعلیٰ ترین

عہدوں پر فائز ہوئے اور وہاں بھی اپنے فرائض پورے احساس وابستگی اور قومی جذبے سے ادا کرنے کے باوجود انہوں نے قارئین "جنگ" کے حضور کبھی ناغہ نہیں کیا کیونکہ وہ اس اظہار یے کو بھی ایک قومی فریضہ سمجھ کر ہی انجام دیتے رہے ہیں۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزئی پروانہ ہے

شمع اردو کے اس پروانے نے گیسوئے اردو کو تابدار کرنے کے لئے پہلی بار اردو میں باقاعدہ' ہفتہ وار اقتصادی کالم کا بھی آغاز کیا۔ "معیشت کی جھلکیاں" کے زیر عنوان ہفتہ وار کالم اردو صحافت میں ایک اور نئے رجحان کی ابتدا تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب دنیا میں اقتصادی سیاست کا غلبہ ہے۔ اب تیسری دنیا کے ممالک' ترقی یافتہ ممالک کے لئے جیتی جاگتی اقوام نہیں بلکہ مارکیٹیں بن گئے ہیں۔ جناب عالی نے اس تبدیلی کا ادراک کرتے ہوئے "جنگ" کے اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان پھیلے ہوئے قارئین کو معیشت کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کا قومی قرض ادا کرنا شروع کردیا۔ "نقار خانے میں" کی طرح "معیشت کی جھلکیاں" بھی بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ "جنگ" کے قارئین دل سے جناب جمیل الدین عالی کے ممنون ہیں اور ان کی درازیٔ عمر کے لئے دست بہ دعا رہتے ہیں کہ وہ انتہائی دردمندی سے ان کے دلوں کی بات اخبار کے صفحات پر ثبت کرتے ہیں جو ایک فغاں بن کر اقتدار کے ایوانوں میں گونجتی ہے۔ مرزا جمیل الدین عالی اپنے جد امجد مرزا اسد اللہ خان غالب کی طرح سخن فہم ہیں' کسی کے طرفدار نہیں ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان' پاکستانیت اور پاکستانیوں کی بات کی ہے۔ وہ کسی بھی حکومت پاکستان کے طرفدار نہیں رہے' انہوں نے سخن فہمی کا مظاہرہ بالعموم کیا ہے۔

"ادارۂ جنگ" کو فخر ہے کہ وہ اپنے ایسے دیرینہ قلمی رفیق کے اعزاز میں یہ تقریب منعقد کررہا ہے' جس نے ہمیشہ سچائی' دلسوزی اور خرد افروزی کو اپنا نصب العین سمجھا ہے۔

جناب وسیم سجاد
چیئرمین سینٹ آف پاکستان

"جناب جمیل الدین عالی صاحب گوناگوں صفات کے حامل ایک عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے۔ ان کی رنگا رنگ اور گوناگوں حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت روزنامہ "جنگ" کے ساتھ وابستگی ہے۔ اس موقر روزنامے کے لئے وہ گزشتہ بتیس برس سے اظہاریہ لکھ رہے ہیں۔ "ادارۂ جنگ" نے ان کی طویل اور اعلیٰ کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اعزاز میں اہل دانش کی یہ مجلس سجائی ہے۔ یوں تو ان کے اعزاز میں متعدد تقریبات منعقد ہو چکی ہیں' پاکستان کے اندر بھی اور پاکستان کے باہر بھی' لیکن آج کی تقریب میں اپنی سطح اور وسعت کے اعتبار سے یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ اس تقریب میں نامور اصحاب فکر و دانش نے جناب عالی کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لے رہے ہیں۔"

"روزنامہ "جنگ" کو پاکستانی اخبارات میں دو امتیازات حاصل ہیں۔ ایک امتیاز تو یہ ہے کہ "جنگ" کی اشاعت ہر پاکستانی اخبار سے زیادہ ہے۔ "جنگ" کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس کا ادارتی صفحہ بہت Rich ہوتا ہے جو صاحبانِ فکر و دانش جنگ کے لئے اظہاریے اور اداریئے لکھتے ہیں' ایسے بلند پایہ اظہاریہ نگار اور اداریہ نگار اتنی تعداد میں کسی اور اخبار کو نصیب نہیں۔ انہی چاند ستاروں میں ایک روشن نام جمیل الدین عالی کا ہے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ان اہلِ دانش نے ملکی مسائل کی نشاندہی اور ان کا حل پیش کرنے کے سلسلے میں کبھی کوتاہی نہیں کی' لیکن مسائل ہیں کہ بڑھتے رہے ہیں۔ اور صورتحال بد سے بدتر ہوتی رہی ہے اور اب بدترین ہے۔ جناب عالی نے اپنے مستقل کالم کا نام "نقار خانے میں" رکھا ہے۔ اس نام کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ جمیل الدین عالی پوری دنیا میں گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ وہ بیشتر اچھی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی استعداد غیر معمولی ہے۔ وہ اپنے مشاہدے' اپنے مطالعے اور اپنے ادراک کا حاصل اظہاریئے کی شکل میں "جنگ" کے قارئین کو پیش کر دیتے ہیں یہ جہاں بینی جہاں بانی سے زیادہ مشکل ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

"عالی کا دوسرا اظہاریہ "معیشت کی جھلکیاں" کے عنوان سے' سال بھر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس موضوع پر کامیاب کالم نگاری آسان نہیں ہے۔ خاص خاص صاحبان علم ہی اس سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاص موضوع پر لکھنے والے نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں اور جمیل الدین عالی کا اس سلسلے میں کوئی ثانی نہیں ہے۔

جمیل الدین عالی نے بڑائی کی منزلیں محنت سے طے کی ہیں۔ انہوں نے وقت کو ضائع ہونے نہیں دیا جو لوگ وقت ضائع کرتے ہیں' وقت انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ وہ اپنی دلچسپی کے میدان میں وقت پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ روز و شب میں الجھے رہنے کی بجائے اپنے لئے نئے زمان و مکاں تلاش کرتے رہے ہیں۔"

"پاکستان آج گوناگوں مشکلات سے دوچار ہے۔ قانون کا احترام ناپید ہوتا جارہا ہے۔ آئینی اداروں کا تقدس پامال کیا جارہا ہے۔ فرقہ واریت اور گروہ بندی عروج پر ہے۔ پاکستان کا عروس البلاد کراچی جو کبھی امن کا گہوارہ تھا' آج افراتفری کا شکار ہے۔ قومی معیشت کی حالت بھی ابتر ہے۔ ان حالات میں تمام محب وطن قوتوں' بالخصوص سماجی و سیاسی کارکنوں اور اہل قلم حضرات کو جناب جمیل الدین عالی کی طرح ملک و قوم کی راہنمائی اور اخوت و بھائی چارے کو فروغ دینے کے لئے اپنا تاریخی کردار ادا کرنا ہوگا۔"

جمیل الدین عالی کی کجکلاہی' ذکی الحسی' اور لاابالی پن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ والیٔ لوہارو کے فرزند ہیں لیکن یہ نہ بھولئے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ میر تو اتنے نازک مزاج تھے کہ بددماغ مشہور تھے۔ جناب عالی نے ہمیشہ استحصالی طبقے کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ وہ نثرنگار بھی ہیں اور نثر میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ صاحب اسلوب ہونا بڑی بات ہے۔ نثر میں انہوں نے سفرنامے اور اظہاریے لکھے۔ ایک سو پچاس سے زیادہ کتابوں پر مقدمے بھی لکھے جو "حرفے چند" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔"

"جمیل الدین عالی کو پاکستان سے محبت ہے۔ ان کا جذبہ' ان کا احساس اور ان کا ادراک "جیوے جیوے پاکستان" کی صورت میں شکل پزیر ہوا ہے۔ وہ دنیا بھر میں گھومے پھرے لیکن بقول شخصے پاکستان ان کے ساتھ رہا ہے۔ جمیل الدین عالی کی خدمات' ان کے کارنامے اور پاکستان سے ان کی لگن انہیں ایک معیاری انسان کا روپ عطا کرتی ہے۔"

مولانا عبدالستار ایدھی

"صبح اٹھتے ہی میں اپنے سیکریٹری سے کہتا ہوں کہ اخبار میں کوئی ظلم' ظالم اور مظلوم کے بارے میں کوئی کالم ہو تو مجھے سناؤ۔ مجھے اس بات کے علاوہ کسی چیز کا پتہ نہیں۔ میں عالی جی کے کالم اسی حوالے سے پڑھتا ہوں۔ آج مجھے اس تقریب میں آکر پہلی بار احساس ہوا کہ عالی جی کتنا بڑا عالم ہے۔ میرا مشن معاشرے میں امن قائم کرنا ہے اور لوگوں کے دکھ اور غم میں ان کی حتی المقدور مدد کرنا ہے۔ مجھے اقتدار کی بھوک نہیں ہے۔ یہاں لوگوں کو ایک سازش کے تحت آپس میں لڑایا گیا ہے اور ہم آج تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ آدم سے لے کر آج تک دو طبقوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ یہ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ اصل جنگ معیشت اور دولت کی تقسیم پر ہو رہی ہے۔ ہم اس کا صحیح تجزیہ نہیں کرتے۔ فرقہ واریت' ذات پات' علاقائیت اور برادریوں کے لئے جو جھگڑے ہو رہے ہیں' یہ سب ڈرامے ہیں۔ لوگوں کو بیوقوف بنایا جاتا ہے اور ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔"

پیغامات

بے نظیر بھٹو

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ روزنامہ "جنگ" مسٹر جمیل الدین عالی کے ساتھ اپنی ۳۲ سالہ رفاقت کے اعتراف کے طور پر ایک تقریب کا اہتمام کررہا ہے۔

جناب جمیل الدین عالی نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہماری معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی زندگی کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ان کے ترانوں نے پوری قوم کو ولولۂ تازہ دیا۔ میری دعا ہے کہ پاکستان میں عالی صاحب جیسے لوگ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسی بھرپور شرکت کا مظاہرہ کریں۔

مسٹر جمیل الدین عالی کے اعزاز میں روزنامہ "جنگ" نے تقریب کا اہتمام کرکے اپنی عظیم الشان ادب دوستی اور ادب پروری کا ثبوت دیا ہے۔

میں عالی صاحب کی خوشیوں کی دعا کرتی ہوں۔

میاں محمد نواز شریف

محترم جمیل ادین عالی کی ہمہ گیر شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں۔ وہ سب اتنے نمایاں' اتنے مکمل اور اتنے باکمال ہیں کہ مجھ جیسا طالب علم تو ان کا احاطہ کرنے کی بھی تاب نہیں رکھتا' چہ جائیکہ میں ان کی عالمانہ و محققانہ کاوش پر کوئی روشنی ڈالوں' البتہ میں یہ اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ میں ان کے علم' تجربے' مشاہدے' تجزیے اور تحقیق سے مستفیض ضرور ہوا ہوں۔

جناب جمیل الدین عالی کے دوہے اور ملی نغمات تو مقبول عام ہیں ہی' ان کے تحریر کردہ "اظہاریے" پاکستانی عوام کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرکے جو راستہ تجویز کرتے رہے ہیں' اگر ان پر عمل کیا جاتا تو آج پاکستان کی معیشت نہ محکوم ہوتی' نہ مفلوج' بلکہ ایک آزاد اور مضبوط معیشت ہمیں وہ بنیاد فراہم کردیتی جس پر خود مختار اور خوشحال پاکستان کی عمارت کھڑی ہوتی۔ اس موقع پر میں خصوصاً عالی جی کے دو کاموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' ایک بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا پاکستان جیسے ملکوں کے ساتھ رویہ اور دوسرا جاگیردارانہ سماج کی بدعتیں' ان دونوں موضوعات پر عالی جی نے پاکستانی عوام کے شعور کو جو جلا بخشی ہے وہی روشنی ہمیں اس راستے کو متعین کرنے میں مددگار ہوگی جو منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں پاکستان کی تعمیر و ترقی کے کاموں کے لئے تاحیات سلامت رکھے (آمین) اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کی تعبیر ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ

الطاف حسین
(از لندن)

میرے لئے یہ امر نہایت مسرت کا باعث ہے کہ ادارہ "جنگ" روزنامہ "جنگ" سے محترم جمیل الدین عالی کی ۳۲ سالہ رفاقت کے اعتراف میں ایک پروقار "تقریبِ سپاس" کا اہتمام کر رہا ہے۔ اردو ادب' اردو زبان اور ملک و قوم کے لئے عالی صاحب کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کی خدمات تاریخ کا اَن مٹ حصہ بن چکی ہیں۔ یوں تو عالی صاحب نے اردو ادب کے تقریباً تمام ہی شعبوں میں مثالی خدمات انجام دی ہیں لیکن میرے نزدیک ان کی اصل پہچان ان کے وہ قومی نغمے ہیں جو نہ صرف زبان زدِ عام ہو گئے ہیں بلکہ عالی صاحب کی پہچان بھی بن گئے ہیں' اور میرے نزدیک کسی قلم کار کی صلاحیت کا اس سے بڑا اعتراف کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اس کی تحریریں ہی خود اس کی پہچان بن جائیں..... ویسے عالی صاحب اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنا خونِ جگر دے کر اردو زبان اور ملک و قوم کی جو خدمت کی ہے' آج اس کا اعتراف بھی کیا جا رہا ہے' ورنہ جس "طبقۂ آبادی" سے ان کا تعلق ہے' اس سے تعلق رکھنے والے اہل افراد کی صلاحیتوں کا اعتراف تو کجا انہیں اس کے اظہار تک کا موقع نہیں دیا جاتا ہے' اس لئے میں عالی صاحب کو دلی مبارکباد بھی پیش کرتا ہوں

میری دعا ہے کہ اللہ عالی صاحب کو لمبی عمر اور اچھی صحت دے تاکہ وہ اپنے قلم سے ملک و قوم اور قومی زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔

قاضی حسین احمد

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ روزنامہ "جنگ" اپنے ممتاز کالم نگار اور ملک کے نامور شاعر' ادیب اور دانشور جناب جمیل الدین عالی کے ساتھ ایک تقریب کا انعقاد کر رہا ہے۔ یہ تقریب عالی صاحب کی "جنگ" سے ۳۲ سالہ رفاقت کے اعتراف کے طور پر منعقد کی جا رہی ہے۔ عالی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں اور ان کی دلچسپیاں بھی متنوع ہیں' مگر ان کی جس بات سے مجھ جیسوں کو خصوصی دلچسپی ہے' وہ ان کی پاکستانیت ہے۔ یہ اسی کا اعجاز ہے کہ خدا نے انہیں وطن کے لئے ایسے نغمے لکھنے کی توفیق بخشی' جنہیں ملک میں بھی ہر کہ ومہ گنگنا رہا ہے اور ملک کی فضاؤں میں مٹھاس گھول رہا ہے۔ تاہم اس شعری سفر کا نقطۂ کمال وہ لمحہ تھا جب انہیں یہ شرف حاصل ہوا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر امتِ مسلمہ کی طرف سے دنیا کو یہ بتا سکیں کہ

ہم تابہ ابد سعی و تغیّر کے ولی ہیں
ہم مصطفوی' مصطفوی' مصطفوی ہیں

آخر پاکستانیت اسی کا تو نام ہے' یہ محض کسی خوبصورت جغرافیہ یا معاشی اعداد و شمار کے طلسم کدے کا نام نہیں بلکہ اس سے بھی سوا اس عقیدے اور نظریئے کا نام بھی ہے جو پاکستان کی اساس بنا۔ یہ بھی درست ہے کہ عالی صاحب کو

اس ملک کے دریاؤں، پہاڑوں، میدانوں سے بہت محبت ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ انہیں معاشی حقائق کے ذریعے لوگوں کو پاکستان سے محبت کرنا سکھانا بہت اچھا لگتا ہے، مگر اس کے پیچھے وہ سچا اور کھرا پاکستانی صاف جھلکتا ہے جو پاکستان کو محض ایک جغرافیہ یا معیشت ہی نہیں سمجھتا بلکہ ایک نظریاتی حقیقت بھی مانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا انہیں "ہم مصطفوی، مصطفوی، مصطفوی ہیں" کہنے کا اعزاز کبھی عطا نہ کرتا، ان کے اس اعزاز اور ان کے اس مزاج پر ان کے لاکھ گناہ معاف کئے جاسکتے ہیں۔

یہ ان کی پاکستانیت ہی کا کمال ہے کہ عالی صاحب نے کبھی علاقائیت کے فتنے سے مفاہمت نہیں کی، وہ ہمیشہ اس عفریت سے اپنی پوری توانائی کے ساتھ نبرد آزما رہے اور قوم کو اس کی حشر سامانیوں سے باخبر کرتے رہے۔ آج ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ فتنہ کیا کیا گل کھلا سکتا ہے۔ "پاکستانیت" تو اخوت اور محبت کا نام ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے دل دھڑکنے کا کام ہے اس میں نفرت، عصبیت، علاقائیت، فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہی پاکستانیت کی اصل روح ہے اور ایک سچے پاکستانی کی پہچان بھی۔ پاکستان سالم اور محفوظ رہے گا تو یہ دین کا گہوارہ بھی بن سکے گا۔ بقول اقبال ؂

این نکتہ کشائندۂ اسرارِ نہاں است
ملک است تنِ خاکی و دیں روحِ رواں است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جاں است

پاکستان تنِ خاکی اور دیں اسلام اس کی روح رواں ہے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو ایک عقیدے اور نظریے کی اساس پر وجود میں آیا ہے، اس سے محبت کرنے والے محض کسی وطنی بت کے پجاری نہیں بلکہ اسلام کے قلعے کے محافظ ہیں۔

ایک بات اور کہتا چلوں کہ عالی صاحب کو علم، سائنس اور عقل کے مسائل سے بڑی دلچسپی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہم وطن پڑھ لکھ کر دانا بینا بن جائیں۔ علم، سائنس اور عقل کی برکات کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ جلوۂ دانشِ فرنگ سے مسلمان کی آنکھیں خیرہ نہ ہوجائیں۔ اس کے لئے عالی صاحب کے پاس پاکستانیت کا سُرمہ ہے جو میرے خیال میں اقبال کے سرمے "خاکِ مدینہ و نجف" ہی کے خمیر سے اٹھا ہے۔ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہوں گا کہ عالی صاحب کو بالخصوص خرد افروزی سے محبت ہے۔ عقل سے کام لینے میں تو ظاہر ہے کوئی ہرج نہیں، مگر خرد افروزی کا شوق کبھی کبھی بڑے فتنے بھی پیدا کرتا ہے۔ عالمِ اسلام کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ مسلمانوں نے ان فتنوں کا جواب عقل ہی سے دیا۔ مثال کے طور پر امام غزالی ملت اسلامیہ کی طرف سے اس جواب ہی کا نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عالی صاحب اقبال کی طرح اچھی طرح جانتے ہیں کہ ؂

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے

عقل، فکر، منطق سب برحق ہیں، مگر ان فتنوں سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے، جو عقل کے نام پر اٹھائے جاتے ہیں۔

عالی صاحب یقیناً اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ قوم کو ان فتنوں سے آگاہ کرتے رہیں۔

آخر میں مجھے ان کی ایک دلچسپی کا ذکر کرنا ہے اور وہ ہے مستقبلیات سے ان کی دلچسپی' مستقبل کے بارے میں جاننا' سوچنا اور منصوبہ بندی کرنا ضروری ہے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی سے غفلت کے نتیجے میں امتِ مسلمہ انحطاط' تنزل اور افراتفری کا شکار ہو گئی اور یورپ نے ساری عالمِ انسانیت کو اپنی اقدار اور تہذیب کی آماج گاہ بنالیا مگر ایک مستقبل اور بھی ہے۔یہ ہے اصل اور حقیقی مستقبل۔ یہ عقیدہ انسان کو حیوان سے ممیز کرتا ہے' خالق کی پہچان اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس۔ مجھے امید ہے کہ عالی صاحب اپنے قارئین کی توجہ اس مستقبل کی طرف بھی لگاتے رہیں گے اور یوں اپنا مستقبل یعنی آخرت بھی سنوار جائیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔اس مطلب کو اقبال نے کس خوبصورتی سے اپنے ایک نعتیہ شعر میں سمو دیا ہے۔

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

ہمچو او از بطنِ ایں گیتی نزاد

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا' اور گیتی نے ان جیسا کوئی پیدا نہیں کیا۔ یعنی دین دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ دنیا کی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ ہے' جو خالق نے اپنے آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بنی نوع انسان کو سکھایا ہے۔

میں جمیل الدین عالی صاحب کیلئے دعا گو ہوں' اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے جو انہوں نے ملک یا اللہ کے بندوں کے لئے سرانجام دی ہیں اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انہیں مزید بھلائیاں کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

مولانا فضل الرحمٰن

جناب جمیل الدین عالی صاحب وطن عزیز کی مشہور و معروف اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔وہ نہ صرف انتہائی پڑھے لکھے دانشور ہیں بلکہ ادیب بھی ہیں۔"پڑھے لکھے" کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے کہ آج کل دانشوری کے لئے پڑھے لکھے ہونے کی شرط نہیں رہی' محض کسی بناء پر شہرت ہی کافی ہے۔

جناب عالی ایک کہنہ مشق صحافی ہی نہیں بلکہ اکاؤنٹنٹ بھی ہیں اور گزشتہ چند ماہ سے ان کے کالم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے وطنِ عزیز کو لاحق معاشی مسائل پر انتہائی دردمندانہ اور کامل مہارت کے ساتھ گرہ کشائی کی ہے۔

شاعری تو ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے' شاعر بھی محض بھرتی کے نہیں بلکہ واقعتاً مقبول شاعروں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے چاہنے والوں میں عمر اور صنف کی بھی قید نہیں۔شاعری تو گویا ان کے ہاتھ کی چھڑی ہے' جیسے چاہیں استعمال کریں' کسی خاص صنف کے مقید نہیں' غزل' نظم' گیت اور دوہے ہر ایک پر

کمال دسترس رکھتے ہیں' گویا شاعری کے میدان کے آل راؤنڈر ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت ہندوپاک ہی تک محدود نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ' یورپ اور امریکہ' کینیڈا تک ان کے ڈنکے بج رہے ہیں۔

ان کی کالم نگاری تو گویا حرزِ جاں بن گئی ہے ہم جیسے طالب علم ان کے کالم میں سے زیادہ تر استفادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سیاسی اور جماعتی مشاغل کی بناء پر میں ان کو مکمل نہیں پڑھ سکا' تاہم جب بھی موقع ملتا ہے تو "جنگ" کے توسط سے ان کے خیالات و افکار سے فکری توانائی محسوس کرتا ہوں۔

عصر حاضر میں کالم نگاری محض ایک پیشہ بن کر رہ گئی ہے اور معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر اکثر کالم نگار محض دفع الوقتی کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

بعض مہربان تو اس معزز پیشے اور قلم کی حرمت سے بھی بیگانہ نظر آتے ہیں' انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں' بلکہ وہ تو اتنا جانتے ہیں کہ کسی کو خوش کرنے کے لئے کسی کی بھی پگڑی اچھال سکتے ہیں' صحافت ایسے مقدس شعبہ کو ایسے ہی برخود غلط اور خود غرض قلم کاروں نے گہنا دیا ہے' ایسی کالی بھیڑوں کی موجودگی میں کسی فاضل دانشور کا ایک عرصہ تک مستقل کالم نگاری کرنا' اور وہ بھی پاکستان کے سب سے بڑے اخبار "جنگ" میں' انتہائی عزیمت و استقامت کی دلیل ہے۔

جناب عالی ایسے کالم نگار ہیں کہ انہوں نے محض ذاتی مفاد کی بناء پر کسی کا دامن آلودہ نہیں کیا' نہ ہی کسی کی بے جا قصیدہ خوانی کی ہے۔ وہ سب کے ہیں اور کسی کے بھی نہیں' یعنی ہر وہ شخص یا ادارہ اور جماعت جو ملک و ملت کی وفادار ہے' وہ ان کی ہم نوا ہے اور جو اس قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا محترم عالی جی بھی اس سے کوئی ناتا نہیں رکھتے۔ پاکستان سے محبت و الفت ان کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے' پاکستانیت اور جمیل الدین عالی گویا لازم و ملزوم ہیں۔

انجمن ترقی اردو کے لئے ان کی خدمات لائقِ تحسین ہیں' علمی اور تحقیقی میدان میں ان کا مقام بھی محتاجِ بیان نہیں۔ انہوں نے اس قدر کتابوں کے مقدمات و پیش لفظ لکھے ہیں کہ آج کل پڑھے لکھے لوگ اتنی کتابیں بھی نہیں پڑھتے۔

مقام مسرت ہے کہ روزنامہ "جنگ" کراچی ان کی طویل اور مستقل رفاقت اور علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کر رہا ہے۔

میں اپنی مصروفیات کے پیش نظر اس باوقار اور عالیشان تقریب میں شریک نہ ہونے پر افسوس کرتے ہوئے ادارۂ "جنگ" کو ایسی مثالی تقریب منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں کہ ہم تو محض بالا بلند لوگوں کے انتقال پر ہی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں لیکن میر شکیل الرحمان نے ادارۂ "جنگ" کے ذریعے اس روایت شکن تقریب سے قوم کو نئی جہت اور نیا رخ دیا ہے۔

جناب جمیل الدین عالی صاحب بھی قابل صد تبریک ہیں کہ انہیں بھی اس مردم بیزار اور علم گریز معاشرہ میں جناب

محمود شام اور میر برادران ایسے مردم شناس اور علم دوست افراد اور ادارہ میسر آیا کہ وہ ان کی خدمات کا اعتراف ہماری روایات کے علی الرغم ان کی زندگی ہی میں کر رہا ہے۔میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں ان کی شخصیت اور علمی' ادبی اور تحقیقی نگارشات سے استفادہ کی توفیق ارزانی نصیب فرمائے۔ (آمین)

عمران خان

میری دلی خواہش تھی کہ میں جناب جمیل الدین عالی کی تقریبِ سپاس میں شرکت کرتا کیونکہ میں ان کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کا دلدادہ ہوں۔لیکن میری بدقسمتی یا تقریب کے منتظمین کی کوتاہی کہ انہوں نے مجھ سے صرف ایک روز پہلے رابطہ کیا۔مجھے انتہائی افسوس ہوا کہ میں پہلے سے اپنے پروگرام طے کر چکا تھا' ورنہ میں خود حاضر ہوتا۔

جناب جمیل الدین عالی کے کالم میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ انکی تحریروں میں پاکستان کے لئے جو گہرا درد پایا جاتا ہے' کاش دوسرے کالم نویسوں کے ہاں بھی ایسا درد ہوتا۔میں پاکستان میں رہوں یا باہر رہوں' میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ عالی صاحب کی تحریر میں تازہ ترین حالات کا تجزیہ پڑھ سکوں۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جناب عالی کو عمر دراز عطا کرے' وہ اسی طرح پاکستان کے لئے لکھتے رہیں۔

میں اس وقت خواندگی کے فروغ کے مشن میں مصروف ہوں۔ جناب جمیل الدین عالی خواندگی کے موضوع پر بہت دردمندی سے لکھتے رہے ہیں۔میری ان سے گزارش ہے کہ وہ خواندگی کے حوالے سے اور زیادہ لکھیں' پاکستان کے حالات میں حقیقی تبدیلی اسی وقت آئے گی جب ہمارے ہاں خواندگی کی شرح میں معقول اضافہ ہوگا۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) راجہ سروپ خان
(گورنر پنجاب)

جناب جمیل الدین عالی پاکستان کے قابلِ فخر صاحبان علم و ادب میں شمار ہوتے ہیں۔سالہا سال پر محیط دشتِ ادب و صحافت کی کامیاب سیاحی نے ان کے نام کو یہ اعتبار اور وقار بخشا ہے کہ آج جہاں جہاں پاکستان اور اردو کا نام لیا جاتا ہے' وہاں عالی صاحب بھی نہایت عزت و احترام سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔

جمیل الدین عالی صاحب کی عالی شان پذیرائی کے موقع پر میری طرف سے ان کی صحت و سلامتی کی پُرخلوص دعائیں۔ خدا کرے ان کا قلم سدا یوں ہی وطن کی محبت کے پھول کھلاتا رہے اور پیار کے نغمے بکھیرتا رہے۔

کمال الدین اظفر

(گورنر سندھ)

میرے لئے یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ روزنامہ "جنگ" اردو کے ممتاز شاعر، کالم نویس، دانشور، سفرنامہ نویس اور ایک ذہین جینکار جمیل الدین عالی کی شاندار خدمات کے اعتراف میں تقریب منعقد کر رہا ہے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ "جنگ" نے ایک اہم قومی شخصیت کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کرکے ایک نئی روایت ڈالی ہے زندہ قوموں کا یہی وطیرہ ہے

جمیل الدین عالی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ عالی صاحب نے زندگی بھر جو لکھا جو بیان کیا اور جن اداروں کے قیام میں حصہ لیا ان کی اساس صرف اور صرف پاکستان کی محبت پر قائم ہے۔ بلاشبہ یہ ان کا حق ہے کہ روزنامہ "جنگ" ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک خصوصی تقریب منعقد کرے، کیونکہ عالی صاحب نے گزشتہ ۳۲ سال کے دوران میں اپنے خیالات و افکار کے اظہار کے لئے رزنامہ "جنگ" کو ہی وسیلہ بنایا ہے۔

جمیل امدین عالی کی غزلیں، دوہے، گیت، مضامین اور ان کے قومی نغمات ہمارے ادب کا روشن باب ہی نہیں بلکہ ہماری قومی میراث ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ جمیل الدین عالی اسی طرح لکھتے رہیں اور اپنے خیالات و افکار سے نئی نسل کی بہتر تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہیں

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

خورشید علی خان

گورنر صوبہ سرحد

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی ہے کہ روزنامہ "جنگ" کراچی، اردو کے نغمہ نگار اور دانشور جمیل الدین عالی کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کر رہا ہے۔

جمیل الدین عالی کی شخصیت ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ انہوں نے ادب کے ہر شعبے میں قابلِ قدر اور قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں، جنہیں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ معاشرے کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے ان کی تحریریں اردو ادب کا اہم اور گرانقدر حصہ ہیں اور لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ جمیل الدین عالی آئندہ بھی زور قلم دکھاتے رہیں گے۔ میں عالی صاحب کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں اور روزنامہ "جنگ" کی انتظامیہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے ایک عظیم ادیب کی خدمات کے اعتراف میں اس تقریب کا اہتمام کیا۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) عمران اللہ خان
(گورنر بلوچستان)

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ ادارہ "جنگ" نے ملک کے ممتاز دانشور جناب جمیل الدین عالی کی ادارے کے ساتھ ۳۲ سالہ رفاقت کے اعتراف کے لئے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے۔

جمیل الدین عالی بلاشبہ ہمارے ملک کے ایک معروف شاعر' قومی نغمہ نگار' دانشور اور کالم نویس ہیں جنہوں نے اپنی زندگی شعروادب کی ترویج اور صحت مند صحافت کے فروغ کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ ان شعبوں میں ان کی قابلِ قدر خدمات کا اعتراف ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے کیا ہے۔ روزنامہ "جنگ" میں مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے ان کے کالم نہایت ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت عمدہ روایت ہے کہ "ادارۂ جنگ" ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں ایک شایان شان تقریب منعقد کر رہا ہے۔ میں روزنامہ "جنگ" کو اس تقریب کا اہتمام کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ملک و قوم ایک طویل عرصے تک جناب جمیل الدین عالی کی خدمات سے مستفید ہوتی رہے۔ (آمین)

سردار محمد عارف نکئی
(وزیر اعلیٰ پنجاب)

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ ادارۂ "جنگ" نے معروف دانشور' ادیب اور بینکار جناب جمیل ادین عالی کی ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا ہے۔

تمام تر لسانی و علاقائی تعصبات سے بالا تر ہو کر وطن عزیز میں پاکستانیت کے جذبوں کو فروغ دینے کے لئے جمیل الدین عالی جیسی محب وطن اور سرگرم شخصیات کی قدر افزائی ہمارا قومی فریضہ ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو نہ صرف قیام پاکستان کے بنیادی مقاصد سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے اکابرین اور اسکالرز کے کارناموں سے بھی روشناس کرایا جائے۔ موجودہ دور میڈیا کا دور ہے۔ ملک و قوم کی سالمیت اور جمہوری اقدار کی سربلندی کے لئے رائے عامہ کے مثبت خطوط پر تربیت کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں جمیل ادین عالی جیسے راست فکر صحافیوں کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ میں "ادارۂ جنگ" کے کارکنوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک دیرینہ ساتھی کی خدمات کا اعتراف کر کے شعور و آگہی کا ثبوت دیا ہے۔

سید عبداللہ شاہ

(وزیر اعلیٰ سندھ)

جمیل الدین عالی نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ سے نہ صرف ادب کے طالب علم بلکہ محض تفریحاً کتابیں اور اخبارات پڑھنے والے لوگ بھی ان کے شہ پاروں سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔ عالی جی جس محفل میں بھی آبیٹھتے ہیں وہ خود بخود ادبی اجتماع میں تبدیلی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پردے میں سے فرمائشوں کے سو سو پرچے بھی آتے ہیں۔

ادب سے قطع نظر معیشت پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔ قومی اور بین الاقوامی معیشت کے پس منظر میں ان کے تحریر کردہ کالم اکنامکس کے طالب علموں کے لئے مشعلِ راہ کے مانند ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم مردہ پرستی کی جانب زیادہ مائل ہیں اور کسی فنکار یا صاحب علم شخصیت کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا اعتراف اس کی زندگی میں بہت ہی کم کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ امر باعث مسرت ہے کہ دور جدید میں حقائق کو تسلیم کرنے کی روایت زور پکڑتی جارہی ہے اور عالی جی بھی ان قابلِ قدر ہستیوں بلکہ میں تو کہوں گا کہ خوش نصیب شخصیتوں میں شامل ہیں جن کے علم کو زندگی میں سراہا جارہا ہے۔

علم و ادب کی اشاعت اور ممتاز اور قابلِ قدر شخصیات کی حوصلہ افزائی میں روزنامہ "جنگ" کا ہمیشہ نمایاں کردار رہا ہے۔ عالی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں خصوصی اشاعت پر موقر روزنامہ کو مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ عالی صاحب کو خراج تحسین کے ہمراہ مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں۔ اللہ دونوں کو کامیاب و کامران کرے (آمین)

نواب ذوالفقار علی مگسی

(وزیر اعلیٰ بلوچستان)

یہ امر خوش آئند ہے کہ ادارۂ "جنگ" کی جانب سے جمیل الدین عالی کی "جنگ" سے ۳۲ سالہ وابستگی کے اعتراف کے لئے کراچی میں ایک شایان شان تقریب کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ جمیل الدین عالی جیسے بلند پایہ شاعر، دانشور اور کالم نویس کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ادارۂ "جنگ" کی کوششیں یقیناً لائق صد تحسین ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ادیب اور شاعر اپنے معاشرے کے بہترین عکاس ہوتے ہیں، وہ اپنے قلم اور اپنی تحریروں سے نہ صرف معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ اپنے عصر کے مسائل کا ادراک رکھنے کے ساتھ ساتھ ان مسائل کا حل بھی تجویز کرتے ہیں۔

جمیل الدین عالی نے جس طرح روزنامہ "جنگ" میں اپنے کالموں کے ذریعہ ملکی سیاست میں نشیب و فراز پر اظہار خیال کیا ہے، وہ ہماری ملکی سیاست اور معاشرتی اقدار میں شکست و ریخت کا بہترین آئینہ ہیں۔

میں روزنامہ "جنگ" کو جمیل الدین عالی کی خدمات کا اعتراف کرنے اور اس سلسلے میں شاندار تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ "جنگ" کا ادارہ اپنے پرانے رفقائے کار کی خدمات کے اعتراف کے لئے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔

ڈاکٹر شیخ عرض محمد

(صدر سندھ' بلوچستان فیڈریشن' امارات متحدہ' ابو ظبی)

متحدہ عرب امارات میں مقیم ستر ہزار بلوچوں پر مشتمل ہماری تنظیم جناب جمیل الدین عالی کو صوبۂ بلوچستان کے لئے ان کی بے لوث خدمات پر خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

بلوچ برادری گزشتہ ایک عشرے سے بلوچستان کو دنیا سے بذریعہ فضائی رستہ ملانے کے لئے اپنی کوششیں بروئے کار لا رہی تھی۔ جناب جمیل الدین عالی کی روزنامہ "جنگ" میں شائع ہونے والی تحریروں نے اس ضمن میں عمل انگیز کردار ادا کیا اور بالآخر متحدہ عرب امارات سے پسنی کے لئے پرواز شروع کئے جانے کا حتمی فیصلہ عمل میں آیا جس کے نتیجے میں متحدہ عرب امارات' خلیج اور دنیا بھر میں رہنے والے بلوچ اس پرواز سے استفادہ کر سکیں گے۔ بلاشبہ جناب جمیل الدین عالی کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جو وقت کی ضرورت سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ صوبائی اور رنگ و نسل کے تعصبات سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت اور تعمیری سرگرمیوں کے عوض بہترین اجر عطا فرمائے۔

خطبات

ایس ایم ظفر

جمیل الدین عالی اور مجھ میں زبردست موافقت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں مقابلے کا امتحان پاس کیا اور میں نے بھی۔ پھر عملی زندگی میں بھی ہماری بہت سی باتیں مشترک رہیں۔ وہ فیوچرسٹ ہیں اور میں بھی مستقبل پر ماضی کے اثر کی وجہ سے پیدا ہونے والے جمود کا مخالف ہوں۔ ان سے پہلی ملاقات میری وزارت کے دور میں ہوئی۔ یہ ملاقات کبھی اسلام آباد میں ہوتی تھی اور کبھی ڈھاکا میں۔ جب ڈھاکا میں مغربی پاکستان کے عالی جی کا نغمہ "جیوے جیوے پاکستان" مشرقی پاکستان کی گلوکارہ شہناز بیگم گاتی تھیں تو احساس ہوتا تھا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کبھی الگ نہیں ہوں گے۔

مستقبلیات کا شعبہ ایسا ہے جو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ جہد مسلسل کا تقاضا کرتا ہے۔ آج کی تقریب اس بات کا ثبوت ہے کہ مستقبل کے حوالے سے تبدیلیاں آرہی ہیں۔ قوم مردہ پرست نہیں رہی' اب زندوں کو تلاش کررہی ہے اور زندوں کو بھی چاہئے کہ وہ خود باہر نکل آئیں۔ نیوورلڈ آرڈر کسی ملک کو اپنی بیساکھیوں پر کھڑا ہونے نہیں دیتا لیکن پاکستان میں اٹھ کر کھڑے ہونے اور ترقی یافتہ ملکوں کی دوڑ میں شامل ہونے کی صلاحیت موجود ہے' تاہم اس کے لئے پہلے ہمیں اپنے گھر کو درست کرنا ہوگا۔ جمیل الدین عالی اس درستگی کے بڑے پیشرو ثابت ہونگے۔ اب کہ ایک سب سے بنیادی اور بڑا مسئلہ کرپشن کا ہے۔ اگر اس کے خلاف بھرپور جہاد کریں تو میرے اور ان کے خواب پورے ہوسکتے ہیں"

مخدوم امین فہیم

"میری یہ خوش قسمتی ہے کہ پاکستان کے عظیم شاعر دانشور اور ادیب جناب جمیل الدین عالی کے اعزاز میں منعقدہ اس تقریب میں مجھے یاد کیا گیا اور اس سلسلے میں کچھ کہنے کا موقع ملا۔ عالی صاحب نے اپنی شاعری' تحریروں اور پاکستان میں اپنی موجودگی سے اس ملک کی جتنی خدمت کی ہے اس پر جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ عالی صاحب جہاں بھی گئے' پاکستان ان کے ساتھ گیا۔ میں یہ بات بھی بلا جھجک کہوں گا کہ عالی صاحب نے ہمیشہ پاکستانیت کی بات کی ہے اور ہمیں چاہئے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں کیوں کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں پاکستان کی وجہ سے ہیں۔ ہم سب کی پہچان پاکستان سے ہے' ہم سب پہلے پاکستانی ہیں اس کے بعد سندھی' بلوچ' پٹھان یا کوئی اور ذات رکھنے والے ہیں۔ میں عالی صاحب کا سب سے بڑا معترف اس لئے بھی ہوں کہ انہوں نے شعرو ادب کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے اور خود شعرو ادب میں سما گئے ہیں۔ شاعری کی بنیاد ہی محبت ہے۔ آج ہم جس مقام پر ہیں' ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرنے اور ایک دوسرے کی عزت کرنے کی بات کریں اور نفرتوں کو محبت کی طاقت سے ختم کردیں۔"

پروفیسر غفور احمد

"قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً نصف صدی جمیل الدین عالی نے اپنی زندگی پاکستان اور پاکستانیت کی خدمت میں گزار دی ہے۔ یہ تقریب ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے کہ جو کچھ جمیل الدین عالی کہتے ہیں کیا ہم نے کبھی اس پر عمل کیا؟ عالی کے ہوتے ہوئے ہم پستی میں مسلسل کیوں گرتے جا رہے ہیں؟ پاکستان بننے سے دس سال پہلے ہم جس انتشار کا شکار تھے' آج کا انتشار اس سے زیادہ گمبھیر ہے۔ ہم آج ہر شعبۂ زندگی میں تنزل کا شکار ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان گرم و سرد جنگ جاری ہے۔ وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو نے یہ بیان دیا ہے کہ فوج کے جو لوگ زیرِ حراست ہیں' وہ ان کے بچوں کو مارنے کا پروگرام رکھتے تھے۔ اس بیان سے بیرونِ ملک پاکستان کا کیا امیج قائم ہوگا؟ عالی تو اس وقت خوش ہوں گے جب پاکستان علامہ اقبال اور قائدِ اعظمؒ کے تصورات کے مطابق بن جائے گا۔ پاکستان حقیقی فلاحی مملکت ہو' یہاں امن اور انصاف ہو اور کسی پر ظلم نہ ہو۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں وہ پاکستان بن کر رہے گا جس کا خواب ہم سب نے دیکھا تھا۔"

ڈاکٹر عبدالوہاب

"کسی بھی معاشرے میں دو قسم کے افراد پائے جاتے ہیں: ایک وہ جو تحریر اور تقریر کے ذریعہ اعلیٰ اقدار کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان کی عملی زندگی ان کی تحریروں اور تقریروں کی تردید کرتی ہے۔ جمیل الدین عالی صاحب اس طبقے سے متعلق نظر آتے ہیں' جن کی تحریر اور عمل میں تضاد نظر نہیں آتا' اگر آپ ان کی سوانح حیات کو دیکھیں تو اس میں ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے' جمیل الدین عالی کا تعلق ایک ریاست کے حکمراں خاندان سے تھا لیکن والیٔ لوہارو کا فرزند جب تمام آسائشوں کو چھوڑ کر پاکستان آتا ہے اور اسے اپنا وطن منتخب کرتا ہے' جہاں ویسی آسائشوں کے حصول کا دور دور امکان نہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آسائشوں سے زیادہ اس ملک اور نظریے سے محبت کرتا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ حکمراں خاندان کا فرد کسی اعلیٰ منصب پر فائز نہیں ہوتا بلکہ ایک انتہائی معمولی عہدے "اسسٹنٹ" قبول کرتا ہے' پھر تین سال بعد انتہائی محنت اور تیاری کے بعد مقابلے کا امتحان پاس کرتا ہے۔ یہ شخص کسی سفارش پر یقین نہیں رکھتا بلکہ صرف محنت اور قابلیت کے ذریعے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ انکم ٹیکس جیسے محکمے کو چھوڑنا معمولی بات نہیں ہے' یہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے تنخواہ سے زیادہ اور کچھ مطلوب نہ ہو۔"

سینیٹر حسین شاہ راشدی

(سندھ)

جس شخص سے آپ محبت کرتے ہوں' جو شخص آپ کے دل میں بسیرا کرتا ہو' اس سے اپنی محبت اور عقیدت کو

آپ تحریر میں نہیں سمیٹ سکتے۔ایسے شخص کی مداح سرائی اور اس سے محبت کا اظہار بیشہ فی البدیہ اور موقع کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ جمیل الدین عالی کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔وہ اس دور کی علامت ہیں جب کراچی امن' علم اور دانش کا گہوارہ تھا' جب ملک کی بڑی بڑی شخصیات آپس میں مل بیٹھتی تھیں' جب کوئی نفرت اور منافقت کی بات نہیں کرتا تھا بلکہ ہر شخص علم اور محبت کی بات کرتا تھا۔ عالی جی اس دور کی تنہا علامت ہیں' اللہ ان کو سلامت رکھے۔ میرے محترم چچا پیر حسام الدین راشدی سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی' جب یہ دونوں شخصیات بیٹھ کر گفتگو کرتی تھیں تو علم و دانش کے دریا بہتے تھے۔میں نہ صرف بچپن سے عالی جی کو دیکھتا آرہا ہوں بلکہ انہیں پڑھا بھی ہے' میری ان سے جذباتی وابستگی ہے۔

عالی صاحب کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے سائے میں مختلف سیاسی رہنماؤں کو یہ موقع بھی ملا ہے کہ وہ اپنی اپنی پارٹی کا سیاسی موقف بیان کریں۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

(ممتاز سائنس داں...... جامعہ کراچی' ادیب اور شاعر' نمائندہ اساتذہ جامعہ)

"من حیث القوم ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں' ان کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم اجتماعی خود کشی کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ قوم کی حیثیت سے ہمارا دم گھٹ رہا ہے ہم نے شاید ماضی کو اس قدر یاد کیا کہ مستقبل نے ہمیں بھلا دیا اور حال ہمارا بے حال ہے۔اس حالت میں زندگی کی کوئی رمق یا زندگی کا کوئی احساس یا آرزو کا کوئی گلاب کھلا ہے تو وہ دراصل ہمارے ایسے اہل دانش ہیں جن میں سرفہرست جناب جمیل الدین عالی کا نام ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور کاموں کے ذریئے قوم میں زندہ رہنے کا جذبہ بیدار رکھا کہ ہم حالات کا جرأت مندی سے مقابلہ کریں اور معاملات کو ان کی درست پس منظر میں جانچیں۔ عالی صاحب پوری اردو دنیا کی محترم شخصیت ہیں۔ان کے سفرنامے بہت اہم ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا کا سفر کیا' ترقی یافتہ ملکوں کی صورتحال کا بغور جائزہ لیا اور مستقبلیات کے موضوع سے اپنے مشاہدات لوگوں تک پہنچائے۔ انہوں نے اپنی جملہ تحریروں میں جس بات پر زیادہ زور دیا وہ عالی صاحب کے یہ احساسات ہیں کہ اگر کوئی قوم عزت اور وقار سے زندہ رہنا چاہتی ہے اور اپنے باسیوں کا پیٹ بھرنا چاہتی ہے تو اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے۔عالی صاحب ایک دانشور ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ آنے والی صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے' اس سلسلے میں تحریک پیدا کرنے کے لئے عالی صاحب نے اپنے کالموں میں بہت کام کیا ہے۔"

اجمل دہلوی

"آج ہم سب ایک بڑے آدمی جناب جمیل الدین عالی کے ساتھ تقریبِ سپاس میں شریک ہیں وہ اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے بھی بڑے آدمی ہیں' غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بھی بڑے آدمی ہیں اور اپنی علمیت کی وجہ سے بھی

بڑے آدمی ہیں۔ وہ ادیب بھی ہیں' شاعر بھی ہیں' گلوکار بھی ہیں' مفکر بھی ہیں' ماہر مالیات بھی ہیں اور ان کے آشنا جانتے ہیں کہ وہ موسیقار بھی ہیں۔ ایسا آدمی ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے' ایک دوست بھی ہوتا ہے اور اس کا دل محبتوں سے سرشار ہوتا ہے' جس کے دل میں جتنی محبت ہوتی ہے اس کے دل میں اتنی ہی نفرت کم ہوتی ہے جبکہ تمام جھگڑے فساد صرف نفرت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔"

"محترم جمیل الدین عالی کے لئے "ادارہ جنگ" نے آج تقریب سپاس کا اہتمام کیا اور اس تقریب کے لئے کراچی شہر کا انتخاب کیا شاید اس انتخاب کا سبب یہ ہو کہ عالی صاحب کراچی میں رہتے ہیں اور یہ شہر تین' ساڑھے تین سال سے لاقانونیت کا مرکز بھی کہا جاتا ہے۔ آج ہم سب محترم جمیل الدین عالی کو ان کی قومی خدمات پر جو انھوں نے علم اور قلم کے ذریعہ انجام دیں' خراج تحسین پیش کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں حاضرین کی بڑی بھاری اکثریت کا تعلق کراچی سے ہی ہے اور آپ سب خود یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ۱۹ر جون ۹۲ء کو آپریشن کلین اپ شروع ہونے کے وقت کراچی کے حالات زیادہ خراب تھے یا آج حالات زیادہ خراب ہیں۔"

"وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کے بہت سے رفقا نے بار بار کہا ہے کہ حکومت کو کراچی میں چھوٹی بغاوت کا سامنا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپریشن سے پہلے بھی ایسی ہی صورتحال تھی' اگر اس وقت کسی بغاوت کا سامنا نہیں تھا تو کیا آپریشن اس وجہ سے کیا گیا کہ یہاں بغاوت ہو؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے کہ آپریشن نے باغیوں کو محب وطن بنایا ہے یا پاکستان بنانے والوں اور ان کی اولاد کو باغی بننے پر مجبور کیا ہے؟"

"محترم جمیل الدین عالی کے کلام میں اسلام سے محبت چھپی ہوئی نہیں' وطن سے محبت بھی پوشیدہ نہیں اور وہ جمہوریت کے پرستار بھی ہیں۔ آج انہیں ان کی نگارشات کی بنیاد پر اور ان کے کالم کی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے۔ علم کے بغیر قلم کس کام کا اور جس طرح علم اللہ کی طرف سے ملتا ہے' اسی طرح قلم بھی اللہ کی امانت ہے' نہ تو علم کو بے آبرو کرنے کی اجازت ہے نہ ہی قلم کی آبرو کو نیلام کرنا چاہئے۔ عالی نے اعلیٰ لکھا اسی وجہ سے خراج تحسین کے مستحق ٹھہرے۔ سچ کو چھپانا نہیں چاہئے' سچ کو چھاپنا چاہئے اور پھیلانا چاہئے۔ سچائی کے بغیر فن میں نکھار نہیں آسکتا' اس لئے سچا فنکار وہی ہے جو سچائی کا نقیب ہو۔ بہت سے فنکاروں نے سچ لکھا ہے' معتوب بھی ہوئے' لیکن حق و صداقت کی راہ نہیں چھوڑی۔ کراچی کی آگ اور دھوئیں کا تذکرہ تمام دنیا میں ہورہا ہے' امریکہ' برطانیہ' جرمنی' سعودی عرب' ایران' بھارت اور دوسرے بہت سے ممالک کے ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات میں کراچی کا چرچا ہے' مگر ہمارے ہاں جن شخصیتوں کے پاس اختیار اور اقتدار ہے وہ خواب غفلت سے جاگنے کو تیار نہیں' چنانچہ میں آج کی عظیم تقریب سے فائدہ اٹھا کر محترم جمیل الدین عالی سے اور میزبانوں کے ساتھ ساتھ تمام مہمانوں سے بھی پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ حکمرانوں کو جگانے کے لئے اپنا اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں تاکہ مظلوم مہاجروں کے ساتھ انصاف ہوسکے' اگر آگ بجھانے میں بہت زیادہ دیر لگادی گئی تو وہ وقت آسکتا ہے جب آگ پر قابو پانا اور اس کو بجھانا ممکن نہ رہے' مجھے بھی اپنا فرض ادا کرنا ہے اور اس ارض پاک کو جنت نشاں بنانے کے لئے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو استعمال کریں۔"

ماجد سلطان خواجہ

"سب سے پہلے میں ادارہ "جنگ" کو اس تقریب پذیرائی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ابھی ہم زندہ قوموں میں شمار کئے جاسکتے ہیں کیونکہ جو قومیں اپنے مشاہیر کی پذیرائی کرتی ہیں، تاریخ انہیں یاد رکھتی ہے۔ شعر و ادب اور صحافت کے حوالے سے عالی صاحب کی خدماتِ عالیہ نصف صدی پر محیط ہیں۔ عالی صاحب کے بختِ عالی کا کرشمہ ہے کہ ہر محبِ وطن پاکستانی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، ان کے نام اور کام سے نہ صرف واقف ہے بلکہ پوری قوم ان زندہ لفظوں اور دعاؤں کے حصار میں ہے جو عالی صاحب کے دل سے نکلی ہیں۔ "ادارۂ جنگ" مبارکباد کا مستحق ہے جس نے ایسی تقریبات کا آغاز کیا ہے اور کراچی کے اس ماحول میں جبکہ لوگ یہاں سے جانے کی سوچ رہے ہیں، قلم کی طاقت کا احساس دلایا ہے۔ آج ایک اہلِ قلم کے لئے دور دراز سے لوگ محبتوں کے گلدستے لے کر آئے ہیں، یہ جذبہ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ ہم پاکستان سے محبت کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔"

غلام ربانی آگرو

"اپنے مشاہیر کی ان کی زندگی میں قدر و توقیر کرنا زندہ لوگوں کا شیوہ ہے۔ عالی جی ہمیشہ پاکستانی قوم اور سرزمین کے گیت گاتے رہے ہیں۔ ان کے ہر گیت خصوصاً "جیوے جیوے پاکستان" کی سرگم فضاؤں میں خوشبو کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ ایوب خان کے زمانے میں شہاب صاحب کے مشورے سے رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی۔ ملک میں پہلی بار عام ادیب کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔"

"عالی جی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس ملک کی تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ معاشرے کا حساس ترین طبقہ، اہلِ علم اور اہلِ دانش پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی لوگ رائے عامہ ہموار کرتے ہیں۔ پس جو معاشرہ قوم اور جدت رائے عامہ کا احترام نہیں کرتی وہ اپنا ہی مستقبل تاریک کرتی ہے۔ وہ لوگ بدنصیب ہیں جو عالی جی کی جہاں دیدہ آنکھوں سے اس ملک کے مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے۔"

جناب عطا شاد

"یہ اس زمانے کی بات ہے جب لاہور کا موجودہ سائنس بورڈ اردو بورڈ ہوا کرتا تھا۔ بورڈ نے مجھے لکھا کہ اسے اردو لغت کے لئے ایسے الفاظ کی ضرورت ہے جو بلوچستان کے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کو ظاہر کرسکیں۔ میں نے جب اس پر کام شروع کیا تو محسوس ہوا کہ اس حوالے سے ایک کتاب ہونی چاہئے، چنانچہ بڑی محنت سے میں نے ایک کتاب مرتب کرکے اردو بورڈ کو روانہ کردی۔ بورڈ کی طرف سے کتاب کے دیباچے کے ایک پیراگراف پر اعتراض کیا گیا تھا اور مجھے خط کے ذریعہ یہ کہا گیا کہ اگر یہ پیراگراف نکال دو تو کتاب شائع ہوگی ورنہ نہیں ..... خط بورڈ کے سربراہ جناب حنیف رامے کی طرف سے تھا۔ اس پیراگراف کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر اردو ہماری قومی زبان ہے تو اسے یہاں کی مقامی

زبانوں کے وہ تمام الفاظ اپنا لینے چاہئیں 'جن کے مترادفات موجود نہیں ہیں۔ میں نے بورڈ کو جواب لکھا کہ میں یہ پیرا گراف نہیں نکالوں گا۔ بورڈ میں ہمارے کچھ دوستوں کی وجہ سے وہ پیرا گراف رہنے دیا گیا اور کتاب شائع ہو گئی۔ اس میں عالی صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ عالی جی کی شاعری' ان کی شخصیت' ان کے رعب و دبدبہ کے بارے میں ہم پہلے بھی جانتے تھے لیکن میری خواہش تھی کہ ان سے ہماری ملاقات ہو۔ اتفاق سے اردو بورڈ کے دفتر میں ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے پہلا جملہ یہ بولا کہ عطا تمہاری کتاب میرے سرہانے رہتی ہے۔ میرے لئے اس سے بڑی تحسین کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ عالی صاحب کے بارے میں میں جو کچھ سوچتا تھا انہیں ویسے ہی پایا۔"

عابد شاہ عابد

"ایک ہی حرف محبت لکھوں
اپنی مٹی سے عقیدت لکھوں

ان دو مصرعوں میں ہمارے محترم بزرگ اور استاد جناب جمیل الدین عالی کی زندگی سموئی ہوئی ہے۔ مٹی سے محبت' حوالہ ہے وطن سے محبت کا'جس سے ہمارا خمیر اٹھا' جہاں واپس اس میں مل جانا ہے۔اگر ہم اپنی اس مٹی پر نفرت و عداوت اور خود غرضی کی دیواریں اونچی کریں گے تو پھر یہ وطن نہیں رہے گا' ہم خانوں میں بٹ جائیں گے اور ہمارا دم گھٹ جائے گا' ہمیں شعر سے لگاؤ ہے' اس کی شعوری کیفیت کو بھی جانچنا ہو گا۔ "جیوے جیوے پاکستان" کسی اعزاز یا منصب کے لیے نہیں لکھا گیا۔ یہ ان نازک احساسات اور معتبر رشتوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے' جنہیں پاکستان سے محبت اور پاکستانی قومیت سے عقیدت کے اظہار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ اعزاز نصیب ہوا کہ جیوے جیوے پاکستان کا پشتو میں ترجمہ سب سے پہلے میں نے کیا۔ میں نہیں جانتا کہ سیاست کے بھاؤ اور داؤ کیا ہیں.....؟ میں نہیں جانتا کہ امارت کے لئے کیا بیچنا پڑتا ہے' میں نہیں جانتا کہ منصب حاصل کرنے کے لئے کتنا نیچے گرنا پڑتا ہے مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ قومی احساس رکھنے والے ادیب اور شعراء معاشرے میں موجود ہوں تو سیاست بھی پاکیزہ ہے' وطن سے عقیدت بھی پائندہ ہے اور یہی عالی صاحب کا پیغام ہے۔ خدا کرے ہم اس پیغام پر عمل کریں۔"

جمیل الدین عالی

(اختتامی 'زبانی 'خطبے سے)

”یہ موقع خیالات کے اظہار کا نہیں ہے۔ مختصر الفاظ میں چند ناگزیر باتیں دہرانا چاہوں گا۔ میرے خاندان کی نوابی کا بہت ذکر ہوا۔ پانچ پشتوں تک انہوں نے نوابی کی' مجھے کیا ملا؟ نوابی کا نام میں نے کراچی میں بھی ترک کر رکھا تھا کہ میرے بزرگوں کی اپنی اقدار روایات آبرو تو خراب نہ ہو' یہاں کی کلرکی ' اسسٹنٹی اور قرض کی روٹی کھانے میں ' جمال پانی پتی' راغب مراد آبادی' حبیب جالب کے ساتھ جب ہم جیکب لائن کے ریستورانوں میں قرض کھاتے تھے' اگر میں کہتا کہ میں نواب زادہ جمیل الدین عالی ہوں تو کہتے ' بھائی ' اچھا ' جیسے کانپور' لکھنؤ کے اور نواب دیکھے ہیں ' ایسے ہی تم بھی ہو گے اس حادثہ پیدائش میں کوئی نہ فخر کی بات ہے نہ شرم کی بات ہے۔ میں یہاں ہوں۔ میرا نام ہے' جمیل الدین عالی۔ بس میں نے آپ کے سامنے ان گلیوں میں ایک بہت ہی چھوٹے آدمی کی حیثیت سے اسٹارٹ کیا اور اب بھی اس شہر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن میں' میں خود شامل ہوں کہ وہ مجھے چھوٹا سمجھتے ہیں اور حقیقت میں' میں چھوٹا ہوں۔ دراصل بڑے لوگ تو وہ ہیں جن کو ہم جانتے نہیں۔ بڑے لوگ تو متقی رہے ہیں' جن کی دعاؤں سے ہم آپ قائم ہیں۔ بڑے لوگ وہ ہیں جو اپنے گھروں میں بیٹھے دعائیں کر رہے ہیں اور ایمانداری سے ایک وقت کی سوکھی روٹی کھا رہے ہیں۔ ہم تو بڑے دنیا دار لوگ ہیں۔ تعریف پر میں خوش تو ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی شرمندہ بھی ہو رہا تھا۔ اس میں آدھی تعریف کے میں قابل نہیں تھا اور جو تعریف ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی' جو ہو رہی تھی میں اس کے قابل نہیں تھا۔“

— — — — — —

”ادب کی اتنی تعریف ہوئی۔ شاعر اور نقاد برادری تو کہتی ہے کہ میں اب شاعر نہیں رہا۔ نثر نے مجھے شاعر نہیں رہنے دیا۔“اے مرے دشت سخن“ نہ آئی ہوتی تو میں سابق شاعر ہو کر مر چکا ہوتا۔ ”مرے دشت سخن“ آنے کے بعد کچھ گفتگو ہو رہی ہے مگر شاعر نثر نگار کو کہاں مانتا ہے۔ پروین شاکر مرحومہ (اللہ بخشے) نے ایک انٹرویو میں مجھ سے پوچھا کہ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے ادب سے زیادہ ادیبوں کا کام کیا۔ میں نے کہا کہ بیٹا آپ کی پسند کی سو غزلیں ایک طرف رکھی جائیں' چاہے وہ دنیا کے کسی بھی بڑے شاعر کی ہوں اور دوسرے پلڑے میں ایک غریب کی بیوہ کے لئے کے ماہانہ ڈیڑھ سو روپے رکھے جائیں جو عزت سے میں اسے دلا سکوں تو میں غالب کی سو غزلیں نہیں بلکہ وہی ڈیڑھ سو کا وظیفہ چنوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ فلاکت کیا ہوتی ہے؟ میں نواب کا بیٹا ضرور ہوں لیکن والد کے انتقال کے بعد ایک مدت یتیم کی حیثیت سے میں نے کچھ عزیزوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں' وہ میرے دل پر نقش ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ جو مجھ پر گزری ہے' وہ کسی اور پر گزرے۔“

— — — — — —

”میں شعر و شاعری کا آدمی ہوں۔ مجھے کالم تحریر کی جانب ”جنگ“ گروپ آف نیوز پیپر کے بانی میر خلیل الرحمن کھینچ کر لائے۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کو میرے بعد مرنا چاہئے تھا۔ تین آدمی میرے ساتھ بے وفائی کر کے اس جہانِ فانی سے چلے گئے۔ ابن انشاء' سلیم احمد اور میر خلیل الرحمن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سفرنامہ لکھوں' اس کی

کامیابی میں اگر سو نمبر دیئے جائیں تو ان میں سے اکیاون نمبر میر خلیل الرحمن کو جائیں گے' ۴۰ نمبر شفیع عقیل کو' کیونکہ وہ تصویروں سے اس کی خوبصورت تزئین کرتے تھے۔ میرے لکھنے کے صرف ۹ نمبر ہیں۔ سفرنامے کے بعد پھر لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے لئے کچھ علم تھا اور کچھ حاصل کرنا پڑا۔ پھر علم حاصل کرنے کا کمپلیکس پیدا ہوگیا کہ کوئی بات کچھ نہ کچھ جانے بغیر نہیں کرنی چاہئے' پھر جاننا شروع کیا۔ جب آپ جاننا شروع کرتے ہیں تو آپ جانتے رہتے ہیں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ وہی کیفیت آج تک ہے۔"

"اس تقریب کے اہتمام پر ادارہ "جنگ" کا شکر گزار ہوں۔ خدا کرے میرے دوست میر خلیل الرحمن مرحوم کے نام پر قائم یہ ادارہ ہزاروں سال چلتا رہے۔ جن لوگوں نے پیغامات ارسال کئے' ان کی بھی عزت افزائی ہے۔ نغمہ "جیوے جیوے پاکستان" کے حوالے سے ایک بات کہوں گا۔ وزیر اعظم کا پیغام سن کر آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں میری بڑی پذیرائی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میرا نغمہ جیوے جیوے پاکستان جو ہر دفعہ ۱۴ اگست کو وزیر اعظم ہاؤس کی تقریب میں پیش ہوتا تھا' اس دفعہ پیش نہیں کیا گیا۔ یہ میرا لکھا ہوا نغمہ ضرور ہے مگر آخر اس کو کیوں ہٹایا گیا۔ اس لئے مجھے خود حیرانی ہو رہی ہے کہ اس تقریب کے لئے پیغام وزیر اعظم نے بھیجا ہے یا کسی اور نے بھیج دیا ہے۔"

میں نے زندگی بھر کبھی قلم کو نہیں بیچا۔ نوکری کرکے دماغ کو بیچا ہے لیکن ذاتی مفاد کے لئے کبھی دل کو نہیں بیچا۔ قلم کا رشتہ دل سے ہوتا ہے۔ آج تک کوئی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے کبھی کوئی پلاٹ' پرمٹ یا پیٹرول پمپ لیا ہو' کسی سے دب کر بات کی ہو یا کسی حاکم کی فرمائش پر لکھا ہو۔ ہاں' البتہ مزدور کی فرمائش پر ضرور لکھا ہے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصل ججمنٹ اس کی موت کے بعد ہوتی ہے۔ آج سے چالیس برس قبل جن لوگوں نے مشاہیر کی زندگی میں خراج تحسین پیش کرنے کی روایت ڈالی' میں ان میں سے ہوں۔ میں گلڈ میں رہا۔ ہر ادیب کو بلایا اور اس کی Recognition کی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ روایت آج بھی چل رہی ہے مگر ہم پیسے والوں اور کرپشن والوں کی عزت کرتے ہیں۔ یہ ہمارا معاشی شعار بن چکا ہے۔ کراچی کی بات چھوڑیں' یہاں تو ایک خاص جماعت ہے جس کے ساتھ لوگوں کی وابستگی ہے۔ لاہور' راولپنڈی' ملتان اور دیگر شہروں میں جہاں پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں' لوگ کرپٹ اور بدعنوان لوگوں کو ووٹ دیتے ہیں لیکن میں جہاں سے بھی ووٹ مانگنے جاؤں گا تو مجھے چار آدمی بھی ووٹ نہیں دیں گے۔ میں نے ایک دفعہ الیکشن لڑا تھا۔ شکر ہے کہ ہار گیا۔ گو ہارے ہوؤں میں سب سے زیادہ ووٹ میرے تھے۔ ہم پی پی پی کے سب امیدوار ہارے تھے سوائے کراچی سے متصل دیہی علاقے اور لیاری کے روایتی پرو پی پی پی علاقے سے۔ ورنہ پتہ نہیں میں کس کس کرپشن میں پڑ جاتا۔ رہی کرپشن تو وہ ہمارے اقدار کے نظام میں شامل ہوگئی ہے اسے ختم کرنا آسان نہیں۔ خدا کرے کہ یہ ختم ہو جائے۔ میں ایس۔ ایم۔ ظفر صاحب سے عرض کروں گا کہ میرے ساتھ مل کر پہلے نظام اقدار بدلیں۔"

ناشرین

کچھ گلڈ کے حوالے سے

جمیل الدین عالی کی شخصیت ہی نہیں انکی خالص ادبی خدمات پر بھی پاکستان رائٹرز گلڈ کی تاسیس سے متعلق افواہیں شبہات' قیاسیات اور تنازعات گہرے سائے ڈالتے رہے ہیں۔ (حالانکہ کردار و تخلیق میں مطابقت یا عدم مطابقت ہمیشہ سے ایک علیحدہ بحث ہے) ۔یقیناً" اس ادارے کے بانی وہ اکیلے نہیں تھے لیکن خود بقول جناب شہاب اس کے کنونشن میں اور تاسیس کے بعد بھی اس میں سب سے زیادہ کام انہی نے کیا اور خالصتاً" اعزازی طور پر کیا وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ملازمت کرتے رہے ہیں) یہاں تک کہ (خود شہاب صاحب نے توثیق کی ہے) ایک دور میں گلڈ کی خاطر مستقل اعلیٰ ملازمت سے بھی مستعفی ہونا پڑا(۱۹۶۶)(اور سرکاری پنشن سے محروم بھی کہ کل ملازمت پر ضوابط وقت کے مطابق مقررہ میعاد پوری نہیں ہوئی تھی- انکی گلڈ سے بارہ سالہ وابستگی(۱۹۵۹ـ۱۹۷۰) ایک پوری کہانی ہے۔ انکے بعض انٹرویوز میں چند سوالوں کے جواب خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ کسی قدر ذکر محترمہ قرۃ العین حیدر کی تصنیف "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملتا ہے۔ کسی قدر "شہاب نامہ" میں۔ دیگر بانیان نے اس باب میں کوئی تفصیلی تحریر نہیں چھوڑی مرزا حسن عسکری (ابن سعید) نے روزنامہ ڈان میں لکھا (اس اشاعت میں شامل) شوکت صدیقی نے جنوری ۱۹۹۷ کی ایک تقریب میں جو گلڈ کی سالگرہ پر اسکے احیاء کے لئے کراچی میں منعقد ہوئی تھی' ایک طویل صدارتی تقریر میں اس امر پر تفصیلی روشنی ڈالی کہ گلڈ سراسر جمیل الدین عالی کا خیال تھا' جس میں اشتراک مقاصد کے سبب انہیں چند دوستوں اور بزرگوں کی سرپرستی اور بائیں بازو کے ادیبوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ شوکت صدیقی نے ان تمام اسباب اور ان مذاکرات کا ذکر کیا جو بائیں بازو کے مغربی اور مشرقی پاکستانی ادیبوں اور کنونشن کے مجوزین کے مابین ہوتے رہے تھے۔ اس کا اخباروں میں کچھ ذکر تو آیا ابھی تحریر نہیں ہو سکے ہیں۔

گلڈ کی تاسیس کے بعد تو تمام کاروائیاں ماہانہ اور سالانہ رپورٹوں کی صدارت میں گلڈ کے دفتر(لاہور) میں موجود ہیں-تاسیس اور اس سے پہلے کا حال گلڈ کے سابق ماہنامے "ہم قلم" نمبر۔۱۹۹۹ میں ہی محفوظ ہے۔ یہ جریدہ چند پرانے اراکین کے پاس بھی ہوگا اور ملک کے بعض کتب خانوں میں بھی۔ ہم نے عالی صاحب سے درخواست کر رکھی ہے کہ وہ اس پر ایک مقدمہ لکھ کر ہمیں دیدیں تو ہم اسے بعینہٖ(فوٹو ٹریسنگ عمل کے ذریعے) شائع کر کے تاریخ کے ریکارڈ پر لے آئیں گے ۔ وہ ابتدائی دو برس کی بڑی اہم داستان ہے۔ پیش تاسیس بعد تاسیس اہم ترین ادیبوں سمیت سیکڑوں

کی ابتدائی شرکت اور رکنیت اور ان کا انتخابات میں حصہ لینا۔ گلڈ بننے کے بعد بیمار ادیبوں اور مرجانے والے ادیبوں کے لئے وظائف کا اجراء 'نجی شعبے کے ادبی انعامات کا قیام' دورے 'بیمہ' تراجم' تحفظ حقوق' آزادی تحریر' گلڈ کے کارنامے' ناکامیاں' تنازعے' اثاثوں کا حصول۔ بہت کافی مواد ہے۔ یہ عالی صاحب پر نئی نسلوں کی طرف سے قرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے انٹرویوز پر اکتفانہ کریں اور ایک بار سب مربوط طریقے سے قلمبند کردیں۔کبھی بعض پرانے اراکین ابتدا ہی سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں جبکہ انہوں نے انتخابات تک لڑے ہیں۔بعض انعامات تک لے کر بھول گئے ہیں۔ عالی صاحب نے "پل بنا گلڈ بنا۔۔۔" کے عنوان سے لکھنا بھی شروع کیا تھا (اس کا ذکر انکے کالموں میں ہے) مگر مکمل نہ کرسکے وہ اس کی عہدہ داری سے ۱۹۷۰ سے الگ ہو چکے ہیں جب اسکے دستور کے مطابق میقاتی انتخابات ہوئے اور ایک بنگلہ ادیب جناب محبوب جمال زاہدی سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔(گلڈ کا سیکریٹری جنرل عالی کے مسودۂ دستوراہی کی رو سے دوسری مسلسل میقات کے لئے منتخب بھی نہیں ہو سکتا تھا)۔ اتفاق کہ ایک برس بعد سقوطِ ڈھاکہ ہوگیا۔ پھر گلڈ کا مرکزی دفتردستور کے مطابق ہر اگلی میقات کے لئے بدل جاتا تھا۔ وہ لاہور چلاگیا اور گلڈ اتنا فعال بھی نہ رہا مگر اس کا قائم کردہ ایک ٹرسٹ باقی رہ گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کے پاس شہاب صاحب اور عالی صاحب کے دور عہدہ داری کی حاصل کردہ زمین' لاہور میں صوبائی اسمبلی کے مقابل ایک بڑی عمارت اور چودہ کنال زمین ہے۔ عمارت توبوسیدہ ہے مگرزمین بازار نرخ کے مطابق قیمت کم از کم دو کروڑ روپے فی کنال کے حساب سے لگائیں بلکہ اس سے زیادہ کی ہے۔ اس لئے ابھی گلڈ کو زندہ کیا جاسکتا ہے۔اب عالی صاحب گلڈ سے کوئی عملی دلچسپی نہیں لیتے' صرف انجمن کے انتظام و انصرام تک محدود ہیں اور سینٹ میں یوں بھی معروف ہو چکے ہیں۔ مگر ہمیشہ منتخب کارکنوں سے تعاون پر تیار رہتے ہیں کسی پر معترض نہیں ہوتے۔ جب تک کارکن گلڈ کو دوبارہ سرگرم نہ کریں' عالی صاحب تنہا اپنی ذات سے ان مقاصد کیلئے کچھ نہ کچھ کام بھی کرجاتے ہیں جو گلڈ کی تاسیس کے وقت انکے پیش نظر تھے۔ مثلاً" سینٹ میں جاتے ہی ایک قرارداد منظور کرائی جسکی رو سے ہر پاکستانی زبان کا ادیب اپنی شخصی اور اپنے مسودے کی ضمانت پر دولاکھ روپے تک کا قرض (بلا سود) لے سکتا ہے۔ واپسی اشاعت کتاب کے ایک برس بعد مناسب ششماہی قسطوں میں۔ یہ واحد نجی قرارداد ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظور ہوئی۔ اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی قرارداد منظور نہیں ہوئی۔

سینٹ میں ایک اور قرارداد پیش کررکھی ہے جسکی رو سے طبی معاینے کے بغیر اور بلا لحاظ عمر ہر پاکستانی زبان کے ادیب کا بیمہ ہونا چاہیے۔

۔سینٹ ہی میں ایک قرارداد زیرِ غور کے ذریعے بین اللسانی ہم جہتی کا حصول مطلوب ہے۔

۔خطیر رقموں کے کئی انعامات کا قیام بذریعہ اکادمی ادبیات پاکستان۔

۔کاپی رائٹ قانون میں پہلی ترمیمات بھی انہی نے کرائی تھیں۔ ۱۹۶۱ء جب وہ یونیسکو فیلو شپ کے تحت تربیت پاکر واپس آئے تھے) پھر ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء تک وزارت تعلیمات اور بک کونسل کے زیر اہتمام انکی زیر صدارت متعلقہ مفادات کی ایک کمیٹی نے مزید ترمیمات پر کام کیا۔ اسکی سفارشات مختلف حکومتوں کے ادوار میں مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی ۱۹۹۱ء میں پارلیمان سے منظور ہو کر قانون بنیں۔ اب وہ اس قانون کے بین الاقوامی معاہدات میں ترمیم پر کام کر رہے ہیں (پاکستان میں پہلی ترامیم کی تحریک گلڈ قائم کرنے والے کنونشن جنوری ۱۹۵۹ء میں پیش ہوئی

تھی)۔ہماری درخواست پر عالی صاحب نے مذکورہ "ہم قلم" کے چند اوراق کا فوٹو مواد دیا ہے جو بعینہٖ (فوٹو ٹریسنگ) شائع کردیا جائے گا عالی صاحب کا کہنا ہے کہ ان صفحات کے بغور اور گہرے مطالعے سے بیشتر معاملات و مقاصد پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ ان میں علم و ادب کے بڑے بڑے ناموں اور مقاصد کے ساتھ پاکستان میں قومی جہتی کی راہ میں جو عملی ابتدا ہوئی وہ خود اپنی جگہ ایک لائق تحسین کوشش تھی۔... افسوس کہ ان صفحات کی نقل کے ساتھ فی الوقت ہم ہر ششماہی کی نئی فہرست رکنیت شائع نہیں کرسکتے(ضخامت اجازت نہیں دیتی) مگر اتنا بتادیا جائے کہ اس "ہم قلم" کے صفحات ۲۹۳ '۳۰۲' اور ۳۰۸ پر اندراجات کے مطابق جناب فیض احمد فیض مرحوم' جناب سبط حسن مرحوم 'جناب احمد ندیم قاسمی جناب سید مطلبی فرید آبادی (معروف کمیونسٹ) اور جناب حبیب جالب کے نام نئے اراکین میں شامل ہیں۔ اراکین متعلقہ فارم بھرے جاکر حسب ضوابط ہی بنتے تھے بعض خواتین و حضرات جو آغاز میں یا بعد میں مختلف کمیٹیوں میں منتخب ہوئے وہ انتخابی عمل ہی سے گزر کر منتخب ہوئے۔بعد میں قاسمی صاحب مغربی پاکستان کے الیکشن کمشنر بھی نظر آتے ہیں یعنی ان معاملات میں انکی کھلی تائید شامل تھی(اگلے برسوں میں جنکی یاد ابھی تازہ ہے اور اخبارات اور گلڈ کے دفتری ریکارڈ پر بھی ہو گی) فیض صاحب اور قاسمی صاحب انعامات کے ججوں میں بھی شامل رہے(خود قاسمی صاحب کو ۱۹۶۳ء کا آدم جی ادبی انعام انکے شعری مجموعے "دشت وفا" پر ملا تھا جو انہوں نے ۱۹۶۴ء میں وصول کیا) ان حوالوں کا اشارہ کرنے سے عالی صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں (مشرقی پاکستانی حوالے اس وقت غیر متعلق ہو چکے ہیں) کہ انہوں نے گلڈ سے کس پیمانے کا تعاون حاصل کر رکھا تھا اور وہ ادب اور ادیب کی سربلندی کے لئے پاکستان میں پہلے' غیر سرکاری' بذریعہ انتخاب آنے والے رضاکاروں کے ذریعے کس طرح کی بنیادیں ڈال رہے تھے۔ یہ علیحدہ بات کہ بہ ہزار وجوہ گلڈ وہ گلڈ نہ رہا جو اسے بن جانا چاہیے تھا۔ ان وجوہ کا بیان عالی صاحب پر بھی قرض ہے اور بعض معاصرین نے لکھا ہے ثبوت و حوالہ کے بغیر لکھا ہے مدلل طور پر بیا بھی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام تر ممکنہ اعتراضات کے باوجود فلاح ادبا کے متعلق انکی حیرت انگیز رضاکارانہ محنت' استقامت' کئی کارہائے نمایاں اور کئی اداروں کی بنیادیں رکھنے بلکہ خاصی حد تک انہیں تعمیر کرا دینے میں بھی عالی صاحب کا کردار ایک بڑا قابل تعریف مطالعہ ہے۔

گلزار جاوید

مدیر "چہار سو" راولپنڈی

براہ راست

(ایک اہم انٹرویو)

(۱۹۹۵ء)

"اردو زبان و ادب پر مرزا اسد اللہ خان غالب کے عظیم احسانات ہیں ہماری بہترین کاوشیں بھی مرزا کی دین کا بدل نہیں بن سکتیں ——— ہاں مگر قدرت نے ایک نادر موقع مرزا غالب سے نسبت خاص کے حامل ہمارے عہد کے عالی وقار دانشور، شاعر، ادیب اور مفکر جناب جمیل الدین عالی کی قابل قدر خدمات کے اعتراف میں ان کے مقام و مرتبہ سے قطع نظر ادنیٰ "قرطاس اعزاز" پیش کرنے کا موقع فراہم کر کے روح غالب کے روبرو ہمیں سرخرو ہونے کی سعادت بخش دی ہے۔

ہم اپنے اس اعزاز پر نازاں ہونے کے ساتھ جمیل الدین عالی، بیگم عالی، حضرت کے دیرینہ دوست جناب محمد عمر، رفیق خاص جناب مصباح العثمان اور اپنے محترم دوست ڈاکٹر احسان احمد شیخ کے مخلصانہ گرم جوش اور بھرپور تعاون و رہنمائی کے لئے بے حد ممنون ہیں۔"

(یہ انٹرویو مدیر "چہار سو" راولپنڈی جناب گلزار جاوید نے لیا تھا۔ عالی صاحب نے بے شمار انٹرویوز دیئے ہیں۔ ان پر مکمل کتاب علیحدہ چھپے گی۔ یہ انکا تاحال طویل ترین انٹرویو ہے جو "چہار سو" کی اشاعت نومبر و دسمبر ۱۹۹۵ء میں چھپا تھا یہ بڑی حد تک ان کا نمائندہ انٹرویو کہا جا سکتا ہے اس میں سے بخوف طوالت ایک سوال کا جواب شائع نہیں کیا جا رہا ہے جو خود بتاتا ہے کہ بیک وقت کتنی باتیں پوچھ لی گئی تھیں۔ ناشر)

○ (الف) حضرت غالب سے آپ کو خاص نسبت' آپ کا خاص موضوع سخن فیض سے آپ کا بے پناہ انس۔
(ب) ہم آپ کو کس مکتبہ فکر کا نمائندہ جانیں یعنی آپ شاعری میں کسی خاص School of thought کی پیروی کے قائل ہیں؟

○○ غالب سے کس ادب دوست کو بے پناہ انس نہیں۔ سبھی کی طرح میں بھی ان کی عظمتوں کے رنگ برنگے افقوں کو حیرت اور محبت سے تکتا رہتا ہوں کائنات تک محدود ہو سکتی ہے۔ (آئن اسٹائن نے تو نوری سالوں کے حساب سے ناپی بھی تھی) غالب کی فکر محدود نہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں لے جاتے ہیں۔

ان سے خاص نسبت کا ذکر وہ کرتا اچھا لگے گا جس نے خود کوئی کمال کر کے دکھایا ہو۔ بہرحال ان سے میرے بزرگوں کے خاندانی اور شاگردانہ روابط رہے ہیں۔ ان کی حیات میں ہی ان کا تعلق کسی اور خانوادے سے اتنا نہیں رہا جتنا اپنی سسرال (ہم لوگوں) سے تین چار پشتوں تک رہا۔ یہ تمام احوال 'قدما کو چھوڑ کر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر مالک رام سے لے کر حال کے کالی داس گپتا رضا جالندھری۔ (اب بمبئی) اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے درج ہے خلاصہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی جناب عبداللہ ملک نے میاں محمود علی قصوری مرحوم کی سوانح لکھی ہے۔ (مرحوم کی بیوی میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہیں) اس حوالے سے جو ہمارے خاندان کا ذکر شروع کیا تو پورے بیس صفحے بھرنے پر بھی کہتے ہیں کہ تشنگی رہ گئی ——— غالب میرے ہم جد نہیں' رشتہ داری ہے مگر مجھ سے شاعر کے طور پر بعد میں متعارف ہوئے۔ اولاً" تو ایک ایسے اپنے ہی بزرگ خاندان جس کے چرچے اور لطیفے کسی نہ کسی طور ہر وقت میری ددھیال میں ہوتے تھے۔ غالب کی بہو (منہ بولے بیٹے زین العابدین خاں عارف کے بیٹے باقر علی خاں کامل کی بیوی اور نیر درخشاں کی بیٹی) نواب معظم زمانی عرف بگا بیگم اور خود ان کی بیٹی جندو بیگم (جنہیں غالب نے اپنے خطوں میں مرزا جیون بیگ لکھا ہے) میری جوانی تک حیات تھیں۔ دادی بگا بیگم کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ وہ مشہور انٹرویو پروفیسر حمید احمد خاں نے انہی سے لیا تھا۔ میں تو بچپن سے ان کے پاس جاتا تھا۔ یتیمی سے پہلے ہم گلی قاسم جان میں رہتے تھے۔ دادی بگا بیگم "محل سرا" میں گلی کے ایک نکڑ پر جہاں محلہ بلی ماراں شروع ہوتا ہے۔ (غالب بلی ماراں میں رہتے تھے۔ کچھ عرصہ احاطہ کالے صاحب میں' وہ بھی عین میرے گھر کے سامنے تھا) میں نے دادی بگا بیگم سے ان کے ہزاروں قصے سنے مگر وہ ان کے بعض اعمال واشغال کے ذکر پر سخت برہم ہو جاتی تھیں۔ (کچھ باتیں میں نے خطوط غالب مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کے مقدمے میں لکھ رکھی ہیں) غالب کا ایک خط میرے والد (فرخ مرزا) کے نام بھی ہے۔ "دادا اور دلدادہ" والا۔ ایک دو خطوں میں ان کا ذکر بھی ہے۔ میرے دادا (علائی) کے نام ان کے خطوں کی تعداد نمبر دو پر آتی ہے۔ سب سے زیادہ خط ہر گوپال تفتہ کے نام' پھر علائی کے نام ——— کچھ لڑکپن میں گھریلو طور سے پڑھائے بھی گئے کہ چھپ چکے تھے۔ والد کی صحبت نہیں اٹھائی مگر اپنے سگے چچا نواب ضمیرالدین خاں عالی کی آنکھیں دیکھی ہیں سائل صاحب کے ہاں خوب

حاضری دی ہے ان دونوں نے غالب کو دیکھا تو نہیں مگر ایک پشت کے واسطے سے انہیں خوب جانتے تھے۔ ان کی باتیں سناتے تھے۔ میری دلی میں چند دوسرے وہ لوگ بھی زندہ تھے جنھوں نے اپنی جوانی میں غالب کو دیکھا تھا۔ مثلاً ہمارے عزیز نواب خضر مرزا۔

میری ننھیال خواجہ میردرد کی مالا جپتی تھی (کوچہ چیلان۔ بارہ دری۔ خواجہ میردرد) اور چونکہ مومن کوچہ چیلاں کی ہی ایک گلی میں رہتے تھے اس لئے ان کے افکار' لطیفے' شعر زیادہ چلتے تھے مگر وہاں بھی غالب کا رعب بہت تھا۔

پوری کہانی دس صفحوں میں آتی ہے۔ آپ اتنی جگہ نہیں نکال سکتے۔ بہرحال یوں سمجھئے کہ اتنی قربت کے سبب غالب میرے لڑکپن سے ایک رومانس رہے ہیں مگر ایسی نسبتوں سے میری شاعری بڑی نہیں ہو جاتی۔

(ب) اس سے قطع نظر کہ میرا کسی مکتب فکر سے تعلق کا دعویٰ کوئی مانے گا یا نہیں مانے گا۔ میں خود یہ طے نہیں کر سکتا۔ نمائندگی تو بڑی بات ہے۔ مکاتب فکر میں جدید تفریق' واضح نشاندہی کے طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام (۱۹۳۶) سے شروع ہوئی تھی۔ اسے اسی وقت بہت سے حلقوں نے چیلنج بھی کیا۔ (اور آج بھی کرتے ہیں) چند برس بعد باقاعدہ طور پر حلقہ ارباب ذوق لاہور نے ایک طرح میراجی صاحب کی قیادت میں اس کے خلاف محاذ بنایا۔ جب وہ دلی آئے تو وہ محاذ وہاں بھی آیا۔ ہمارے کالج میں حلقے کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی رہیں۔ مگر یہ ایک محدود بیان ہے۔ ترقی پسند تحریک ملک گیر اور ہمہ لسانی تھی۔ بہت پھیلی ہوئی تھی۔ آج بھی جب کہ انجمن ہندوستان میں بھی نہیں اور پاکستان میں تو باعلان پانچویں دہائی میں ہی ختم کر دی گئی (علیحدہ کہانی) تحریک یا مکتب فکر پورے زوروشور سے جاری ہے تعبیرات کسی قدر مختلف ہو گئی ہیں۔

لیکن میں اب بھی یہ نہیں جانتا کہ شاعری کے لئے مکتب فکر کیسے متعین ہوتا ہے۔ معاف کیجئے میں یہ چاہوں گا کہ یہاں لفظ "شاعری" سے آسان نہ گزرا جائے۔ یہ اضافی بیان بھی شامل کر لیجئے کہ اگر مکاتب متعین کرنے ضروری ہیں تو یہ تعین عصر بعد عصر نقادوں کا کام ہوتا ہے عصر بعد عصر پر بھی دھیان رہے۔ بعض اوقات "مصالح مرسلہ" نے بھی طرح طرح کے لکھنے والوں کو ترقی پسند اور زوال زدہ قرار دلوایا۔ قطعی ناشاعر' کمزور ادیب بھی بڑے بڑے مقام پا گئے۔ بعض ضروریات' جن کی اہمیت اپنی جگہ' مسلّم ادبی فیصلوں پر حاوی ہوتی رہی ہیں۔ اور اب بھی ایسا ہو جاتا ہے پھر وہ ضروریات ختم یا کم ہو جاتی ہیں تو انہی نقادوں کے اور ان کے بعد میں ابھرنے والوں کے فیصلے یا محاکمے کبھی کاملاً" کبھی جزواً" بدل جاتے ہیں۔ ہمارے بعض قدما اور متوسلین کے بارے میں بازیافت کا عمل اسی ناگزیر سفر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شیفتہ جیسے فاضل اور باخبر کا نظیر اکبر آبادی کو نظرانداز کرنا بلکہ ان کی مذمت کرنا اور ایک صدی بعد نظیر اکبر آبادی کا ایک دم ابھر کر آ جانا اسی سفر کی ایک مثال ہے۔ خود ترقی پسند تحریک جلد فیصلوں' ان میں ترمیمات' تبدیلیوں بلکہ تنسیخ تک کے عمل سے گزری ہے۔۔۔۔۔ گزرتی رہتی

ہے ـــــــ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ Undefined تصور یا خاصیت جو ہے "ذوق سلیم" وہ کلاسیک اور جدید کے امتزاج سے کسی نہ کسی مدت کے بعد کسی ادیب' شاعر پر' خواہ بن لکھا' اتفاق ضرور کرا دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اسکی بہترین مثال منٹو صاحب ہیں۔ ایک وقت ان کی باضابطہ مذمت کرتے ہوئے انھیں زوال پسند اور بیمار ذہنیت کا تخلیق کار قرار دے دیا گیا تھا۔ اب کوئی بیس برس سے نہ صرف اس فیصلے کی بن لکھی سہی' مگر کھلی تنسیخ ہوئی بلکہ انھیں ایک بڑا ادیب قرار دے دیا گیا۔ ان کے مدارج روز بڑھتے جاتے ہیں۔

خود فیض صاحب کی نظم "یہ داغ داغ اجالا" پر ہندوستان کی انجمن تک سے غیر ترقی پسندی کا فتویٰ آگیا تھا۔ اس وجہ کے ساتھ کہ انھوں نے "آزادی جیسی نعمت کو داغدار کہہ دیا لیکن پھر انھی محترمین نے اپنی رائے سے رجوع بھی کیا اور فیض صاحب کا قد بہرحال بڑھتا ہی رہا۔ اور بڑھتا ہی رہتا ہے۔ ایک موقر گروپ نے علامہ اقبال تک میں فاشسٹ رجحانات کی نشاندہی کی مگر پھر اس سے رجوع کر لیا۔ ہمارے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مرحوم نے ایک دور میں علامہ پر جو اعتراض کئے۔ وقت گزرنے یا اپنے ذہنی رویے یا اپنے معاشی حالات اور پیشہ بدلنے کی وجہ سے اس رائے پر قائم نہ رہے۔ ان کے آخری دنوں میں میں نے ایک تقریب سپاس میں جو ان کے اعزاز میں ہوئی تھی۔ سوال وجواب کے دوران یہ بات چھڑی تو انھوں نے سب کے سامنے بے تکلف اقرار کیا کہ وہ اپنی رائے سے رجوع کر چکے ہیں چلتے روانی میں یہ چند مثالیں آگئیں لیکن دراصل یہ میرا مضمون تحریر ہے نہیں۔ میں جدید تنقید کی زبان بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے جانتا اور سمجھتا ضرور ہوں مگر وہ ایک بڑا علم دریاؤ ہے۔ میری اپنی مصروفیات اور یقیناً کم مائیگی نے اس طرف جانے کی اجازت نہیں دی اور اب کہ بظاہر فرصت ملی میرے فکری مسائل ہی نے اتنا گھیر رکھا ہے کہ نہ میں وہ علم حاصل کر سکتا ہوں ـــــ مغرب ومشرق کی تاریخ تنقید اور عصریات ـــــ نہ وہ زبان سیکھ سکتا ہوں نہ کوئی اپنی زبان وضع کر سکتا ہوں۔

یوں بھی کوئی تخلیق کار' معمولی ہی سہی' تنقید کی اہلیت اور فرصت کم پاتا ہے۔ فراق صاحب یا ایک آدھ اور استثناء ہے اردو میں' انگریزی ادب میں بے شک ایلیٹ صاحب اور ـــــ اور میرے حسابوں چینی میں صدر ماؤزے تنگ۔

اصولاً" مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں کہ ایک' خواہ مجھ جیسا ناچیز' تخلیق کار اپنی تعبیرو تفسیر خود کرتا پھرے یا اگر دانستہ طور پر یک رخا نہیں تو' اپنا مکتب فکر متعین کرنے بیٹھ جائے۔ ہاں بہت ضروری جانے یا کسی کو بے تکلفانہ خطاب کر رہا ہو۔ (خواہ تحریر میں خواہ تقریر میں) یا کہیں سے کوئی ناگزیر طلب آئے تو دو چار باتوں کی وضاحت یا شعروں کی اپنی تفسیر کر سکتا ہے۔ ورنہ اسے عصری اور بعد عصر قارئین اور ناقدین پر ہی اعتماد کرنا چاہئے۔ اگر وہ ابلاغ کا قائل ہے تو آخر وہ جس قاری' سامع' ناظر تک اپنی بات پہنچانی چاہتا ہے۔ اسے کیوں اتنا نااہل سمجھتا ہے ہاں اگر وہ غالب یا فراق کی طرح اہل نقد بھی ہے تب بھی' وہ بھی کسی حد تک' اپنی تخلیق کی تفہیم میں کچھ مشوروں

کا اضافہ کر سکتا ہے اور بس۔ تعلّی' خود پرستی' رعب گانٹھنا' معاصرین سے موازنے کرنا شاید نوجوانی اور ناپختگی کی "ضروریات" ہوں' کسی میچور عمر میں ایسا کرنا اچھا نہیں لگتا اور شاید کوئی مضبوط بات کہنا ممکن بھی نہیں تاوقتیکہ اسے یہ دعویٰ نہ ہو کہ وہ جتنے متعلقہ علوم و تواریخ ہیں ان پر حاوی ہو چکا ہے۔ یہ تاوقتیکہ بھی میں نے احتراماً" ہی کہہ دیا ہے ہاں کمرشل مقاصد' محض طلب شہرت' پھکڑپن' فقرہ بازی' غیر ذمہ داری وغیرہ دوسری صفات ہیں جو میرے احاطۂ گفتگو میں نہیں آتیں۔

○ آپ کے بیشتر مداحین کو علم ہے کہ شاعری کی ابتدا آپ نے اپنے بزرگ کے مصرع طرح پر سوہاوہ کے ریسٹ ہاؤس میں غزل پڑھ کر غالباً" یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے ہندی زبان و ادب سے خاص شغف نہ ہونے کے باوجود نوعمری میں ہی دوہے کی جانب آپ کے رجحان کے کیا اسباب تھے میرا بائی' کبیر داس' تلسی داس یا میراجی سے کسی قسم کا تعلق بنتا ہے اس خوبصورت حادثہ کا؟ نیز اس کا مستقبل آپ کیا دیکھتے ہیں۔

○○ تک بندی کی ابتدا تو دلی میں گھریلو طور پر ہی ہو گئی تھی۔ میں کسی الہامی تحریک یا اپنے اندرون سے آنے والی آواز کا حوالہ نہیں دوں گا۔ دلی میں کھاتے پیتے شرفا سے لے کر متوسط طبقے تک کا ماحول ایسا تھا کہ شاعری' پتنگ بازی' شطرنج' چوسر' تیراکی' اگر وسائل ہوں تو گھڑسواری اور شکار ایک طرح کے لوازم تھے۔ مجھ سے ذرا پہلے ڈیرے داروں کے گھر گانا سننے اور آداب محفل سیکھنے بھی جاتے تھے۔ مگر میرے وقت میں یہ ایک قریب الختم روایت تھی۔

اسکول میں بھی کچھ نہ کچھ کہنے لگا تھا۔ "لب پہ آتی ہے دعا" اور کئی نصابی نظمیں خوش الحانی سے پڑھتا تھا تو مزا آتا مثنوی مولانا روم کو تو بے سمجھے بھی ناظرہ کے بعد ہی سکھا دیا جاتا تھا۔ گلستان بوستان بھی مگر مثنوی میں میرے لحن پر میرے مولوی صاحب ہی نہیں نک چڑھے عزیز بھی جھومتے تھے۔

مشاعرے (مختصر مختصر محفلیں) دیکھے تو پڑھنے کا شوق ہوا۔ ایک دو دفعہ میں ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں کسی استاد کا شاگرد ہوئے بغیر کوئی قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ مشاعرے طرحی ہوتے تھے (خواجہ شفیع مرحوم کی اردو مجلس میں بعد میں گیا ہوں) مگر میری خاندانی وجاہت کے سبب فوائکات کے وقفے میں آج کی اصطلاح میں As a Special case پڑھوا دیا جاتا۔ اشارہ بھی ہوا کہ کسی کے شاگرد ہو جایئے۔ گھر والوں سے کہا (والد انتقال کر چکے تھے) والدہ نے کہا پہلے میٹرک کر لو۔ میں اڑ گیا۔ پھر اپنے بھائی' میرے ماموں سید ناصر مجید مرحوم' سے کہہ دیا۔ انہوں نے کہا سوچیں گے اور بڑے (سوتیلے) بھائی اور نگراں نوابزادہ مرزا اعتزاز الدین مرحوم کو خط لکھ دیا۔ وہ پنجاب میں ایس۔پی تھے گورنمنٹ انڈیا میں کسی کام سے آئے۔ گھر آکر نرم لفظوں میں ڈانٹا۔ چند شعر سنے۔ پھر کہا جاؤ سائل صاحب کے شاگرد ہو جاؤ۔ (لوہارو والے بے خود صاحب کے شاگرد ہوتے تھے کیونکہ سائل صاحب اپنے تھے۔ سائل صاحب کے بیٹے قطب الدین فصیح بھی بے خود صاحب کے شاگرد تھے) مگر میں کم عمر تھا

اور بے خود صاحب کے دیوان خانے میں میری وہ نگہداشت نہیں ہو سکتی تھی جو چچا سائل صاحب کے ہاں ہوتی۔ وہ مجھے زیادہ سنجیدگی سے بھی نہیں لے رہے تھے۔ سوچا ہو گا بچپن کا شوق ہے۔ غائب ہو جائے گا۔ کہنے کو خود بھی شاعر تھے مگر موسمی یعنی خاندانی تقریبات پر کہہ لینا۔ تخلص ہمایوں کیونکہ پیار کا نام بھی ہمایوں مرزا تھا۔ میں چند شعر کہہ کر چچا جان کے پاس گیا۔ اصلاح پر گستاخی کی انہوں نے شاگرد نہ کیا۔ (پورا قصہ ان کے خاکے میں ملاحظہ ہو) چھٹیوں میں جہلم گیا۔ بھائی صاحب دورے پر ساتھ لے گئے (اس وقت سینئر افسران دوروں میں اہل خاندان کو ساتھ لے جاتے تھے۔ خوب شکار اور سیر سپاٹا ہوتا تھا) اس شام سوہاوہ کے ڈاک بنگلے میں قیام تھا۔ شام کو جہلم کے معززین مدعو تھے۔ (روناموں میں راجہ آتا تھا) صبح حکم آیا اس زمین میں غزل کہئے۔ کم سے کم سات شعر ہوں۔ شام تک کہہ کر مجھے دکھا دیجئے۔ موزوں ہوئی تو احباب کو بھی سنواؤں گا وہاں میں نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل کہی گیارہ شعر ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے آپ مجھے جہلمی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ میری کئی بیاضیں اور ڈائریاں کھوئی ہوئی ہیں۔ بعض ضائع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں جب دہلی چھوڑ کر قسمت آزمائی کرنے پونہ (اختر الایمان کے ہاں) اور بمبئی جارہا تھا فسادات شروع ہو گئے تھے ننھیال میں والدہ نے بھی گھر بدل لیا تھا۔ کوچہ چیلاں ہی میں تھا ماموؤں کی شادیاں اور بچے ہو جانے کے بعد دوسرا گھر لینا ضروری ہو گیا تھا۔ پہلے سے آگے ایک کافی بڑا گھر لیا جارہا تھا۔ میں نے اور سامان تو چھوڑ دیا۔ ایک بکس ساتھ رکھا۔ وہ بکس 'صندوقچہ لکھنے پڑھنے کا بکس تھا۔ علائی کی یادگار۔ اس میں روایت کے مطابق غالب کی چند قلمیں' علائی کی چند قلمیں' سیپ کے' ہاتھی دانت کے کاغذ تراش' چند اور Curios تھے۔ میری دو ڈائریاں اور بیاض بھی سمائی تھیں۔ بیوی کو شملے چھوڑنے گیا جہاں اس وقت ان کے والدین لیڈی ذوالفقار علی خاں (علامہ اقبال والے) کی وسیع کوٹھی "نوبہار" میں مقیم تھے۔ انبالہ رک کر آپا شمیم جالندھری سے ملنے جالندھر گیا۔ میری بیوی مدرستہ البنات جالندھر میں پڑھتی تھیں تو ان کی Proteje تھیں۔ (ان کے والد جالندھر میں انسپکٹر پولیس رہ چکے تھے) آپا شمیم سے مجھے بہت محبت اور عقیدت تھی۔ وہ میری شادی سے پہلے بلند شہر آچکی تھیں۔ میری شادی میں ان کا خاصا رول رہا۔ بہر حال وہ بکس آپا کے پاس رکھوا دیا۔ شملے جا کر بیوی کو چھوڑا اور خود پونہ چلا گیا۔ (یوم اقبال کا مشاعرہ بھی تھا مگر میرا مقصد اس کے بعد قسمت آزمائی) فسادات جالندھر میں آپا پر حملہ ہوا (زنانہ مسلم لیگ کی پر جوش کارکن) لکڑ بازار میں ان کے اور بھائی جان کے سب گھر جلا دیئے گئے میرا بکس بھی جل گیا۔۔۔ ایک اور بیاض جو ساتھ لے گیا تھا بچ گئی۔ کچھ ابتدائی بھی ہے مگر بہت کم اب یاد آجائے تو محفوظ کرتا رہتا ہوں۔ مشکل سے یاد آتا ہے۔ وہ غزل یاد نہیں شاید مطلع یہ اس کا ہے۔۔۔

ستارے انہیں یاد وعدہ دلائیں
کبھی جھلملائیں کبھی ڈوب جائیں

دلّی پر داغ کی حکمرانی تھی۔ غالب کا احترام۔ غالب کے قصے کہانیاں' میرے وقت کے پڑھے لکھوں میں ان کی

rating اس وقت بھی بہت اونچی مگر شاعر زیادہ تر داغ کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ تمام زور زبان پر دیا جاتا تھا۔ میں جلد ہی کالج میں داخل ہو گیا۔ اختر الایمان ہمارے ہیرو بنے مگر وہ اس وقت رومانوی شاعری کرتے تھے نظم کی 'بہت جلد وہ "گرداب" والی نظمیں کہنے لگے تھے۔ لیکن مجھ پر ان دلی والوں کا اثر زیادہ رہا۔ میں غزل ہی کہتا رہا۔ خیر آپ نے ابتداء کی بات کی تھی۔ اپنے ایک دوست نسیم الظفر کے الیکشن ۱۹۴۳ء پر اس کا قصیدہ بھی کہا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ایک دو آزاد نظمیں مگر غالب غزل ہی رہی۔ بہرحال ابتدائی کلام ضائع بھی ہوا اور کچھ تھا بھی نہیں۔

(دوسرا حصہ) دوہا نگاری۔ یہ بھی کسی فیصلے یا نعوذ باللہ الہام کا نتیجہ نہیں؟

دوہا ۱۹۴۴ء کے ستمبر سے کہا ہے۔ ہندی نہیں جانتا تھا۔ اب بھی دیوناگری رسم الخط نہیں پڑھ سکتا۔ مگر لوہارو میں قریبی گاؤں سے جو جے پور کی حدود میں واقع تھے کچھ بھاٹ 'فقیر آجاتے تھے اور میرا بائی کے دوہے سناتے تھے لوہارو اب ہریانے میں ہے۔ قانونا" مشرقی پنجاب مگر راجستھان سے متصل اور جاٹ 'کھڑی بولی کا علاقہ) مجھے ان سے بڑا لطف آتا تھا۔ کالج میں بھگت کبیر سے بھی "شناسائی ہوئی لیکن واجبی .... اگست ۱۹۴۴ء میں چند ہفتہ بیماری کے بعد تبدیلی آب و ہوا کے لئے اپنے چچا زاد بھائی صاحب زادہ صمصام الدین فیروز کی دعوت پر دلی کے قریب یو پی کے ضلع بلند شہر گیا وہ ریٹائر ہو کر آئے تھے۔ چھتاری ہاؤس میں رہتے تھے۔ ان کی بیگم 'میری ساس' ریاست جہانگیر آباد میں حصہ دار تھیں۔ (نواب محمد اسماعیل خاں نبیرہ شیفتہ کی ایک چھوٹی بہن....) جہانگیر آباد بلند شہر سے گیارہ بارہ میل دور ایک موضع تھا۔ بلند شہر (تاریخی نام برن۔ برنی والا) قصبے سے زیدہ شہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہاں مجھے دیہاتی ہاٹ بازار دیکھنے کا موقع ملا۔ چھوٹے چھوٹے میلوں میں بھی گیا اور وہاں کی لوک موسیقی میں بڑا مزا آیا لوہارو میں بڑا ہو کر محض چند مرتبہ شکار پر 'ایک دو بار' یا تعطیلات میں جاتا تھا۔ بے تکلفانہ دیہات کی سیر کا موقع نہیں مل سکتا حفاظتی سپاہی ساتھ ہوتے تھے ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے۔ یہاں نوجوانی 'چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ' دیہات بھی نہایت سبز و شاداب ہنستیں ہنگامہ پرور۔ بھاٹوں کی ٹولیاں 'مغربی یو پی کا مشہور رزمیہ "آلہا اودل" اونچی تان سے گاتیں۔ فی البدیہہ مقابلے بھی کرتیں جیسا یہاں ہمارے وسطی پنجاب میں عام ہے۔ (شاید کبھی جگہ ہو میں نے اپنا پاکستانی وسطی پنجاب زیادہ دیکھا ہے) ادھر مجھے اپنے ان بھائی کی صاحبزادی بہت پسند آگئی تھیں میرے خسر اور خوشدامن مجھے پسند کرنے کے باوجود تفاوت عمر اور میری ننھیال کے "دلّی پن" سے ڈرتے تھے۔ میرا بی۔ اے میں ایک پرچے میں کمپارٹمنٹ آیا تھا۔ کالج کے آخری دو سال میں نیم سوشلسٹ خیالات نے ریاست سے ایک طرح کا باغی بھی کر رکھا تھا۔ وہاں حسب رواج نوکری کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ الاؤنس وغیرہ اچھا تھا مگر اتنا نہ تھا کہ بیوی کے ساتھ الگ گھر لے کر آرام سے گزارہ کروں۔ ریاست سے مزید یافت کے لئے وہاں رعایا سے جبریہ "فتوح" ضروری تھی۔ جو پہلے تو ملتی رہتی تھی کہ والئی ریاست کی مرضی شامل تھی مگر بے باکانہ اظہار خیال

نے اس رعایت کو خرخشے میں ڈال دیا تھا۔ بڑا پریشان تھا۔ نہ اچھی آمدنی (آخر والدہ کا سہارا کب تک لیتا۔ جب ان کی ذمہ داریوں میں میری چھوٹی بہنوں کے علاوہ جنہیں بہرحال الگ الاؤنس ملتا تھا اپنے میکے کی بڑی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی تھیں)۔ میں بے ڈگری' بے رقم خطیر اور ضدی کہ نکاح ابھی ہوگا۔ ایک شام کو بے اختیار دو دوہے ہو گئے۔)

پہلا

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے' اسے یہ کون بتائے

دوسرا نکاح کے بعد کہا۔

نا مرے سر کوئی طرّہ کلغی نا کیسے میں چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری سانوری اور اللہ کا نام

پھر چند دوہے اور .... دلی آیا ... میراجی صاحب سے ملنا ہوا۔ انہیں سنائے یا شاید ۱۹۳۶ء میں پونا میں سنائے تھے وہاں خوب کہے بھی۔ انہیں پسند آئے کہا اگر میں اب "ادبی دنیا" کا مدیر ہوتا تو تمہیں بڑے زور و شور سے متعارف کراتا۔ بہرحال یاد رکھنا کہ یہ غزل سے زیادہ مشکل ہے مگر شاید تم سے چل جائے۔ بس دو کام کرنا۔ دوہے میں بالکل سچ بولنا۔ غزل جیسی معنی آفرینی نہ کرنا اور ہندی زبان نہ پڑھنا ورنہ اردو کے لئے مشکل لفظیات میں پھنس جاؤ گے۔ یہ تازگی اور شادابی اس کی بحروں کی پابندی کا شکار ہو جائے گی۔ میں نے ہندی نہیں پڑھی۔ دوسری ہدایت پر عمل کا یقین نہیں پورا ہوا ہو نہ ہوا ہو وہ سامع' قاری' ناقد جانے اتفاق کہ غزل کے ساتھ ساتھ لائف ہجو بشنز پر دوہے بھی کہنے لگا۔ پڑھتا ہمیشہ ترنم سے تھا۔ انہیں پڑھنے میں الھا اودل کی تیز اور بلند لے کو اپنے فعلن فعلن کے ساتھ ذرا مدھم کر کے جو دیکھا تو بڑا لطف آیا۔ اس کے بعد ایک دو پرانی دلی کے مرتے ہوئے مشاعروں میں پڑھے تو وہاں کا ردعمل حیرت' غصے اور خاموش احتجاج میں ابھرتا پایا۔ وہ طرح باز لوگ تھے۔ کالجوں میں پڑھے تو لڑکے لڑکیاں بھونچکے اور پھر میرے دیوانے ہو گئے۔

مگر پھر میں دلی میں کم ٹھہرا۔ پونہ' بمبئی' حیدر آباد دکن گیا ۔ وہاں ہجو بشنز بھی بنیں اور جہاں پڑھے بہت کامیاب رہا۔ جب دلی واپس آنا پڑا تو مشاعروں پر ہندو مسلم فسادات کے اثرات غالب آرہے تھے۔ جلد ہی پاکستان بن گیا۔ یہاں چند ہفتے دوہوں کے باب میں ٹھنڈے گزرے۔ طرحی مشاعرے بھی شروع ہو گئے تھے۔ ایسے مشاعروں میں غزل زیادہ سنتے تھے۔ دوہے کچھ ذاتی ہو کر رہ گئے تھے گو کہتا برابر رہا۔ پھر ذرا زندگی بدلی' اچھی بھی ہو رہی تھی۔ دوہے پڑھنے شروع کئے تو پورے پاکستان میں پذیرائی ہونے لگی۔ اعتراض بھی آئے کہ یہ مروّجہ ہندی بحر میں نہیں۔ اردو کے ذریعے میرا بائی' بھگت کبیر' رحمٰن' تلسی داس' بہاری کو پڑھنا اور سمجھنا چاہا۔ رحیمن اور

بھاری کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی کیونکہ وہ ٹھیٹھ ہندی کہتے ہیں۔ امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی طرف گیا کچھ آسان دوہے ملے۔ بابا بلھے شاہ کے دوہڑے ملے اندر کی مختلف آگیں بھی بھڑکتی تھیں۔ جوانی تھی۔ خوش الحانی تھی۔ شاید مصرع چست بھی ہوتے ہوں۔ بہرحال کیوں کا تجزیہ کوئی اور کرے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ غزل تو جیسی تھی تھی ہی ایک دم میرا دوہا بہت مقبول ہوگیا۔ خواجہ دل محمد صاحب کے دوہے میں نے بعد میں پڑھے۔ ان کی کتاب شاید ۱۹۵۱ء میں آئی تھی۔ کمال کے ہیں مگر مضامین دوسرے اور بحر ہندی کی مروجہ تیرہ ماترے والی جو میں نے اب تک اختیار نہیں کی میرے ذہن میں ایسے وقفے۔ بشرام۔ سے جھٹکا لگتا تھا۔ لیکن میری بحر۔ "عالی چال" ---- کے لئے دوہے پر وہ بہت سے مباحث دیکھتے ہوں گے جو بہت سی کتابوں میں بھی آچکے ہیں۔ جامع ترین کتاب ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی (علی گڑھ) کی ہے۔ دوہوں کی تاریخ پر جامع ترین مقالہ سید قدرت نقوی کا ہے۔ (تخلیقی ادب ۱۹۸۴ء) میرے دوہوں کو اردو دوہے قرار دینے پر ایک سیر حاصل بحث جمال پانی پتی نے کر رکھی ہے۔ ("عالی۔ حیات وفن" اشاعت دہلی ۱۹۸۸ء از جناب حبیب خاں) حضرت ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سمیت دوسرے بہت سے اہل نظر نے ان پر بہت کچھ لکھ رکھا ہے آج بھی کہ غزل سے بڑے مدت ہوگئی دوہا میرے اندر سے بار بار پھوٹتا ہے۔

میرا وقت تو گزر گیا۔ میرے دوہے پر بہت سے محترم ماہرین ہندیات اور ناقدین کے تبصرے بھی آئے اور آتے رہتے ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے جڑ پکڑلی۔ پاک ہند میں بڑے اچھے اچھے دوہا نگار سامنے آتے جارہے ہیں۔ احیائے دوہا میں اولیت کسی کو دی جائے وہ میرا مسئلہ نہیں اہم تر بات یہ ہے کہ ایک اور خوبصورت فارم نے اردو میں جڑ پکڑلی ہے۔ میں نے ۱۹۸۹ء کے جشن عالی دہلی میں اعلان کردیا تھا۔

کیسے کیسے کہنے والے کیا کیا بھاؤ سبھاؤ

عالی دوہا زندہ رہے گا بس اب تم اٹھ جاؤ

یہ فارم کے حوالے سے تھا۔ لیکن میں نے دوہوں میں کیا کہا ہے۔ یہ خود کیا بتاؤں۔ وہی کہ قارئین جانیں، ناقدین جانیں۔ افسوس اب تک فارم پر کریڈٹ اور بحث جاری ہے۔ مہربان نہ جانے یہ کب دیکھیں گے کہ کہا کیا ہے۔ صرف ایک دو مضامین میں تفصیلی گفتگو آئی ہے ورنہ احیاء یا اسے مقبولیت دینے کے حوالے سے بات کئے جاتے ہیں چلئے یہ بھی بہت ہے۔ میرا کوئی دعویٰ بھی نہیں۔ نہ احیاء کا نہ خدانخواستہ کسی اور پہلو سے اہمیت کا

"من کی پیاس بجھی نہ کسی سے، اسے یہ کون بتائے"

○ آپ کے ہم جماعتوں میں سے کچھ کے بقول کالج کے زمانے میں آپ کے نظریات سوشلزم کے خاصے نزدیک تھے کیا آپ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے کیا آپ کا اس تحریک سے کسی قسم کا تعلق رہا گر نہیں تو اس روشنی کی نشاندہی ضرور کیجئے جس سے آپ کے دل و دماغ میں وسعت اور بنی نوع انسان کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا؟

○○ جی ہاں مگر میرے مطالعے کا دخل کم تھا۔ میرے ایک ہم جماعت حمید ہاشمی تھے۔ یہاں امروز لاہور سے

منسلک رہے قاہرہ ایئر کریش میں ختم ہو گئے(۱۹۹۲ء.....)ان کے ہمارے ننھیالی واسطوں سے خاندانی تعلقات بھی تھے۔(ان کے بڑے بھائی انیس ہاشمی صاحب وہاں بھی اور یہاں کراچی میں کیمونسٹ پارٹی سے متعلق رہے) وہ بڑا سیاسی اور انقلابی خاندان تھا۔ حمید کے بڑے بھائی حنیف ہاشمی کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور لوک تھیٹر والے مظفر ہاشمی تھے جو چند برس ہوئے رجعت پسندوں کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے اور پورے ہندوستان کے روشن خیال حلقوں نے ان کا سوگ منایا اور احتجاجی جلسے کئے۔

روس پر جرمن حملے تک ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی خلاف قانون Banned تھی بھائی انیس ہاشمی 'حنیف ہاشمی اور حمید ہاشمی ان کے رکن یا کارکن تھے۔ اس وقت پارٹی کا کچھ لٹریچر بٹر پیپر جیسے کاغذ پر غالباً "پیاز" سے تحریر کیا جاتا اور خفیہ طریقے سے بٹتا تھا۔ میں کالج ۱۹۴۰ء میں پہنچا۔ چودہ برس کا تھا حمید ہاشمی نے مجھ سے کہا تم ایک نواب کے بیٹے ہو۔ تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔ تم یہ لٹریچر فلاح فلاں مقامات تک پہنچا دیا کرو۔ مجھے یوں بھی اپنی یتیمی شروع ہوتے ہی جاگیردار طبقے سے شکایت یا نفرت ہونے لگی تھی۔ کالج بھی عوامی تھا۔ قائد اعظم نے نواب زادہ لیاقت علی خاں کو صدر منتظم کرا دیا تھا۔ اور خود بھی کبھی کبھی ہم لوگوں میں "جاتے تھے (مسلم لیگ کونسل کی اہم نشستیں وہاں ہوتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء کی قرار داد بھی ہمارے ہی لان میں منظور ہوئی) ادبی طلباء میں اختر الایمان کا سکہ چلتا تھا۔ وہ کھدر پہنتے تھے باقاعدہ سوشلسٹ تھے یا نہیں اس وقت یاد نہیں "رہا لیکن جلسے اور آزادانہ گفتگو سے اس وقت کے لحاظ سے بھی سوشلسٹ کہا جاسکتا ہے گو سکہ بند ترقی پسندوں نے انہیں کبھی سوشلسٹ نہیں مانا۔ میں یوں بھی ان کی شخصیت سے متاثر تھا۔ حمید کی پیشکش میں مجھے آج کی زبان میں ایک رومانس نظر آیا اور میں نے تقریباً ایک ڈیڑھ سال یہ لٹریچر پندرہ بیس دن میں ایک مرتبہ ہندو کالج اور اور سینٹ سٹیفنز کالج جاکر تقسیم کیا۔ دریا گنج میں ایک مکان تھا جو پابندی پر سے پابندی ہٹ جانے کے بعد باقاعدہ کیمون بنایا گیا۔ وہاں کامریڈ سرلا گپتا اور کامریڈ متیم فاروقی آتے جاتے تھے۔ (شاید ویسے انڈر گراؤنڈ تھے) میں نے یہ لٹریچر وہاں جاکر بھی دیا۔ دریا گنج میں ایم این رائے صاحب کا دفتر بھی تھا۔ وہاں بھی ایک دو ہندو مسلم کارکنوں کو یہ لٹریچر دیا کرتا تھا۔ اسے پڑھنے کے لئے اسے دھیمی سی آنچ پر لانا پڑتا تھا۔ جس سے لفظ واضح ہو جاتے تھے۔ میں نے شاید ایک دو بار پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ ہدایات سی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ بہرحال میں کوئی سوا برس تک پوری وفاداری سے یہ کام کرتا رہا۔ اس دوران میں حمید ہاشمی نے جو خود بھی میرا ہم عمر تھا مجھے کچھ مارکسیت سمجھانی چاہی۔ وہ میرے سمجھ میں کسی تفصیل سے نہیں آئی مگر میں عمومی طور پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے نفرت کرنے لگا۔ پھر ترقی پسند ادب کی تحریک پھیلی اور کرشن چندر' بیدی' عصمت' منٹو (منٹو اس وقت ہم لوگوں میں ترقی پسند جانے جاتے تھے) اور سب سے بڑھ کر فیض صاحب چھپنے اور سامنے آنے شروع ہوئے تو سب کی طرح میں بھی ان کے رومانس میں بہہ گیا..... ویسے بنی نوع انسان کا احترام ہر درد مند نوجوان کو ہو سکتا ہے اس کے لئے سوشلسٹ یا ترقی پسند ہونا

ضروری نہیں۔ ہاں عملی میدان میں تفصیلی عقائد' حکمت عملی اور اقدامات کے لئے بہت سی واقفیت درکار ہے
بنی نوع انسان کا سب سے زیادہ احترام تو کورس میں علامہ اقبال کی نظمیں ہی پیدا کردیتی تھیں اگر اس سوال کے
جواب میں یہ وضاحت نہ کروں تو گویا آپ سے متفق قرار پاتا کہ بنی نوع انسان کا احترام صرف سوشلزم سکھاتا ہے
میرے خیال میں سوشلزم انسان کو سب کچھ نہیں سکھاتا۔ یہ بات اس کی مبینہ ناکامی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔
مسئلہ جو آج بھی موجود ہے اور شورائیہ روس کے عروج و زوال سے قطعاً" منتج نہیں انسانوں میں پیدا کردہ (نہ کہ
بعض حالات میں پیدائشی) ناہمواری کا ہے۔ مواقع میں مساوات اور ذہنی ارتقاء کا ہے اس کا واحد حل سوشلزم نہ
سہی اجتہاد کے ساتھ اسلامی نظریہ حیات بھی ہے۔ بلکہ بقول مولانا حسرت موہانی اپنی روح میں اسلام اور سوشلزم
ایک ہی ہیں۔ (وہ اپنے آپ کو اشتراکی مومن کہتے ہیں) لیکن میں اپنی عملی زندگی میں سوشلزم کے بیشتر مطالبات
پورے نہیں کرسکا۔ نظریاتی طور پر متاثر ضرور ہوا ہوں اور اب بھی ہوں۔ روس اور یورپ میں اس کی تصوراتی
شکست نہیں ہوئی۔ یہ سانحے غلط تعبیرات اور غلط ہاتھوں میں آجانے سے پیش آئے ہیں۔ خود اسلامی نظام امویوں
کے دور سے آج تک اپنی روح کے مطابق زیر عمل نہیں آسکا تو اس کے بنیادی اصولوں کی تغلیط نہیں ہوگئی۔
آئیڈیلز پورے ہونے میں ہزاروں برس لگ سکتے ہیں۔

میں کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں مسلسل جاتا رہا (حلقہ ارباب ذوق میں تو روایت کے مطابق
وقفوں وقفوں سے اپنا کلام بھی پیش کیا کرتا تھا) وہاں ادب کی بحثوں میں تحریکی اثرات وہدایات کے تحت نظریاتی
معیاروں پر پرکھنا ایک معمول تھا۔ مجھے ان صحبتوں سے تحت الشعوری طور پر کچھ ملا ہو تو ملا ہو مگر میں صف بندی
کے خلاف تھا۔ مارکسیت کے ادبی اطلاق سے بنیادی واقفیت بھی نہیں تھی۔ اپنی وضع کا غزل گو ہی رہا۔ (یقیناً یہ
میری بدنصیبی یا کم اکتسابی کہ میری غزل میں سوشلسٹ فکر نہیں جھلکی' دوہوں میں ضرور آمیز ہے نثر میں تو بہت
ہے) پھر انجمن کو حکومت نے سیاسی پارٹی قرار دے دیا۔ ہم سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی کے رکن یا شریک جلسہ
نہیں ہوسکتے تھے۔ بہتوں کی طرح مجھے بھی وہاں حاضری ترک کرنی پڑی.... آگے پاکستان میں ترقی پسند تحریک کی
ایک کہانی ہے۔ کراچی میں منعقدہ (غالباً" ۱۹۵۴ء) ایک کنونشن میں وہ باقاعدہ ختم بھی کردی گئی لیکن اس تحریک کے
انتہائی موثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ تنظیم تو اب ہندوستان میں بھی ختم ہوگئی۔ میرے خیال میں تحریک ختم
نہیں ہوئی۔ ہاں اس سے کمیونزم کے ساتھ باقاعدہ تنظیمی اور صف بندی جیسی وابستگی کی مخالفت پہلے بھی خود بعض
ترقی پسند کرتے رہے تھے.... بہرحال میں ان مباحث کو ادبی تاریخ و تنقید نویسوں کا کام سمجھتا ہوں۔ اسی لئے ایسے
سوالات پر الجھتا ہوں۔ میرے مسئلہ کتنا ہے اس میں سب کچھ فن و جمال کے ساتھ' آمیز ہونا چاہئے' واضح غیر مبہم'
نثری تحریروں کی اہمیت کم بھی نہیں۔ مسئلہ تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب میں کسی قدر فرق کا ہے۔ میں تخلیقی ادب سے
وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ یہی چاہتا ہوں۔

یہ جواب "اے میرے دشت سخن" کے شائع ہونے سے پہلے دیا گیا۔

○ شاعر، ادیب، کالم نگار، منتظم، ماہر معاشیات، بیدار مغز دانشور ہونے کے ساتھ آپ تیزی سے تحقیق و تنقید کے آدمی بنتے جا رہے ہیں آپ کی ان مصروفیات نے اردو ادب سے وہ بلند پایہ شاعر چھین لیا جس سے پروفیسر حسن عسکری کو بڑی توقعات وابستہ تھیں آپ اپنی ان مصروفیات کی روشنی میں اسے المیہ کہیں گے یا بہتری کی جانب سفر گردانیں گے؟

○○ میں ماہر معاشیات نہیں ہوں۔ ۱۹۴۲ء میں نے بی اے ضرور معاشیات کے ساتھ کیا تھا۔ ایم اے میں بھی داخلہ رہا مگر ایم اے کی تعلیم پوری نہ ہوئی شادی کر لی۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ نوکریاں البتہ ایسی ملتی رہیں جو ایک طرح عملی معاشیات، خصوصاً" اطلاقی مالیات سے واقف کراتی تھیں۔ کامرس، انکم ٹیکس، جزوی بینکاری اور آج تو معاشیات ایک بہت پھیلا ہوا اور اپنے ذیلی شعبوں میں بھی انتہائی مہارت طلب مضمون ہے۔ مقامی اخبارات اور بیرونی جرائد میں پڑھتا ضرور رہتا ہوں۔ مگر مہارت تو کیا کسی معقول درجے کی واقفیت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ بس کچھ علم و تجربہ ہو گیا ہے۔ (بر سبیل تذکرہ، ہمارے انگریزی اخبارات کے بعض معاشی تبصرہ نگار بھی ایم اے معاشیات تک نہیں ہیں) یا "جنگ" میں ایک معیشتی کالم اس مضمون کو پاکستانی حوالے سے اردو دانوں میں متعارف کرانے کے لئے شروع کرنا پڑا۔ بحمد اللہ کامیاب رہا۔

۲۔ میں بلند پایہ شاعر ہونے کے امکانات رکھتا تھا یا نہیں یہ تو پروفیسر عسکری مرحوم جانیں یا کوئی اور، ابتدا میں تو شاعر ہی تھا۔ شاید کچھ ترقی بھی کرتا اور جتنی شاعری کی ہے۔ اس پر کچھ زیادہ معذرت خواہ بھی نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ غزلیہ شاعری کی مقدار بہت کم رہ گئی۔ وجوہ میں کالم نگاری (جزوی حد تک) لیکن ملا جلا کر۔ یہ کئی وجوہ بھی ہیں (۱) گلڈ کی تاسیس اور تنظیم نجار دسمبر ۱۹۵۸ء سے مارچ ۱۹۷۰ء تک (۲) انجمن ترقی اردو اور اردو کالجوں سے گہرا انتظامی تعلق ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۳ء تک جب کالج تو میائے گئے، انجمن سے تعلق جاری ہے۔ (۳) گلڈ اور کالموں کی وجہ سے نوکریوں کا جانا اور بے روزگاری کی پریشانیوں کے ساتھ نئے روزگار کی تلاش (۴) پھر اس میں شاعری یا شہرت کی بناء پر مراعاتی قسم کا ذریعہ روزگار لینے کے بجائے میرٹ پر دوسری نوکری حاصل کرنے اور اس میں شدید محنت کر کے باعزت طور پر اپنے آپ کو جمانا (۵) اپنی قربانیوں اور محنت کے جواب میں نہ صرف داد نہ ملنا بلکہ بے داد ملنا...... اس سے اتنا سخت فرسٹریشن ہوا کہ ایک وقت تو کبھی خدمت خلق چھوڑنے والا تھا مگر جذبے نے قائم رکھا (۶) وقت کے ساتھ ساتھ فکری افق کا اونچا ہونا۔ ساتھ ہی جمالیاتی معیار بدلنا اور معیار شعر کا بہت اونچا ہو جانا جس پر پورا اترنے میں بڑی جو کھم لگتی تھی (لگتی ہے) ۱۹۸۵ء کا ایک شعر

میں جو رہا ہوں بے سخن یہ بھی ہے احترام فن
یعنی مجھے عزیز تھی اپنی غزل کی آبرو

میرے ان بیانات کی تہہ میں بعض مجزو معیار اور گاہے گاہے عالمی معیار ہوتے ہیں جو بادی النظر میں کھل نہیں پاتے اور اپنی "اوقات شناسی" یا منسکر المزاجی کی بنا پر واضح بھی نہیں کیا کرتا یقیناً وقفے آئے وقفے چھوڑ کر وہ ہے برابر کہتا رہا اور ان پر بالکل شرمندہ نہیں ہوں۔ اس تعطلِ غزل کے زمانے میں اصل 'پرانا' پاکستان ٹوٹ چکا تھا۔ باقی ماندہ کو مایوسی سے بچانا تھا شعوری یا غیر شعوری طور پر قومی مطالبوں کے زیر اثر بہت سے قومی نغمے آسان زبان میں لکھے (کتاب چھپی ہوئی ہے) ان پر بھی قطعی شرمندہ نہیں ہوں..... گاہے ماہے اپنا طویل نظمیہ "انسان" لکھتا رہا ہوں۔ وہ جس دن پورا چھپ گیا بلند پایہ کا فیصلہ تو الگ سے ہو سکتا ہے جس کی پیشن گوئی بھی نہیں کر سکتا میرا "مسلسل شاعر" ضرور آپ کو نظر آجائے گا۔ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ مستقلاً "چھین لیا..... بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی کہتا رہا۔ (قومی حالات اور ذاتی 'حد سے بڑھی ہوئی' حساسیت نے فرسٹریشن 'ایک شدید بیزاری' پیدا کر دی تھی) بہت سے وہ ہے جو برسوں سے مشاعروں میں پڑھتا ہوں وہ بھی چھپے ہوئے نہیں۔ بڑے ضخیم جرائد میں سے کس کو بھیجوں کس کو نہ بھیجوں 'گروپ بندیاں ڈراتی ہیں۔ نوجوانی چھوڑ کر پہلے بھی مدیران گرامی کو خطوط اور کلام کی آزمائش میں نہیں ڈالتا تھا "شہرت" نے وہ عادت نہیں بدلی۔ کوئی معیاری جریدے کا مدیر تلوار لے کر کھڑا ہوتا نہیں کہ شعر دو ورنہ جان سے مار دیں گے۔ کچھ مایوس بھی ہو گئے۔ لیکن واضح رہے کہ کالم نگاری نے بہت سی وہ باتیں 'آسان اور غیر جمالیاتی' غیر فنی زبان میں کہلوا دی ہیں جو شعری زبان میں بڑی اور اچھی لگتیں مگر پھیل نہ پاتیں جب کہ نثری اظہار عام آدمی تک پہنچتا ہے۔ یقیناً نثر نے میرے چھوٹے سے تخلیقی خزانے میں سے بہت سا مال لے کر استعمال کر لیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ سفرنامہ چھوڑ کر میری کالم نگاری (۱۹۸۹ء تک بغیر معاوضہ) خالصتاً ایک مشن کے تحت رہی 'کیا مشن؟ قومی یکجہتی' خرد افروزی' اقدار درستی' مستقبلیات 'سائنس کا فروغ (خالصتاً اسلیے کہا کہ ریٹائرمنٹ ۱۹۸۹ء سے کچھ معاوضہ لینا شروع کیا ہے ورنہ پورے ۲۵ برس یہ کالم بالکل بے معاوضہ رہا) کیا لکھا ہے یہ ریکارڈ پر اور کتابوں (دعا کر چلے 'صدا کر چلے) میں محفوظ ہے (وفا کر چلے' کی کئی جلدوں میں بھی آرہا ہے) جو لکھا اس پر بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ اس نے وقت لیا' خیال لئے' فکر لی' جذبہ لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب میری شاعری کے خام مال کے حصے سے لیا گیا سو کیا ہوا۔ ایک مقصد کی طرف تو چلتا رہا ہوں شاعری یقیناً ایک ارفع فن ہے مگر شاید خلق خدا کی اپنے وطن کی راست خدمت اس سے کم ارفع نہیں۔ اگر آپ بہت اور اعلیٰ شاعری نہ کر سکیں مگر کچھ اور اچھے کام کرنے کی کوشش کرتے رہیں تو کم از کم خود اسٹاک ٹیکنگ کے وقت اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ معاصرین اور تاریخ جو فیصلہ دیں وہ ان کا کام ہے شاعر کے لئے یہ تصور کہ اسے اور کچھ نہیں کرنا چاہئے میرا تصور نہیں۔ شاید میں کل وقتی شاعر رہنے کے قابل بھی نہیں تھا کون کون سا شاعر اور کس معیار کے ساتھ بنا یہ لوگ جانیں۔ خود شاعری ذاتی تسلی یا چلئے کسی آفاقی جستجو کے ساتھ کیا ہے؟ یہ شاید دوبارہ طے کرنا پڑے۔ بر سبیل تذکرہ مجھ سے ایک ٹی وی انٹرویو میں پروین شاکر نے پوچھا کہا جاتا ہے۔ (حالانکہ وہ ظاہراً" ہی سہی۔ جیسی تکریم۔ میری اور میری

بیوی کی کرتی تھیں اس کے مطابق خود ان کا سوال نہیں تھا۔ بعد میں پتہ بھی چل گیا کہ ان سے پچھوایا گیا تھا)
"آپ نے ادب کی کم اور ادیبوں کی زیادہ خدمت کی۔" میں نے فوراً کیا جواب دیا؟ اس پر غور کیجئے گا۔ میں نے اپنی کسی مفروضہ شعری خوبی کی شان میں کوئی فلسفہ نہیں بگھارا۔ یہ نہیں کہا کہ میں نے کم کہا ہو مگر ایسا کہا ہے ویسا کہا ہے۔ بلکہ یہ جواب دیا کہ اگر آج بھی میرے تمہیں تمہارے معیار کی سو غزلیں نظمیں ایک طرف اور کسی ادیب کی بیوہ یا بچی کے لئے ۶۰۔۱۹۵۹ء کے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ دلوانے کی حیثیت یا طاقت دوسری طرف رکھ دیے جائیں اور مجھ سے پوچھا جائے کہ تم ان میں سے کسے قربان کرنا پسند کرو گے تو میں وہ غزلیں، نظمیں قربان کردوں گا۔ جب بھی میرے بس میں ہو ایک بیوہ کی باعصمت خوددارانہ زندگی ایک یتیم بچی کی آبرومندانہ پرورش میرے لئے کسی کی بھی نظر میں بہترین سو غزلوں ہی نہیں تمام شاعری سے زیادہ قیمتی اور محترم ہے۔ ساتھ ہی میں نے کہا مجھ جیسے (یہ نہیں کہا کہ تم لوگوں جیسے یا بہت سے) شاعر تو آتے رہتے ہیں۔ اپنی ادیب برادری کے لئے بے غرضانہ کام کرنے والے ہم ادیبوں میں ذرا کم پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر ہونے کے بارے میں بھی میرا تصور Elitist نہیں ہے۔ اور میرا یہ موقف اپنی کسی نااہلی کی وجہ سے نہیں بجا غلط ہو تب بھی میری حد تک طبعی اور سچا ہے۔ میں نے شاعری کی عزلت سے اوروں بھی زندگی میں بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ جن کی میں کچھ بھی خدمت کرسکوں میری شاعری جاری رہنے کی قیمت پر دکھ جھیلے جائیں۔ ہاں تمام کارجہاں میرے یا کسی کے بس میں نہیں۔

میرے شعر کی تعداد کم ہوجانا المیہ بھی ہے۔ مگر میرے لئے اس حد تک نہیں، یہ بھی دیکھ لیجئے کہ میں نے شاعری کی قیمت پر وقت شراب و کباب اور ادب کے بہانے محض مخالفانہ یا موافقانہ ذاتی یا گروہی مباحث (زبانی، تحریری، قضیوں) میں نہیں گزارا (نوجوانی کی ایک منزل یا اوائل یا جوانی کی اور بات ہے) میں نے اپنی کوتاہیوں اور ذاتی عیوب کے باوجود دوسروں کے لئے اچھے کام ہی کرنے چاہے "کار آمد عمارتوں کی اچھی بنیادیں ڈالنی چاہیں۔ کم خرچ پر۔ مفت بھی۔ اچھے طلباء و طالبات پیدا کرنے چاہئے۔ یہ میں کس حد تک کرسکا۔ نہیں جانتا۔ آج اردو سائنس کالج میں ساڑھے چار ہزار طلباء و طالبات گھومتے ہیں۔ میں انہیں اپنی اچھی بری ان کہی غزلیں، دوہے، گیت سمجھتا ہوں بلکہ کالج میں تو گیارہ ہزار کے قریب ہیں۔ مولوی صاحب کے بعد، ان کے بچ جانے میں اور نئے کالج (سائنس) کی تعمیر میں اسکی چہل پہل اور اس کے آئندہ امکانات میں کچھ فیصد میرا بھی حصہ ہے۔ میرے لئے یہ کافی ادائے قرض نہ ہو کر بھی کافی ہے۔ مولوی صاحب کے بعد انجمن برقرار رہ گئی۔ کچھ کام بھی کرگئی۔ کرتی رہتی ہے۔ علم پھیلتا ہے۔ چند فیصد میرا بھی حصہ ہے۔ کافی نہ ہو کر بھی میرے لئے کافی ہے۔ گلڈ نے پہلی بار سب پاکستانی زبانوں کے ادیبوں کو آپس میں متعارف کرادیا تھا۔ ہم قومی یکجہتی کی طرف جارہے تھے۔ کئی سمتوں میں کام شروع ہوچکا تھا اور شہاب صاحب تو ۱۹۶۳ء میں سفیر ہو کر ہالینڈ چلے گئے اور ۱۹۶۷ء میں واپس آئے۔ مرکزی کام

میں ہی کرتا رہا اور میرے دور کی حد تک مختلف زبانوں کے ساتھ معذور بیمار مستحق ادیبوں اور مرحومین کے خاندانوں کے باعزت وظائف مقرر ہو گئے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسے وظیفوں کی طرح پڑ گئی۔ اس سے پہلے یہ روایت کہاں تھی! ایک آدھ بڑے کی سرپرستی ہو جاتی تھی۔ مثلاً مخدومی حفیظ جالندھری کو کسی نہ کسی بہانے کچھ ملتا رہتا تھا کہ بڑے شاعر تھے۔ کمیونسٹ 'کم معروف' احمد ریاض جیسے ادیب کی بیوہ اور بچی کو کون پوچھتا تھا۔ اب یہ' خواہ کم مقدار' وظیفے ایک لازمہ ہیں مگر افسوس کہ بعد ازاں ان کے معاملے میں بھی سیاسی پسند اور ناپسند در آئی ہے گرانی کے لحاظ سے اضافے بھی نہیں کئے جاتے۔ عہدہ دار اپنی تنخواہوں اور مراعات میں برابر اضافے کئے جاتے ہیں۔ ہم بھی کافی نہ دلوا سکے مگر جو خدمت کرتے بے معاوضہ کرتے تھے۔ بہرحال ادب' علم' ادیب' کے حوالے سے۔ میری حقیر شخصیت کو مینیجر کے طور پر لیجیے تو بہت نہ ہو کر بھی کسی قدر لائق توجہ ضرور لگے گی۔ عیب ہم عصری یا میری نام نہاد لسانی عرفیت جو کوئی مجھ پر تھوپ دے اور پھر اپنے لقب اور عرفیت کی نظر سے دیکھے تو یہ اس کا کام ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ یہ باتیں تاریخ کو بھی آلودہ کردیں یہ اور بات ہے کہ مجھے تاریخ پر شبہ رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ منصف ثابت نہیں ہوتی۔ انصاف اپنا ضمیر ہی کرتا ہے۔ اس کے لئے کسی مخصوص شہرت یا تاریخ تک کی سند ضروری نہیں۔

مجموعی طور پر میرا کوئی سفر میرے معیار کے لحاظ سے بہتری کی طرف نہیں رہا۔ رستہ ایک کب تھا۔ بیک وقت کئی راستوں پر چلنے والا آدمی کسی ایک پر چل کیسے سکتا ہے۔ لیکن یہ کوئی کمتری برتری کا مسئلہ بھی نہیں۔ یا میں خود فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اتنا ہے کہ محنت اور عزت سے روٹی کمانے کی عادت وقت بہت کھا جاتی ہے۔ ادیبوں کی کچھ خدمت کی۔ علم کی کچھ خدمت کی۔ ادیبوں کی عملی خدمت کے لئے ادارہ ضروری سمجھا' بنایا۔ اس کی کہانی جدا ہے۔ اگر تقریر سے کچھ خدمت ہو سکتی ہے یعنی معاشرے اور حکومت پر دباؤ پڑ سکتا ہے تو وہ جاری رہی اور جاری ہے۔ علم کی ایک عملی خدمت کا شعبہ کالج تو میا لیا گیا۔ گیا۔ بعد میں اس کی منتظمہ پر نامزد ہوا تو بہتری کے لئے جو کر سکتا تھا کیا اگر تحریر سے کچھ خدمت ممکن ہے مثلاً خواندگی' تعلیم' سائنس کے فروغ پر' خرد افروزی' قومی یکجہتی کے لئے اپنی بساط بھر دباؤ ڈالنا' فضا پیدا کرنا تو وہ کالموں کے ذریعے جاری ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد شعر کی طرف پھر زیادہ متوجہ ہوا تھا۔ لیکن اتنے بڑے' مقداری خلاء کو پر کرنے کے لئے جتنا وقت چاہئے۔ شاید اب وہ نہیں بچا۔ بہرحال اب ریٹائرمنٹ کے بعد سے مشاورتی ملازمتوں کی اچھی اچھی پیشکش چھوڑ کر بھی ادب کا کام کرنا چاہا تھا۔ ایک برس بکھرے ہوئے مختلف النوع کاغذات جمع کرنے' سفروں' مشاعروں میں لگ گیا۔ پھر فوراً ہی پورا ڈیڑھ برس ہسپتال میں رہتے ہوئے والدہ کی ہمہ وقت تیمارداری' اسی زمانے میں خود دل کے دورے میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں رہا۔ ان کے انتقال کے چند روز بعد ہی ایک سگی بہن کے شوہر (غالباً "ڈاکوؤں کے ہاتھوں) ایک صبح اپنے گھر میں ہی اس طرح قتل ہوئے کہ سراغ تک نہیں ملا۔ پھر اپنی طرف سے بے یقینی کی نفسیاتی الجھنوں میں پھنس گیا۔

کچھ اموات سے قریبی رشتے داروں کی نئی ذمہ داریاں آپڑیں۔ کراچی کی زندگی ہر وقت سخت تکلیف دہ اثرات پیدا کرتی رہتی ہے۔ ذہن بنا ہوا ہے۔ ساتھ ہی "ادبی سماجیات" سے کامل لاتعلقی بھی ممکن نہیں۔ مجبوراً بے شمار جلسوں میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں تقریر وغیرہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ حاضرین میں ہمیشہ چند بہت دکھی شناسا اور اجنبی اپنی اپنی ضرورت سے مل جاتے ہیں وہ گھیر لیتے ہیں۔ ان کے حالات ہی ایسے ہیں کہ مجھ جیسا بے طاقت' بے اثر بھی سہارا لگتا ہے۔ کاش میں اس سب کو فلسفیانہ کراچی توجہ صرف اپنی تخلیقات پر مرکوز کر سکتا۔ مگر یا مجھ میں اتنا تخلیقی دم ہی نہیں یا دکھی ملاقاتیوں کو نظرانداز کرنا میرا مزاج نہیں کیونکہ میں خواہ تھوڑے عرصے کے لئے سہی ان معاملات میں بڑا دکھی رہا ہوں چنانچہ ان کے لئے بھاگ دوڑ بہت سا وقت اور توانائی کھینچ لیتی ہے۔ انجمن کے چند مسائل پریشان کن ہو گئے ہیں وہ الگ۔ ساتھ ہی جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو اپنی تقابلی بے بضاعتی کی شدت کچھ نہیں کرنے دیتی۔ بد قسمتی کہ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں متفرق مضامین کو اگلی گہرائی میں جا کر پڑھنا چاہا۔ وہ کچھ سامنے آیا اور آتا ہے کہ معیار ہی بدل گیا۔ اس معیار کے مطابق کہنا سخت مشکل ----- یوں کوئی بھی کہنہ مشق بلکہ موزوں طبع ایک دن میں دو ڈھائی سو نہ سہی ٹھیک ٹھاک پچاس ساٹھ شعر تو کہہ ہی سکتا ہے۔ ایسی کوانٹٹی (Qauntity) سے میری تسلی نہیں ہوتی لیکن اگر کچھ غزلیں 'کچھ دوہے اور کہہ سکوں اور "انسان" کے حصے جوڑ سکوں تو شاید مجموعی طور پر یا آخر آخر کوئی قابل توجہ مقدار و معیار بھی چھوڑ جاؤں گا۔ شاید وہ کسی معیاری بہتری کی جانب سفر بھی قرار پا جائے۔ لیکن اب میں اس سوال کے جال میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتا۔ میرے تخلیقی سفر پر دوسرے رائے دیں تو بہتر ہے یعنی یہ میرا حق نہیں ان کا ہے۔ "آج" سے مجھے پورے انصاف کی توقع نہیں کیونکہ میں گلڈ کی وجہ سے ادباء کے کئی معاملات میں بہت فعال رہا۔ وقت کتنا آگے چلا گیا ہے۔ اگر یہ کوئی بری مثال تھی تو اس سے بھی بدتر مثالیں پیدا ہو چکی ہیں مگر یار لوگ میرے ہی پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ بے شک بہت سے تجزیہ نگار قیام گلڈ کے مدح خواں بھی ہیں وہ ایک ضرورت تھا۔ تحفظ کی چھتری' قومی یک جہتی کی طرف سفر..... مگر بعض شاکی بھی ہیں۔ شکایتیں تلخ یادیں چھوڑ جاتی ہیں۔ میرے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے ساتھ ہی یہ کہ گلڈ چھوٹا تو میں نے کوئی گروپ نہیں بنایا اور میں اپنے اسی کلیشے "پاکستانی قومیت" یا قومی یکجہتی سے چمٹا ہوا ہوں یعنی اسی پر لکھے جاتا ہوں جبکہ بعض فاضل اور معتبر اردو نقاد بھی اندر سے گروپ بندی اور کچھ تو صوبائیت زدگی کی رو میں بھی بہہ گئے ہیں ابھی میری ادبی نثر اور شاعری پر لکھتے وقت یکسوئی کے ساتھ نہیں لکھ سکیں گے۔ کبھی ادبی محاکمہ گلڈ کے حوالوں سے کبھی میرے ان موقفوں سے اپنے (خواہ) جائز اختلافات میں آمیز کریں گے جو میرے اظہاریوں سے پیدا ہوتے ہوں۔ یہ قابل فہم ہے لیکن شاید ایک وقت ایسا آئے جو میری موت کے بعد ہی آئے گا جب کوئی بے تعصبانہ طور پر میری شاعری اور نثری کاوشوں اور مجموعی حیثیت کا محاکمہ کرے گا۔ شاید اس وقت میرے بارے میں کوئی معروضی گفتگو ہو سکے۔ فیصلہ میں نہیں جانتا کیا ہو گا۔ یوں آج بھی بعض محترم ناقدین و محترمین میرے کچھ

کاموں کچھ تخلیقات کی ستائش کرتے ہیں مگر ہم عصری ہم عصری ہے۔ بے گروپ ہونا' بے گروپ ہونا ہے ساتھ ہی وہ عجیب و غریب مقبولیت جو مجھے پاکستان اور پاکستانیوں میں قومی نغموں اور پاک ہند میں دوہوں سے ملی ہوئی ہے۔ اور پاکستان سے باہر مشاعروں میں بھی وہ ابھی کسی معروضی تنقید کی راہ میں حائل لگتی ہے۔

جی ہاں! میں نے عسکری صاحب کی توقعات کے بارے میں "لاحاصل" کی اشاعت کے وقت یہ لکھ دیا تھا۔ اول تو کسی کو بھی خالص' بے داغ' بے تنازعہ شہرت اسکی زندگی میں نہیں مل سکتی کیونکہ ہمیشہ کوئی دوسرا نقطہ نظر کچھ محض حاسد ' کچھ مسابقت میں حصہ لینے والے اور اپنی اپنی سچائی کے مطابق اختلاف کرنے والے بھی ہوتے ہیں اور جناب' پیغمبروں اور آئمہ معصومین کے علاوہ کون انسان غلطیوں سے پاک ہوتا ہے۔ میں نے اپنی شہرت کو سچائی کے ساتھ متنازعہ فیہ کہہ دیا ہو' آج سبھی نام نہاد مشاہیر متنازعہ فیہ ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت شاعر نہ سہی بہ حیثیت منتظم ہی' حقیقتاً" گلڈ بہت دن تک ایک متنازعہ فیہ ادارہ رہا۔ گو اس سے تقریباً سبھی معاصرین نے دلچسپی بھی رکھی اور اس میں اپنے اپنے تحفظات کے ساتھ خوب حصہ بھی لیا۔ فیض صاحب' قاسمی صاحب' شیخ ایاز' امیر حمزہ شنواری سینکڑوں محترمین ان میں شامل ہیں۔

گلڈ ایک بڑا موضوع ہے مگر اب تک جتنے انٹرویو میں نے دیئے ان سوالوں کی حدود میں دیئے جو کیے جاتے ہیں۔ اپنی بات بہت کم کہہ سکا۔ ایک مضمون زیر تحریر ہے۔ "پل بنا گلڈ بنا"۔ اس کی تکمیل میں دوسرے کام حارج ہیں اور یہ وجہ بھی کہ میں اسے ممکنہ حد تک دستاویزی شواہد کے ساتھ لکھنا چاہتا ہوں جن کے لئے بہت سا مواد جمع کرنا اور اسے چھاننا ہے لیکن اس وقت مختصراً" یہ ریکارڈ کر دیا جائے کہ یہ میری حد تک ایک بڑا سنجیدہ اور ہمار یعنی ادیبوں کا ایک بہت بڑا ناقابلِ مثال اور ایسا ادارہ تھا جس کی ضرورت آج پہلے سے زیادہ ہے۔ ہمارے ہمہ لسانی ادیبوں کو ایک ایسا ادارہ بہر حال درکار ہے۔ جہاں وہ سرکاری نامزدگیوں کے ذریعے نہیں بلکہ صحافیوں کی طرح اپنے انتخابی نظام سے اپنے مسائل اور مقاصد کے لیے کام کریں۔ جو کسی سرکار کا ماتحت نہ ہو۔

○ آپ نے کسی انٹرویو میں فرمایا کہ مجھے گلڈ سے شہرت تو ملی مگر متنازعہ کچھ تو حقیقت ہوگی جس کا یار لوگوں نے فسانہ بنا لیا ورنہ صورتحال یہ نظر آتی ہے کہ ساری خدائی ایک طرف تنہا آپ ایک طرف۔

○○ ایسا نہیں ہے کہ ساری خدائی ایک طرف..... بحمد للہ آج بھی ملک و بیرون ملک میری عوامی مقبولیت آپ کے سامنے ہے میرے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اور باتیں چھوڑیئے جب تک جیوے پاکستان کا نعرہ کسی بھی گھر میں زندہ رہے گا۔ کوئی میرا نام ہر جگہ سے خارج بھی کرا دے تب بھی پاکستانی مجھے نہیں بھول سکتے۔ ادب کے Assessment پر پہلے کہہ چکا ہوں۔ دوہوں پر عرض کر چکا ہوں۔ ہندوستان تک کے کونے کونے میں (دیوناگری رسم الخط میں بھی کر کے) پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔

"گلڈ سے شہرت ملی مگر متنازعہ" اس کو کسی مبہم حقیقت سے کیا وابستہ کرنا۔ گلڈ کا مارشل لاء کے دور میں بننے

کی وجہ سے متنازعہ ہونا خود ہی ایک حقیقت ہے مگر درجہ بدرجہ سب بانیان اور جو شامل ہوتے گئے۔ فیض صاحب' قاسمی صاحب' شوکت صدیقی' بہت سے بائیں بازو کے محترمین' سب متنازعہ ہوتے رہے۔ مگر وہ معاملہ فہم بزرگ تھے۔ ہیں۔

فی الحال گلڈ کا جریدہ "ہم قلم" سالگرہ نمبر ۱۹۹۹ء دیکھ لیا جائے۔ بہت سے کتب خانوں میں اور سینئر ادیبوں کے پاس ہوگا۔ اس وقت بھی میں نے ان تمام شبہات' بیانات اور تاثرات کو اپنی سالانہ رپورٹ میں دہرا رکھا ہے جو اس میں چھپی ہوئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اکادمی ادبیات سے پچھلے مارشل لاء میں تعاون اور فائدے اٹھانے کا ذکر نہیں ہوتا۔ اب بھی سبھی جاتے ہیں۔ جسے جو ملتا ہے چھوڑتا نہیں جبکہ اکادمی متنازعہ فیہ رہی اور اب بھی ہے۔ گلڈ پر ایک علیحدہ کتاب آرہی ہے۔ یہ انٹرویو تمام باتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اتنا یاد دلاتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں (اسی شائع شدہ ریکارڈ کے مطابق)

۱۔ کنونشن نجی شعبے کے اور ادیبوں کے اپنے خرچ پر ہوا تھا۔

۲۔ کنونشن کے آغاز سے ہی عہدہ داروں کے معاملے میں انتخابات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس وقت اور اگلے برسوں میں سینکڑوں امیدوار۔ سب انتخابات کے نتائج اور لوگوں کے نام ریکارڈ پر ہیں۔ آپ حیرت انگیز طور پر تمام سیاسی مکاتب فکر کے ادیبوں کو ایک جگہ دیکھیں گے۔ سب کی اپنی اپنی وجوہ تھیں۔ میں کہانی نہیں بیان کر رہا ہوں۔ مگر وہ پہلے تجربے سے Fascinate بھی ہو رہے تھے۔

۳۔ ہمارا قرضوں سے خرید کر حاصل کیا ہوا اور قرض ادا کرنے کے بعد "گلڈ ہاؤس"

اب بھی گلڈ کے پاس تقریباً چودہ کروڑ کے اثاثے لاہور والی عمارت اور زمین کی صورت میں' موجود ہیں۔

۴۔ سینکڑوں بڑے چھوٹے ادیب پچھلے مارشل لاء کے زمانے میں سرکاری خرچ کی مہمانی پر اکادمی ادبیات کے بلائے ہوئے جلسوں میں جاتے رہے اور جاتے ہیں۔ وہاں کبھی کوئی انتخاب عہدہ داران نہیں ہوا۔ اکادمی کے سربراہ نامزد نیم سرکاری ملازم ہوتے ہیں اور منتظمہ بھی سو فیصد نامزد ــــــــــ

پچھلے مارشل لاء کے حالات اور آج ملا کر پورا پس منظر سامنے رکھا جائے تو گلڈ کا قیام اور کام شاید اتنا متنازعہ نظر نہ آئے ــــــ لیکن میرا خیال ہے اب یہ بستہ بند ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ میری اہمیت اتنی ہے ہی کہاں کہ آپ پرانی باتیں دہرا دہرا کر مجھے مسلسل مجروح کرتے رہیں۔ خدارا مجھے مت کہنے دیجئے کہ کب کب کون کون صرف اپنی خاطر کن کن سمجھوتوں میں مبتلا ہوتا رہا ہے۔ کسی دوسرے کے لئے کچھ نہیں کیا اور جب موقع ملے میری گلڈیت کا رونا لے بیٹھتا ہے۔ بلکہ پرانے ناقدین گلڈ میں سے بیشتر اس کے رکن بھی تھے اور یہ مجبوری نہیں بلکہ بڑی خوشی سے الیکشن بھی لڑتے تھے۔ کوئی ادبی انعام ملتا تو وہ بھی لیتے تھے۔ ماشاءاللہ سب نام حوالوں سے ریکارڈ پر ہیں۔ اسوقت ایسی باتوں سے آلودہ ہونا اچھا نہیں لگتا ورنہ۔ خیر

○ ہمارے ناقص علم کے مطابق آپ کی زندگی کا سنجیدہ دور گلڈ کے تلخ تجربے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی کے

بعد آپ کا سفرنامہ آتا ہے آپ کی کالم نگاری شروع ہوتی ہے آپ کے دوہوں میں نکھار آتا ہے۔۔۔۔۔۔ ملی نغموں کی کسک آپ کے دل میں کب اور کیونکر نمایاں ہوئی اور کس سبب آپ اس مقدس فریضے سے کسی قدر کم تعلق ہوگئے؟

○○ سنجیدہ دور سے مراد کیا ہے یہ میں نہیں سمجھا۔ میری پہلی کتاب تو ۱۹۵۷ء میں چھپ گئی تھی ۵۸ کے وسط تک میری شہرت خاصی دور تک پہنچ چکی تھی۔ میں ۱۹۵۶ء میں اختر الایمان کا خاکہ لکھ چکا تھا (مطبوعہ نیا دور '۱۹۵۶ء) ہاؤسنگ سوسائٹی کا الیکشن لڑ کر کامیاب ہو چکا تھا۔ کئی ٹریڈ یونین ٹائپ اداروں میں منتخب ہو کر کام کر چکا تھا۔ کنونشن بلاتے وقت میری عمر ۳۲ برس کی تھی ہاں مجھ میں کوئی خاص سیاسی' سماجی بالغ نظری نہیں تھی۔ (شاید اب بھی پیدا نہیں ہوئی) سفرنامے ۱۹۶۳ء سے شروع کئے۔ وہ بھی کالم نگاری کے ذیل میں آسکتے ہیں کہ سلسلہ دار اور باقاعدہ تھے دوہوں میں نکھار تو بہتوں کی رائے میں ۱۹۴۵ء سے ہی آگیا تھا۔ ملی نغمے البتہ ۱۹۶۵ء سے شروع ہوئے جب رن آف کچھ کی لڑائیاں شروع ہوئیں اور پھر بہت جلد پہلی بڑی جنگ ۱۹۶۵ء آگئی۔

میں اس مقدس فریضے سے کم تعلق نہیں ہوا۔ مگر یہ فریضہ بنیادی طور پر الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہی پوری طرح ادا ہو سکتا ہے۔ ورنہ ملی نظمیں کیا کم تھیں۔ میں نے ایک ٹی۔وی انٹرویو میں سجادؔ میر سے یہ کہا کہ قومی نغمے کلام اقبال کے چند گوشوں کی میڈیا توسیع ہیں۔ دراصل یہ نغمے بیشتر "عوام" کے لئے لکھے گئے تھے۔ جن کی اکثریت خواندہ نہیں اور جو ان سے پہلے ریڈیو پر صرف فلمی گانے سنتے تھے۔ (ٹی وی بعد میں آیا) جب اللہ کی مہربانی سے میرے نغمے بہت مقبول ہوتے گئے اور دوسرے بھی اس طرف آئے اور کافی کامیاب رہے تو اول میں خوش ہوا کہ ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آرہی ہے۔ دوم صرف میرے لئے جو جگہ بنی تھی وہ پھیلی اور اسے دوسرے معاصرین بہت اچھی طرح پر کرنے لگے۔ بہرحال آپ دیکھیں گے کہ ۱۹۷۶ء تک میں نے زیادہ نغمے لکھے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں مجھے PPP کا ٹکٹ برائے قومی اسمبلی ملا۔ میں الیکشن لڑا اور ہار گیا۔ پھر مارشل لاء لگ گیا۔ چند مہینے کو میری نوکری بھی گئی۔ میرا نام وائٹ پیپر میں بھی آگیا۔ نہ جانے کیا کچھ گزری۔ جن غیر سیاسی کارکنوں (اساتذہ' بینکر ملازمین وغیرہ) نے میرے الیکشن میں محض میری خاطر کام کیا تھا سخت دھمکیوں اور خطروں سے دوچار تھے۔ انہیں بچانا تھا۔ وہ سیاسی کارکن نہ تھے۔ بال بچوں والے تھے۔ انہیں عتاب سے بچانے کے لئے مجھے کتنے عذاب اٹھانے پڑے ہیں۔ ایک پوری کہانی ہے۔ چونکہ مجھ پر کوئی الزام بددیانتی یا الاٹمنٹ' پرمٹ وغیرہ لینے کا نہیں تھا۔ اس لئے میرے خلاف کوئی فوجداری کارروائی نہیں ہوئی نہ پوچھ گچھ' بس ذہنی ٹارچر' بہرحال جناب غلام اسحاق خان کی کوششوں سے میری نوکری چند مہینے بعد بحال کردی گئی۔ مگر عملاً میں ریڈیو' ٹی۔وی پر اس تمام مارشل لاء کے زمانے میں ممنوع رہا۔ اتنے برس "جیوے پاکستان" کے علاوہ جسے قتل کرنے کے لئے کسی مارشل لاء کو بھی بڑی ہمت چاہئے میرا کوئی نغمہ ان میڈیا نے نہیں چلایا۔ نئے کا سوال کہاں پیدا ہوتا تھا کہ لکھواتے اور سنواتے/

دکھاتے۔ پھر بھی میں نے چند لکھے اور وہ ناگزیر طور پر آہستہ آہستہ تقریبات چھ ستمبر، مارچ، اگست میں بجتے رہے لیکن اس دوران میں اتنے طویل امتناع نے زیادہ بڑا خلاء بھی پیدا کیا اور میرے خلاف غیر ضروری حسد و سازش کو بھی زیادہ کامیاب کرا دیا غیر ضروری اس لئے کہتا ہوں کہ میں اجارہ داری کا قائل نہیں۔ میں تو دوسروں کو خود اس طرف لانا چاہتا تھا کہ ایک قومی ضرورت ہے۔ جتنی بہتر ہو سکے جتنے لوگ کر سکیں۔ معاصرین اور سینئرز بھی اس طرف آئے۔ پھر جونیئر لوگ بھی آ گئے۔ میں نہ تو وزیروں سے ہاب ناپ کرتا تھا۔ (اب بھی نہیں کرتا) نہ ٹی وی کے متعلقہ افسران سے "مطلوبہ" پی۔ آر کا قائل، کبھی دوسرے لوگوں کے رستے میں حائل بھی نہیں ہونا چاہا۔ ایک رجحان بحمد للہ قائم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ اب یہ میدان وسیع ہو گیا ہے۔ سبھی کا کام ایک آدمی تو نہیں کر سکتا۔ پھر میری دو شرائط بھی ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ دھن میری مرضی سے اور میری منظوری سے بنے گی۔ وہ عموماً" سہیل رعنا بناتے تھے۔ وہ ٹی وی کے آنے کے بعد ریڈیو پر تو جاتے ہی کم کم تھے۔ پھر مہنگے بھی ہو گئے۔ کمپوزر مجھے نیاز صاحب اور خلیل صاحب بھی پسند تھے کہ ساتھ کام کر سکتے تھے۔ خلیل صاحب لاہور میں ہیں۔ نیاز کو بوجوہ بعض پروڈیوسر پسند نہیں کرتے۔ میں اپنے اس انتخاب پر اس لئے زور دیتا ہوں کہ ملی نغمہ ملی یا قومی نظم سے مختلف تخلیق ہے۔ اس میں ادبی جمالیات اور فکری تراوشیں آسان زبان میں آجائیں تو کیا بات ہے لیکن اس کا اصل مقصد عام پاکستانی کے دل میں اتر کر اسے اپنے ساتھ لینا ہے جس کے لئے موثر دھن نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ادب لکھئے، نظم، افسانہ، مقالہ یہاں تک کہ کالم بھی۔ سو وہ دوسرے مقامات ہیں۔ میں اپنے نغموں کو ضائع کرنا نہیں چاہوں گا۔ میں چاہوں گا کہ وہ مقبول اور موثر ہوں۔ پاکستانی دلوں کی دھڑکنیں بنے رہیں۔ الحمد للہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ بہرحال امتناع کے کئی سال اور حکومتوں کی تبدیلیاں، کچھ سخت کالموں اور جگہ گھرتے رہنے کی وجہ سے میرے نغموں اور ان کے ٹیلی کاسٹ ہونے کے مواقع کم ہوتے گئے۔ میں اب بھی کبھی کبھی لکھتا ہوں مگر مارشل لاء میں تو ممنوع تھا ہی بعد میں کسی حکومت سے نزدیک نہ ہونے یا افسران (بیوروکریسی) پر گاہے گاہے تنقید کی وجہ سے ان کو پسندیدہ نہیں رہا۔ (میرے بہت سے کالم ملاحظہ ہوں جن میں گاہے ماہے یہ سب جھلکتا رہا ہے اب بنیادی بات یہ ہے کہ ان کو بولوں کے مطابق موسیقی اور آواز کے ساتھ متعین کیا جائے۔ جب تک مجھے پروڈکشن پر اطمینان نہ ہو میں ان کی طلب پر بھی نہیں دیتا۔ لکھ کر رکھ دیتا ہوں۔ کبھی کوئی کام میں لے آئے گا۔ لیکن یہ سوچئے کہ جو کنٹری بیوشن کر دیا گیا کیا وہ کافی نہیں۔ کیا وہ رجحان ساز ثابت نہیں ہوا اگر نہیں تو میں گفتگو آگے نہیں چلاؤں گا۔ عوام میں مقبولیت بعض اوقات خواص میں کم قدری کا باعث بھی ہو جاتی ہے کہ دونوں کی طبقاتی نفسیات مختلف ہوتی ہے اگر ہاں تو خود ہی آگے چلے گی ——— بس اللہ کا ہزار شکر ہے۔ شکایتیں چند برس رہیں اب وہ بھی نہیں ہیں۔ کس کس کا کیا کا تذکرہ کروں۔ یہ ہمارا قومی مزاج ہے کہ کوئی کسی شعبہ حیات میں ابھرتا نظر آئے تو اس کی کونپیں کاٹ دیتے ہیں ہاں وہ مقابلہ پر اتر آئے اور مقابلے میں مروّجہ حربے استعمال کرنے کی ذلّت مول لے تو

اور بات ہے۔ مجھے اس مقابلے کی ضرورت نہیں تھی نہ ہے۔ دوسروں کو بھی تو آنا چاہئے۔ اجارہ میری طبیعت میں نہیں رہا۔ مزید کام کے لئے تیار ضرور ہوں اور کسی معاوضے کے بغیر مگر از خود کسی کے پاس نہیں جا سکتا۔ دراصل اسلام آباد میں بیورو کریسی سے آمیز ہو کر بظاہر پھنے خان بنے رہتے ہوئے ان میں ایک خاص قسم کی پی۔ آر مروج ہے وہی بڑے بڑے پروگرام اور معاوضے مقامات اور انعامات تک دلواتی ہے۔ میرا مزاج ہمیشہ سے سخت خودداری یا بقول کسے کسی قدر سرکشی کا ہے۔ اسے سب جاننے والے جانتے ہیں آپ "شباب نامہ" دیکھ لیجئے۔ "شباب نگر" میں شباب صاحب کا انٹرویو دیکھ لیجئے۔ میرے بارے میں سلیم احمد کا مضمون دیکھ لیجئے۔ ۱۹۵۷ء تک میں الطاف گوہر صاحب کا میرے مجموعے پر ریڈیائی تبصرہ دیکھ لیجئے۔ محمد طفیل صاحب کا مجھ پر خاکہ دیکھ لیجئے۔ آپ کو اس طرف واضح اشارے ملیں گے۔ میرے سینکڑوں کالم تو ریکارڈ پر ہیں ہی۔ وہ تو لاکھوں کے سامنے جاتے رہے ہیں۔ لوگ زبانی ہیرو بنتے ہیں۔ میں تو ریکارڈ پر ہوں۔ میں نوکری میں بھی کسی بڑے کی دھونس میں نہیں آیا۔ نقصان اٹھائے۔ سو گزر گئی۔ اس مزاج کے ساتھ میں وزارت اطلاعات یا پی۔ ٹی۔ وی وغیرہ میں جا کر کیا اشارے دوں کہ میں حاضر ہوں۔ ویسے میں اب بھی حاضر ہوں کہ میں اب بھی قومی نغموں کو عوام و خواص میں عشقِ وطن اور مقاصد اعلیٰ کے لئے ایک بہت موثر میڈیم سمجھتا ہوں گو بعض ہائی براؤ اور نقاد ادیب (غالباً" اپنی سچائی میں) ان سادہ بولوں کا مذاق اڑاتے رہے۔ انہیں ادب نہ مانا۔ مگر مجھے ان کے ادب منوانے پر اصرار نہیں۔ میں نے کبھی کسی نثر یا گفتگو میں مدافعت نہیں کی۔ بہرحال میڈیا کو فلمی اجارے یعنی فلمی گیتوں کے ادارے سے تو آزاد کرا لیا۔ عام آدمی کو کچھ دے گیا اور دوسروں سے بھی دلوا دیا۔ بتاتا چلوں کہ اب بھی جی۔ ایچ۔ کیو میوزک کمیٹی کے لئے قطعاً" بے معاوضہ کئی نغمات لکھے جو بحریہ اور فوج کی چند رجمنٹوں میں منظور ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے تمام فوجی بیوگل کالز کے انگریزی بولوں کو اپنی "نہایت مختصر دورانیوں کے ساتھ قومی زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ بہت سی رجمنٹوں کے لئے خود فوجی افسران کے لکھے ہوئے نغمے جو پیش ہوئے منظور کرائے ہیں اور کوئی بھی جی۔ ایچ۔ کیو (میوزک اسکول) سے پوچھ سکتا ہے کہ میں نے خاصی محنت شاقہ کی مگر اپنے کام کا کسی بھی شکل میں کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ جبکہ معاوضہ پیش ہوتا رہا ہے (اور بعض محترم شعراء نے لیا ہے) میں کوئی امیر آدمی نہیں رہا لیکن اس کام کو پیشہ ورانہ نوعیت سے ارفع جان کر کیا ہے۔ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔

○ مزاجاً" آپ زندہ دل اور رومان پسند واقع ہوئے ہیں آپ کی شاعری بھی جا بجا اس کی گواہی دیتی نظر آتی ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ آپ کا نثری آہنگ خاصا خشک بے ربط اور مبلغانہ ہوتا جا رہا ہے اس کا سبب بینکنگ کے شعبہ سے وابستگی ہے یا انجمن ترقی اردو کی مصروفیات؟

○○ زندہ دلی اور رومان پسندی کو بے تبصرہ جانے دیجئے کہ وہ آپ کا بیان ہے نثری آہنگ کی خشکی میری رائے کے مطابق سفرناموں میں تو قطعاً" نہیں تھی۔ کالموں کو جو مقصدی ہوتے ہیں ادبی لحاظ سے دلچسپ بنانے کے

لئے وقت چاہئے یا ابن انشاء جیسی خداداد اور بے مثال صلاحیت۔ کالم میں نے یک نشستی اور ہزار مصروفیات
کے ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔ پروازوں میں بھی۔ بیرونی دوروں میں بھی' بے ربطی آپ کا تاثر ہے۔ بجا ہوگا مگر کچھ
لوگ اسی کو تنوع اور اسٹائل قرار دیتے ہیں۔ میلقانہ کا مجھے اقرار ہے کالموں سے میرا بنیادی مقصد ہی اپنی فکر کی
آسان تبلیغ تھا اور ہے۔ چھتیس برس بے معاوضہ لکھے (جب تک ریٹائر نہیں ہوا تھا) بہت نہ سہی کچھ احتیاطیں
بھی لازم جو نیم سرکاری ملازمت اور کراچی جیسے پیچیدہ اور ہمہ وقت مشتعل شہر میں رہنے کی وجہ سے کرنی پڑتی
تھیں۔ کچھ اب آزاد ہونے کے بعد بھی کرنی پڑتی ہیں۔ محض ایک دو کالم کے لئے خفیہ حکومتی اداروں کی زد میں
آنا جبکہ اب تو حکومت اقرار بھی نہیں کرتی کہ پکڑلیا ہے' دوسرے کسی سیاسی گروپ سے گولی کھانا' ہاتھ پاؤں
تڑوانا' ذرا سی سیاسی خفگی پر اغوا ہو جانا' کوئی مجاہدانہ بات نہیں جبکہ یہ بھی یقین نہ ہو کہ ایسی موت کو شہادت سمجھا
جائے گا قاتل ہی پکڑ لئے جائیں گے۔ میں باقاعدہ صحافی نہیں میرے لئے ان کی انجمن بھی کھڑے ہوجانے کی پابند
نہیں بہت ہوا تو اظہار ہمدردی کردے گی۔ اب آپ میرے شہر میں بیٹھ کر بہت سی باتیں اس طرح نہیں لکھ سکتے جس
طرح دوسرے شہروں میں بیٹھ کر لکھ سکتے ہیں پھر بھی اس انکسر کے باوجود خدارا پڑھ کر دیکھئے کہ کیا کیا اور کس کس
طرح لکھے گیا ہوں۔ بہرحال اس کا سبب نہ بینکنگ شعبے سے تعلق ہے۔ نہ انجمن کی مصروفیات سے' انجمن کا ذکر
آیا تو میں اپنے کوئی ڈیڑھ سو شائع شدہ مقدموں پر مشتمل دو جلدوں "حرفے چند" اول اور دوم پر توجہ کی دعوت دوں
گا۔ اور ان پر جناب مشفق خواجہ جیسے فاضل اور بے باک تبصرہ نگار کی رائے پر بھی اور ان تبصروں پر بھی جو آئے
اور آتے رہتے ہیں۔ ویسے مجھے اپنی نثر کے اسٹائل پر کوئی ناز نہیں نہ اس کا دفاع کرنا ہے۔ البتہ اس حد تک
مطمئن ہوں کہ ایسی سینکڑوں باتیں کہہ دی ہیں' ایسی بہت سی کتابوں اور ایسے بہت سے موضوعات پر لکھ دیا ہے
جن کی طرف اس سے پہلے اخباروں میں لکھنے والے عام قارئین کی توجہ کم کم مبذول کراتے تھے۔ میں بیانیہ اور
سجاوٹ کے مباحث میں بے شمار مغربی حوالوں سے بھی حصہ لے سکتا ہوں مگر وہ میرے لئے میری نثرنویسی کے مقاصد
نہیں۔ میری اظہاریہ نویسی تخلیقی ادب اور اس کی مروجہ اقدار کے مروجہ معیار سے جڑی ہوئی نہیں تو نہ ہو۔
مجھے نثر میں مشتاق یوسفی یا مختار مسعود کے Elitist مقامات درکار نہیں۔ اول الذکر تو اب بڑے ہی مثالی نثر نگار
ہوگئے ہیں۔ گو مجھ سے اپنے بیان کے مطابق دونوں حضرات مہینوں میں دو دو چار صفحے ہی لکھ پاتے ہیں (کاش میں
ان جیسا ایک پیراگراف بھی لکھ سکتا واقعی بڑی گاڑھی لذیذ اور خوبصورت تخلیقات ہوتی ہیں۔ عام آدمی کے
لئے کتنی مفید مگر شاید ایک دن بہت مفید اور بڑی یادگاریں بھی) لیکن میرا مقصد اور میدان الگ ہے مجھے بہت ہی
معمولی استعداد کے پاکستانی قاری تک وہ بہت سی باتیں پہنچانی ہیں جو میری رائے میں اس کے لئے ضروری ہیں۔
کبھی کبھی کسی قدر برتر سطح کے قاری سے بھی خطاب کرلیتا ہوں۔ مگر ان کی تمام تر اہمیت کے باوجود وہ میرے اصل
ہدف نہیں ہوتے۔ ادب کی حد تک آپ کے سامنے میری ناچیز شاعری موجود ہے یا سفرنامے یا میرے پیش لفظ'

اچھے فقرے تراشنے میں وقت لگتا ہے وہ مجھے برسوں میسر نہیں ہوا۔ اب کسی قدر ملا ہے تب بھی کام اتنے ہیں کہ مناعی اور مصوری کے لئے جو تنہائی اور عملی لاتعلقی درکار ہے' میسر نہیں۔ دماغ کے خلیے بھی اس عمر میں اتنے کام نہیں آسکتے کہ شعر بھی کہوں اور آراستہ نثر بھی لکھوں۔ کوشش یہ ہے کہ شعر پر زیادہ توجہ دوں جو بہرحال قبیلہ فنون میں سب سے برتر قبیلہ تسلیم کیا گیا ہے' نثر اسی طرح جاری رہے گی۔ ہاں اگر فرصت میسر آئی تو چند خاکے اور ایک دو سفرنامے مکمل کرنے چاہوں گا۔ انہیں دیکھئے گا۔ شاید وہ مکمل نہ ہو پائیں۔ میں زینے پر تیزی سے نیچے اتر رہا ہوں۔ آخر کتنے معیاری کام کر سکوں گا۔ ہاں یاد رہے کہ بعض مرتبہ مقدار Quantity جو ہے وہ معیار Quality میں بدل جاتی ہے۔ مادہ توانائی' مادے کا فارمولا یہاں بھی نافذ ہو سکتا ہے۔ مگر اب اپنا ججمنٹ شروع نہ ہو جائے۔ اس بحث کے ہزار گوشے ہیں۔ مجموعی ججمنٹ آپ پر قارئین پر' وقت پر چھوڑا۔ اس گزارش کے ساتھ کہ مقدار سے ڈرے بغیر اسے پڑھ کر ہی فیصلہ کیا جائے تو سچا ہوگا ورنہ.......

○ اہل قلم برادری کی خدمت کے نام پر مختلف اوقات میں آپ کی مختلف النوع مصروفیات اور ہمہ جہتی کے برعکس ایک طبقہ فکر کے خیال میں یہ آپ کے اپنے اندر چھپی اقتدار کی خواہش کی تکمیل و تسکین کو ذریعہ یا قد کاٹھ بڑھانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش تھی یا ہے؟

○○ بلاتکلف عرض کر دیا جائے کہ ایسے ہی خیالات اور سوالات نے ہمارے ملک کے بیشتر شعبوں میں رضاکاروں کی ہمت شکنی کی ہے۔ اب زیادہ تر تنخواہ دار ہی کام کرنے آگے بڑھتے ہیں اب کوئی بڑا مولانا ایدھی جیسا ہی رضاکاری پر قائم رہتا ہے (اور ان پر بھی شبہات اور سوالات ہو چکے ہیں) لیکن چونکہ یہ ایک اہم ذاتی قسم کا سوال ہے اس لئے آیئے میری گزارشات پر غور فرمایئے۔ امید ہے گو یقین نہیں کہ ہمارے اندر کی "تمرد ورلذیت" اب بھی میری ناچیز بے اقتدار حیثیت کی وجہ سے انہیں اس طرح سمجھے ہی نہیں' جیسے میں سمجھانا چاہتا ہوں بہرحال میرا کام آپ کے ذریعے ہی سہی' ریکارڈ پر آتا ہے۔

ا۔ اپنا نفسیاتی تجزیہ تو میں کر نہیں سکتا۔ وہ بڑے ذہین ماہرین کرتے ہیں اور ہمیشہ درست نتائج اخذ نہیں کر پاتے۔ کس انسان کی کون سی چھپی ہوئی خواہش کیا کام کرنے پر اکساتی ہے یہ ایک بڑی اور دوسری بحث ہے اپنے بارے میں تعلّی' تجزیہ' دفاع' معذرت' یہ سب بھی بڑی طوالت طلب باتیں ہیں فی الوقت میں انہیں ضروری بھی نہیں سمجھتا۔ یہ انٹرویو یوں ہی بہت طویل ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔ Ambitious ہونے کے کیا معنی ہیں؟ مختلف سطحوں کے ذہن مختلف انداز میں سوچتے ہیں یہ بھی ہے کہ جو کچھ نہ کریں یا نہ کر سکیں وہ اپنی نااہلی کو کسی فلسفیانہ بے نیازی' فقیری' ہائی تھنکنگ' کے نام پر بے عملی کا جواز پیدا کرتے ہوئے ایسی الزام تراشی کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا بنیادی قصور یہ ہے کہ میں نے پاکستان میں بڑی کم حیثیت سے آغاز کیا۔ لیکن میں نے صرف گلڈ بنانے

میں ہی عملیت ثابت نہیں کی آپ شروع سے سنئے ٹریک ریکارڈ دیکھئے میں Ambitious ہوں تو ہمیشہ سے ہوں۔ یا شوقِ خدمت ہے ولولہ ہے تو ہمیشہ سے ہے۔

۲۔ سال دوم میں بزم اردو کے لئے معتمدی کا الیکشن لڑا اتفاق سے کامیاب بھی ہوا نائب صدر جناب سعد الخیری سابق سفیر پاکستان' سال چہارم میں بزم ادب کے لئے پھر الیکشن لڑا اتفاق سے کامیاب بھی ہوا بزم ادب خوب چلائی ہماری روایات کے مطابق صدر تو استاد فنون ہوتے تھے۔ طلباء سال دوم میں معتمد اور سال چہارم میں بذریعہ انتخاب نائب صدر ہوا کرتے تھے۔

۳۔ کالج کی تعلیم ختم کرتے کرتے شادی کرلی تھی۔ اس سلسلے میں والئی ریاست سے اپنے حقوق کے معاملے میں کچھ بدمزگی پیدا ہوئی تو روزگار کی فکر لاحق ہوگئی عمر انیس برس تعلیم صرف بی۔اے تک' خاندانی روایات کے مطابق اپنی ریاست میں مجسٹریٹی اور پھر شاید دیوانی مل جاتی مگر اس پورے نظام سے نفور بڑھ گیا تھا۔ جنگ ختم ہو رہی تھی بارروزگار لوگ بھی چھانٹی کی زد میں آرہے تھے۔ بیوی کو بھی دہلی لے آیا تھا۔ تین برس طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ پونہ' بمبئی' حیدر آباد گیا۔ کسی نے خدمت خلق کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ صبح شام کسی نہ کسی بہانے روٹی کمانے اور تلاش روزگار میں گزرتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان پہنچا۔ کامرس منسٹری میں اسسٹنٹ' مگر یہاں آتے ہی "انجمن عمال حکومت پاکستان" کی تشکیل میں حصہ لیا۔ رکنیت کئی ہزار' صدر آغا محمد اشرف مرحوم (شاگرد پطرس' وزارت اطلاعات' پھر پی سی پھر یو۔این) معتمد رشید تبسم (کالج کے اولڈ بوائے بھی تھے) نائب معتمد میں ——— سب بذریعہ انتخاب۔ ایک ٹریڈ یونین نما انجمن جسے حکومت پسند نہیں کرتی تھی۔ جلسے' مطالبے' احتجاج نوبت گرفتاری تک پہنچ گئی' بچ گئے پھر مطالبات جزوی طور پر مان لئے گئے۔ یہ سب اس زمانے کے اخبارات میں موجود ہے۔ تنخواہوں کے نئے اسکیل جو بنائے گئے وہ اس انجمن کی تحریکات اور قربانیوں سے ہی بنے۔

۴۔ کراچی میں پاکستان ایمپلائز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (پی۔ای سی۔ایچ ایس) مخفف "سوسائٹی" ۴۴ میل کل طوالت کی سڑکیں' ہزارہا مکانات کی بنیاد ڈالنے والوں میں شامل اور متحرک رہا۔ پہلے صدر بہار شریف کے جناب سید امام تھے۔ (ڈپٹی سیکریٹری درجے کے افسر) وہ اس سوسائٹی کے بانی کہلاتے ہیں۔ اور بجا طور۔ لیکن وہ اتنے بڑے منصوبے کا بار کیسے اٹھاسکتے تھے انہوں نے ایک مختصر سی ٹیم بنائی۔ میں حاضر ——— ہم دن میں کام کرتے راتوں کو لالٹینیں ہاتھ میں لے کر ٹوٹی پھوٹی جیپوں (Jeeps) میں' کبھی کبھی سائیکلوں پر بھی' اس اونچے علاقے کی مساحت کرتے۔ جہاں یہ اتنی بڑی ہاؤسنگ اسکیم بن گئی اور قائم ہے ہزاروں مختلف سائز کے پلاٹ نکالے گئے۔ داخلے کی فیس پچاس روپے' زمین کی قیمت ایک روپیہ فی گز' خدمات وترقیات کا معاوضہ تین روپے فی گز' چھ ماہی قسطوں میں' بے گھر سرکاری ملازمین ٹوٹ پڑے یہ کسی صوبے سے مخصوص نہ تھی۔ نہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ پھر آہستہ آہستہ دہلی اور دیگر مقامات بطور خاص حیدر آباد دکن کے فسادات نے اتنے رشتہ داروں کو میرے گھر لا پھینکا کہ خود

روٹی کھانی مشکل ہو گئی۔ (رات کو روزنامہ "مسلمان" میں شاعر کرار نوری کے ساتھ ترجمے اور سب ایڈیٹنگ کا کام شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو چھپاتا بھی تھا کیونکہ سرکاری ملازمین بلا اجازت کوئی اور کام نہیں کر سکتے) اس لئے سوسائٹی کے انتخابات میں اس وقت حصہ نہ لے سکا' یوں بھی کم عمر تھا۔ امام صاحب کی پالیسی تھی کہ با اثر با اختیار افسروں کی توجہ کو زیادہ اہمیت دی جائے کیونکہ بہت سے کام انہی کے اختیار میں تھے۔ اپنے پاس اتنے دام بھی نہ تھے کہ اس قیمت پر بھی کوئی پلاٹ لیتا۔ ۱۹۵۰ء میں تو یہ حالت تھی کہ سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان میں داخلہ فیس کے لئے وہ پچاس روپے والی رکنیت بھی ختم کر کے رقم واپس لی اور داخلے کے لئے بھیج دی۔ مگر پھر ۵۵-۱۹۵۴ء میں واپس ہوا اور آگے بقول کسے بڑے "اہم" واقعات پیش آئے۔ حوالہ آگے۔ امتحان کے لئے ایک دن تیاری کی چھٹی نہیں ملی لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ آہا اب نواب صاحب افسر بن کر حکومت کریں گے۔ نہ جانے کیا پڑھا' کیسے پڑھا جبکہ یہ جھگڑے اور مشاعرے بھی جاری تھے۔

۵۔ ۱۹۵۱ء میں سی ایس ایس پاس کر کے ۱۹۵۲ء میں محکمہ انکم ٹیکس پہنچا وہاں حالاتِ کار نہایت خراب' محکمے میں اکثریت انسپکٹری سے ترقی پائے ہوئے بزرگوں کی تھی۔ مقابلے کے امتحان سے آئے ہوئے افسر بہت کم تھے۔ (مقابلے شروع ہی ۱۹۴۹ء سے ہوئے تھے یا دو چار قبل از تقسیم مخصوص امتحانات کے ذریعے آگئے تھے) سی ایس پی والے اس محکمے کو بھی ایک زبردست مملکت قرار دیتے تھے۔ ہمارے لئے سرکاری مکانوں کی کوئی گنجائش نہ تھی وغیرہ وغیرہ ------ یوں یہ محکمہ ۱۹۲۲ء سے قائم تھا۔ کبھی کسی خود آگاہی کسی حق طلبی کی روایت قائم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چند مہینے کے اندر اندر انکم ٹیکس آفیسرز ایسوسی ایشن بنائی انتخاب ہوا مجھے معتمد منتخب کیا گیا۔ کابینہ ڈویژن اسٹیبلشمنٹ ڈویژن جانا شروع کیا۔ اجلاس مطالبے عرضداشتیں' احتجاج۔ یقیناً افسروں کو ٹریڈ یونین بنانے کی اجازت نہ تھی۔ اب بھی نہیں ہے اس لئے اسے ایسوسی ایشن کہا۔ بعض ہمدرد پیدا کئے گارڈن روڈ پر افسران کوارٹرز بن رہے تھے۔ اب G.O.R کہلاتے ہیں' آٹھ اپنی سروس کے لئے الاٹ کرائے۔ اپنے مکانوں کے لئے سستی قیمت پر پلاٹ حاصل کرنے کی طرح ڈالی۔ (زمین ملی ذاتی نہیں بلکہ محکمے کے نام' وہی پھیل کر بعد میں کالونی بھی بنی) ۱۹۵۶ء تک صدر ریاست میجر جنرل سکندر مرزا کو اپنی انجمن کے سالانہ عشائیے میں لے آیا۔ قمرالاسلام صاحب ممبر بورڈ آف ریونیو بعد میں ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن اور سفیر پاکستان اور صدر ٹیکسیشن کمیشن وغیرہ ہوئے) سی ایس پی تھے مگر ہمارے کمشنر بھی رہ چکے تھے ہماری سروس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ علم اور شعروادب سے ذوق بھی۔ انہوں نے خاصی مراعات دلوائیں اس وقت کے افسران ریٹائر تو ہو چکے ہیں مگر اکثر زندہ ہیں۔ میں ۱۹۵۹ء میں محکمے سے باہر ڈیپوٹیشن پر چلا گیا۔ ایسوسی ایشن چلتی رہی' مختلف ادوار میں بھی' حسب سابق قائم نہ رہی مگر کچھ نہ کچھ مراعات یا حقوق ملتے رہے۔ (یہ پلاٹ سرکاری رہے۔ کالونی میری سروس ہی کی بنی)۔ ۶۔ ۱۹۵۵ء میں پی ای سی ایچ ایس (سوسائٹی) کی رکنیت کا احیاء کرایا۔ ۱۹۵۶ء میں منتظمہ کے لئے انتخاب لڑا رکنیت سات ہزار کے قریب

ہو چکی تھی بیشتر زمین کے پلاٹ بن گئے تھے۔ مکان تیزی سے بن رہے تھے۔ انتخابات ضروری اور سخت مشکل ہو گئے تھے۔ بڑے افسران گروپ بندیاں کر کر کے خود بھی آتے اور زیر اثر جونیئرز کو پینل بنوا کر لڑواتے۔ میں آزاد لڑا۔ تھوڑے سے ووٹوں سے ہار گیا بے ایمانی کا شبہ ہوا مرافعہ دائر کر دیا وہاں کسی کے تبادلے سے منتظمہ میں ایک جگہ خالی ہوئی ذیلی ضوابط کی رو سے ہارے ہوؤں میں نمبر ایک تھا۔ کو آپٹ کر لیا گیا۔ پھر بڑا طوفانی دور رہا۔ منتظمہ کے بڑے افسروں نے پلاٹ الاٹ کرنا اپنے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ ہم اپنا دخل بھی چاہتے تھے (اس وقت میرا کہیں کوئی پلاٹ یا مکان نہیں تھا) کشمکش ہوئی' ہم جیتے' میں نے اپنے محکمے والوں کو پلاٹ الاٹ کرائے ایک خود بھی لیا۔ قمر الاسلام صاحب کو بھی الاٹ کیے۔ اگلا انتخاب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پھر لڑا اپنے پینل کے ساتھ جیتا اس وقت ان انتخابات میں اندر ہی اندر صوبائی بنیادیں بھی جڑ پکڑنے لگی تھیں۔ میں نے پینل میں بہاریوں کے ساتھ پنجابی پختون اور بنگلہ دیشی بھی رکھے۔ ریکارڈ ووٹ سے جیتا جس دن نتائج آئے اسی رات مارشل لاء لگ گیا۔ میں نے اگلی شب کراچی کلب میں بیس آدمیوں پوری منتظمہ کا عشائیہ رکھا تھا۔ کلب والے اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ کئی بار پوچھا کیا منسوخ کر دیں۔ میں نے کہا ہم نے کسی کی چوری کی ہے؟ وہ اس پورے کراچی کے کلبوں اور ہوٹلوں میں اس رات واحد عشائیہ ثابت ہوا۔ اس الیکشن بازی اور "پبلک سروس" کا ذکر سلیم احمد نے مجھ پر اپنے خاصے سخت مضمون میں کر رکھا ہے۔ وہ مجھے صرف شاعر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ گریجویٹ بھی نہیں تھا مگر آہستہ آہستہ بہت پڑھ لکھ گیا۔ آخر آخر تو بہت سے نوجوانوں کے لئے پیر کا درجہ ہو گیا تھا۔ اس کا سفر علیحدہ مضمون ہے۔ پھر جلد ہی گلڈ بن گیا تو میں اس سوسائٹی میں فعال نہ رہ سکا۔

پہلے انجمن کے معاملات میں کوئی دلچسپی لینے کا وقت اور موڈ نہیں تھا۔ بس مولوی صاحب کو گاہے گاہے سلام کرنے چلا جاتا تھا جیسے کہ سب جاتے تھے اور میرے بعض بزرگوں' نواب منظور جنگ (حیدر آباد دکن) اور سید ہاشمی فرید آبادی سے ان کے خصوصی روابط بھی رہ چکے تھے۔ ایک بار جب مولوی صاحب بہت ہی تنگ کر دیئے گئے۔ تو انشاء مجھے ان کے پاس لے گیا۔ آگے ان کی لڑائی لڑنے کی کہانی ہے (ان کے آلام ان کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں موجود ہیں) پھر وہ دو ڈھائی برس تک منتظمہ انجمن میں ان کی طرف سے میری نامزدگی اور ان کے بعد انجمن اور کالجوں کی معتمدی پر منتج ہوئی۔ میں نے انجمن اور کالجوں میں کیا کیا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ اسی وقت سے اب تک انجمن میں معتمد اعزازی ہوں۔ ۳۵ برس سے زیادہ گزر گئے۔ (وہ کالج ۱۹۷۳ء میں تعلیم کے ساتھ قومیا لئے گئے تھے)

۷۔ گلڈ۔ علیحدہ پوری کہانی۔

۸۔ نیشنل بینک میں ۱۹۶۷ء میں آیا تھا۔ کبھی نیشنل بینک آفیسر ایسوسی ایشن برائے نام قائم ہوئی تھی۔ بے حس پڑی تھی۔ گلڈ اور انجمن کی مصروفیات نے کوئی عہدہ داری تو نہیں کرنے دی۔ اسے خوب فعال کیا۔ منتظمہ سے

بقضیے قضیے ہوتے رہے۔

۹۔ گلڈ میں ۱۲ برس ہو گئے تھے۔ ہمارے دستور میں سیکریٹری جنرل تک مسلسل دو میقات سے زیادہ اس عہدے پر نہیں رہ سکتا تھا۔ یوں بھی میں کئی حیثیتوں میں بہت دن متعلق رہ لیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں انتخاب منعقد کرایا۔ بنگلہ ادیب محبوب جمال زاہدی منتخب ہو گئے۔ مگر ایک ہی برس میں سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔ پھر ۱۹۷۵ء میں گلڈ کا صدر دفتر نئے دستور کے مطابق دوسرے صوبائی صدر مقام لاہور چلا گیا۔ میں سقوط ڈھاکہ سے دل شکستہ تھا' گلڈ کی عدم فعالیت اور خود پر مسلسل اعتراضات سے جو آپ نے سوالات کی صورت میں بھی کئے ہیں بالکل دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ بعض تعاون دیگراں بغیر نہیں چل سکتے تھے جب سبط علی صبا کا اچانک انتقال ہوا فوراً سبط علی ٹرسٹ بنایا۔ انہیں میں نہیں جانتا تھا۔ کبھی ملا بھی نہیں تھا۔ مگر حالات پڑھے تو بے چین ہو گیا۔ گلڈی خون گردش میں آیا۔ بعض نسبتاً" خوش حال ادیبوں کو ذاتی خطوط لکھ کر اس کے لئے بینک اکاؤنٹ راولپنڈی میں براہ راست رقمیں منگائیں۔ مخدومی سید ضمیر جعفری صدر مقرر ہوئے برادرم اختر ہوشیار پوری معتمد.... میں نے کوئی عہدہ نہیں لیا۔ بوجوہ وہ ٹرسٹ مطلوبہ سطح کے کام نہ کر سکا۔ ہاں صبا فیملی کی تھوڑی بہت امداد ہو گئی۔ بی سی سی آئی سے بھی وظیفہ کرایا۔ ان کے بچے مجھے لکھتے رہتے ہیں۔ بڑے ہو گئے ہیں۔

۱۰۔ اردو کالج منتظمہ پر تو میاں جانے کے بعد بھی نامزد ہوا تو نہ جانے کتنا کام کیا۔ لاء کالج میں اردو کو ایل ایل ایم کا ذریعہ تدریس بنوانے میں بڑے کشٹ اٹھانے پڑے۔

۱۱۔ ۱۹۷۷ء میں بیٹھے بٹھائے قومی اسمبلی کے لئے پی پی پی کا ٹکٹ ملا۔ انتخاب لڑا اور ہارا (وہ علیحدہ کہانی ہے۔)

۱۲۔ ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر محبوب الحق وفاقی بجٹ بنا رہے تھے۔ میری نوکری (پاکستان بینکنگ کونسل میں) کا آخری سال تھا۔ اکادمی ادبیات بن چکی تھی مگر مطلوبہ سطحوں کے اور ضروری کام نہیں کر رہی تھی۔ اس سے تعرض نہ رکھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے عرض کی کہ ادیبوں کو بلا سود ضرور آسان شرطوں پر قرض دینے کے لئے بجٹ کے حوالے سے ہی کچھ کر جائیں۔ انہوں نے سالانہ دو کروڑ روپے قرض حسنہ بینکوں سے دلوانا منظور کیا۔ یہ اعلان بجٹ خطبے جون ۱۹۸۸ء میں موجود ہے۔ اس کے بعد میں نے بینکنگ کونسل سے جاتے جاتے یعنی ریٹائر ہوتے ہوتے (۱) ضوابط اور طریق کار اور (۲) آنے والے مسودوں کو ادبی یا غیر ادبی قرار دینے والے ججوں کی نامزدگی بھی کرادی تھی کیونکہ لوگ جنتریاں اور مناقشوں سے بھرپور نام نہاد مذہبی' سیاسی اور ہر طرح کے مسودے بھیج دیتے تھے۔ مجھے گلڈ میں اس کا تجربہ تھا ہمارے انعامات کے لئے ایسے ایسے موضوعات پر ایسی ایسی کتابیں آتی تھیں کہ الامان والحفیظ۔

بجٹ خطبے میں تو اعلان ہو ہی چکا تھا جب میں نے کونسل کے ذریعے تمام تیاریاں مکمل کر دیں تو اپنے کالموں میں کئی بار ذکر کیا۔ ادیبوں کو دعوت دی کہ اشاعتی تخمینوں کے ساتھ مسودے کونسل کو بھیجیں اور قرض حسنہ

حاصل کریں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لکھا۔ فی ادیب عموماً" پچاس ہزار کا قرض حسنہ مل سکتا تھا۔ ضمانت صرف ذاتی اور خود کتاب کی۔۔۔۔ نیشنل بینک میں میرے ماتحت اور پھر جونیئر شریک کار شیخ لال جانی ڈی جی بینکنگ کونسل نے بینکوں سے ضروری رابطہ پورا کرلیا تھا میں خود نہ پہلے اپنے بینک (نیشنل بینک آف پاکستان) میں قرضوں کے شعبے کا انچارج رہا نہ کونسل میں۔۔۔۔ میرے چلتے چلتے چند درخواستیں بھی آ گئی تھیں۔ واضح رہے کہ نہ میں نے اپنے کسی مسودے کے لئے قرض مانگا نہ ملا کن کن کو ملا یہ میں نہیں جانتا کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد سے میں کبھی بینکنگ کونسل نہیں گیا اتنا معلوم ہے کہ اگلے کسی بجٹ میں یہ مد نہیں رکھی گئی۔

اس گفتگو کا ماحصل = غیر شعوری کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن یہ ٹریک ریکارڈ کیا کہتا ہے اس کا فیصلہ آپ اور پڑھنے والے خود کرسکتے ہیں۔ ویسے ان باتوں کا تخلیقی معاملات کے assessment سے تعلق کم کم ہوتا ہے۔ میں اس حوالہ خدمات سے خدانخواستہ کسی ادبی ججمنٹ میں رعایت کا مطالبہ نہیں کررہا۔ وہ دوسرا شعبہ ہے۔ صرف جوابِ سوال ہے۔ ویسے' اگر آپ بہت بڑے ادیبوں کے بھی نظریاتی اور کرداری تضادات دیکھنے بیٹھ جائیں تو عجیب منظرنامہ اور طلسمات سامنے آئے گا۔ بحمد للہ میرے ہاں اتنا تضاد نہیں ملے گا۔ آپ کے الفاظ میں جو طبقہٴ فکر و خیال میرے اندر صرف اقتدار کی خواہش دیکھتا رہا یا دیکھتا ہے اللہ اس پر رحم کرے۔ مگر کام کیوں نہیں دیکھتا۔ کام تو سارے ٹریک ریکارڈ میں ہے۔ شاید مقطع کا بند یہ ہے کہ بہت سے متوسط طبقے کے لوگ کسی کو اپنے سے "مختلف" نہیں دیکھنا چاہتے۔ پیدائشی بڑے یا بڑے افسر مثلاً شہاب صاحب کو اس الزام کے بغیر قبول کرلیتے ہیں کہ وہ تو تھے ہی بڑے افسر' بہرحال ایسے سوالات آئندہ کام کرنے والوں کی بڑی دل شکنی کریں گے بلکہ کرچکے ہیں۔ میرا وقت تو گزر گیا۔ بعض اچھے کاموں کے لئے اس مخصوص شعبے میں ذمہ داری سنبھالنا یعنی آپ کے سوال کی زبان میں اقتدار بھی ضروری ہوتا ہے مگر کون سا اقتدار؟ اچھا چلئے شاید اقتدار کی اور کوئی ڈھکی چھپی خواہش بھی ہو۔ سو وہ پوری نہیں ہوئی مگر جیسا کہ گلڈ کے علاوہ اور بعد کا ٹریک ریکارڈ بتاتا ہے میں بے اقتداری میں بھی اپنی بساط بھر ویسے ہی کام کرتا رہا ہوں۔ اب وہ خوش رہیں کہ میری خواہش اقتدار پوری نہیں ہوئی مگر یہ تو دیکھیں کہ ادب' ادبا اور خلق خدا کے لئے میں نے کچھ ایسی کوشش بھی کی تھی یا نہیں جو ہماری برادری کے بہت سے دوسری محترمین نے کبھی کی ہی نہیں اور مقتدر بھی ہوتے رہے اب بھی کسی نہ کسی مسند اقتدار پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کبھی سیاسی کبھی تعلقاتی وجہ سے' کبھی کسی سیاسی قسم کے انعام میں۔ گو مجھے کوئی اعتراض نہیں! وہ جہاں ہوں خوش رہیں۔ ترقی پائیں۔ نام کمائیں۔ اکرام و اعزاز مع تنخواہ و مراعات لئے جائیں۔ لیکن بہرخدا آپ مجھے کم ازکم "مختلف" ہی کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ مختلف ہونا کسی بڑے مقام پر فائز ہونا تو نہیں ہے۔ یوں بھی ہر فرد unique ہوتا ہے۔ چلئے چھوڑیئے!!

واہ جوش صاحب علامہ کے اتباع میں ہی کہا مگر کہا تو سہی۔

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ عشق و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

○ آمد اور آورد کا سوال تو پرانا ہوا ماحول مثلاً گھر کا محلّے کا شہر کا' محلّہ کا شہر کا ملک کا' کرۂ ارض کا اگر ہم اسے برصغیر تک محدود کرتے ہوئے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں تو آپ تخلیق ادب کی رفتار اور معیار (مراد اردو ادب سے ہے) کے بارے میں کیا فرمائیں گے اضافی نقطہ اس سوال میں پاکستان کا قیام' مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی موجودہ انارکی اور ہندوستان میں مسلمان اور اردو کی ناگفتہ بہ صورتحال کی روشنی میں دیا جائے۔

○○ جواب شائع نہیں کیا جارہا۔ بہت لمبا تھا کہ سوال بھی بہت طوالت طلب!

○ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو زبان میں عالمی پائے کا ادب تخلیق کیا گیا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ فرمایئے کہ عالمی ادب میں اس کا نمایاں مقام نہ پانے کے اسباب کیا ہیں؟ ہم یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ عالمی معیار کا ادب کب کہاں اور کس صنف میں تخلیق ہوا اور ہو رہا ہے؟

○○ عالمی پایہ کیا ہوتا ہے؟ پچھلے پانچ سو برس میں مغرب کی مشرق پر حکومت نے اس کے چھوٹے سے چھوٹے ادیب' شاعر دانشور کو ہم سے متعارف کر رکھا ہے۔ ہمارے مشرق کے بہت سے بڑے بھی انگریزی' فرنچ ترجموں کے ذریعے سامنے آئے ہیں مثلاً کالی داس اور عمر خیام اور ٹیگور کو انگریزی ترجموں کے ذریعے جانتے ہیں۔ ہمارے بہت سے بڑوں کے انگریزی ترجمے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انہیں یہ نام نہاد عالمی درجہ استناد ملتا بھی کیسے۔ دور نہ جایئے اپنے چند آدمی لیجئے۔ حضرت امیر خسرو کو غیر اردو فارسی دنیا میں کون جانتا ہے؟ تو کیا وہ ان بہت سے انگریزی' فرنچ' جرمن اسپنش زبان کے شعراء سے کم تر ہو گئے جن کے نام اور کام ہمارے ذہنوں اور زبانوں پر قابض رہے ہیں؟ غالب کے ترجمے کتنے ہوئے اور کہاں تک پہنچے؟ ایک معروف ترجمہ پچھلے بیس سال میں پروفیسر رالف رسل اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کیا۔ سوانح میں کچھ فارسی اردو خطوط اور تھوڑے سے شعروں کا۔ کتاب بھی دو ہزار سے زیادہ نہیں چھپی۔ شاید دوسرا ایڈیشن تک نہیں آیا۔ یونیسکو نے اسے کاروباری سطح پر مارکیٹ ہی نہیں کیا۔ بس کونے میں ڈال کر ادھر ادھر چلا دیا۔ اور مجھے یاد نہیں کہ یورپ کی کسی اور زبان میں اس کا جزوی ترجمہ بھی ہوا ہو۔ علامہ اقبال نے' وہ بھی' ایک اردو نظم میں' انہیں گوئٹے کا "ہم نوا" قرار دے دیا تھا۔ یہ اچھے اچھے جرمنوں تک کو معلوم نہیں۔ خود علامہ اقبال کو لیجئے۔ نکلسن صاحب کے ترجمے بھی مثنویوں تک محدود رہے۔ بعد میں جستہ جستہ ترجمے ہوئے "مسجد قرطبہ" جیسی عظیم الشان نظم کا کوئی معقول انگریزی ترجمہ میری نظر سے گزرا نہیں' نہ میں نے روسی' فرنچ' جرمن' انگریزی امریکی ادیبوں شاعروں میں اس کی بازگشت سنی۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۱ء کے پیرس میں (جہاں میں بار بار گیا ہوں اور اچھے اچھے اساتذہ و ادبا سے ملا ہوں۔ "مسجد قرطبہ" اور علامہ اقبال" متوسط درجے کے شعراء میں بھی متعارف تک نہیں وہاں تو دو سو برس سے کوئی گارسین دتاسی بھی پیدا نہیں ہوا۔ بس دو ڈھائی

وزنگ پروفیسر قسم کے لوگ جیسے جامعہ کراچی میں پروفیسر گیبرے تی آر GAMBRETERE آئے تھے۔ غالب واقبال کو کسی حد تک جان کر آتے تھے یا جان جاتے تھے۔ پروفیسر این ماری شمیل بھی اب کوئی تیس برس سے آتی ہیں اور ان کا کام بھی چند مغربی جامعات کے مخصوص شعبوں تک پھیلا ہے۔ یہاں سے جاکر مغرب میں بس جانے والے کچھ پاکستانی کسی قدر کوشش کر رہے ہیں گو پہلے اپنا کلام اور انگریزی ترجمے چھپواتے ہیں۔ حضرت شاہ لطیف بھٹائی کو بھی اسی صدی میں وہ بھی کسی حد تک، ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے "مغرب" یعنی دو تین جامعات کے شعبہ ہائے ادب میں متعارف کرایا۔ (اب پروفیسر شمیل کراتی ہیں) حالانکہ ان کے انگریزی ترجمے چند ہندو ماہر سندھیوں نے بھی کر رکھے تھے۔ وارث شاہ کے منتخب مقامات تک مغرب میں ایک اچھا اوسط پڑھا لکھا نہیں جانتا۔ خوشحال خان خٹک اپنی سیاسی حیثیت کے سبب اپنی شاعری کے حوالے سے بھی بعض انگلستانی حلقوں میں درج کرادیے گئے تھے۔ آج وہاں کوئی پاکستانی اسٹڈیز لے تو واقف ہوتا ہے۔ خواجہ فرید "سچل سرمست" بابا فرید' قدیم بلوچی شعراء' کوئی بھی باہر متعارف نہیں۔ فیض صاحب کو لینن انعام برائے امن کے بعد کیرنن صاحب نے وہ بھی روس کے زور پر اور گلڈ بننے کے بعد یونیسکو کی طرف سے پاکستان پر زور پڑنے کے بعد کیا۔ نومی لیزڈ کا ترجمہ بہت بعد میں آیا ہے۔ مگر روس میں ہو چکے تھے۔ مگر روسیوں کی وجہ اور معیار خالص ادبی نہیں تھے ادب میں دوسرے معاشروں کے خرابیوں اور انقلابی جدوجہد کی عکاسی پہلا معیار انتخاب تھا۔ پرو سوویت ہونا بھی۔ وہاں جب تک میں گیا ہوں۔ ن۔م راشد اور میراجی تک کو اور سٹیل انسٹی ٹیوٹ میں بھی رو ڈھائی پروفیسری جانتے تھے۔ مثلاً" سنئے۔ میں ۱۹۶۰ء میں ماسکو گیا اور نیشنل انسٹیٹیوٹ میں سوال وجواب کے لئے بلایا گیا۔ کچھ جائزہ وغیرہ بھی ہونا تھا۔ خیر ایک صاحب اٹھیں۔

(یہ بات میں نے ۱۹۶۰ء کے دورہ روس پر اپنے سفرنامے دنیا مرے آگے میں لکھی ہے)

"جناب اردو کے عظیم ترین زندہ شاعر علی سردار جعفری کے متعلق اپ کے ملک میں کیا خیال ہے؟ (اس وقت تک فیض صاحب کو لینن پرائز فار پیس نہیں ملا تھا ہاں کچھ اپنی شاعری اور کچھ ایفروایشین کانفرنس تاشقند (۱۹۵۸ء) میں شرکت کی وجہ سے وہاں متعارف ہو چکے تھے۔) عرض کی آپ نے جواب خود دے دیا ہے بولیں میں جانتی تھی آپ یہی کہیں گے۔ عرض کی تو اگلا سوال' فرمایا۔ بڑائی کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے۔ میں نے بحث نہیں کی۔ فیض صاحب علی سردار بھائی سے تو بڑے تھے اور ہیں مگر اس وقت وہاں علی سردار جعفری کا سکہ چل رہا تھا کیونکہ روس سے بھارت کے بہتر سیاسی تعلقات نے ادب کے دریچے بھی ہماری نسبت زیادہ کھول رکھے تھے۔

دیکھئے ادبی ترجمے عموماً" مستثنیات کو چھوڑ کر' ان چند وجوہ سے ہوتے ہیں۔

(ا) کسی ذہین قوم کا اپنے مفاداتی پھیلاؤ میں اپنے ہدف ممالک کو ان کے کلچر سے بھی جاننے کی کوشش کرنا۔ اس کوشش کی بہت سی DIMENSION ہوتی ہیں۔ اسی چکر میں مخلصانہ شوق رکھنے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

بہرحال وہ بھی اس رو کی پیداوار ضرور ہوتے ہیں۔

(۲) کسی معاشرے کسی حکومت کا اپنا وسائل سے اپنے پسندیدہ ادیبوں کو باہر متعارف کرانے کا منصوبہ تاکہ ان کے فکرو اسالیب کا شہرہ ہو (اس کے وسیع تر اقتصادی/فوجی/سیاسی مفادات کی خدمت ضرور کرے) میرے علیحدہ ہوتے ہوتے گلڈ نے باقاعدہ منصوبے بنالئے تھے۔ حکومت عدم تعاون کرتی تھی اور نجی شعبہ پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہماری حیثیت دھونس دینے کی تو تھی نہیں۔ ابھی تعمیری مرحلے میں ہی تھے۔

(۳) کوئی تعلیمی ادارہ کمر باندھ لے کہ خرچ کی ایک مستقل مد ترجموں کے ذریعے اہم ممالک کے ادب جاننے اور ان سے اپنے بروں کو متعارف کرانے پر رکھی ہے۔ پھر دو طرفہ مفادات پیدا ہو کر فروغ پانے لگتے ہیں۔

یہ سب سے پہلے برطانیہ، فرانس، جرمنی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہماری تاریخ میں عباسیوں نے کیا۔ انہی کے ترجموں سے یورپ اپنے قدیم مشاہیر اور ان کے ادوار سے روشناس ہوا۔ عربوں کے لئے یہ نیم خالص علمی کوششیں تھیں۔ پوری طرح خالص یوں نہیں کہ بہرحال وہ سلطنت روم سے جنگ آزما رہتے تھے اور اندازہ تھا کہ روم اس وقت کے خواہ بیشتر نیم وحشی یورپ کی مدد لے سکتا ہے۔ یونان قدیم کو مصری حوالوں سے جان گئے تھے اور رومن حوالوں سے بھی۔ کیونکہ سلطنت روما میں بہت سے عرب علاقے شامل رہ چکے تھے رومیوں نے بھی یونانی فکر ادب کے ترجمے کرائے تھے (بہت سے نہیں، کچھ کیونکہ وہ تلواروں پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ ہاں جب رومن اعلیٰ طبقے نے اپنے لئے حکومت کے حقوق چاہے تو انہیں کسی قسم کے جمہوری افکار کی ضرورت پڑی۔ وہ انہیں اس وقت کے مقبوضہ یونان سے مل گئے۔ رومن تہذیب کی کہانی یونانیوں کی جزوی فکری توسیع ہے۔)

(۴) کوئی قوم، کوئی پھیلتی ہوئی ریاست، طاقت اپنا فلسفہ عام کرنا چاہے۔ مذہب، مسلک، اسی رو میں ادب کو بھی ترجمہ کرادیتی ہے۔ جب بیرونی زبانوں کے ماہرین اس سے متعارف ہو جائیں وہ اپنے اپنے شوق کے مطابق دوسرے ترجمے بھی کرنے لگتے ہیں۔ اب کچھ ملٹی کلچرازم کی ہوا چلی ہے مگر ابھی زیادہ تر حکومتی گرانٹ کی محتاج؟

(۵) بعض امیر مشاہیر خود اپنے خرچ سے اپنے ترجمے کرتے اور کراتے ہیں۔ کچھ حلقے ٹیگور کے اعتراف عظمت کے باوجود ان کو سند مغرب ملنے میں ان کی وجاہت اور دولت کے سبب بین الاقوامی خوش تعلقی کا بڑا دخل سمجھتے ہیں۔ اس صدی کے اوائل سے نوبیل انعام نے ایک ناگزیر رجحان یہ بھی پیدا کر دیا کہ جسے نوبیل انعام ملے اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو جاتا ہے اب بھارت کا گیان پیٹھ ایوارڈ جو سال میں صرف ایک ہندوستانی زبان کو ملتا ہے اس شہرت کی طرف جارہا ہے جسے ملے اس کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہو ہی جاتا ہے دوسرے ممالک بھی جن میں افراد اور ادارے اسے قابل توجہ سمجھنے لگے ہیں مگر میں نے معلوم کرلیا کہ مغرب اب بھی سب گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ کتابوں کے ترجمے نہیں کرتا۔ وہ بہرحال مغربی مارکیٹوں میں نہیں ہیں۔ بھارت کی بعض سیاسی کتابیں ضرور عام ہوتی جاتی ہیں تخلیقی ادب نہیں..... یہ چند وجوہ تھیں۔ ذیلی بھی ہیں۔ خلاصہ ہوا۔

۱۔ کسی قوم کا سائز اور حیثیت' مالی وسائل' روابط

۲۔ دانستہ کوششیں

۳۔ آخری تجزیے میں سیاسی ضروریات

۴۔ اب فکری اور جمالیاتی ضروریات جو کسی حد تک ملٹی کلچرل ازم کے آہستہ آہستہ بڑھنے والے موقف سے پرورش پا رہی ہیں اور اب ایک صدی سے پی۔ آر بھی....

بلا م کم و کاست اردو میں اس کے جم جانے کے بعد سے ایسا ادب موجود ہے جو ان "عالمی معیاروں" پر پورا اترتا تھا' جن کی بنیاد پر دوسری زبانوں کے ترجمے ہوئے۔ پچھلے پچاس برس میں پاک بھارت کے کئی غیر زباں جاننے والے بیرونی یونیورسٹیوں میں جا کر دنیا میں گھوم کر دیکھ چکے ہیں کہ کم از کم میر' غالب' اقبال ان تمام عالمی ادیبوں سے کم نہیں۔ جن کے ترجمے ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ میر کا کوئی قابل ذکر انگریزی ترجمہ میرے علم میں نہیں۔ غالب کے لئے پنجاب کے ایک اہل خیر درانی صاحب ہارورڈ میں کچھ رقم چھوڑ گئے تھے (شاید ایک لاکھ ڈالر) اس نے یونیسکو سے مدد مانگی۔ یونسکو نے رالف رسل اور ڈاکٹر خورشید الاسلام (علی گڑھ) کو رالف رسل ہی کی تجویز پر دو منصوبے دیئے۔ غالب کے فارسی خطوط اور فارسی کلام (انتخاب) کا ترجمہ کبھی کا چھپ گیا تھا۔ گو برسوں لگے۔ ایک اور ترجمہ' اس میں بھی مدتیں لگیں' اب میری تحریک پر خاص پاکستان سے چھپ رہا ہے۔ (دارالاشاعت کو آپر' لاہور/کراچی) رالف سے یہ میں نے چھین کر انہیں دیا ہے ورنہ ان کے اور خورشید کے افسوسناک تنازعے میں رکا پڑا تھا۔ لیکن کیا غالب کا ایک اچھا فارسی اردو انتخاب ہمیشہ سے ترجمے کا مستحق نہ تھا؟ برطانوی حکومت کے ہندوستانی محکموں میں کوئی ایسا شعبہ ہی نہیں تھا۔ امراء بے نیاز' غربا بدحال۔ برطانوی اقتدار کے بعد ضرورت نہ تھی۔ کچھ اردو نثر "باغ و بہار" کے ذریعے اپنے برطانوی افسروں کو مقامی زبان سکھانے کے لئے لکھوائی مگر اس کی دوسری بے شمار ایجنسیاں برطانوی حکومت کو ہندوستانی فکر سے مطلع رکھتی تھیں۔ الٹے ہم کو ایک ایک انگریزی ادیب' شاعر' نقاد ازبر کرا دیا جاتا تھا۔ یقیناً ان کی مجموعی ناگزیریت اور افادیت میں کلام نہیں ہم یورپ بلکہ دوسری بہت سی ایشیائی تخلیقات کو بھی انگریزی کے ذریعے جاننے پر مجبور تھے۔ اور اب بھی ہیں کہ عالمی ادب سے رابطہ ہمیں مسرور کرتا ہے۔ ہمیں سب کو جاننا ہی چاہئے۔ لیکن کیا ان کا ہر وہ تخلیق کار جسے ہم خوب جانتے ہیں ہمارے ہر تخلیق کار سے برتر تھا یا ہے؟ قطعاً نہیں۔ وہاں بڑے بڑے تھرڈ کلاس شاعر اور ادیب گزرے اور گزر رہے ہیں جو ہمارے لئے لازمی نہ تھے۔ اور ہمارے ہاں ان تین سو برس کی مختصر مدت میں بھی چند بہت بڑے تو گزرے ہی ہیں جن کا اسلوب' متن اور فکر انگریزوں امریکیوں اور پورے یورپ کو ایک ایسا جہان معنی و انداز دکھا سکتی ہے جس سے وہ واقف ہی نہیں' علامہ اقبال کا ترجمہ کتنا ہوا شاید فہرست سازی کے لئے کچھ نکل آئے۔ وہاں معروف نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں بھی باتیں بہت بنیں۔ نہ کام ہوا نہ کرایا گیا۔ ہم نے گلڈ کی

ابتدا میں ہی ایسے منصوبے بنائے تھے۔ ملاحظہ ہو "ہم قلم" سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء۔ ہر قرارداد ہر فیصلہ ہر منصوبہ جس کو مختلف ادوار میں اور آج بھی اکادمی ادبیات اپنا اور ہیجنل آئیڈیا کہتی رہی ہے ہماری ان قراردادوں اور فیصلوں میں موجود ہے اور ۱۹۶۰ء کے بعد تو ہم نے بہت سوچا اور منصوبہ بندی کی جو اس نمبر میں نہیں گلڈ کے دوسرے ریکارڈ میں ہے جو میرے پاس نہیں۔ دراصل ایسے آئیڈیاز اوریجنل ہوتے بھی نہیں۔ ہم سب زبانوں کے ادیب پہلی بار ایک پلیٹ فارم پر جمع اور منتخب ہو گئے تھے۔ اپنی جگہ سوچتے رہتے تھے اول اول ہمارے کنونشن میں انہیں خام مواد ہم نے دیا وہ خود بھی لائے اور ان کی کمیٹیوں نے خوب بحث مباحثے کے بعد گلڈ کے لئے اصولی اور عملی خطوط مرتب کر دیئے ہم کتنے آگے جا سکے۔ کیا نہیں کر سکے اور کیوں۔ یہ الگ کہانی ہے اصل بات ہوتی ہے لگن کے ساتھ وسائل کی۔ لگن ہمیں تھی مگر روپیہ کبھی نہیں ملا۔ بیوروکریسی نے شروع میں بھی ہماری مخالفت کی اور شہاب صاحب کے منظر سے ہٹتے ہی تو ہماری کمر توڑ دی۔ وہ واپس آئے تو محتاط رہے زیادہ دلچسپی نہ لی۔ میں کام چلاتا رہا مگر بیچ میں تو میں بھی مارا جا چکا تھا۔ (پکی نوکری تک سے استعفیٰ دینا پڑا تھا) بات کہاں سے کہاں نکل آئی۔ مگر بس ایسے موقعوں پر میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ یا میں اسی طرح کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں سوانح عمری لکھ نہیں پاؤں گا۔ عزائم اور ناکامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جہاں موقع ملا شعور یا تحت الشعور کی رو چل پڑتی ہے۔

سنئے' ۱۹۶۱ء میں جی الانہ صاحب کا ترجمہ (ہمہ لسانی انتخاب) گلڈ سے چھاپ کر یورپ اور امریکہ لے گیا تھا۔ (یونیسکو فیلوشپ) لندن کے قیام میں سی۔ڈے۔لیوس صاحب (C.Day.Lewis) کو دکھایا۔ اخلاقاً" مسکرائے "ویری گڈ" (وہ اس وقت پوئٹ لاری ایٹ (POET LAUREATE) یا ملک الشعرائے برطانیہ تھے) "یہ کن صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ کیا ان کی اپنی کوئی انگریزی کتاب برطانوی مارکیٹ میں آچکی ہے؟ غرض کی بڑے فاضل آدمی ہیں اپنی شاعری بھی انگریزی میں کرتے ہیں۔ بولے برخوار (مائی سن) میں نے پوچھا تھا ان کی کوئی کتاب مارکیٹ میں آچکی ہے۔ عرض کی یاد نہیں۔ ٹال گئے۔ اچھا یہ آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا۔ میں بڑے شوق سے پڑھوں گا کیا یہ یہاں مارکیٹ کریں گے آپ؟ لیکن اسکا گیٹ اپ بہت اچھا نہیں بہرحال بات آگے ضرور بڑھایئے۔"

نیویارک میں امریکی اکادمی آف لیٹرز صرف مصنفین (نہ کہ ہماری نئے مارشل لائی اور جاریہ سرکاری چال کے مطابق مصنف جمع دانشور جمع صحافی جمع شوقین باثر افسران "اہل قلم" کے منتخب (نامزد نہیں منتخب) صدر تھے جناب گلن وے ویسٹ کوٹ (کٹ) (GLENNWAY WESCOTT) تیسری دہائی کے بہت مشہور مگر بقول ناقدین متوسط درجے کے ناول نویس۔ ہنری ملر کے ہم عصر گو دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن اب بڑے سینئر' مشفق' منتظم آدمی) اس یونیسکو تربیت کے دو ہفتے ان کی نگرانی میں کام کیا۔ بے تکلف ہو گئے تھے۔ وہ ترجمہ Presenting Pakistan Poetry انہیں بھی دکھایا۔ سراہے کہ Promote کیا

جائے۔ پہلے آئیں بائیں شائیں۔ رواجی باتیں۔ دیکھنے کے لئے رکھ بھی لیا۔ ایک دن جب بے تکلف ہو چکے تھے' کہا "میاں کوئی مادری زبان والا غیر مادری زبان والے کو بہت ہی مشکل سے تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ ترجمے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بعض نے مجھے FASCINATE کیا۔ لیکن کتاب کا پروموشن کیسے ہو۔ ابھی تمہاری قوم یہاں اتنی اہم نہیں مانی جاتی کہ ہم خود تمہیں ادب کے ذریعے بھی جاننے کے لئے دوڑ پڑیں۔ تمہارے سب اہل معاملہ تو خود انگریزی بولتے ہیں۔ اہم اخبارات و جرائد انگریزی میں ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی مصالح کے لئے تمہارے ادب و ثقافت سے گہری واقفیت ابھی ہماری قوم کی ضرورت نہیں بنی' او۔ کے (O.K) 'ایشیا سوسائٹی وغیرہ اس طرف ایک خیراتی قسم کی توجہ کر رہے ہیں۔ میں تمہیں ان سے ملوا دیتا ہوں۔ (ملا) ہماری کمرشل مارکیٹ بڑی ظالم ہے۔ ہندوستانی کلاسیک بھی جو اتنی قدیم اور مضبوط ہیں۔ مخصوص لوگ پڑھتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر بعض جامعات کے ڈیپارٹمنٹ آف انڈولوجی میں۔ میں نے دیکھا کہ فراسٹ صاحب تک مشرق کو کم جانتے ہیں۔ تمہارے نئے ملک کا تو ذکر کیا ہے وہ تو ٹیگور سے بھی واجبی سے واقف ہیں۔ اگر تمہارے پلے پڑ جائیں تو خود Scan کر سکتے ہو (فراسٹ صاحب حیات تھے مگر میں نہیں مل سکا) یہ تو بھائی بڑے زبردست خرچ کا مسئلہ ہے۔ بہترین ترجمہ بہترین گیٹ اپ پہلے خود متعارف کراؤ۔ جیسے ٹیگور نے اپنے آپ کو کرایا تھا۔ اخبارات و جرائد کے ادبی صفحات کو ایک مسلسل کوشش سے متاثر کرو (کرواؤ) ادبی ایجنٹ مقرر کرو (رواج' تقریباً لازمی) خوب اشتہار دو۔ پھر ایک دم برسٹ ہو گیا تو ناشرین اور مصنفین خود پاکستان کی طرف دوڑ پڑیں گے۔" میں نے واپس آکر وزارت تعلیم کو سب رپورٹیں دیں۔ بے چارے گلڈ کو متحرک کیا.... لاحاصل' لاحاصل!

شکر کہ اب رفتہ رفتہ ہمارے لوگ وہاں پہنچے ہیں کچھ معقول کچھ نامعقول ترجمے کر رہے ہیں۔ گو ابھی تک بہت کم تعداد میں۔ کسی حکومت نے پچھلے دنوں تک تو سفارت کی سطح پر بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اب اس اکادمی ادبیات کو روپیہ اور وزیر اعظم کی ذاتی مدد ملتی رہی تو شاید یہ کچھ کر جائے۔ لیکن اگر ان پر ان کے سیاسی اور تعصباتی اور خود پرستانہ معیار چھا گئے جن کا مجھے بڑا ڈر ہے تو روپیہ خرچ ضرور ہو جائے گا۔ مطلوبہ نتائج نہیں لائے گا۔ بالآخر کوالٹی ہی بولتی ہے وہ وہاں نہ پہنچی تو زیادہ سے زیادہ بھی کوئی Quota Position مل جائے گی۔ گلڈ نے ڈھاکہ اجلاس (۱۹۶۷ء) میں فیض صاحب اور کوی جسیم الدین کو نوبل ادبی انعام کے لئے نامزد کیا تھا بات آگے بڑھانے کا موقع نہ ملا۔ کاش ہمیں جب ہم گلڈ چلاتے تھے حکومت کی آج سے ایک بٹہ ہزار تائید حاصل ہوتی۔ بیورو کریسی رخنے نہ ڈالتی اور آج سے ایک بٹہ سو روپیہ ہی مل جاتا۔ ہم کام یوں بہتر طریقے پر شروع کر سکتے تھے کہ ہمارے ہاں ہر معاملے کا فیصلہ ہماری منتخب کمیٹیاں کرتی تھیں۔ کوئی "صوابدیدیت" نہیں چل سکتی تھی۔ جن کو گلڈ ترجموں کے لئے منتخب کرتا وہ پوری پیشگی 'احتیاط بذریعہ نمائندگی' اور بعد میں جواب دہی کی حدود میں رہ کر کرتا.... اگر اب بھی ایسا ممکن ہے تو اکادمی اس کام کو کسی حد تک ضرور آگے بڑھا دے گی پچھلے تیس سال میں پاکستان ٹوٹ

کر بھی عالمی توجہ کا مستحق رہتا ہے کہ آج ہماری جیو پولٹیکل پوزیشن ایک خاص حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ دنیا بھی بقول کسے (گو یہ زیادہ تر ابھی ایک رومانٹک اور امریکی اطلاع شعبہ تجارت کا ایک تجارتی نعرہ ہی ہے) ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے ... بہرحال ہم تخلیقی لحاظ سے خاصی اچھی پوزیشن میں ہیں اگر بہترین انتخاب کریں' مادری زبان والے غیر ملکیوں سے اپنے ترجمے درست اور ایڈٹ کرائیں اور ان کی مارکیٹ میں لے جائیں۔ ہمارے اردو ادب ہی نہیں علاقائی ادب بطور خاص علاقائی کلاسیک کی نوعیت 'کوالٹی' ایسی ہے کہ علمی دنیا کو چونکا دے اور پھر اچھا قاری خود ہماری تخلیقات طلب کرنے لگے گا۔ وہاں کے ناشر بڑے بدمعاش ہوتے ہیں مگر قاری کی نبض پر ہر وقت ہاتھ رکھے رہتے ہیں۔ آج نہ سہی کل ہم ان کی (برطانیہ' یورپ' امریکہ) کی کھلی مارکیٹ میں بھی بغیر مزید سرکاری امداد کے لئے اچھی جگہ بنا سکتے ہیں۔ ابتدا فردیا سرکاری شعبے کو یا کسی دور میں نجی شعبے کو خاصی رقم کی سرمایہ کاری کرنی پڑے گی۔ میں نے گلڈ چھوڑنے کے بعد بھی بک کونسل' بک فاؤنڈیشن اور سرکاری کانفرنسوں میں بڑے بڑے تحریری منصوبے پیش کئے ہیں۔ مگر خیر چھوڑیے مسئلہ کریڈٹ کا نہیں۔ کام ہو جانا چاہئے۔ آخر میرا اور دوسرے ہم خیالوں کا اصل مقصد کریڈٹ لینا تو نہیں تھا یہی دیکھئے کہ تحریک آزادی کے سبھی کارکن تو نہ پاکستان آئے نہ وہ ہندوستانی جو پاکستانی علاقوں کے جاں باز تھے زندہ رہے نہ وزیر اور مشیر بنے۔ ان کا کریڈٹ یہ ہے کہ ہندوستان آزاد ہوا اور پاکستان بن گیا چاہے ان کے نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوں۔ پاکستان کا نام تو دنیا کے نقشے پر آ چکا ہے۔ کبھی کسی کو نوبیل انعام بھی مل جائے گا۔ بس یاد رہے کہ وہ زندہ ادیب کو دیتے ہیں۔ اور ان کا ایک بڑا نظام مشاورت ہے۔ میں سویڈن جا کر سویڈش اکادمی میں سب طریق کار دیکھ چکا ہوں۔ بنیادی جواب آپ کے سوال تک یوں محدود نہیں رہا کہ معیار کے بارے میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں۔ اصل مسئلہ حقائق' مشکلات اور آئندہ کا تھا جس کے بارے میں جتنے اختصار سے ممکن تھا میں نے بعجلت ایک منظر نامہ بنا دیا ہے۔ واضح رہے کہ اب دنیا تمام نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کو عظیم نہیں مانتی۔ برسوں سے سیاسی مصالح بھی یہ انعام دلوا دیتے ہیں۔ میرے پاس فیض صاحب کا ایک خط ہے (۱۹۸۴ء) جس میں انہوں نے یہ تاثر دہرایا ہے۔ خود میں نے ایزاک سنگر کو نوبیل انعام ملتے دیکھا۔ اس تقریب کے بعد کھانے کی میز پر ان کا بیٹا اسرائیل میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا سائنس میں تو ہم نے سب کو ایک طرف کر ہی دیا تھا اب دیکھو یہ بھی یہودیت کی فتح ہو رہی ہے۔ عرض کی بھائی پہلے بھی یہودی کو مل چکا ہے۔ بولا جناب میرا باپ زیادہ تر دراصل ییدش YEDISH (ایک پرانی اب پولش یہودی زبان) میں لکھتا ہے۔ پھر ہنسنے لگا ایزاک سنگر صاحب بڑے ناول نویس تھے لیکن ۱۹۷۸ء کا سال یاد کیجئے۔ یہود نوازوں نے اور خود یہودیوں نے کیسی سیاسی اور ثقافتی یلغار کر رکھی تھی۔ اب نوبیل ادبی انعام عالمی لابی سے بھی منسلک ہو گیا ہے۔

لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہماری تخلیقات اگر اچھے ترجموں کے ساتھ پوری حکمت عملی سے متعارف ہوں تو نوبیل انعام نہ ملے اول مرحلہ درست انتخاب ہو گا جو یہاں دوسرے اہم سے اہم شعبوں میں تو مفقود ہے۔ خدا

کرے شعبہ ادب میں ہی میرٹ چل جائے۔

○ لسانی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے کہیں فرمایا تھا کہ اردو زبان سے تعصب اور بیر کا سبب اس زبان کے نادان دوست بھی ہیں کیا آپ ان دوستوں اور نادانیوں کی نشاندہی فرمانا پسند کریں گے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ان نادانیوں کی ابتدا کراچی سے دار الخلافہ منتقل ہونے کے ساتھ ہی احساس محرومی کی شکل میں نمایاں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

○○ یقیناً پاکستان میں اردو کو اس کے نادان دوستوں نے بھی بڑا نقصان پہنچایا۔ میں نے کئی مرتبہ کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ ویسے دلی 'لکھنؤ کے اہل زبان بھی جب سے سلطنت دہلی کمزور ہوئی اور طاقت بٹ کر شمال کی حد تک لکھنؤ میں بھی منتقل ہوئی آپس میں خوب لڑتے تھے۔ تاریخ ادب اردو شاہد ہے۔ پھر علامہ اقبال جیسے تو داغ کے شاگرد ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ سر عبدالقادر جیسے اور بعد میں میاں بشیر احمد (ہمایوں) ٹکسالی اردو پر زور دیتے رہے۔ لیکن بہت جلد نیاز مندان لاہور (ڈاکٹر تاثیر مرحوم وغیرہ) اور شاہد احمد دہلوی مرحوم کی سربراہی میں "شلوار ان پنجاب" کے مابین اسی "ٹکسالیت" کی وجہ سے ایسی ناخوشگوار بحث کا آغاز ہوا کہ اس کے ارتعاش آج تک چلتے ہیں۔ یہاں آکر "اہل زبان" نے کم از کم کراچی میں مقامی سینئرز تک کے لب و لہجہ پر ناک بھوں چڑھائی۔ یہ بیورو کریسی میں زیادہ ہوتا تھا اور کئی موثر عناصر بیورو کریسی میں بھی تھے۔ شعرا ادبا میں کم ہوتا تھا۔ یہ الزام ہے کہ باہر سے آنے والے شاعر ادیب یہاں والوں کو نہیں مانتے تھے میں تو اس پورے دور کا گواہ ہوں۔ باہر سے جوش صاحب کے علاوہ (وہ بھی شاید ۵۶۔۱۹۵۵ء میں آئے) کون بڑا کب آکر کتنے دن جیا؟ جگر صاحب نے ہجرت نہیں کی۔ گاہ گاہ آتے تھے تو میں اکثر حاضر خدمت رہا۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ وہ اس مزاج کے آدمی ہی نہیں تھے۔ اور یوں دلی میں پرانے دلی والے انہیں کب اہل زبان مانتے تھے۔ وہ تو دلی باہر مراد آباد کے تھے۔ سیماب اکبر آبادی صاحب دیر میں آئے۔ جم نہ سکے اور جلد انتقال کر گئے۔ یگانہ صاحب اپنے آخری زمانے میں آئے' عسرت کا عالم تھا۔ کسی سے زبان پر کیا لڑتے بھڑتے جلد واپس بھی چلے گئے۔ فانی صاحب تقسیم سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ کون بڑا شاعر آیا اور رہا۔ جوش صاحب آئے سو وہ دلی والوں کو بھی نہیں پتیاتے تھے۔ ہر ایک کی تقریر تحریر کی گرفت کرتے تھے۔ میں خود ان کی خدمت میں ایک دو بار سے زیادہ حاضر نہیں ہو سکا کہ ان کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی یہ چودھراہٹ نامرغوب تھی۔ اور انہیں یہاں بڑھایا کس نے؟ جگہ کس نے دی؟ چیف کمشنر کراچی ابو طالب نقوی مرحوم نے تو صرف قیام وغیرہ کے معاملے میں کچھ مدد دی تھی جس کی کہانیاں بنی ہوئی ہیں (مجھے سید سعید جعفری صاحب نے ان کا پہلا مالیاتی منصوبہ بند مشیر مقرر کیا تھا۔ بوجوہ میں جلد بھاگ آیا۔ وہ حقیقتاً "کچھ لے نہیں سکے۔ مگر وہ دوسری کہانیاں ہیں) انہیں اردو بورڈ میں ممتاز حسن صاحب اور پیر حسام الدین راشدی لائے۔ (پھر لمبی کہانیاں) مگر انہوں نے کسی سے کوئی صوبائی تخصیص نہیں برتی۔ وہ اپنی دنیا آپ تھے۔

حفیظ جالندھری صاحب ان پر تقسیم سے پہلے بھی عقائد کے حوالے سے معترض رہتے تھے۔ بعد میں بھی رہے۔ مگر ان کے جھگڑے پھیلے نہیں۔ بلکہ جوش کے خلاف "جوش نمبر" کس نے نکالا۔ شاہد بھائی نے..... حفیظ صاحب نے نہیں۔ شاہد بھائی اپنے دادا کی توہین پر ناراض ہوئے تھے۔ مگر سیکریٹریٹ میں اور محفلوں میں بعض اہل زبان نے غیر مہاجروں پر جو معمولی سے طنز بھی کئے (میرے سامنے بھی) ان کے آوازے اور اثرات دور دور تک گئے۔ میں گو نوجوان تھا۔ کم تجربہ، کم بیں مگر ان کی شاؤنیت پر ان بزرگوں سے بھی لڑ لیتا تھا وہ جلد ہی ختم بھی ہو گئے ان دنوں فیض صاحب سے کم واسطہ رہا۔ کیونکہ وہ کئی برس انہوں نے جیل میں گزارے۔ مگر جب انہیں یہاں کی محفلوں اور مشاعروں میں دیکھا مقبول و محترم ہی دیکھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے لہجے یا زبان پر کوئی ڈھکا چھپا اشارہ بھی کرتا..... اور نثر نگاروں میں تو ہم نے ایسا قضیہ ہی نہ دیکھا ان میں مکاتب فکر کے اختلاف ضرور رہے مثلاً پروفیسر حسن عسکری اور منٹو صاحب متحد ہو کر اس وقت کے ترقی پسندوں سے لڑتے تھے۔ یہ پانچویں دہائی کے پہلے دو ڈھائی برس تک چلا۔ ایسی لڑائیاں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں سے بھی لڑی گئیں۔ مگر یہ اردو کے حوالے سے کوئی مسئلہ نہیں بنا۔

اہم تر بات یہ تھی کہ یہاں آتے ہی بعض حلقوں نے جن میں بطور خاص پنجاب کے لوگ شامل تھے اردو کو قائد اعظم اور مسلم لیگ کے انتخابی منشور اور تحریک آزادی کے نہایت اہم وعدے کے مطابق انگریزی کی جگہ سرکاری زبان بنانا چاہا۔ بابائے اردو نے وفاقی کابینہ سے خوب جھگڑا کیا۔ اسی لپیٹ میں سندھی زبان بھی آگئی جو یہاں ضلعی دفاتر میں بھی ذریعہ اظہار تھی۔ کراچی کی سندھ سے علیحدگی اور وفاقی صدر مقام بنائے جانے پر سندھی جاگیرداروں کا ایک طبقہ خوش نہیں تھا۔ انہوں نے خود اور اپنے جونیئر ہم نواؤں کے ذریعے جن کی اپنی وجوہ بھی تھیں ایک معاندانہ سیاسی فضا پیدا کر دی۔ پنجاب اردو صوبہ تھا۔ وہاں نفاذ اردو کی تحریک چل رہی تھی (مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، حامد علی خان، پروفیسر حمید احمد خان وغیرہ) سرحد اور بلوچستان بھی اردو پسند تھے۔ (مولانا عبدالقادر، مولانا یوسفی) (۱۹۷۲ء میں تو پاکستان بھر میں پہلی بار گورنر غوث بخش بزنجو صاحب نے اردو کو بلوچستان کی سرکاری زبان کے طور پر نافذ بھی کر دیا تھا) اور پھر یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں مرکز سے سیاسی اختلافات ابھر رہے تھے مگر صوبائی حکومت میں اہم افسران مثلاً فضل احمد کریم فضلی مرحوم اردو کو اسی ارشاد قائد کے مطابق مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی عجلت میں تھے۔ یہی کوشش تعلیمی سطحوں پر اردو نفاذ کے لئے جاری تھی۔ یہ غلط تھا صحیح تھا الگ بحث ہے۔ مگر قائد اعظم خود چاٹگام جا کر ایک کھلے خطبے میں فرما آئے تھے کہ اردو اور صرف اردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہوگی۔ بات بڑھی۔ قائد کے بعد مرکز اور مرکزی علامت کے طور پر صوبائیت پسندوں میں اردو کے خلاف تحریکوں میں شدت آگئی۔ ایک دن نورالامین صاحب کے دور حکومت میں ڈھاکہ کے احتجاجیوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلوس بنایا اور روایتی سیاست کے

مطابق نعرے لگاتے چلے تو متعلقہ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر ایس پی مسعود محمود نے فائرنگ کرادی.... بس اس سے وہاں "اردو شاونیت" کا ڈنکا پیٹ دیا گیا۔ مسعود قصور کا پنجابی تھا (اس نے کراچی میں مہاجر لیفٹیننٹ کمانڈر عبرت کیس میں ان کی بیوی پر مبینہ طور پر سے ایک شرمناک تارچر کی شہرت بھی حاصل کی تھی وہ کوئی اردو اسپیکنگ شاونیت زدہ نہیں تھا۔ یہ وہ شخص ہے جو بھٹو صاحب کو بہت مرغوب رہا اور ان کے مقدمے میں سلطانی گواہ بھی بنا اس نے اپنے ساتھیوں پر بھی بڑے مظالم کئے۔ ان میں پنجابی بھی شامل تھے۔ وہ ایک بدصفات آدمی تھا۔ صوبائی اپنائیت کا لحاظ بھی نہیں رکھتا تھا۔ ڈھاکہ میں اس سانحے کے اثرات مغربی پاکستان تک آئے۔ وہ ایک معمولی سطح کا اردو شاعر بھی تھا۔ مشرقی پاکستان میں اردو کو اس کے ظلم نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ وہاں طلباء نے اپنے تین شہیدان بنگلہ کی یاد میں پھانسی یادگاریں بنائی تھیں۔ ہر سال بڑا جلوس نکالتے تھے۔ ہم نے گلڈ میں بنگلہ کو اردو کے ساتھ رکھا۔ ۱۹۶۷ء آتے آتے میں نے ان کے جلوس کی قیادت خود کی یہ وہاں کے تمام اخبارات میں چھپا ہوا ہے۔ تو یہاں اردو کے ان دوستوں میں وہ مہاجر ہی نہیں جن کا ذکر آیا۔ بلکہ سندھ اور زیادہ تر پنجاب کے اردو پسند بھی شامل تھے۔ پیر حسام الدین راشدی' پیر الٰہی بخش (علی گڑھ کے فارغ التحصیل) بہت سے نام ہیں۔ پنجاب میں میاں مولانا صلاح الدین احمد' میاں بشیر احمد' ڈاکٹر سید عبداللہ' پروفیسر حمید احمد خان' مولانا حامد علی خان۔ کتنے نام گنواؤں میرے کئی مقدموں "حرفے چند" میں ہر دور کی صورتحال کے تجزیے ہیں۔ نادان دوست تو جلد ختم ہو گئے دانا دوست سیاسی مناقشوں سے الگ تھلگ مخلص علماء فضلاء تھے۔ وہ متعلقہ سیاسی حلقوں پر اس طرح اثر انداز نہ ہو سکے کہ سیاسی اور اقتصادی حقوق کے لئے کشمکش میں قومی زبان ملوث نہیں ہونی چاہئے۔ سندھ کے احساس محرومی نے اور جئے سندھ ٹائپ تحریکوں نے زبانوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اردو کو مہاجر پنجابی سیاسی گٹھ جوڑ کی ایک علامت بھی قرار دے دیا گیا۔ روسی دانشوروں (بطور خاص پروفیسر گنکووسکی) نے اپنے مقاصد کے تحت مفسدانہ ریسرچ کے ساتھ یہاں ایسا لٹریچر بنوایا جو مقامی زبانوں بخلاف قومی زبان کے غیر ضروری مسائل اٹھاتا تھا۔ ون یونٹ کے قیام نے اس قضیئے کو پہلے ہی ہوا دے دی تھی۔

صدر مقام کے کراچی سے چلے جانے اور کسی رد عمل سے اردو کا معاملہ متاثر نہیں ہوا۔ جب یہ ہوا چند پرانے اہل زبان جن کو میں نے شاونیت زدہ کہا ہے' رہے ہی نہیں تھے۔ اور جو دو چار رہ گئے تھے وہ فعال نہیں تھے۔ صدر مقام تبدیل ہونے پر اقتصادی احساس محرومی نے ضرور جنم لیا۔ کوئی لسانی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ ریکارڈ پر نہیں آیا اور میری یاد میں بھی نہیں آ رہا۔ کیونکہ جب صدر مقام کراچی تھا۔ تب بھی اردو سرکاری زبان نہیں تھی۔ انگریزی ہی تھی۔ نہ ہی اہل کراچی نے اس تبدیلی کے حوالے سے کوئی لسانی قضیہ کھڑا کیا۔ یہاں مقیم بنگالی بھی اتنے ہی ناراض ہوئے تھے کیونکہ وہ معتدل موسم کی وجہ سے اور سرمایہ کاری میں خصوصی مراعات کی وجہ سے یہاں بسنے لگے تھے یعنی کاروبار میں ان کی شراکت سے مقامی سرمایہ کاروں کو وفاقی

پالیسیوں کے تحت جلد تر اور زیادہ مراعات مل جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ صدر مقام جانے سے متاثر ہوئے۔

کراچی میں اردو اس وقت مسئلہ بنی جب ۷۲ء میں ممتاز بھٹو صاحب نے روایت کے مطابق بھٹو صاحب سے اجازت لئے بغیر ایک لسانی بل سخت عجلت میں منظور کرایا۔ اس کی بعض دفعات نے اپنے دیگر حقوق کے معاملے میں پہلے سے ہی ناراض اردو اسپیکنگ آبادی کو بھڑکا دیا اور لسانی فسادات ہو گئے۔ پھر بھٹو صاحب نے مذاکرات کئے۔ ترمیمات ہوئیں۔ اس کے بعد سے سندھ میں اردو سندھی دونوں کئی سطحوں پر رائج ہیں۔ کوئی عملی تضاد نہیں۔ صوبائی سیکریٹریٹ میں انگریزی زیادہ چلتی ہے درخواستیں اردو سندھی دونوں میں لی جاتی ہیں۔ آج بھی 'اس سخت دور متنازعات میں بھی 'اردو زبان اور سندھی زبان میں کسی تصادم' کسی جھگڑے کی خبر نہیں بنتی۔ وہ ہے ہی نہیں۔

چند برس سے جو "نسلی" یا لسانی گروپ ابھرے ان کا بھی سندھی زبان سے کوئی تنازعہ نہیں۔ وہ لوگ "اردو اسپیکنگ" ہیں مگر ان کے تمام تقاضوں میں اردو کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اردو کو قومی زبان سمجھتے ہیں مگر اس کے تحفظ یا فروغ و نفاذ کی ذمہ داری پورے پاکستان پر ڈالتے ہیں۔ ان کے مسائل میں زبان کے حوالے سے کوئی مطالبہ کوئی قضیہ نہیں۔

دراصل نفاذ اردو شہری سندھ کا نہیں پورے پاکستان کا مسئلہ ہے۔ اسے سندھی کی اردو اسپیکنگ آبادی سے منتھی نہیں کیا جاسکتا میں ۱۹۵۹ء اور خاص طور سے ۱۹۷۳ء سے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کام کرتا رہا ہوں۔ میرے مقدمے ملاحظہ کر لیجئے۔ یہ موقف کہ انگریزی کی جگہ وفاق میں اردو کو نافذ ہونا چاہئے آج بھی ایک قومی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں رہ چکے ہیں۔ ان کے افکار اور ان کے عہد کا کام دیکھئے۔ پہلے چند بزرگوں کے نام تو گنوا ہی چکا ہوں۔ بابائے اردو کے بعد ان بزرگوں جیسے اردو کارکن "اردو اسپیکنگ" طبقے میں پیدا نہیں ہوئے۔ ۳۳ برس سے میں انجمن ترقی اردو میں بیٹھا ہوں۔ صلح کل۔ پاکستانی زبانوں کو دل و جان سے ماننے والا' ان کے فروغ کا حامی...... اور میں شہری سندھ میں کسی جن سنگھی قسم کے اردو ادیب' شاعر' دانشور سماجی کارکن سیاست داں کو بھی نہیں جانتا جو تہ دل سے اردو کا ٹکراؤ ان زبانوں سے چاہتا ہو۔ سیاسی حربوں میں اسے قضیہ بنا دینا اور بات ہے۔ اردو کی لڑائی انگریزی کے سرکاری استعمال سے ہے (ہاں اس رویے کے مرتب ہونے میں تھوڑا سا کنٹری بیوشن میرا بھی ہے.... میں نے انجمن میں آکر لسانِ واحد کی تحریک نہیں چلائی' نہ چلنے دی) انگریزی ہمارے کسی بھی علاقے کے آدمی کی زبان نہیں۔ میرے سامنے کوئی علاقائی یا پاکستانی زبانوں کی مخالفت یا ناقدری بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے اردو میں ان کے ترجمے بھی کرائے ہیں (انجمن کی کمائی) نہیں جناب وہ احساس محرومی سیاسی اور معاشی حقوق سے منسلک ہے۔ اردو سے نہیں۔

○ ملک کے سنجیدہ اور غیر جانب دار اہل علم کی رائے میں خرابی کی ایک وجہ اہل زبان کا احساس تفاخر اور بوئے

حکمرانی بھی بنا۔

○○ کون سی خرابی؟ یہ ایک بہت مبہم اور غلط تاثر سے پیدا ہونے والا سوال ہے۔ خرابیاں تو بلا تخصیص طبقاتی محرومیوں سے آئی ہیں۔ یہ سیاسی اور اقتصادی مسائل ہیں۔ بڑی تفصیل ہے ان کی۔ "اہل زبان" نے پاکستان پر حکومت ہی کب کی؟ بوئے حکمرانی ان میں تھی کہاں وہ تو دو سو برس سے عملاً" اور ۱۸۵۷ء سے باضابطہ طور پر انگریزوں کے غلام چلے آئے تھے۔ اگر آپ کی مراد نوابزادہ لیاقت علی خان سے ہے تب بھی غلط ہے۔ وہ قائد اعظم کے نامزد وزیراعظم تھے کل پاکستان سطح سے مسلم لیگیوں کے بل پر حکومت کرتے تھے۔ مسلم لیگیوں میں اختلافات ہوئے تو ایک دھڑے کی مخالفت کا نشانہ بنے۔ پنجاب میں ان کے حلیف میاں ممتاز دولتانہ تھے۔ ان کے مخالفین نے نوابزادہ صاحب کی بھی مخالفت کی۔ یہی سندھ اور مشرقی پاکستان اور سرحد میں ہوتا رہا۔ ویسے لیاقت علی خان مرحوم نے کبھی کوئی "اہل زبانی" دکھائی بھی نہیں۔ وہ دراصل کرنال کے تھے جو مشرقی پنجاب میں تھا (اب ہریانہ میں ہے) زیادہ تر بلکہ تمام جاگیر کرنال میں تھی۔ ایک ذیلی جاگیر مظفر نگر مغربی یوپی میں... حضرت اگر میں اپنی فصیلوں والی دلی میں بیٹھ کر بات کرتا تو انہیں قطعاً "اہل زبان نہ مانتا۔

ثقافتی احساس تفاخر کا الزام بھی بالکل فروعی بلکہ فضول الزام ہے۔ کراچی میں بقول پیر راشدی صاحب پورے ہندوستان کی کریم Cream آگئی تھی (حقیقتاً" نہیں محاورۃ) وہ اپنے اپنے خاندانی تفاخر ضرور ساتھ لائے تھے۔ وہ کوئی ترقی پسند روشن خیالوں کے قافلے تو نہیں تھے۔ جیسے اس وقت یہاں اور وہاں اپر کلاس مسلمان ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی تھے۔ جاگیردار نہ ہو کر بھی جاگیردارانہ مزاج کے چھوٹے چھوٹے آوازے۔ ہندوستان پر مسلم حکومت کی یادوں کے شاخسانے..... یہاں ایک دوسرے سے خاندانی تفاخر کرتے تھے۔ مگر جلد ختم ہو گئے ان کا تضاد یہاں ہوا کس سے؟ کسی سے بھی نہیں کیونکہ جو یہاں کے جاگیردار نواب اور خاندانی تھے وہ بھی ویسے ہی تھے اور ہیں۔ فرق یہ کہ وہ بے زمین ہوئے یہ اپنی زمین پر ہیں۔ نہیں یہ کوئی وجہ خرابی نہیں تھی۔ نہ جانے آپ کن اہل علم اور اہل الرائے کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ تاریخ تو ماضی قریب کی ہے۔ اسے بھی توڑنا مروڑنا کسی اہل علم اہل الرائے کو زیب نہیں دیا۔

اچھا اگر کوئی ایسا تھا بھی تو اس وقت کے صدر مقام کراچی تک ہی محدود رہا۔ اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا۔ آج کے اتنے پاکستانی مسائل جو اس شدت سے جاری ہیں۔ ان میں ان کا کوئی تسلسل ہے؟ بالکل نہیں پھر ان کی کیا اہمیت رہ گئی۔ افسوس کہ طبقاتی جدوجہد کو جو اصل مسئلہ ہے کس کس بہانے سے کن کن سمتوں میں پھینک کر قومی توجہ ہٹائی جاری ہے.... حضرت تفصیل کے لئے میں اپنے انشائیے پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔

○ (الف) اردو زبان کے کلی طور پر رائج اور مقبول ہونے میں تلفظ کی بحث و تکرار کا تنازعہ بھی رکاوٹ بنا ہوا ہے اب دیکھئے ایک طرف تو آپ سائنسی علوم کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے پرجوش حامی ہیں دوسری جانب

لفظ مقتدرہ ہم سے ہضم نہیں ہوتا یہ دو عملی نہیں تو کیا ہے؟

○○ (الف) یہ کوئی چالیس برس پرانا سوال تھا جو ختم ہو چکا ہے۔

(ب) روزمرہ کی گفتگو میں مقتدرہ مجھ سے بھی ہضم نہیں ہوتا۔ مگر میں اسے Establishment سے بہتر سمجھتا ہوں۔ نیز یہ میرے خیال میں اس کے اصل معنی نہیں۔ اور Establishment سے بھی میری مراد صرف مقتدر طبقہ نہیں بلکہ اعلیٰ معاشی سطحوں کا اقتدار طلب طبقہ بھی ہے یعنی وہ سب جو تاحال صاحب اقتدار ہیں اور اقتدار طلب' ایک طرح کے استحصالی جو حکومتیں بناتے بگاڑتے اور حکومتوں سے اعلیٰ سطحوں پر متعلق رہتے ہیں۔ خیر یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ مقتدرہ جن لوگوں نے رائج کرنا چاہا انہوں نے AUTHORITY کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور اس کے اراکین منتظمہ گواہ ہیں کہ میں نے دو باتیں کہیں۔

(ا) ہمارے عقائد کے مطابق مقتدر صرف خدا کی ذات ہے۔ کسی ادارے کو مقتدرہ کہنا مذہبی جذبات کو مجروح کرنا ہے۔

(۲) سارے ملک میں کسی AUTHORITY مثلاً CDA' LDA' KDA کے ترجمے میں مقتدرہ استعمال نہیں کیا گیا۔ ادارہ کہتے اور لکھتے ہیں۔ اس مقتدرہ قومی زبان کو بھی کوئی اور نام دے دیا جائے۔

یہ میں نے کالموں میں بھی لکھ رکھا ہے۔ ان کی منتظمہ نے میرا موقف منظور کرکے صدر صاحب کو بھیجا۔ انہوں نے سفارش مسترد کر دی۔ وہ خط کتابت مقتدرہ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔

علوم میں اصلاحات کا مسئلہ دوسرا ہے۔ کئی مکاتب فکر ہیں۔ ہم کام کرتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں بھی علوم کی زبان علیحدہ ہوتی ہے۔ مگر عام بول چال میں مقتدرہ ایک ثقیل لفظ ہی کہا جائے گا۔۔۔۔ یہاں دو عملی کا اشارہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔۔ میں تو کبھی کسی یا اس قومی زبان والی مقتدرہ کا صدر نشین نہیں رہا۔ نہ ہوں نہ ہونے کا امکان ہے نہ مجھ میں وہ اوصاف ہیں نہ میری مزاجی کیفیت ایسے معاملے میں جزو ایمان کی طرح کسی چپڑ قنات سیکرٹری' وزیر بلکہ کسی وزیراعظم تک کی ماتحتی قبول کر سکتی ہے۔ یہ دل کا مسئلہ ہے میں نے نوکریوں میں دماغ بیچا ہے' دل نہیں بیچا۔

○ سندھ کے بے پناہ سنگین مسائل میں ایک مسئلہ کراچی کی جانب ہجرت کا بھی ہے۔ مقامی آبادی کی جانب سے سن اور تناسب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے نیز جبری اور اختیاری ہجرت کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

○○ یہ کوئی بیس صفحے کا جواب مضمون چاہتا ہے۔ جو لوگ میرے کالم پڑھتے رہے ہیں۔ وہ میری رائے جانتے ہیں۔

○ ایک مفروضہ قائم کرتے ہیں خدانخواستہ پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا یا آپ ہجرت نہ فرماتے تو آج ہم کس

ڈھب کے جمیل الدین عالی سے متعارف ہوتے؟

∞ یوں تو یہ مفروضہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ میں میثاق آدم میں شامل نہ ہوتا اور پیدا ہی نہ ہوتا۔
مگر آپ نے واپس جاکر اپنی اوقات متعین کرنے کی بات کی ہے تو کسی قدر سوچ سکتا ہوں کہ میں وہاں بھی کشمکش کرتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مجھے پاکستان نے سب کچھ دیا ہے مگر یہ نہ بھولا جائے کہ پاکستان مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا نتیجہ بھی ہے۔ ایک تسلسل کو کم اور ختم ہو رہا ہے یا اس طرح آمیز ہو رہا ہے کہ شاید کچھ مدت بعد اس کی شناخت نہ ہونے پائے۔ میرے پس منظر میں بھی رہا۔
اچھا یوں دیکھتے ہیں کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو کیا ہوتا' اگر ہندوستان میں ریاستیں بھی رہتیں تو میں ریاست سے ذہنی بغاوت کے باوجود اس کا وظیفہ تو لیتا رہی رہتا یعنی دوسرے ہندوستانیوں کے مقابلے میں مراعاتی تو رہتا ہی ممکن ہے مجبور ہو کر ریاست میں ہی چلا جاتا اور وہاں سے ابھرتا۔ اس اضافی حیثیت کے ساتھ کشمکش کرتا تو شاید بہت پچھڑا ہوا نہ رہتا۔ اگر ریاستیں بھی ختم ہو جاتیں جیسے کہ ہوئیں تو وظیفہ ختم ہوتے ہوتے (شاید ۱۹۷۱ء میں کامل طور سے ختم ہوئے) ریاست کی سیاست میں آکر کوئی جگہ بنالیتا۔ دلی میں کوئی جگہ بنالیتا۔ شاید ہر جگہ ناکام رہتا لیکن یہ ضروری نہیں' میری بے چینی کہیں تو لے جاتی۔ شاعر تو میں رہتا ہی شاید نثر نگار بھی ہو جاتا۔
لیکن میں اتنی کم عمر میں یہاں آیا ہوں کہ اس مفروضے کا مجھ پر اطلاق ہونا ہی نہیں چاہئے۔ میں تو حقیقت سے شروع کرتا ہوں۔ میں پاکستان کسی مجبوری یا فساد کے نتیجے میں ہجرت کر کے نہیں آیا۔ حکومت ہند میں پاکستان آنے کے لئے بھرتی ہوا۔ اور مستقلاً "OPT" کر کے آگیا (عارضی اور مستقبل تبادلے کی OPTIONS دی گئی تھیں۔ اور قائد نے اپیل کی تھی کہ مسلمان ملازمین پاکستان چل کر حکومت اور ادارے بنائیں۔ یہ ریکارڈ پر ہے) یہاں کشمکش رہی۔ محنت کی' ملک کے حالات نے مدد کی (مجھ جیسے بہتیرے رہ بھی گئے) بہرحال پروان یہیں چڑھا تو جو بھی ملنا تھا یہیں ملا۔ یہاں تک کہ ایک وراثتی جائیداد بھی (بے اولاد بہن مہربانو بیگم مرحومہ کی جائیداد اور زیورات) جس میں ایک بٹہ آٹھ حصہ ملا۔ پاکستان (ساہیوال' لاہور) میں ہی واقع تھی۔ ایک وقت تک اس کے ملنے کا امکان نہ تھا کہ مرحومہ کے سگے بہن بھائی زندہ تھے مجھے حسبِ شرع کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی ایک بڑی بہن (بیگم پاٹوڈی) ان کے بعد بھی زندہ رہیں۔ (انہیں آدھا حصہ ملا۔ ان سے ان کے بیٹے ریٹائرڈ میجر جنرل شیر علی بیٹے کو آیا جو پاکستان میں ہیں) یہ اتفاق ہوگا میرے لئے تو وسیلہ ثابت ہوا پاکستانی وسیلہ۔

ماضی کی پیش گوئی بڑا مشکل کام ہے۔ وہی

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا

حال پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مگر میرے اس احساس کے اسباب منفرد ہیں۔ اگر مفروضے کو عمومیا جائے تو ہر ایک کے ذاتی اور خاندانی حوالے سے سوچنا ہوگا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ذاتی سطح پر مادی طور

سے بہت کچھ کھودیا۔ مگر پاکستان مل جانے پر خوش ہیں۔ اب مہاجروں کی نوجوان نسل میں ہمارے اور ان بزرگوں کے اس تصور سے اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں مگر ان کی ایک معاملاتی کیفیت ہے بہرحال اس پر کتابیں ہی کتابیں آرہی ہیں۔

(پرانا سہی) میں اپنی جگہ اب بھی یہ موقف رکھتا ہوں کہ پاکستان ناگزیر تھا۔

(۲) مجھے یہاں سبھی کچھ ملا اور (۳) میں ایک پاکستانیت پسند نہ کہ صوبائی لسانی عرقیت زدہ شہری کے طور پر مرنا چاہوں گا۔ اللہ یہ خواہش پوری کرے۔

○ علوم و فنون میں رہبری و راہنمائی تخلیقات و ترغیبات کے حوالے سے پچاس سے اوپر بلوغت کی عمر شروع ہوتی ہے ہماری موجودہ ابتری تنزلی اور اخلاقی باختگی کی ذمہ دار ہماری نو عمر نو آموز قیادت تو نہیں؟

○○ ممکن ہے آپ کا فارمولا انفرادی سطح پر عمومی طور سے کو بلا استثناء درست ہو' افلاطون نے تو ملکی خدمات کی ذمہ داری رہنے کے لئے ساٹھ برس تک کی شرط رکھی ہے۔ جس سے پہلے مختلف واضح تعلیمی اور تربیتی مراحل سے گزرنا ضروری تھا۔ لیکن ہماری موجودہ ابتری' تنزل اور اخلاق باختگی کا اس بلوغت یا عدم بلوغت کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک نئے سیاسی نام کے ساتھ ہم پچاس برس سے کم عمر ہیں مگر یہ کوئی ایسا صحرا نہیں تھا جہاں انسان پہلی بار متشرّ ہو رہا رہے ہوں۔

ہماری موجودہ نو آموز قیادت بھی پچھلے آٹھ دس برس میں ہی جوان ہوئی اخلاق باختگی اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔

ابتری اور اخلاق باختگی ہم سے کہیں زیادہ میچور سیاسی قیادت کے معاشروں پر چھائی ہوئی ہے۔ ہاں بعض معاشروں میں تمام تر اخلاق باختگی کے باوجود حکومت اور عوام کے رشتوں میں جواب دہی کے نظام نے ملک کو اتنا نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ ہم سے کہیں بدتر ہمارے شرعی اخلاقی معیاروں کے لحاظ سے بھارتی معاشرہ ہے مگر وہاں سیاست دان عموماً" نہایت مجرمانہ ذہنیت اور دوغلے پن کے باوجود جواب دہی کے نظام میں ہمارے مقابلے میں کم سے کم قومی نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی حال برطانیہ اور امریکہ کا ہے ذاتی سطح پر نہ جانے کیا کچھ لیکن اجتماعی سطح پر پبلک لائف میں بہترین سیاسی ضوابط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

ہماری ابتری کے بہت سے اسباب ہیں۔ یہ مفروضہ نابالغی نہیں۔ آگے جواب مضمون شروع ہو سکتا ہے۔ مختصراً' ہماری بیشتر بدعنوانیوں کی جڑ ہمارے جاگیرداری نظام معاشرت میں ہے جو حکومتوں پر بھی حاوی رہتا ہے۔ ہمارا نظام اقتدار ایک آدم خور دلدل کی طرح ہے۔ کوئی اچھائی ابھرتی بھی ہے تو اسے بہت جلد ہڑپ کر لیتا ہے۔ اگر پاکستان بنتے ہی جاگیرداری' وڈیرہ شاہی' خاندانیت پر تحدید لگا کر آہستہ آہستہ اسے ختم کر دیا جاتا تو سو سمتوں میں روشنی پھیلنے لگتی میں تو حیران ہو کہ علوم و فنون میں ہمیں اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہے وہ کیسے ممکن ہوا؟ شاید یہ

ہماری پرانی بہتر روایات کی سخت جانی ہے۔

○ قریب ۳۰ سال قبل ہارورڈ انٹرنیشنل سیمی نار کے دوران آپ نے ہنری کسنجر سے سوال کیا تھا کہ ہمارے سیمی نار کے انتظام وانصرام میں سی۔ آئی۔ اے کس قدر ملوث ہے جواب میں ہنری کسنجر نے کہا میں سی۔ آئی۔ اے کے تعاون واشتراک کا منکر تو نہیں طریقہ کار کے بارے میں البتہ لاعلم ہوں۔ یہی سوال ہمارا آپ سے پاکستان کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے ہے؟

○○ نہیں کسنجر صاحب نے یہ کہا تھا کہ جہاں تک میں جانتا ہوں ان سیمیناروں میں سی۔ آئی۔ اے ملوث نہیں۔ لیکن انہوں نے یہ برا مان کر کہا تھا۔ اور وہ سیمینار کوئی اتنا بڑا اور ایسا مہنگا نہیں تھا کہ کروڑوں ڈالر خرچ ضروری ہوتا۔ چالیس بیالیس آدمی باہر سے بلوائے جاتے اور لےمونٹ LAMONT لائبریری سے متصل لڑکیوں کے ہوسٹل میں ٹھہرائے جاتے۔ کھانا کھانے ایک باہر کے سیلف سروس خاصے سستے نجی ریستوراں میں جاتے' جہاں کوپن دکھانا پڑتا تھا۔ کوئی مزید اکل وشرب یا سیر سپاٹا مفت نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ Friends of the Seminar اپنے طور پر اپنے گھر یا تفریح کے لئے لے جاتے۔ لیکن امریکی مفادات کے لئے دنیا بھر میں سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ایک کتاب آئی تھی۔ The Ugly American پھر جلد ہی دوسری آئی۔ اس کا تو نام ہی تھا CIA۔ دونوں نجی اشاعتیں تھیں۔ مگر لوگوں نے کہا خود سی۔ آئی۔ اے نے دنیا کو ڈرانے کے لئے لکھوائی ہیں وہ ان بیانات سے منکر بھی رہے اور انہیں عام بھی ہونے دیا۔ پچھلے بتیس برس میں تو اتنا لٹریچر آچکا ہے اور دنیا بھر کے علاوہ خود پاکستان میں ایسے بڑے بڑے واقعات پیش آچکے ہیں کہ اب یہ سوال موہوم قرار پا کر ساقط ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی' تمام صورتحال ہر لمحہ خود منہ سے بولتی ہے۔ ۱۹۶۸ء سے جب صدر ایوب مرحوم بڈبیر علاقے کی لیز توسیع نہ کرنے پر امریکہ کے معتوب ہوئے۔ آج تک جتنی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں وہ خالص مقامی وجوہ سے نہیں آئیں۔ یہ تو سب ہی جان چکے ہیں۔

چونکہ میں ثابت نہیں کر سکتا' اس لئے اپنے طبقے تک سے نام نہیں لے سکتا۔ لیکن بہتوں کے طرز فکر اور عمل کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو آخری تجزیے میں اکثر نہ سہی بہت سے "محض غلطیاں کرنے والے" بھی "اپنی ہی سچائیوں" کے مطابق مطلوبہ اقوال واعمال سے متصف نہیں' کسی بیرونی قوت کے متاثرین اور بعض اوقات واضح طور پر آلہ کار نکلیں گے۔ سی۔ آئی۔ اے وغیرہ کے ملوث ہونے کا واحد طریقہ یہ نہیں کہ وہ کیش ہی دے دیا کرے' بلکہ عہدے بخشوا دے یا کاروبار میں آسانیاں دلوا دے۔ اس نے ایک بڑا گھیرا ڈال رکھا ہے جس میں ہمارے بیسیوں شعبہ ہائے حیات کے افراد اور ادارے اور سیاسی افراد اور طبقے کسی حد تک نادانستہ اور بڑی حد تک دانستہ طور پر گھومتے ہیں۔

آگے 'فی الحال' حد ادب۔ اور چہ پدی چہ پدی کا شوربا "لاحاصل" میں ۱۹۵۹ء کے لکھے ہوئے دو ہے "پاکستان کتھا" میں ملاحظہ کر لیجیے۔ اس وقت تو نہ مجھے یونیسکو فیلوشپ ملا تھا نہ ہاورڈ گیا تھا۔ جولائی یا اگست ۱۹۵۹ء کے ہفتہ وار "لیل و نہار" لاہور میں بھی چھپ چکے تھے۔

آج بھی بھیڑ چال میں مبتلا ہو جانا' سمجھوتے کر لینا' خوف میں مبتلا ہو کر چپ رہنا انہی کا ہو جانا کہ سب انہی کے ہو چکے ہیں اور بات ہے۔ حقیقت یہی ہے جو تمام دنیا تسلیم کرتی ہے گو اس چکر سے باہر نکلنے کی ہمت بہت کم ملکوں اور کم افراد نے دکھائی ہے بس۔۔۔۔۔۔۔

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

سچ کہ ہم اب بھی کسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظر آنے والے اور نظر نہ آنے والے داؤ پیچ اور سحر میں مبتلا ہیں۔ نتائج ظاہر بھی ہوتے جاتے ہیں اور ہم جانتے بھی ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گا لیکن مفادات پیوستہ ہمیں اس دلدل سے نہیں نکلنے دیتے۔ اب تو ایسی غلامی کو قومی شعار بنا لیا گیا ہے۔ بین الاقوامی بھیڑ چال کے حوالوں سے خود تشفی اور جواز کے طلسمات میں کوئی آواز اختلاف بھی نہیں سنی جاتی۔ بلند ہو تو اس کا مذاق اڑا دیتے ہیں۔ سی۔ آئی۔ اے بظاہر پیچھے رہ گئی اب تو عالمی بینک اور آئی۔ ایم۔ ایف کا کھلا کھیل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خیر' یہ بات بہت دور تک جا سکتی ہے۔ از راہ کرم اپنے قارئین کو میرے اظہاریے پڑھنے کی ترغیب دلایئے۔ مستقلاً "با تفصیل لکھتا رہتا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ افیون یا ہیروئن کے عادی اگر نشے سے نکلتے بھی ہیں تو کتنی مشکل سے اور اپنے حال کی کتنی قیمت دے کر۔۔۔۔۔۔ یعنی مستقبل کو کتنی دور کرتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔ بہرحال کہنے والے کا کام کہے جانا ہے!

○ ادب سے وابستہ ایک نوجوان کی ہمہ جہتی سے متاثر ہو کر آپ نے فرمایا تھا تم کرنا کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت یہی سوال آپ سے پوچھوں کہ آپ کرنا کیا چاہتے تھے آپ کی منزل آپ کا ہدف آپ کے شوق کی انتہا کیا ہے؟

○○ یہ بہت اچھا سوال ہے۔ بڑی تفصیل مانگتا ہے مگر اس بھروسے کے ساتھ جواب بہت ہی مختصر طور پر دوں گا کہ آپ اور قاری اس سعی بلاغت کو ضائع نہ ہونے دیں گے۔

میں چاہتا تھا کہ ہمارے معاشرے میں' متقین کے بعد' سب سے بڑا درجہ ادیب کو ملے۔ میری نوجوانی سے ہی' اترانے والے بڑوں کی سرکشی کم از کم کراچی میں بہت معروف رہی ہے۔ وقت آیا تو میں نے کونشن اور پھر گلڈ کے اراکین کے لئے سبز گول بیج پر قلم کا نشان بنوا کر تقسیم کیا کہ سینوں پر آویزاں کر لیا جائے۔ ہماری شناخت قلم ہو' ہمارا مقام کسی بھی عہدے' سیاسی مقام' تجارتی' صنعتی اثاثے سے کم نہ ہو۔ یہی میں اب بھی چاہتا ہوں۔ میرے اور کئی خیالات میں تبدیلی آچکی ہے۔ اس تجربے' اس تصور' اس خواہش میں تبدیلی نہیں

آئی ــــــــــ یہ کہ ہم میں کون بڑا چھوٹا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی ہم ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی محض وزیر، محض بیورو کریٹ، محض سیاسی عہدہ دار نہیں کر سکتا نہ اسے اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ رہے ہمارے عیوب تو وہ اس بلند مقامی کے ارتقا میں احساس ذمہ داری سے خود ہی کم ہوتے جائیں گے۔ ہم اب بھی، مجموعی طور پر، معاشرے کے لئے دوسروں سے بہت بہتر ہیں۔ یہ سب نہیں ہو سکا۔ مگر میرے وقت تک اور شہاب صاحب کے تحفظ یا سرپرستی میں میری جدوجہد، کچھ ساتھیوں ــــــــ مشرقی و مغربی پاکستان ــــــــ کی ہم خیالی اور عملی تائید سے ہم اس تصور کو تقریباً دس فیصد آگے بڑھانے میں کامیاب ہو گئے تھے ــــــــ لیکن پھر ہم کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا گیا ــــــــ یہ کہانی میرے دور گلڈ کی کہانی ہے۔ کبھی لکھی ضرور جائے گی۔

ایسا کہیں ہوا ہو نہ ہوا ہو اس سے مجھے تعرض نہیں۔ ہم صحافتی سطح پر یا صرف آج کے تناظر میں بات نہیں کر رہے۔ یوں دنیا کے بعض ملکوں میں ایسے ادوار گزرے ہیں جب حکومت کے سربراہ اپنے ادیبوں کی صرف "قدر افزائی" ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر ان کی بات سنتے تھے۔ چین میں کنفیوشس اور کنفیوشس ازم کی تاریخ پڑھئے۔ یونان میں ارسطو اور اسکندر کے افسانوی نہیں حقیقی روابط کی کہانی دیکھئے جو پلوٹارک نے بیان کی ہے۔ سکندر نافرمان ہو گیا تھا۔ استاد خفا مگر استاد سے سکندر کی جان نکلتی تھی۔ بعض مسلم ادوار بھی ایسے گزرے ہیں کہ ادیب (اس وقت اس تعریف میں بعض علماء بھی آجاتے تھے) مطلق العنان بادشاہ کو برسرعام ڈانٹتے ہیں اور وہ چپ رہتا ہے۔ اکبر اعظم دربار لگاتا تھا مگر اپنے وسطی دور میں شیخ مبارک اور ابوالفضل اور فیضی کو جو اس کے ملازم تھے اپنا رہنما سمجھ کر کیسا نیازمندانہ رویہ رکھتا تھا۔ جہانگیر نے پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ پر عتاب کیا پھر انہیں رہا کر کے ایک طرح ان کی اور ان کی اولاد کی حلقہ بگوشی بھی اختیار کی ــــــــ یہ سب کسی نہ کسی حد میں عظمت ادب کے Recognotion کی ذیل میں آتا ہے۔ صدر ماوزے تنگ نے لوشین LOHSUN (معروف تلفظ لوسون) کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ انقلاب کے لئے اپنے طور پر کام کرتا ہوا ینان کلچرل فورم (۱۹۴۲ء) سے پہلے مر بھی چکا تھا۔ صدر ماوزے خود بھی بڑے شاعر اور سیاسی مصنف تھے۔ انہوں نے خطبات ینان میں اس کے لئے چار مرتبہ Greatest کا لقب استعمال کیا ہے۔ انہوں نے شاعر کو مورو Koumolo کو نیشنل کانگریس کا چیئرمین بنا رکھا تھا۔ انقلاب کے بعد بھی یعنی جب حکومت حاصل کر لی تب بھی ــــــــ میں نے اپنے دورۂ چین میں بھی یہی دیکھا (اور لکھا ــــــــ) ان کی طرف عام اور خاص چینیوں کا رویہ بھی دیکھا۔ ہمارے ہاں بھی ایک آدھ مثال موجود ہے۔ مولانا میمن۔ پیر راشدی۔ فیض صاحب، امیر حمزہ شنواری۔ ایک وقت میں جوش صاحب، حفیظ صاحب!

فرض کیجئے آج علامہ اقبال زندہ ہوتے (وہ ہماری برادری کے سردار ہی تو ہیں) تو انہیں کیا معاشرتی حیثیت ملنی چاہئے تھی۔ میں سرکاری حیثیت نہیں کہہ رہا۔ اور اگر آج ہم ہر وقت ان کے راگ گا رہے ہیں تو کس وجہ

ہے۔ ان کا موثر ترین میڈیم کیا تھا۔ ادب یا سیاست؟ یا حکومت؟ تو اس برادری کی برتری اور توقیر کو اپنا آئیڈیل بنانا ناممکن کو چھونے کی آرزو نہیں ہے یہ ایک امکان ہے جو کئی عناصر جمع ہو جانے کے بعد حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ برادری اپنی فضولیات میں پڑ کر اسے دور سے دور تر کرتی رہی لیکن ادیب برادری ہی متقین کے بعد ہر لحاظ سے ہماری اہم ترین اور محترم ترین برادری ہونی چاہئے۔ اس کے پاس علم بھی ہوتا ہے اور تخلیقی جوہر بھی۔ ان دو کا امتزاج اور کسی برادری میں نہیں۔

بر سبیل تذکرہ (اور اب کہنے کی ہمت کر ہی لی جائے۔ کھونے یا پانے کے لئے کچھ رہ بھی نہیں گیا ہے) میں نے اپنے انتہائی ضرورت مندی کے دور میں بھی ادب کی نوکری نہیں کی۔ ایم۔اے کر لیا ہوتا تو شاید پڑھانے چلا جاتا۔ کیونکہ میرے ابتدائی زمانے میں وہاں میرا "باس" بھی کوئی پڑھا لکھا ہوتا (اب کی بات نہیں کر رہا) مگر ادب کی نوکریاں محدود تھیں اور صرف سرکاری شعبے میں ملتی تھیں جہاں ہر شعبہ کسی نہ کسی وزارت کے تحت ہوتا تھا۔ دراصل تھا بھی ایک ہی میں' یعنی وفاقی حکومت میں ڈی۔ایف۔پی (محکمہ اطلاعات کے تحت) وہاں میں نے افسری زیادہ دیکھی۔ میں خود کسی قابل تھا یا نہیں (ظاہر ہے کہ اس وقت یقیناً نہیں تھا اور شاید اب بھی نہیں ہوں) مگر جو اوپر تھے وہ بالا تر افسروں کے ماتحت ہوتے تھے۔ پروفیسر عسکری' پروفیسر وقار عظیم' پروفیسر عزیز احمد ادھر گئے۔ (مگر سب جلد جلد چھوڑ کر بھاگ گئے) ان کی ماتحتی مجھے منظور ہوتی لیکن جن کے ماتحت وہ تھے وہ صرف بیورو کریٹ تھے۔ (شیخ محمد اکرام بہت اوپر تھے) میں کچھ نہ ہو کر بھی ایک تخلیق کار تھا۔ اپنے فیلڈ میں بغیر سوال کسی بڑے کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اسی رویے سے میرے تمام کیئررز پر برے اثرات پڑتے رہے کیونکہ کہیں بھی جاؤ کسی نہ کسی صورت سے ادیب ہونے پر حملہ ہوتا۔ توہین کی جاتی۔

جتنے کیرئیر اختیار کئے ان میں دماغ اور ہاتھ بیچے۔ انکم ٹیکس افسری میں کمشنر جو حکم دے۔ تعمیل۔ دل کہیں Involve نہیں ہوتا۔ ایوان صدر میں بھی دماغ کی نوکری بلکہ اس نوکری کے بہانے ادیب کی سربلندی کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرنا۔ (یہ سیاسی طور پر متنازعہ دعویٰ کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ بحث تو میری اس جوانی کے کیرئیر کے معاملے میں ہوتی ہی رہتی ہے) پھر پریس ٹرسٹ میں بھی دماغ اور محنت' کاپی رائٹ دفتر (مختصر المیعاد نوکری) محنت' بینک' دماغ اور محنت۔

آگے چلئے۔ چار آدمی زندہ ہیں۔ کوئی ان سے پوچھ سکتا ہے۔ پچھلے مارشل لاء دور میں وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل۔ نسیم اہیر' وزیر تعلیم' جوگے زئی وزیر تعلیم۔ تینوں نے کہا اکادمی آف لیٹرز میں آجایئے۔ عرض کی ادب اور ادیبوں کی نوکری اچھی نہیں ہوتی۔ کر بھی لوں تب بھی افسر تو سیکریٹری وزارت تعلیم اور وزیر تعلیم ہوتا ہے۔ کہا آپ کے لئے ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کر کے دیکھئے تو سہی۔ ایک تو میں اس مارشل لاء کے جواز سے اس پر اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اپنے اندر ایک احتجاج رکھتا تھا۔ بس بینک کی نوکری میں اپنا وقت گزار دینا چاہتا تھا۔

دوم اگر حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے (جس نے نہیں کیا اسے مبارک مگر یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ کس کس نے اس مارشل لا کی وزارت اطلاعات تک کے کسی نہ کسی شعبے میں کب تک نوکری جاری رکھی اور ——خیر———) اپنے آپ کو وسیع تر مقاصد کی خوراک پلا کر ادھر چلا بھی جاؤں تو فوراً ہی کوئی ان پڑھ سیکریٹری کوئی ان پڑھ وزیر حکم چلانے لگے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اپنے پیشے میں اگر سیکشن آفسر کے سامنے بھی جانا پڑے وہ برداشت کرلیا جائے۔ لیکن اکادمی ہوئی' مقتدرہ ہوئی' وزارت اطلاعات کے (سب نہ سہی) دو چار شعبے ہوئے۔ نااہل' چھوٹے لوگ' چڑ قات وزیر بھی ایک ادیب کو اس کے مضمون کے بارے میں کیا رہنمائی دے سکتے ہیں۔ دھونس سے ہی کام چلانا چاہیں گے۔ آفتاب احمد خان سابق اسٹیبلشمنٹ سیکریٹری (وزارت خزانہ کے بھی) زندہ ہیں۔ ایک سیّح الزمان صاحب کیبنٹ سیکریٹری تھے۔ میں ان سے ایک مرتبہ سے زیادہ ملا بھی نہ ہوں گا۔ وزیر اعظم جونیجو صاحب کے دور میں دونوں نے پوچھا کہ آپ کو ان تین ناموں میں شامل کرنا چاہتے ہیں جو مقتدرہ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ریٹائرمنٹ پر زیر غور آرہے ہیں۔ عرض کی اگر جونیجو صاحب خود یقین دلادیں کہ میں کسی سیکریٹری کے تحت نہ ہوں گا (نظری نہ سہی عملی طور پر مقتدرہ کا چیئرمین گریڈ ۲۲ میں رہ کر بھی ایک سیکریٹری کے تحت رہتا ہے) اور وہ کم از کم اپنی سی کوشش نفاذ اردو کے لئے کریں گے تو بلا تنخواہ اپنی زمین بیچ کر اسلام آباد میں کسی کے گھر رہ کر گزارہ کرلوں گا———وہ یقین دہانی حاصل نہ کرسکے۔ باقی تفصیل ہے۔ بہرحال ان ہستیوں پر ان حضرات سے استفسار کیا جاسکتا ہے۔ جونیجو صاحب نے خود بھی بلا کر بات کی تھی مگر وہ گواہی دینے کو زندہ نہیں ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ میری جاریہ بینکاری ملازمت میں ہی مزید توسیع کردی۔ انہوں نے دو برس کا حکم دیا تھا اسٹاف نے پچکار کر "فی الحال" ایک برس کردیا۔ دو پہلے ہی مل چکے تھے۔ میں نے دوبارہ مل کر شکایت بھی نہ کی۔ اونے پونے جائیداد بیچنے میں لگ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ میرے لئے اچھا ثابت ہوا———بہرحال میرے ہدف تین ہیں ایک ذاتی۔ یہ کہ میں کچھ اور لکھ جاؤں دوم اجتماعی۔ یہ کہ ہمارے معاشرے میں (ہماری دنیا میں ادب اور ادیب کو متقین کے بعد سب سے بڑا مقام ملے۔ میں افلاطون کے فلاسفر کنگ والے حوالے سے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ادیب حکومت کریں یا جب کوئی مقامی یا عالمی حکومت بنے تو اس کے سربراہ صرف ادیب ہوا کریں۔ یہ بڑے طویل المیعاد مستقبل کے مسائل ہیں گو میں اب بھی فلاسفر کنگ کا آنا قیامت تک خارج از امکان نہیں سمجھتا۔ شاید ایسا وقت آجائے جب ہمارا ذہنی ارتقاء' فلاسفر کنگ بھی پیدا کرنے لگے۔ سبھی فلاسفر ہونے لگیں اور اپنے میں سے کسی واقعی بے غرض دانشور کا انتخاب کیا کریں۔

تیسرا ہدف یہ کہ میں Quest for Knowlegde کے لئے کوئی بڑا کام کر جاؤں۔ اپنی جاتی عمر' اوقات اور قومی پسماندگی دیکھتے ہوئے آج یہ امکان بڑا مشکل لگتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے تو کچھ بھی بعید نہیں۔ بہرحال یہ میرا ہدف ہے ضرور۔ اس میں یہ بات ضروری نہیں کہ میں ہی کروں۔ مراد ہے کہ میں ایسے حالات پیدا

کرنے میں کوئی کردار ادا کرسکوں۔ علم ہی تو خیر ہے بھائی صاحب۔ وہ بزرگوار اتنے پرانے ہو کر بھی بات بڑی تازہ کہہ گئے ہیں مگر حضرت یہ انٹرویو میری کس حیثیت میں لیا گیا ہے؟ سوالات قدم قدم پر سوانح سے منسلک 'گلڈ' کے Repitition شاید ناگزیر طور پر ——— جناب میں بہت معمولی آدمی ہوں مگر میں نے روزی کمانے کے علاوہ بہت کام کیا ہے۔ بہت 'خواہ نثر میں' لکھا ہے کچھ نہ کچھ پڑھا بھی ہے اور پڑھتا رہتا ہوں یہ سب نثری تحریروں میں بھی Reflect ہوتے ہیں خواہ وہ کالم ہوں اور شعر میں بھی۔ ذاتی تجربات سے کشید ہو کر خواہ وہ ہے ہوں خواہ "انسان" کے حصے۔ کاش ہم ایک دو نشستوں سے زیادہ نشستوں میں تسلسل کے ساتھ جم کر باتیں کرسکتے——— مگر خیر بقول فیض صاحب یہ بھی ٹھیک ہی ہے——— افسوس کہ میری ابتدائی تعلیم یتیمی لاڈ پیار اور جیسے بھی با محبت سرپرست تھے ان کی نااہلی اور کم توجہی سے بالکل ناقص ہوئی۔ تربیت لڑکپن میں تو ہونے ہی نہ پائی۔ کبھی کسی نے ایک گھرکی تک نہ دی۔ طمانچے کا تو کیا ذکر ہے——— بڑے ہوتے ہوتے کچھ پرانی وضع کے فضلا مثلاً اپنے چچا نواب ضمیر الدین عالی اور سراج الدین خان سائل دہلوی اور مفتی کفایت اللہ صاحب (ننھیالی گھر کے بالکل سامنے آکر رہنے لگے تھے) کے پاس از خود جا کر بیٹھنے لگا تھا۔ ایک آدھ استاد نے کالج میں توجہ کی مگر اعلیٰ تعلیم نہ پاسکا۔ یہ کمی بعد میں ہزاروں کتابیں پڑھنے اور دنیا بھر کھنگالنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی——— ہاں جدید لوگوں میں اختر الایمان کی محبت سے بعض بڑے لوگ 'گو گاہے گاہے' ملتے رہے۔ ان کا فیض لاشعوری طور پر کچھ نہ کچھ دے گیا ہوگا۔

آیئے آپ کے انٹرویو کا اختتام کریں۔ ممنون ہوں کہ مجھ پر توجہ فرمائی۔ اتنا وقت اور کاغذ ضائع کررہے ہیں۔ میری شعوری عمر نہایت سخت کوشی کے باوجود کسی کائنات اصغر کی تشکیل پر سوچتے اور اس سمت میں چھوٹے چھوٹے کاموں کی معمولی ابتدائیں کرتے گزری ہے محض خیالی دنیا میں شعری' فکری کاوشوں میں تو لوگ اپنی کائنات اکبر تک تخلیق کرکے مطمئن (یا نامطمئن) رہتے ہیں اور عموماً" ناقدین انہیں سیاست کے شعبے میں پھینک دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی درست ہوں مگر ایک وقت کے بعد میں نے اپنی ہزارہا محدودات میں بھی دونوں کوششیں کرنی چاہیں۔ کامیابی اور ناکامی خارج از بحث کیونکہ یہ دونوں چھوٹے بڑے فاصلوں سے منسلک ہیں۔ میرے لئے ایک مصرع' ایک فقرہ' ایک قدم بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب نئی کتاب "اے مرے دشت سخن" میں "حمد" ملاحظہ کیجئے اور یہ دو شعر بھی۔

چل آ کہ تو بھی اسی باب ناتمام سے ہے
یہاں تو سب کو غرض اپنے اپنے کام سے ہے
رہا یہ قصہ کہ کب کون کس کو کیا مانے
تو کون جانے' ازل جانے یا ابد جانے

جمیل الدین عالی
(خط بنام مدیر)

پس مکالمہ

اس شمارے میں شامل انٹرویو قطعی نامکمل ہے مگر یہ شاید میرا آخری انٹرویو ثابت ہو۔ بہت دن سے میں ایسے انٹرویوز کا قائل نہیں رہا۔ یوں بھی اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔ جب کوئی کچھ کر گزرتا ہے تاریخ خود بھی نہ کبھی اس کا انٹرویو کر لیتی ہے۔ سولن (Solon) قدیم ایتھنز کا ایک بڑا آدمی گزرا ہے اس کا کہنا تھا کہ کسی انسان کی اصل پرکھ Assessment اس کی موت کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی مراد خدمت وطن کے حوالے سے تعیین مقام تھی۔ میں تخلیق و خدمتِ علم کو شامل کر کے کہتا ہوں کہ اگر ہم کسی لائق ثابت ہوئے تو ہمارے لئے ججمنٹ ہمارے جانے کے بعد ہی بہتر رہیں گے۔ بطور خاص ہمارے دور کی آپادھاپی' گروپ بندی' لحاظ' مصالح' پی آر کے حد سے گرے ہوئے ظاہر و نا ظاہر داؤ پیچ' جہاں جہاں در آئے صوبائیت زدگی' مفادات پیوستگی' ذاتی بغض و عناد' حسد اور مجموعی طور پر کئی غیر سنجیدہ رویوں نے سولن کے اس قول کو نہایت اہم رہنما بنا دیا ہے۔

بحمد للہ کئی شعبوں میں مجھے شہرت ملی بلکہ جاری بھی ہے۔ اہل نقد و نظر نے سند بھی دی۔ اب بھی جب کام سامنے آتا ہے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مجھے مجموعی طور پر اپنے آپ سے شکایت زیادہ ہے' دوسروں سے کم۔ اب میں عمر اور ذہنی کیفیت کی ان منزلوں میں ہوں جہاں ان بہت سی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی جو کبھی خاصی اہم لگتی تھیں۔ اگر گلزار جاوید صاحب آپ کا اتنا اصرار جاری نہ رہتا تو میں اس انٹرویو کے لئے بھی تیار نہ ہوتا۔ یہ بھی کئی قسطوں میں لیا گیا۔ سوالوں کا انتخاب آپ کا اپنا تھا۔ مجھے انہی دائروں میں گھومنا پڑا گو کئی جملائے معترضہ بھی آگئے کیونکہ بعض جوابات سوانحی وضاحتوں سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ بات سے بات نکل آتی ہے۔

دراصل مجھے اپنی سوانح عمری نہ سہی اپنی عملی زندگی۔۔۔۔ مشاہدات' تجربات۔۔۔۔ پر ایک سیر حاصل یادداشت لکھ دینی چاہئے۔ اس میں بہت سے ان سوالوں کے جواب آجائیں گے جو بعض موضوعات مثلاً گلڈ سے متعلق بار

بار کیئے جاتے رہے ہیں اور چونکہ یک رخے ہوتے ہیں ضخامت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے ایڈیٹنگ بھی دوسرے ہاتھوں میں ہوتی ہے اس لیئے کوئی بھرپور بات چھپ کر سامنے نہیں آتی۔ ادھر میری مصروفیات جاری ہیں۔ وقت نہیں مل پاتا۔ شاید ملے ہی نہیں اور سچ کہ اتنے بڑے تناظر میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اس گوشے کے لئے میرا انتخاب کلام 'جو میں نے نہیں کیا' نہ کرسکتا ہوں' ضخامت میں کافی ہو کر بھی میری تسلی کے مطابق نہیں۔ یوں مجھے کوئی دعوی بھی نہیں مگر کسی کو زحمت تفہیم کرنی ہے تو میرے ناچیز مجموعے ملاحظہ کرے۔ بہت سی باتیں نثری تحریروں میں بھی کہہ رکھی ہیں۔ وہ کالموں میں بھی آتی ہیں اور مقدموں میں بھی' میری تمام کالمی تحریروں کو کالم کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا کیونکہ اب چند برس سے پہلے میں نے "کرنٹ افیرز" پر بہت کم لکھا ہے۔ اپنی طرف سے بساط بھر بعض تصورات اور اقدار پر اپنے مشاہدوں' تجربوں اور مطالعوں کی روشنی میں اردو والوں کے لئے کسی قدر قابل غور گفتگو کرتا رہا ہوں۔ کوئی ایک بڑے پھیلے ہوئے عصری مطالعے کی ہمت کرے تو ان اثرات کی نشاندہی بھی ہوجائے گی جو ان تحریروں نے میرے معاصر اور جونیئر لکھنے والوں اور بعض معاشرتی شعبوں پر مرتب کئے۔ بعض بے حس حکومتی شعبوں تک کو متاثر کیا۔ مثلاً ایک زمانے میں جہیز کی رسم پر میرے مسلسل احتجاج نے ایک قانون بنوانے میں خاصا تسلیم شدہ کردار ادا کیا تھا۔ برصغیر کی بجائے سرکاری میڈیا پر جنوبی ایشیا کی عرفیت عام ہوئی۔ صوبائی تفریق و منافرت کے خلاف بھی قانون سازی ہوئی۔ (یہ الگ بات کہ ان قوانین کا جواب بھی موجود ہیں نفاذ تشنہ تکمیل رہتا ہے)

ایک دو بنیادی باتیں :

ذہنی بلوغت کی تعریف ہوتی رہے گی۔ مجھے اب بھی اس کا دعوی نہیں لیکن مجھے ہمیشہ سے اور اب تو خاص طور سے حیات و کائنات کے بنیادی مسائل نے مضطرب رکھا ہے۔ یہ دنیا بھر کے سوچنے والوں میں مشترک رہے ہوں' میرے لئے رواجی حسن و عشق کے طلسمات پر بھی حاوی رہے۔ وجود میرا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔

ایک تو نشتر وجود جس کی خلش سے جان فگار

کسے خبر کہ یہ سرگرم رہروان حیات
رواں دواں ہیں تو کیا کیا فریب کھائے ہوئے

جو بھی ملا اسیر زمان و مکاں ملا

کرب ہو کہ لذت ہو زندگی غنیمت ہے
اے شرارۂ بے تاب، بس یہی غنیمت ہے

یہ "غزلیں دوہے گیت" سے ــــــــ اب "لاحاصل" سے بھی ایک مثال

بزمِ حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی
پہلے ہی کیا کچھ تھے عالیؔ، اب ٹھہرے فرزانے بھی

"انسان" میں مدتوں پہلے ایک طویل خود کلامی اس مصرع پر ختم ہوئی تھی۔

مجھے صرف اک یقیں کی، ایک دھوکے کی ضرورت ہے

چلئے اس وقت روانی تحریر میں "انسان" کے چند شعر بھی آجائیں تو برسہا برس سے میرے ذہنی سفر کا ایک رخ واضح ہوجائے گا یہ "اے مرے دشت سخن" میں "انسان" کے تیسرے باب کے مکالمے میں۔(ماہنامہ "صریر" ۱۹۹۳ء میں چھپے تھے) میں اپنی نظم "حجی" کی طرف بھی توجہ چاہوں گا جو آپ کے انتخاب میں شامل کی گئی ہے لیکن یہ شعر دیکھتے چلئے۔

یہ اتنے گل یہ فرو رفتگان باغ مراد
نہ کر سکے مرے ویراں مطالبے آباد
اور اب یہ دور ثبوت عقیدہ مانگتا ہے
بہار کیسے تو دامن دریدہ مانگتا ہے

رہی یہ بات کہ دیدار یار کب ہوگا
تو جب ہوا وہ اسی ذہن کے سبب ہوگا
کہ ذہن منطق وایماں بھی واردات بھی ہے
مشاہدے، نظریات، تجربات بھی ہے
"یہ مہر و مہ یہ ثریا، یہ وسعت افلاک"
کرم ہے یا کہ ستم کیوں نہ ہو یہ پردہ بھی چاک
وہ نور ارض و سما وہ حریم ذات و صفات
ہماری دسترس شوق میں نہ ہو ہیہات
کہ ہم اسی سے تو ہیں
کہ ہم اسی کے تو ہیں

نظریات و دلائل تو ہیں تضاداتی
ہزار ان میں ملے دانش جدلیاتی
بہت مشاہدہ و انکشاف ہونا ہے
ابھی بہت سے دھندلکوں کو صاف ہونا ہے
وہ تجربات کی بھٹی، جہنمِ شبہات
اسی میں سب کے لئے ہے بہشتِ امکانات
ہمیں حقیقتِ کبریٰ کو جذب و فکر کے ساتھ
اب انکشاف سے عمل سے جاننا ہوگا
نہیں تو برزخِ تشکیک و ظن کی چھلنی میں
ابد تلک انہی ذروں کو چھاننا ہوگا

میں کیسے دیکھوں وہ کتنی بڑی قطار میں ہیں
امیدوار نظریے جو انتظار میں ہیں

دوسرے سوالات وہ ہوں، مختصر نظموں، غزلوں کے شعروں اور "انسان" میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کاش ہم کچھ باتیں ان کے حوالے سے بھی کر سکتے۔ مگر ایک گوشہ میدان تو نہیں ہوا کرتا۔ آپ نے جتنا کیا وہی بہت بلکہ بہت زیادہ ہے۔

میری دو شخصیتیں ہیں (شاید اس سے زیادہ بکھرا ہوا ہوں) ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے بقول مع "شرح سلیم احمد" وہ غالب اور میر درد کے وارثی ٹکراؤ ہیں (یہ کرداری سطح پر ان کے مجتہدانہ تجربے تھے) بلکہ فکری سطح پر ہمیشہ سے بٹی ہوئی...... جب ۲۱ برس پہلے "دنیا میرے آگے" چھپی تو سرورق پر علامہ اقبال" سے یہ نقل کیا تھا۔

از کاخ و کو بلند و پریشاں بہ کاخ و کو
کرم بہ چشم ماہ تماشائے ایں سرائے

پھر "انسان" کے باب دوم میں ایک آواز، کئی مسئلے ابھار کر یہ کہہ جاتی ہے۔

چل، اتنی بہت سی کائناتیں
کیا ان میں بس اک کرے کی باتیں

دیکھئے کوئی چالیس برس پہلے کا ایک دوہا بھی، گو حقائق زمین کے حوالے سے، کن سمتوں میں جاتا ہے۔

تہ میں بھی ہے حال وہی جو تہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

دوسری شخصیت زندگی کے ٹھوس مادی حقائق سے کھلی ہوئی' جمال پرست' جدوجہد کو خوش آمدید کہنے والی ـــــــــ کسی قسم کی کلبیت' فرار' غرور' خود پرستی نہیں۔ اپنے دکھوں یا کسی مکتب فکر کی وجہ سے ہر سطح پر جاکر اپنی بساط بھر دوسرے انسانوں سے شرکتِ غم اور کلیشے زبان میں خدمتِ خلق کی کوشش' جس شعبے میں ممکن ہو' تسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ..... کسی بڑی' عملی' شرکت کا دم نہ تھا' دعویٰ بھی نہیں۔ موازنہ میں کیا نہیں کرتا ـــــــ قلم کے ساتھ قدم ضرور اٹھاتا رہا ہوں۔ "ارتکاز؟" میرے لئے زندگی صرف شاعری پر ارتکاز کا نام نہیں رہا ـــــــ اور جنہوں نے ارتکاز کیا ان میں سبھی تو ہمالیہ نہیں چھو آئے۔

انکسار ـــــــ منکسر المزاجی نہ تو منافقت کی دلیل ہوتی ہے نہ خود رحمی کا مظہر ـــــــــ ایک سچائی ہے جس سے ہر طالبعلم کو متصف ہونا چاہئے۔ میں کچھ ہوں نہ ہوں طالب علم ضرور ہوں۔ جب علم میں..... اور فن میں..... ہر لحہ افق در افق کھلتا ہوا نظر آئے تو کوئی کس تیقن کے ساتھ "در مدح خود" کیا کہہ سکتا ہے۔ شاعری میں بھی تعلّی ایک تفریحی قسم کی خود پروری یا کسی رد عمل کی جھنجھلاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی مگر وہ بھی شاید نوجوانی میں ہی جائز ہو سکتی ہے۔ آگے حد ادب..... علامہ ہی کو دیکھئے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اس سے قطع نظر کہ اس انکسار کی حدیں کیسی کیسی بڑی بلندیوں کو چھو رہی ہیں یہ ایک مستقل طالبعلم کی پہچان ہی تو ہے۔ جب اتنے بڑے تخلیق کار نے انکسار کو عیب نہ جانا تو ـــــــ خیر چھوڑیئے۔ جناب نہال سیوہاروی۔ بہت سے غیر منکسر المزاج محترمین کا جواز نا پیش کر گئے ہیں۔ وہ یہاں معروف نہ ہوں سیوہارہ سے تعلق رکھتے ہوں مجھے یہ شعر اپنے لڑکپن سے اس طرح یاد ہے کہ ہر کسی پر انگشت نمائی نہیں کرنے دیتا۔

باہر ہیں حدِ فہم سے رندوں کے مقامات
کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

اس طوالتِ کلام کی معذرت ـــــــ نہ جانے اور کیا کچھ کہنا تھا۔ آپ کے قارئین سے التجا ہے کہ میرے لئے 'Compassionate Grounds' پر ہی سہی' دعائیں ضرور کریں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحت کے ساتھ اتنے دن اور رکھیں کہ میں "انسان" مرتب کر جاؤں جس کا بیشتر حصہ لکھا ہوا مگر بکھرا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعہ یا کسی اور ذریعے سے بھی ان کی مخلوق کے ادنیٰ خادموں میں ضرور شمار کیا جاؤں۔ اور ایک یہ کہ

میری زبان وقلم سے کسی فرد کو آزار نہ پہنچے...... بتوں کی طرح میں بھی بعض اداروں..... استعمار' جاگیرداری استحصال' افکار بندی' علاقائی تعصب وغیرہ پر حملے کرتا رہتا ہوں وہ ذاتی نوعیت کے نہیں ہوتے۔ ان پر مجھے کوئی شرم' کوئی خوف نہیں۔ کوئی معذرت پیش نہیں کرنی۔ بس میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کسی فرد کو میرے کسی دانستہ یا نادانستہ قول یا فعل سے کوئی ضرر کوئی دکھ نہ پہنچے۔ اس زمرے میں سینئر' ہم عمر اور جونیئر معاصرین بھی آتے ہیں...... آج بھی میری زندگی اور مشاہدات کا خلاصہ ان تین شعروں میں آجاتا ہے۔ سادہ ہیں۔ نوجوانی کے ہیں مگر تازہ اور بامعنی۔

ہنسی میں تلخی کلام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یونہی بار حیات اٹھائے ہوئے
کسے خبر کہ یہ سرگرم رہروان حیات
رواں دواں ہے تو کیا کیا فریب کھائے ہوئے
سوائے اس کے یہاں دعویٔ بہار نہیں
کہ ایک میں بھی ہوں اپنا چمن سجائے ہوئے

("چہار سو" راولپنڈی نومبر ۱۹۹۵)

جمیل الدین عالی
(۱۹۵۶ء)

میں اور میرا فن☆

بھائی شاعر صاحب

آپ کے جانے کے بعد میں نے بہت دیر سوچا کہ آپ سے وعدہ کیوں کر لیا کیونکہ سوائے خطوط کے میں نثر لکھنے کا عادی نہیں ہوں پھر میں اتنا گھبرا گیا کہ سوچا صاف وعدہ خلافی کر جاؤں آپ سے بھی معافی مانگ لوں گا۔

پھر خیال آیا کہ جیسا کچھ لکھ سکوں ہرج ہی کیا ہے آخر میں بھی تو بہتوں کی تحریر پڑھتا ہوں
بات یہ ہے کہ موضوع بڑا کٹھن ہے۔ آدمی اپنے بارے میں کچھ بھی کہے ایک طرح کا انکسار تو کرے گا ہی اور کچھ نہ کچھ گھبراہٹ بھی ہوگی بہر حال میری روداد یہ ہے کہ اب کوئی چودہ پندرہ برس سے تو میں ادب کو اپنے لئے اور سب کے لیئے بہت اہم سمجھتا ہوں مگر جب یہ شوق شروع ہوا تو کوئی شعوری کوشش ادب برائے یا ادب برائے زندگی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ضروری قسم کا سبق تھا جو ہمارے (اور اس زمانے میں دلّی کے ہر ایک اچھے) خاندان میں پڑھایا جاتا تھا۔ میرا سلسلہ یہ ہے کہ میرے دادا تھے علاؤالدین خاں علائی۔ اور میری والدہ کے ایک طرح پڑدادا تھے خواجہ میر درد دہلوی' ان نسبتوں اور دلّی کے قیام نے ہمارے ہاں ایک بن لکھا قانون رائج کر رکھا تھا کہ اگر آسودہ حال ہوں تو حرف شناسی کے ساتھ ساتھ شطرنج' شعر' شہسواری' پتنگ بازی اور تصوف سے بھی شوق رکھیں مجھے میرے حالات یا مزاج کی محدودات نے صرف شعر اور سواری کی اجازت دی باقی "فنون" سے دلچسپی ضرور رہی مگر مہارت حاصل نہ ہو سکی۔

اس زمانے میں دلّی میں بھی ہر ہفتے طرح طرح کے مشاعرے ہوتے تھے۔ میں نے اپنے رشتہ کے چچا نواب سائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہا مگر انہوں نے میرے جہل اور نافرمانی کی بنا پر مجھے تمام عمر (یعنی جب تک وہ جیے) صرف probationer ہی رکھا یعنی غلطی بتا دیتے تھے اصلاح نہ دیتے بہر حال میں نے ایک سائلی کی حیثیت سے مشاعرے پڑھنے شروع کیئے اس وقت دلی میں دو اساتذہ کی جماعتیں قابل ذکر تھیں "سائلیے"۔ اور "بیخودیے" ان میں بڑے بڑے معرکے ہوتے تھے اور ان ہنگاموں کے چھینٹے استادوں تک بھی پہنچتے تھے۔ وہ صحبتیں کچھ پرانی دلّی

کے علما فضلا کی نہ تھیں بلکہ معمولی فارسی داں مزدوری پیشہ' یا کاروباری اہل ذوق شعر گو لوگوں کی تھیں پھر بھی ان بزرگوں کی نسبتوں سے جو معاملے پیش آتے تھے ان کی افادیت میں مجھے آج تک کلام نہیں ہے تخلص میرا اپنا نہیں ہے میرے چچانواب ضمیرالدین خاں عالی تخلص کرتے تھے لیکن وہ اہل حدیث کے پیشوا تھے اور بڑے متقی پرہیز گار بزرگ' جب میں نے ان سے "جنگنامہ" اور "انوار سہیلی" پڑھ لیے تو شاید میری بدشوقی کی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ مجھ سے فارسی صرف ونحو نہیں چلے گی نہ کوی اور ڈھنگ کا کام ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ بھئی ایک تخلص اچھا تھا لیکن میں تو اپنی خشک مزاجی اور ادق گوئی کے سبب اس میدان میں نام پیدا نہیں کر سکا۔ تم اردو سے شوق رکھتے ہو یہ زمانہ بھی اردو کا ہے سو یہ تخلص تم لے لو۔ یہ بات ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء کی ہے میرے چچا نے لاولد انتقال کیا ان کی کتابیں ریاست نے کتب خانہ میں داخل کر دیں اور کسی کو کچھ نہ ملا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ مجھے ان سے ایسی میراث تو پہنچی جس کا میری زندگی پر بڑا اثر ہوا ہے' مجھے نصاب سے کبھی شوق نہ ہوا۔ سوائے تاریخ اور شعر کے سو نتیجہ ظاہر تھا۔ میں فیل کبھی نہیں ہوا مگر فقط پاس ہوتا رہا۔ اس زمانے میں روز کی غزلیں ہوتی تھیں کچھ چوری کچھ مستعار لینا غرض کہ جو سمجھ میں آیا کہا پھر مکمل غزلیں کہنے لگا اور کچھ عرصے بعد توفی البدیہہ مقابلوں میں بھی شریک ہونے لگا۔

پھر لوگ مجھ پر عاشق ہوئے میں لوگوں پر عاشق ہوا اس کی داستانیں الگ ہیں قابل ذکر بات صرف اتنی ہے کہ ایک ہم جماعت سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ جس کی کسک آج بھی ہے اس وقت کی دلی میں ایک ترنم سے پڑھنے والا نو عمر' خوش صورت' خوش گو' شاعر پردہ نشین گھرانوں کے لیئے بڑی چیز تھا۔ بہت سی شرمائی لجائی آنکھیں مجھے اب بھی یاد ہیں جو مجھے کس حیرت اور عزت سے دیکھتی تھیں ہمارے کالج میں مخلوط تعلیم نہیں تھی مگر اور کالجوں میں آنا جانا رہتا تھا مباحثے اور مشاعرے طرح طرح کے تعارف پیدا کرتے تھے جو وضع وضع کی کہانیوں میں بدل جاتے تھے۔

کالج تک پہنچنے سے پہلے میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا وہ ریاست لوہارو کے والی تھے اور گو حیات ہی میں اپنے بڑے بیٹے کے حق دست بردار ہو چکے تھے (جس کا سبب بجٹ کو چالیس سال تک تباہ کرتے رہنا کہا جاتا ہے) مگر بہر حال انکے خطابات اعزازات اور وظائف بر قرار تھے۔ ہم لوگ تعلیم کیلیے دلی میں رہتے تھے۔ انکی حیات تک آرام کیا بلکہ عیش سے گزری لیکن ان کے بعد کچھ تو والی ریاست کی مجبوری کچھ بے اعتنائی اور پھر حکومت ہند کے احکامات تخفیف سے نہ صرف یہ کہ ہمارے وظائف میں بے حد کمی ہو گئی بلکہ ہم دیگر مراعات سے بھی تقریباً محروم ہو گئے جو ریاست سے نقد واجناس کی صورت میں ملتی تھیں

مجھے اس تفصیل کا علم بہت دیر سے ہوا کیونکہ اس وقت میں صرف گیارہ برس کا تھا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے زیورات آہستہ آہستہ رہن اور فروخت ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور ہم اپنی ددھیال کا گھر چھوڑ کر کوچہ چیلان ننھیال میں آ گئے۔ میرا کوئی سگا بڑا بھائی نہ تھا۔ چچا ضعیف العمر اور دنیا سے بیزار۔ وہ صرف علمی دلچسپی کی حد تک مجھ سے متعلق رہ سکے چنانچہ ان کے احترام کے باوجود مجھ میں اپنے معاملات میں دخل اندازی برداشت نہ ہوتی تھی' مجھے حالات کا صحیح اندازہ نہ تھا اکلوتے پن نے عادتیں خراب کر رکھی تھیں اب ہر سال پہاڑ پر کوئی کیسے بھیجے نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں ایک سرشوری پیدا ہو گئی نہ جانے اس زمانے میں کیسے کیسے complexes پیدا ہوئے ہوں گے

جن کا آج تک شکار ہوں اس وقت دستور یہ تھا کہ دوسرے والیان ریاست سے بھی مدد مانگی جاسکتی تھی میرے چار بھتیجوں کو مہاراجہ پٹیالہ نے مدتوں اعلیٰ تعلیم کے لیئے وظائف دیئے تھے۔ مرحوم مہاراجہ کپور تھلہ میرے والد کے پگڑی بدل بھائی تھے ان کی وفات کے بعد انہوں نے ہمیں خطوط لکھے اور اپنے طور پر میرا داخلہ انگلستان کے مشہور اسکول "ہیروز" میں کرادیا مگر جب اپنے ساتھ لیجانے آئے تو میری والدہ نہ مانیں کچھ تو سبب میری کم عمری پھر یہ کہ وہ سید زادی تھیں ان کا کہنا تھا کہ امیر رہتے ہیں یا فقیر ہم غیر سے بھیک نہیں لے سکتے۔ چنانچہ ہم امراسے زمرہ فقرا میں شامل ہوگئے۔

یوں کالج میں اچھی گذری اخترالایمان سے میری بڑی دوستی تھی ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو پر بھی بڑے بڑے ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ادھر لیبر ڈیپارٹمنٹ میں تاثیر صاحب آگئے تھے ادھر فیض صاحب فوجی محکمہ اطلاعات میں' ہم لوگ کالج کی بزم ادب میں انہیں بلاتے اور گفتگو کرتے مجھے ان سب میں میراجی اور ڈاکٹر تاثیر سے خصوصی طور پر نیاز حاصل رہا میراجی کو تو خیر میں بہت بڑا آدمی سمجھتا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب جیسی ہمہ گیر شخصیت کا آدمی بھی آج پاکستان کی ادبی دنیا میں نہیں ہے۔

اسی زمانے میں جنگ نے ایک چیز آل انڈیا مشاعرہ پیدہ کر دی تھی جس میں عام طور پر ترنم سے پڑھنے والے شعرا خطیر معاوضوں پر بلائے جاتے تھے۔ کوئی دو برس میں بھی تقریباً پیشہ ور شاعر رہا۔ ان مشاعروں کی ادبی افادیت کچھ ہو نہ ہو "بڑے بڑے" شعرا کو قریب سے دیکھنے کے مواقع خوب ملتے تھے ان کی رنجشیں' ان کی عداوتیں تعلقات قائم کرنے کے معیار' بڑی آنکھیں کھلتی تھیں۔

مگر یہ کام اپنا تھا نہیں' اسے جاری رکھنے کے لئے سستی چیزیں کہنا اور مختلف افسران ضلع سے "اچھے" تعلقات رکھنا بہت ضروری تھا۔ یہاں اپنی آشفتہ مزاجی کھائے جاتی تھی ہم جلد ہیFADE OUTہو گئے۔

اسی آشفتہ مزاجی کے سبب ایم۔اے سال اول سے تعلیم چھوڑ دی اور گھر بار چھوڑ کر دنیا بھر کی خاک چھانی آپ کے سابق وطن حیدر آباد دکن کا ایک ایک ضلع دیکھا۔ پونا دیکھا بمبئی دیکھا پھر یوپی اور پنجاب میں گھوما۔ شاید یوں گھومتے پھرتے غزل کے آداب برقرار نہ رکھے جا سکتے تھے اس لئے مغربی یوپی کی سیاحت میں نوٹنکی والوں کو سن سن کر دوہے کہنے کا شوق ہوا تب سے دوہے کہتا ہوں' دوہوں کے نام سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ شاید میں ہندی عروض کو خراب کر رہا ہوں یا ہندی الفاظ اردو میں غلط طریقے پر لانا چاہتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اُسان اردو کی دو بیتوں کے مجموعے کو میں نے دوہا کہہ دیا ہے اور بس نہ مجھے ہندی کے چوبیس چھندوں سے کوئی تعلق ہے نہ مجھے ناٹک بھید آتا ہے مجھے جیون بھید سے ہی فرصت کہاں جو ناٹک بھید وغیرہ میں SPECIALISE کرتا پھروں غزل کا نام بدنام نہ ہوتا اور یہ پابندیاں کہ ایک قافیہ یا ایک ردیف ہو وغیرہ وغیرہ نہ ہوتیں تو میں ان دوہوں کو شعر ہی کہتا میں نے گیت بھی کہے ہیں' ہلکے پھلکے گیت ان میں بھی کوئی باہر کی بھاشا کی پابندی نہیں ہے کچھ لفظ ہندی کے بہت خوبصورت ہیں جو اضافت کے امتزاج کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہیں بجز و استعمال کر لینا اگر وہ بے ساختہ استعمال ہو سکیں یا فارسی کے الفاظ سے جو اردو میں رائج ہو کر اردو بن چکے ہوں ملا لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

یہ بات یوں بڑھ گئی کہ ابھی میں نے کچھ مضمون پڑھے جن میں دوہوں اور گیتوں پر "فنی" گفتگو کی گئی ہے مجھے سب کے ارشادات سے فائدہ ہوا ہے مگر کہنا یہ ہے کہ اب نہ تو تلسی داس کی زبان کوئی سمجھتا ہے نہ میرا بائی کی' لے دے کر صرف کبیر اور وہ بھی جستہ جستہ پڑھا جاتا ہے اور خاص طور پر پاکستان میں جہاں کا میں باشندہ ہوں پرانی ہندی سے لوگوں کو شغف بھی نہیں ہے پھر کیوں صرف دھونس دینے کے چکر میں موٹے موٹے نا قابل فہم الفاظ ڈھونڈ کر لائے جائیں اور اکھڑی اکھڑی بحریں استعمال کی جائیں پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے وہ زبان نہیں آتی جو کچھ ناقدین چاہتے ہیں مجھے تو آسان اردو زبان آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان پاکستان کے مابین کوئی بیس پچیس برس بعد جب فراق صاحب نہیں رہیں گے اگر کوئی رشتہ رہ جائے گا تو یہی آسان اردو کا' اس زبان کا جس میں میں دوہے کہتا ہوں نہ کہ اس زبان کا جس میں میں غزل کہتا ہوں(یہ بات الگ ہے کہ مجھے اپنی غزل اپنے دوہوں سے زیادہ عزیز ہے)۔

تقسیم ہند کے سبب مجھے بھی کراچی آنا پڑا یہاں آکر ایک طویل منظوم ڈرامہ "انسان" لکھا جو مختلف قسطوں میں قدیم اور جدید "نیا دور" اور "ماہ نو" میں شائع ہو چکا ہے یہ ڈرامہ میں نے ۱۹۴۹ء میں لکھا تھا جب یہاں کوئی اور منظوم ڈرامہ نہیں لکھا گیا تھا خیر اب تو اس پر بھی کام ہوا ہے اور کئی غنایئے اور ڈرامے لکھے جا چکے ہیں بہرحال مجھے امید ہے کہ جب یہ ڈرامہ چھپے گا تو اسے نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ ایک منظوم افسانہ "دو مغموم آنکھیں" لکھا تھا جو ۱۹۵۲ء میں ساقی کی کسی اشاعت میں آیا۔ یہ ایک ہیئتی تجربہ تھا جسے سب لوگوں نے پسند کیا۔ کراچی کی زندگی مدتوں ایک عذاب بنی رہی ہے خیر یہ عذاب گزر گیا اب اس کا کیا ذکر کیا جائے۔

اب مجھے غزل بلکہ ہیئت شعر میں کچھ اور تجربے کرنے کا شوق ہوا ہے مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات غزل کا ایک مصرع اتنا مکمل اور جامع ہوتا ہے۔ کہ پہلے مصرع کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ بعض اوقات پہلا مصرعہ شعر کو خراب کر دیتا ہے لیکن چونکہ ہر مصرع اتنا مکمل بھی نہیں اس لئے ایک نئی چھوٹی غزل کی گنجائش نکالی جائے۔ اب ایسی غزل قطعی بالا رادہ کہی جائے تو احتمال ہے کہ مجموعی طور پر ایک بوگس چیز نکلے گی اور یوں نہیں تو دوسرا طریقہ کیا ہو یہ ابھی میں سوچ رہا ہوں میں نے اس موضوع پر لوگوں سے بات کی ہے اور مجھے امید ہے کہ میں نہیں تو کوئی اور اس طرح کی غزل کی بنیاد ضرور رکھے گا بات حرف و ہیئت میں اکتساب آمیز کرنے کی ہے جس میں صرف ارادے کا کام نہیں۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ خیال یا جذبات جس رفتار یا شدت سے گزرتے ہیں اور جیسے ان کی ایک شکل مرتب ہوتی ہے ان کو اسی طرح کے حروف اور ہم رنگ بحروں میں ڈھالا جائے' اس قسم کے غیر شعوری اظہار دوسرے ادب اور اردو ادب میں کہیں کہیں ملتے ہیں اصل میں خود اس خیال کو واضح طور پر سمجھنے کے لیئے مختلف زبانوں کی تاریخ جاننی بہت ضروری ہے اور اس مضمون پر کتابیں کم ازکم میری معلومات کے مطابق کراچی اور لاہور میں نہیں ہیں۔ ہیں تو دستیاب نہیں ہوتیں بہرحال شاید کوئی اور صاحب اس طرف توجہ کریں اس طرح کے تجربے میں

بڑی گنجائش ہیں۔

تو یہ ہے میری زندگی' اب میں تیس سے اوپر ہوا اپنی بساط بھر زندگی دیکھی اور برتی' میرا کوئی الگ عقیدہ نہیں ہے آج کل جو ملی جلی نئی پرانی سماجی ادبی اور مذہبی قدریں رائج ہیں وہی میری بھی ہیں۔ ہاں میں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم سے پہلے گزرنے والے ایسے ہی گھامڑ اور بے علم نہ تھے جیسا اس زمانے کے کچھ نوجوان دو چار اچھے شعر کہہ کر سمجھ بیٹھے ہیں' ہم کسی بات کو پسند نہیں کرتے نہ کریں اسے بگاڑنا کیا ضرور ہے اب ادب ہی کو لیجئے آجکل ہیئت اور خیال یعنی مواد کی بحث چل رہی ہے بحث تو بہت لمبی ہے مگر بات اتنی ہے کہ ارسطو کی بوطیقا پڑھ جایئے ڈھائی ہزار برس پہلے کا آدمی ہے اس نے بھی ہیئت اور خیال کو الگ نہیں کیا تھا۔ سو اگر لکھنؤ اسکول نے یا بقول کسے دہلی سکول کے متاخرین نے محاورہ بندی اور بندش کی چستی پر ہی زور دیا تو انہیں اس وقت کس نے اچھا کہا جواب برا کہا جائے اپنی اپنی مجلسوں اور شہروں میں اپنے اپنے معیار مقرر کر لینا اور بات ہے اس بات کو دور تک پہنچانا اور بات' یہ تو ہم بھی دن رات کافی ہاؤسوں میں کرتے رہتے ہیں لاہور جایئے وہاں ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں دس پانچ فی گھنٹہ کی رفتار سے Genius لوگ آتے جاتے ہیں کراچی کے ادبی چائے خانوں میں بیٹھئے تو شبہ ہو کہ ان لوگوں کو شاید یہ بھی علم نہیں کہ لاہور میں بھی اسی طرح کے Genius ڈھلتے رہتے ہیں تو یہ باتیں چلتی ہی رہتی ہیں مگر ان کو سنجیدہ ادبی تنقید میں بدل دینا خاصی قابل اعتراض بات ہے مگر ہوتی رہی ہے' خیر تنقید نگاروں کے ذاتی تعلقات بھی ہوتے ہیں ذاتی پسند ناپسند بھی ہوتی ہے وہ بھی کیا کریں اگر تنقید کے پردے میں اس کا اظہار نہ کریں۔ آپ کو یاد ہوگا جناب نیاز فتحپوری نے ایک زمانے میں علی اختر صاحب کو جوش صاحب سے بھڑا دیا تھا ابھی کل کی بات لیجئے لاہور میں جب ہر کاتب آزاد نظم کہنے لگا اور ہر کتب فروش نے "حسن پرستی شعار کی" تو جگر اور جوش اور حالی کے پرخچے اڑا دیئے گئے تھے کہ جی یہ دیکھیے یہ ہے شاعری اور یہ ہے شعر' آج بھی ترقی پسند مصنفین اپنے کارکنوں کی سیاسی خدمات اور اہلیت کے مطابق انہیں ادب کی سندیں عطا کرتے رہتے ہیں آج بھی حلقہ ارباب ذوق کے با اثر لوگ اپنے دوستوں شاگردوں اور افسروں کو طرح طرح کے نقاب پہنا کر ادیبوں کی مجلس میں لاتے رہتے ہیں تو یہ سب کچھ ہوتا ہی آیا ہے ہاں جب یہ مشغلہ شور شر کی حد تک پہنچ جائے تو ہم جیسے حقیر فقیر بڑے مصنف ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک ادب کے طالب علم بھی خراب ہوتے ہیں کیونکہ ہر مبتدی تو طباع نہیں ہوتا کہ ہنگامے کی اصلیت کو سمجھے وہ تو چھپی ہوئی تحریروں پر جاتا ہے اور نتیجہ میں گمراہ ہوتا ہے یہ سب کچھ اس لیئے کہہ دیا گیا کہ میں بھی انہی حالات کا شکار ہوں ایک تو اس ملک میں ویسے ہی پڑھے لکھے لوگوں کی کمی ہے جو پرانے تھے وہ یا ریٹائر ہو گئے یا افسران بالا بن گئے۔ ان کی رہنمائی تو ختم ہو گئی اب رہ گئے کچھ استاد تو استادوں کی تنخواہوں کی قلت اور ضروریات کی گرانی سفید پوشی کی آرزو کے ساتھ ساتھ اس طرح ستا رہی ہے کہ وہ ادب کی طرف توجہ ہی نہیں کر پاتے بہت لکھا ہر تین برس بعد نصاب لکھ لیا۔ ناشر دام نہیں دیتے پڑھنے والے ناول اور افسانہ مانگتے ہیں حکومت کرکٹ کو خدا کی نعمت سمجھتی ہے ادب کو آسمانی عذاب' وہ ادھر کیوں توجہ کرے اب رہ گئے متفرق لوگ ان میں زیادہ تر تو سرکاری ملازمین ہیں شام کو آٹھ آٹھ بجے دفتر سے آئیں گے تو کیا پڑھیں گے کیا لکھیں گے۔ رہے طالب علم تو ان میں لگن والے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جو پانچ

سات برس بعد کام کرنے کے قابل ہوں سو انہیں کتابیں نہیں ملتیں۔ آپ یقین کیجئے کہ اس شہر کراچی میں غیاث اللغات تک کوئی چار پانچ مقامات پر پائی جاتی ہے اور بس۔ مجھے پروفیسر مرزا سعید دہلوی نے چار کتابیں سانیات کی تاریخ پر تجویز کی تھیں۔ آٹھ مہینے کی بے حد اور وسیع پیمانے پر کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ ایک کتاب کے دو نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہیں سو وہ بھی اجرا کے لیئے نہیں حوالے کے لیئے وہیں رکھے رہتے ہیں یا یہ کہ پروفیسر حسن عسکری صاحب کو دیکھتا ہوں آتے جاتے سے کتابیں منگواتے ہیں کوئی لندن گیا یا نیویارک گیا اور شرافت برتی تو کام چل گیا ورنہ آپ کتاب فروشوں کی خوشامد کیجئے دس دس فارم بھریئے سٹیٹ بنک سے اجازت لیجئے تب کہیں جا کر کتاب کی صورت نظر آتی ہے۔ میں نے پڑھا پڑھایا تو ایسا زیادہ نہیں لیکن مقدور بھر پڑھنے کا شوق ہمیشہ رہا میں سمجھتا ہوں ادب کا رشتہ تاریخ سے جتنا قریبی ہے کسی اور شعبہ علم سے نہیں کہ تاریخ سے ہی ادب کی تاریخ بھی معلوم ہوتی ہے پھر مجھے زبان بلکہ زبانوں کی تاریخ کا شوق ہے مجھے محاورے وغیرہ کا مرض کبھی نہیں ہوا گو یہ ہمارے گھر کی علت تھی مگر ہاں اتنا ضرور ہے اس معاملے میں زاجیت کا قائل نہیں ہوں میرے خیال میں زبان میں وسعت پیدا کرنے کے لیئے کوئی باقاعدہ کوشش بھی ضروری نہیں وہ ہر لمحے بعد زندگی کی طرح خود وسیع تر ہوتی جاتی ہے اور جس جس طاقت کو اس کے ساتھ جینا ہے خود ہی وسیع ہونا پڑتا ہے۔ آج اردو میں کتنے ہی بیرونی الفاظ آگئے ہیں جنہیں ہم بے تکان استعمال کرتے ہیں بس زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ لفظ پر ذوق سلیم کے بہانے اختلاف ہو جائے جیسے ایک زمانے میں "دلچسپ" پر ہوا تھا۔

خط طویل ہو گیا' پتہ نہیں میں نے کتنی باتیں متعلق کیں اور کتنی غیر متعلق بہر حال آپ میں دم ہے تو اپنی فرمائش کی سزا بھگتئے میں نے اپنے شعری سرمائے کے بارے میں جان بوجھ کر رائے زنی سے گریز کیا ہے میں سچائی کیساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ میں اپنے بارے میں سوائے انتخاب کے اور کوئی بات صفائی سے نہیں کہہ سکتا میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بڑا زبردست غزل گو ہوں یا بڑا دوہا نگار ہوں نہ میں اتنا انکسار برت سکا ہوں کہ اپنے سولہ سترہ برس کے کام کو بالکل ہی بوگس قرار دے دوں مجھے تو اپنے بارے میں اتنا ہی احساس ہے کہ بہت سے "مشاہیر" جیسے میں نے بھی کہہ رکھا ہے آخر میں بھی کوئی کند ذہن نا تجربہ کار "شوقین" تو ہوں نہیں میں نے بھی زندگی گزاری ہے رویا ہوں ہنسا ہوں محبت کی ہے کامیاب بھی ہوا ہوں ناکام بھی رہا ہوں نوابی کی ہے نوکری بھی کرتا ہوں پھر اگر میری کوئی فکر ہے کوئی نظر ہے اور زبان کا استعمال آتا ہے۔ تو میرے جذبات' میرا خلوص' کہیں نہ کہیں اجاگر ہوتے ہونگے اور کچھ نہ کچھ میں نے بھی کہہ رکھا ہوگا۔ وہ غزل ہو یا دوہا یا ڈرامہ یا گیت یہ سب ایک ہی راگ کے الگ الگ سر ہیں کبھی کوئی سر لگ جاتا ہے کبھی کوئی اور کیا خبر کون سر کہاں لگتا ہے۔

تو یہ باتیں میں دوسروں پر چھوڑتا ہوں' مجھے اپنے حالات نے ہی ایسا خراب کر رکھا ہے کہ اتنے طویل مختصر خط پر ہی مجھے حیرت ہے' اس زمانے میں کوئی ملازمت خاص طور پر وہ جو میں کرتا ہوں یعنی انکم ٹیکس کی تشخیص بجائے خود ایک مجادلہ ہے۔

ویسے مجھ پر کچھ لوگ لکھ چکے ہیں لیکن مجموعے کی عدم موجودگی میں کوئی کیا لکھے گا یا کسی کو مجھ سے شدید دلچسپی

پیدا ہو جائے اور وہ توجہ کرے تو بات آگے بڑھے

ایک بات انتخاب کے متعلق

میں نے شاید کہہ دیا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ اپنا انتخاب کر سکتا ہوں یہ بات بھی میں روا روی میں کہہ گیا ورنہ اپنا انتخاب تو خود شناسی کی بہترین نشانی ہے۔ یہ میں کیا کروں گا غالب نہیں کر سکے تھے۔ اس خط کے سلسلہ میں آپ کے بقول "نمونہ کلام" کے لیئے جو نظر دوڑائی تو کچھ پسند نہیں آتا اور بہت کچھ پسند آتا ہے چنانچہ جستہ جستہ اشعار کا طریقہ ترک کردیا اب پانچ مختصر غزلیں بارہ دوہے اور گیت حاضر ہیں نہ یہ میرے بہترین ہیں نہ کمترین بس جو دھیان میں آیا لکھ دیا ہے ویسے آپ کا یہ طریقہ اچھا نہیں کہ آپ شعر نویسوں سے نثر لکھوائیں' وہ بھی اپنے بارے میں! اس طرح نہ جانے کتنے ڈھکے ڈھکے چھپے لوگ ایکسپوز ہوں گے۔

مجھے ان غزلوں وغیرہ کے بارے میں یقین نہیں کہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ میں کوئی ریکارڈ تو رکھتا نہیں اندازہ ہے کہ دو تین چھپ چکی ہیں دوہے تقریباً سب کبھی نہ کبھی چھپ چکے ہیں اور تازہ کچھ ہے نہیں۔

☆ ۔ یہ ایک خط تھا ایک نئے جریدے "شعور" حیدر آباد (سندھ) سال ۱۹۵۶ء نے عالی صاحب پر گوشہ مرتب کیا تھا اور اپنے بارے میں ان کا مضمون بھی مانگا تھا۔ ادارہ تحریر میں جناب حمایت علی شاعر اور پروفیسر عتیق احمد مرحوم شامل تھے۔ ناشرین

حضرت خواجہ میر درد دہلوی ؒ
(مرحوم)

(جمیل الدین عالی کی والدہ سیدہ جمیلہ بیگم مرحومہ خواجہ سید ناصر وحیدین خواجہ سید ناصر وزیر سجادہ نشین خواجہ میر درد کی بیٹی تھیں

علاالدین خاں علائی

نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا (۱۸۶۰-۱۹۲۷ء)

والئی لوہارو

جمیل الدین عالی کے والد۔ (غالب نے ایک خط میں انہی کے بچپن میں ان کو ایک خط کا جواب دیتے ہوئے اپنے آپ کو ان کا دادا نہیں "دلدادہ" لکھا ہے)

صاحبزادہ صمصام الدین فیروز لوہاروی

(عالی کے چچا زاد بھائی اور خسر)

جمیل الدین عالی اور بیگم طیبہ عالی ۔ ۱۹۶۲ء

عالی بیگم عالی اور افتخار احمد عدنی

فرخ منزل۔ قلعہ لوہارو کا ایک حصہ۔۱۹۸۲ء میں عالی اور بیگم عالی۔
اب یہ حصہ تحصیلدار کا دفتر اور گھر ہے۔ ضلع حصار (صوبہ
ہریانہ۔بھارت)

اس منزل کا نام عالی کے والد کے تخلص فرخی اور پیار کے نام فرخ
مرزا پر رکھا گیا تھا۔

عالی بیگم عالی، گود میں حمیرا (زوجہ احمد مصطفےٰ قصوری)
(۱۹۳۸)

کھڑے ہوئے جمیل الدین عالی، کرسی پہ ان کا چھوٹا بھائی جمال الدین جو
صغر سنی میں ہی فوت ہو گیا

مرتبہ : مصباح العثمان

جمیل الدین عالیؔ

کوائف

نام : نوابزادہ مرزا جمیل الدین احمد خان

○ تخلص : عالی

○ پیدائش : ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء دہلی

○ والد : نواب سر امیر الدین احمد خان المعروف فرخ مرزا (والی ریاست لوہارو)

○ والدہ محترمہ : سیدہ جمیلہ بیگم

○ دادا : نواب علاؤ الدین احمد خان علائی

○ نانا : خواجہ سید ناصر وحید بن خواجہ سید ناصر وزیر (سجادہ نشین خواجہ میر درد)

○ شادی : ۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء ہمراہ طیبہ بانو بنت صاحبزادہ مرزا صمصام الدین فیروز

○ اولاد : حمیرا زوجہ احمد مصطفیٰ خان قصوری ○ ذوالقرنین جمیل عالی ○ مرزا نصیر الدین ○ حسان الدین جمالی (مرحوم) ○ ربیعہ زوجہ شاداب مسرت ○ مراد جمیل

○ تعلیم : پرائمری تک گھر پر ○ میٹرک: اینگلو عربک ہائی اسکول دریا گنج دہلی ۱۹۴۰ء ○ انٹر: اینگلو عربک کالج اجمیری گیٹ دہلی ۱۹۴۲ء ○ بی اے: اینگلو عربک کالج دہلی ۱۹۴۴ء ○ داخلہ ایم اے اکنامکس: دہلی یونیورسٹی ۱۹۴۵ء (وجوہ نامکمل) ○ سی-ایس-ایس: پاکستان ۱۹۵۱ء ○ یونیسکو فیلوشپ ۱۹۶۱ء ○ ہاورڈ انٹرنیشنل سیمینار ۱۹۶۳ء ○ ایف-ای-ایل: جامع کراچی ۱۹۷۱ ○ ایل-ایل-بی: جامع کراچی ۱۹۷۶ء داخلہ ایل-ایل-ایم: (ایک بار پھر

بوجوہ نامکمل) ○ ڈپلومہ: "کارپوریٹ پلاننگ" (۱۹۷۸ء) انٹرنیشنل ایجوکیشن اینڈ انڈسٹریل انسٹیٹیوٹ جنیوا میں تربیت کے بعد۔

○ ملازمتیں : اسسٹنٹ وزارت تجارت حکومت پاکستان ۱۹۴۷ء ○ انکم ٹیکس افسر پاکستان ٹیکسیشن سروس ۱۹۵۲ء ○ افسر بکار خاص ایوان صدر ۱۹۵۹ء ۱۹۶۳ء ○ نامزد کاپی رائٹ رجسٹرار وزارت تعلیم ۱۹۶۳ء ۱۹۶۳ء ○ سیکریٹری نیشنل پریس ٹرسٹ ۶۹۔۱۹۶۴ء ○ نیشنل بینک پاکستان سے وابستگی ۱۹۶۷ء سینئر ایگزیکٹو' وائس پریذیڈنٹ اور رکن ایگزیکٹو بورڈ کے عہدے پر ترقی پاکر پاکستان بینکنگ کونسل میں کارپوریٹ پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ایڈوائزری' پہلے دو برس پھر ایک برس کی توسیع کے بعد ۱۹۸۸ء میں ریٹائرمنٹ (ملازمتوں کے درمیان دو مرتبہ استعفے' حکومت سے (۱۹۶۵ء میں) پریس ٹرسٹ سے (۱۹۶۹ء میں) نیشنل بینک سے عارضی (سبکدوشی ۱۹۷۱ء میں۔ مقدمہ داخل کر کے ۱۹۷۲ء میں واپس آ گئے)

○ خدمات : نجی شعبے کے پانچ اردو' بنگلہ قومی ادبی انعامات (ہر سال دیے جانے والے) کے بانی سیکریٹری ۷۰۔۱۹۶۰ء (قومیائے جانے تک) ضوابط جو انہی نے بنائے ان میں ایک یہ کہ یہ خود تا عمر ان میں سے کسی کے حق دار نہیں ہو سکیں گے۔

ا۔ آدم جی ادبی انعام ۱۹۶۰ء (تخلیقی ادب)

۲۔ داؤد ادبی انعام ۱۹۶۳ء (تحقیق' تنقید' تاریخ)

۳۔ نیشنل بینک ادبی انعام ۱۹۶۳ء (سائنس' معیشت)

۴۔ یونائیٹڈ بینک ادبی انعام ۱۹۶۵ء (بچوں کا تخلیقی ادب)

۵۔ حبیب بینک ادبی انعام ۱۹۶۹ء (پاکستانی زبانوں کے ادب سے بین اللسانی ترجمے)

○ ممبر نیشنل بک کونسل ۷۸۔۱۹۶۹ء' ۸۸۔۱۹۸۳ء ○ ممبر کاپی رائٹ بورڈ ۷۱۔۱۹۶۸ء ○ اعزازی سیکریٹری و ایڈمنسٹریٹر اردو آرٹس لاء اور سائنس کالج کراچی ۷۳۔۱۹۷۲ء ○ ممبر گورننگ باڈی نیشنل لینگویج اتھارٹی ۱۹۸۳ء ○ ممبر جی۔ایچ۔کیو میوزک کمیٹی ۱۹۸۳ء تا حال ○ اعزازی سیکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ ۶۷۔۱۹۵۹ء ○ منتخب سیکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ ۷۰۔۱۹۶۷ء رکن منتظمہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۷۳۔۱۹۵۹ء ○ (معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۳ء تا حال) ○ رکن و بانی مرکزی سائنس بورڈ لاہور ○ رکن: اردو لغت بورڈ کراچی ○ رکن: نیشنل بک فاؤنڈیشن آف پاکستان اسلام آباد ○ رکن: کاپی رائٹ ٹریبونل حکومت پاکستان ○ رکن مجلس نظماء مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ○ منتخب

ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ○ صدر و یکے از بانیان: ادیب سہارنپوری ٹرسٹ کراچی ۱۹۹۳ء ○ صدر و یکے از بانیان: نظر حیدر آبادی ٹرسٹ کراچی ۱۹۹۳ء ○ سرپرست: سید سبط علی صبا ٹرسٹ واہ کینٹ ○ فاؤنڈنگ رکن: سلیم احمد ٹرسٹ کراچی ○ فاؤنڈنگ رکن: "نگار" ٹرسٹ کراچی ○ نگراں و رکن ادارت: ماہنامہ "قومی زبان" کراچی ۱۹۹۳ء تاحال ○ اول مدیر: ماہنامہ "ہم قلم" کراچی ۶۱ـ۱۹۶۲ء ○ رکن: مجلس ادارت سہ ماہی "اردو" کراچی ۱۹۹۳ء تاحال ــــ صدر نشین اردو لغت بورڈ ۱۹۹۸ء

دنیا پاکستان: ۱۹۷۶ء میں پاکستان ٹیلی ویژن سے حالات حاضرہ کا پروگرام 'کمپیئر و رائٹر ○ سفرنامہ نگاری: "دنیا مرے آگے اور تماشا مرے آگے" روزنامہ جنگ ۶۲ـ۱۹۶۳ء ○ باقاعدہ کالم نگاری: "نقار خانے میں" روزنامہ جنگ ۱۹۶۷ء تاحال ○ ہفتہ وار اقتصادی کالم روزنامہ جنگ ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء

○ اعزازات : کینیڈین اکادمی (اردو) ایوارڈ ٹورانٹو ۱۹۹۰ء ○ سنت کبیر ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس دہلی) ۱۹۹۰ء ○ صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (شعبہ ادب) ۱۹۹۱ء

○ نشان سپاس : کراچی کے تمام (بیس) روٹری کلبز کی جانب سے ، سنڈیکیٹ جامعہ کراچی سے اعزازی ڈاکٹریٹ آف لٹریچر (ڈی۔ لٹ) ۱۹۹۸ء
○ نشان سپاس: آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی
○ شمالی امریکہ میں کئی پاکستانی انجمنوں سے نشانات سپاس
صدر و حکومت پاکستان سے ہلال امتیاز (شعبہ ادب) ۱۹۹۸ء

○ بیرونی ممالک کے سفر : امریکہ' کینیڈا' ٹورنٹو' روس' جاپان' مغربی و مشرقی یورپی ممالک' مشرق وسطیٰ' چین' ○ نمائندگی چین' روس' امریکہ' عراق' برلن' روم اور بھارت میں بہت سے بین الاقوامی ادبی میلوں' سیمیناروں اور مشاعروں میں پاکستان مندوب کی حیثیت سے شرکت' اور بیشتر ممالک میں خدمات کے اعتراف میں جشن عالی کا اہتمام

○ تصانیف :
۱۔ "غزلیں دوہے گیت" ۱۹۵۷ء' ۱۹۷۳ء' ۱۹۸۳ء' ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۳ء
۲۔ "جیوے جیوے پاکستان" ۱۹۷۳ء' ۱۹۷۶ء' ۱۹۸۸ء
۳۔ "لاحاصل" ۱۹۷۳ء' ۱۹۸۳ء' ۱۹۸۸ء' ۱۹۹۳ء
۴۔ "دوہے" (اردو رسم الخط میں) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۳ء
۵۔ "دوہے" (دیوناگری رسم الخط) علی گڑھ ۱۹۸۹ء
۶۔ "نئی کرن" (کتابچہ) ۱۹۵۹ء

۷۔ "شنگھائی کی عورتیں" (شریک مترجم) ۱۹۷۲ء

۸۔ "ایشین ڈرامہ" نوبل انعام یافتہ (شریک مترجم) ۱۹۷۶ء

۹۔ "دنیا مرے آگے" ۱۹۷۵ء، ۱۹۸۳ء (کتابی صورت میں)

۱۰۔ "تماشا مرے آگے" ۱۹۷۵ء، ۱۹۸۵ء، (کتابی صورت میں)

۱۱۔ "صدا کر چلے" ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ "دعا کر چلے" ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۳ء

۱۳۔ "حرفے چند" جلد اول ۱۹۸۸ء (انجمن ترقی اردو کی کتابوں پر تبصرے)

۱۴۔ "حرفے چند" جلد دوم۔ ۱۹۹۳ء (انجمن ترقی اردو کی کتابوں پر تبصرہ)

۱۵۔ "حرفے چند" جلد سوم۔ (انجمن ترقی اردو کی کتابوں پر تبصرہ) ۱۹۹۶ء

۱۶۔ اصلاحات بینکاری (شریک مترجم) ۱۹۹۳ء

۱۷۔ اے مرے دشت سخن (شاعری) ۱۹۹۵ء

زیر طبع و زیر ترتیب: ۱۔ "انسان" (طویل نظم)

۲۔ سفرنامہ آئس لینڈ

۳۔ جدید اقتصادی اصلاحات (شریک مترجم)

۴۔ وفا کر چلے ("نقار خانے میں" کالموں کا انتخاب تین جلدیں)

۵۔ سفرنامہ چین۔ منتخب خطوط مشاہیر۔ خود نوشت

○ عالی صاحب پر لکھی گئی تصانیف اور تھیس (Thesis)

۱۔ "جمیل الدین عالی ـــــ بحیثیت شاعر" (رب نواز مونس بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، مقالہ)

۲۔ "جمیل الدین عالی ـــــ فن اور شخصیت" (مرتبہ: ایم حبیب خان ناشر: علمی مجلس دلی، ہندوستان (کتاب مجموعہ مضامین مشاہیر) ۱۹۸۸ء

۳۔ "جمیل الدین عالی کی نثر نگاری" ـــــ عبدالعزیز ساحر استاد اردو، اٹک (۱۹۹۳ء)

۴۔ "عالی۔ فن اور شخصیت" ارمغان جشن عالی ابو ظہبی دوبئی کے موقع پر۔ ۱۹۸۹ء

۵۔ ان کے منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ Beyond Destination از ڈاکٹر بیدار بخت (ہندوستانی اسکالر مترجم) اور کینیڈین اسکالر مترجم

ڈاکٹر این ماری ارکی (Anne Marie Erki) (دونوں مقیم ٹورانٹو) نے اور فرانسیسی میں ترجمہ ڈاکٹر این ماری ارکی نے کیا۔ انگریزی ترجمہ ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں متن اردو' دیوناگری اور لاطینی رسم الخط میں دیا گیا ہے اور صرف انگریزی دانوں کے لئے اصوات و الفاظ پر رہنما نوٹ بھی لکھے گئے ہیں۔ ناشرین کواپرا' کراچی' لاہور' ٹورانٹو' نئی دہلی۔

۶۔ پروفیسر رالف رسل نے بھی منتخب کلام کے ترجمے کر رکھے ہیں جو انشاء اللہ اس سال کے اواخر تک مصور ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

ایچ۔ یو۔ بیگ
(انتظاریہ)

عالی

جمیل الدین عالی سے پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں تب ہوئی جب میرا انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے کراچی تبادلہ ہوا۔ اس ملاقات نے جو تاثر دیا وہ تینتالیس سال کے بعد بھی قائم ہے۔ وہ ایک باغ و بہار شخص ہے' بہت مخلص دوست۔ دوست کے لئے جان و مال ہر وقت دینے کے لئے حاضر۔ اور یہی حق وہ دوست سے بھی مانگتا ہے۔ لیکن دنیا میں بہت کم دوست اس امتحان میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسکی شخصیت میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ شاعر کا Poetic Licence مانگتا ہے۔ اور اس حق کو لینے کے لئے اصرار کرتا ہے' اس کا خودی کا تصور اقبال کے شاہین سے کم نہیں۔ ذہنی استعداد (I.Q) اس قدر بھرپور کہ میرے مشاہدے میں آج تک اور کوئی نہیں بچا۔ جو کوئی شخص اس سے دو چار ہوا۔ وہ اسکی صلاحیتوں اور کمزوریوں کے بارے میں جو تجزیہ کرتا ہے' غلط ثابت نہیں ہوتا۔

اگر وہ کسی چیز کی تمنا کرے تو اسے حاصل کرنے کے لئے جناتی طاقت رکھتا ہے اور اکثر کامیاب نکلتا ہے۔ وہ اگر انگریزی زبان' کا شاعر ہوتا تو Noble laureate ہوتا۔ شاعر کی حیثیت سے انسانی فطرت۔ سائنسی فکر اور ماورائی طاقتوں کے امتزاج کے بارے میں وہ شعوری سرحدوں سے پار نکل کر بات کرتا ہے۔ یہ تاثر اس کے زیر ترتیب شاہکار "انسان" اور دوسری نظم "تجی" سے بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں مکمل جائزہ دینا مشکل ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔

☆۔جناب حبیب اللہ بیگ مقابلے کے امتحان سی۔ ایس۔ ایس (۱۹۴۹) میں کامیاب ہو کر پاکستان ٹیکسیشن سروس میں آئے ۔مختلف وزارتوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ بہترین پیشہ ورانہ ملکی و غیر ملکی تربیت سے بہرہ ور ہوئے (مثلاً" ہاورڈ لا اسکول میں ایک سال کا کورس)۔سات برس سے زیادہ وفاقی فنانس سکریٹری رہ کر ۱۹۸۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ اب بھی ایک مشاورتی ادارہ میں کام کرتے ہیں اور کئی اعلیٰ سطحی فکری اداروں کے فعال رکن ہیں ۔ناشرین

نمونہ نثر و نظم

نمونہ نثر و نظم

۱ سراج الدین خان سائل (خاکہ) جمیل الدین عالی

۲ "بابی بانو اور کامیابی" اظہاریوں سے جمیل الدین عالی

۳ غزلیں، دوہے، گیت، نظم

جمیل الدین عالی

سراج الدین خان سائل

(خاکہ)

وہ پلنگڑی پر گاؤ تکیے کے سہارے پر بیٹھے تھے اور چاروں طرف فرش پر کوئی پچاس شاگرد۔ بیچ میں ایک مٹھائی کا خوان رکھا تھا۔ اور خوشبویات' ہار پھول وغیرہ۔ داروغہ دیوان خانے سے بار بار باہر جاتا اور مغلانی بڑے دروازے کی چلمن ہٹا ہٹا کر چائے کی کشتیاں اندر بڑھاتی جاتیں۔

میں بور ہو رہا تھا۔

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ میں دسویں جماعت میں آ چکا تھا میرے بھائی مرزا اعتزاز الدین شاید جہلم سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ میری والدہ ان کی سوتیلی ماں تھیں مگر وہ سلام کو ضرور آتے تھے۔ اس بار وہ شب کو بارہ بجے پہنچے تو معلوم ہوا کہ میں بارہ دری خواجہ میر درد میں مشاعرہ سننے گیا ہوں۔ صبح کو میری پیشی ہوئی اور کافی زجر و توبیخ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر مجھے شاعر ہی بننا ہے تو شریفوں کی طرح بنوں اور چچا سائل صاحب کی شاگردی اختیار کروں۔ اسی دن انہوں نے مٹھائی کا انتظام کیا۔ میرے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا کر تنبیہہ کی اور میرے پرائیویٹ ٹیوٹر کو برخواست کر دینے کی دھمکی دے کر جہلم چلے گئے۔

میں دوسرے دن چچا سائل صاحب کے ہاں بڑے اہتمام سے حاضر ہوا۔ میں نے صبح شام محنت کر کے ایک غزل کہی تھی جو اپنے ایک خوش رقم دوست سے جس نے خود کٹ کہنیوں پر قلم پھیر کر لکھنا سیکھا تھا اچھی طرح ایک موٹے سے کاغذ پر لکھوائی تھی۔ وہاں چچی جان نے نوٹس دے رکھا تھا۔ میں ان کا بہت لاڈلا بھتیجا اور "دوست" تھا۔

چچا جان کے دونوں پاؤں ایک حادثہ میں زخم کھا کر متورم ہو چکے تھے۔ وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ بس بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت وہ عینک لگا کر پڑھ لیتے تھے اور کروٹ بھی خود ہی بدلتے۔

جب فارغ الاصلاح شاگرد بھی آکر قرینے سے بیٹھ گئے تو چچا جان نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ شاگرد بھی از روئے ادب مسکرائے میں سب کے بیچ میں دو زانو بیٹھا تھا۔ میری پوتھ کی شیروانی گرمی میں میرا بدن جلائے دے رہی تھی۔ پر چوگوشی مخملی ٹوپی نے بھیجا جھلسا دیا تھا۔ سامنے مٹھائی رکھی مجھے زہر معلوم ہو رہی تھی' یا اللہ یہ شاعری ہے یا عذاب ہے

"ہاں تو مرزا صاحب غزل ارشاد ہو" وہ ملائمت سے بولے۔ وہ مجھے مذاقاً مرزا صاحب کہتے تھے۔ میں جھجکا۔ مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔ لیکن میں اس ماحول کی ہیبت اور شاگردی کے ہیجان میں مبتلا ضرور تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے مطلع پڑھ دیا۔

تیری دوری کے سبب دل بھی خفا ہوتا ہے
مدتوں کا مرا ساتھی یہ جدا ہوتا ہے

شاگردوں نے مجھے بہ نظر تمسخر اور انہیں بنظر استفسار دیکھا۔ فارغ الاصلاح نیم استادوں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ صرف نہال سیوہاروی بالکل چپ سادھے بیٹھے رہے۔ چچا جان نے ایک لمحے توقف کیا پھر انہوں نے جھک کر قاب میں سے مٹھائی کی ڈلی اٹھائی گویا اب مجھے کھلانے والے ہیں۔

"یوں کر دو" انہوں نے فرمایا۔

مدتوں کا مرا جی جان جدا ہوتا ہے

"بھئی میں مضمون نہیں بدلا کرتا۔ پہلے زبان دیکھتا ہوں۔ یوں بے کا تنافر دور ہو جائے گا۔" شاگردوں نے واہ واہ کا دونگڑا برسا دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مٹھائی کی ڈلی مجھے عنایت فرمائی اور دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ (پتہ نہیں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی تھی یا کچھ اور مگر کچھ پڑھا جاتا تھا) لیکن میں جیسے پھر گیا۔

"بیٹے" میں نے ایک دم کہا۔ ان کے ملے ہوئے ہاتھ کھل گئے۔

"ہم تو نہیں بدلتے" میں اٹھلایا۔ "بے وے کیا ہوتا ہے۔ اباّ اچھا تو مطلع کہا ہے ہم نے۔ کچھ اور طرح ٹھیک کیجئے۔ ہم زبان وبان نہیں مانتے چچا جان۔"

شاگرد سن ہو گئے۔ دو چار نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ نیم استاد لوگ سخت متنفر نظر آئے۔ نہال سیوہاروی ہی ہی کرنے لگے۔ میں گھبرانے لگا تھا کہ چچی جان کی کڑاکے دار آواز گونجی۔

"اے مرزا سراج الدین' یہ فرخ مرزا کی اولاد ہے۔ ہے نا امین الدینؒ خانی۔" پھر وہ آہستہ سے ہم ہم کر کے ہنسیں۔ شاید وہ چلمن کے پاس آکر میرا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

چچا جان مسکرائے۔ انہوں نے عینک اتار کر رکھ دی اور نیم دراز ہو گئے۔

"بیگم یہ مٹھائی اٹھوا لو۔ گھر ہی میں بٹے گی۔ جمیل میاں ہمارے شاگرد نہیں ہوں گے۔ انہیں زبان سے کوئی علاقہ

نہیں ہمیں کچھ اور نہیں آتا۔"

شاگردوں نے میری طرف سے منہ پھیرلیا دو چار کو مجھ پر رحم بھی آیا وہ بدمزگی کے منتظر تھے مگر چچا جان خوش خوش باتیں کرنے لگے۔

"اچھا تو ابزادہ صاحب پوری غزل تو سنا دیجئے۔" وہ نرمی سے بولے۔

"نہیں ہم تو پہلے شاگرد ہوں گے۔" میں اترایا۔ میں روہانسا ہو رہا تھا۔ میری عمر اس وقت کتنی ہوگی۔ کوئی تیرہ برس۔

"اچھا پھر شاگرد ہو جانا"۔ انہوں نے تسلی دی۔ "آج تو قصہ ختم۔ پیسہ ہضم۔ تمہاری مٹھائی بٹ گئی اب پھر محفل جمائیں گے۔ پھر سوچیں گے۔ تم آیا جایا کرو باقاعدہ۔ اچھا تو سناؤ کیا مطلع تھا۔"

"اچھا تو ہم استاد بیخود کے پاس جا رہے ہیں" میں نے دھمکی دی۔ مجھے معلوم تھا کہ استاد بیخود سے چچا جان کی چشمک ہے مگر پھر میں استاد بیخود کا مزاج یاد کر کے ڈر گیا۔ "اچھا ہم پنڈت جی کے ہاں جائیں گے۔ آپ ابھی رقعہ لکھیے ہم ان سے فارسی بھی پڑھیں گے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ عینک صاف کر کے آنکھوں پر لگائی۔ قلم اٹھایا اور رقعہ لکھ دیا۔ یوں!

"برادر بجان برابر۔ یہ لڑکا بھائی سرامیرالدین خان مرحوم کا ہے۔ ماں اس کی بزرگ زادی سیدانی خواجہ میر درد رحمتہ اللہ علیہ کی ذریت سے ہے۔ شاگردی اس کی مطلوب ہے۔ امید ہے کہ بڑا ہو کر شعر اچھے نکالے گا کہ پوتا علائی کا اور نواسا درد کا ہے۔ چونکہ طبیعت کا ضدی اور شوخ ہے اور سائل گھر کی مرغی آپ اسے سنبھالئے اور اپنا لخت جگر جان کر اس کی پرورش کیجئے۔ کل سہ پہر حسب دستور آستانے پر حاضری دینے آؤں گا۔ تو آپ کے سامنے اس کے کان کھینچوں گا کہ آپ کو تکلیف نہ دیوے اور خدمات مناسب طور سے بجالاوے۔

آثم

ابوالمعظم سائل

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ایک صوفی منش استاد تھے کچھ افسر وغیرہ رہے تھے اب پنشن پر تھے۔ فارسی کے بڑے جیّد عالم اور ہزاروں شاگردوں کے استاد تھے۔ لمبی سفید داڑھی تھی جس کو نیچے سے چوٹی کی طرح گوندھ لیتے تھے۔ یہ اپنے گھر کے سامنے والے دھرمشالہ میں سالانہ طرحی مشاعرہ بھی کراتے تھے جو دو تین دن چلتا تھا۔ اور اس میں جملہ اساتذہ فن اطراف ہندوستان سے شریک ہونے آتے تھے۔ ہمارے حیدر دہلوی مرحوم بھی انہی کے شاگرد تھے اور گو بانی ہو کر استاد ہو گئے تھے مگر پنڈت جی کے سامنے غزل پڑھتے وقت احتراماً گردن جھکا لیا کرتے تھے۔

پتہ نہیں چچا جان سے ان کی دوستی کب شروع ہوئی تھی۔ میں نے تو صرف دونوں کی موت پر اسے ختم ہوتے دیکھا ہے۔ چچا جان روز سہ پہر رکشا میں ایک کرسی پر لاد کر بٹھائے جاتے اور ہوا خوری شروع ہوتی۔ سب سے پہلے وہ بازار

بینارام سے گزرتے ہوئے ایک تنگ گلی کے ایک شاندار مکان کے آگے ٹھہر جاتے رکشا والا آواز لگاتا۔

"نواب صاحب آگئے ہیں۔"

ادھر چھجے پر پنڈت امرناتھ ساحر اپنی داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے نمودار ہوتے۔ کئی برس تک وہ نیچے چبوترے تک اتر کر آتے رہے مگر بعد میں جب چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تو صرف چھجے تک کھسک کر آتے اور بڑی نقاہت سے سلام کا جواب دیتے۔ آخر میں یہ بھی ہوتا تھا کہ دونوں بوڑھے لمحوں ایک دوسرے کو چپ دیکھ رہے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں نہ منہ سے بولتے ہیں بس ٹک ٹک دیکھے جاتے ہیں اور آنکھیں رومال سے پاک کرتے جاتے ہیں۔

میں نے خط لے کر آداب کیا اور بھنایا ہوا ملک نسیم الظفر کے ہاں پہنچا۔

یہ ملک نسیم الظفر وہ ہیں جو ابھی مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کی صوبائی عاملہ کا الیکشن میرے کہنے پر لڑے اور میری ہی وجہ سے ہار گئے۔ یہ حضرت اس وقت بھی ایسے ہی کے کسائے بنے چنے رہتے تھے۔ اس وقت یہ اینگلو عربک اسکول دریا گنج کی فٹ بال ٹیم کے ایک "مشہور" کھلاڑی تھے۔ مجھ سے عمر میں ایک برس چھوٹے یا ایک برس بڑے مگر ہمیشہ سے بڑے وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے بزرگ ہیں۔ یہ میرے ادبی ایڈوائزر تھے۔

"بھئی تم شاگرد کیوں ہو کسی کے۔ غالب کس کا شاگرد تھا۔ بڑے آدمی کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔" انھوں نے فیصلہ سنا دیا۔

میں پنڈت جی کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

○

۱۹۳۵ء میں میری شادی ہو چکی تھی میں کالج چھوڑ چکا تھا۔ اس وقت تک میں نے بہت سے شعر کہے اور پڑھے تھے۔ میرے اردو مطالعہ میں فیض، میراجی اور راشد رہتے تھے اور دوستوں میں اختر الایمان، مختار صدیقی اور خورشید الاسلام جیسے بانکے لوگ شامل (گو وہ سب سینئر تھے) میں نے اچھے اچھے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور بڑے بڑوں سے ٹکریں لے چکا تھا سائل صاحب کا آخری زمانہ تھا، میں ان کی بینائی سلب ہو جانے کے بعد دو تین برس ان کا کاتب بھی رہ چکا تھا (وہ شعر کہتے تھے اور میں لکھتا تھا) اور ہفتے میں دو تین بار حاضری کا معمول جاری تھا۔ ایک دن میری بیوی چچا جان کے رومال تہہ کر رہی تھیں، میں ان کے ماہانہ وظیفہ کے متعلق حکومت کو ایک احتجاجی یادداشت لکھ رہا تھا اور بھق بھق سگریٹ بھی پی رہا تھا۔ چچی جان حسب دستور ان کی بد پرہیزی پر خفا ہو رہی تھیں۔ میری بیوی سخت سعادت مندی کے موڈ میں تھیں۔

"دادا جان آپ انھیں شاگرد کر لیجئے نا۔ اب تو ان کی امیدواری کو اتنے دن ہوئے۔" وہ بولیں۔ وہ ان کی پوتی ہوتی تھیں۔ برادری میں رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'

"اے لڑکی ذر تجھ پر"۔ چچی جان دھاڑیں۔ "ہمارا بچہ اچھا خاصا چل نکلا ہے اب عمر ہو لے تو مقابلہ کا امتحان دلوایہ شاگردی استادی کے چکر میں نہ ڈال دیجو اسے، ہر آدمی تو نواب مرزا خان نہیں ہوتا نا۔" وہ داغ کی بیٹی ہیں۔☆☆

"ہوں" چچا جان لیٹے لیٹے مسکرائے۔ ان کا چہرہ دودھ کی طرح ہو گیا تھا اور ہڈیاں رخساروں کو چیر کر ابھر آئی تھیں۔

"اب سفارش پر اتر آئے ہیں مرزا صاحب۔ نا بیٹی ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔"

میرا جی چاہا کہ رو دوں' میں نے عمر میں پہلی بار سنجیدگی سے سوچا کہ کاش میں ان کا شاگرد ہو جاتا۔ جانے کیوں مگر میں نے اس احساس میں بہت شدت محسوس کی۔

"چچا جان سیریسلی آپ شاگرد کر لیجئے' یعنی اب میں سچ سچ کہتا ہوں" میں کہہ رہا تھا۔ "نا بیٹا ہمیں زبان سے لگاؤ ہے اور تمہیں' تمہیں شاید کسی چیز سے بھی لگاؤ نہیں ہے۔" انہوں نے منہ پر مکھیوں سے بچنے کے لئے ململ کا ٹکڑا ڈال لیا اور آہ بھر کر غافل سے ہو گئے۔ وہ اسی مہینے انتقال کر گئے۔"

○

وہ غالباً ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا نام مرزا غالب نے رکھا تھا۔ مرزا سراج الدین۔ ان کے والد تھے مرزا شہاب الدین ثاقب۔ جو نواب نیر رخشاں کے صاحبزادے تھے۔ ثاقب جواں عمر رخصت ہوئے اور سائل صاحب نے دادا کی آغوش میں پرورش پائی۔ مجھے ان کی جوانی کے حالات کا زیادہ علم نہیں' بس یہی کچھ سنا ہے کہ وہ بہت اچھے قدر انداز اور شہ سوار تھے۔ اس وقت آسودہ حال لوگ اور ہوتے بھی کیا۔ خراب ہوئے رنڈی بازی کی' جوا کھیلا۔ تکلّیں اڑائیں اور ڈگریاں کرا کے بیٹھ گئے۔ اچھی صحبت پائی تو عالم ہو گئے یا شاطر۔ شہ سوار اور شاعر۔ چچا جان گنجفہ اچھا کھیلتے تھے۔ مگر ایسا نہیں کہ لوگ کان پکڑیں۔ ہاں شطرنج ان کی بہت اعلیٰ تھی۔ میرے زمانہ میں بھی جگر صاحب گھنٹوں سر پٹختے تب کہیں مہرے ادھر سے ادھر کرتے تھے اور جگر صاحب کو سب جانتے ہیں کہ وہ کتنے اچھے کھیلنے والے ہیں۔ کئی سال کلکتہ جا کر بلیرڈ کے مقابلوں میں شریک ہوتے رہے اور انڈیا چیمپئن بھی ہوئے۔ شاعر نہ جانے وہ کیسے تھے میں نے سات برس میں ان کا سبھی کلام پڑھا بلکہ کچھ نہ کچھ تو خود اپنے ہاتھ ہی سے لکھا کیوں کہ وہ عام طور پر مجھ سے اور اپنے ایک چہیتے شاگرد انوار دہلوی سے ہی لکھوایا کرتے تھے۔ ہم دونوں کے اوقات مقرر تھے۔ لیکن میں نے کبھی ان کے شعر کی طرف توجہ نہ دی۔ کہنے کو وہ دلی کے آخری استادوں میں سے تھے۔ (یہ آغا شاعر قزلباش' سید وحید الدین بیخود' پنڈت امرناتھ ساحر اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تھے) اور ان کی زبان سے پورے ہندوستان کے "زبان نویس" سند لیتے تھے۔ وہ جانشین داغ بھی کہلاتے تھے۔ کیوں کہ وہ داغ کے چہیتے شاگرد ہونے کے علاوہ ان کے داماد بھی تھے۔ (یوں جانشین داغ بہت سے اور اساتذہ بھی کہلاتے تھے) سو اس وقت کی دلی اور لکھنؤ اور حیدر آباد میں سائل دہلوی ایک خوش گو' قادر الکلام اور مستند شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن میری نظر کبھی ان کی شاعری کی طرف نہ گئی میں بیٹھا گھنٹوں ان کے کرتوں اور ان کی بیلوں اور چوگوشی ٹوپیوں پر قیطون کی ڈوری سے زنجیرے کا کام دیکھا کرتا ان کے قلم کھٹ کھٹ بجاتا' ان کی بیاضوں سے کاغذ کی جلدیں اور ان کے بے مثال خط میں لکھی ہوئی وصلیاں اور قرابادینیں پڑھا کرتا۔

ایک بار میں نے ایک قرابادین میں ذہانت کا کوئی نسخہ پڑھا اس میں مشک کا ذکر تھا مشک ان کے پاس ہمیشہ رہتا تھا اور

ان کی بیاضوں سے لے کر ان کے کمرے دالان اور آنگن تک مہکیں آتیں۔ آخر میں نے وہ نسخہ پڑھ کر تھوڑا سا مشک چرایا اور بے نسخہ بنائے صرف چائے میں ڈال کر پی گیا۔ جب طبیعت خراب ہوئی اور تفتیش کی گئی تو راز کھلا۔ چچا جان کو خبر ہوئی تو پورا نافہ لے کر رکشا پر آئے اور عنایت کر گئے۔ وہ مشک آج بھی میرے پاس ہے مگر اس میں وہ پہلی سی مہک نہیں رہی۔ وہ مہک شاید مشک والے کی اپنی تھی۔ جو اس کے کمروں' دالانوں کے آگے پڑے ہوئے موٹے موٹے روئی کے پردوں میں رچی ہوئی تھی جن پر ٹول کی چادریں چڑھی رہتی تھیں۔ وہ مہک شاید صدیوں کی مہک تھی۔ ان اقدار کی جنہوں نے سائل دہلوی کو جنم دیا تھا اب کبھی کبھی میں کسی نئے ملنے والے کو وہ نافہ اپنے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی شیشے کی الماری سے نکال کر دکھاتا ہوں' اس کمرے میں میرے والد کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے۔

"یہ مشک نافہ ہے' ہمارے ہاں مدتوں سے ہے" میں اسے بن کے امپریس کرتا ہوں کہ بھئی ہم بڑے پرانے خاندانی لوگ ہیں۔ میں انکسار سے آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔

"خوب خوب۔ کیا ہے یہ" پوچھنے والا پوچھتا ہے۔

"مشک نافہ"

"اچھا۔ یہ بو سی کیوں آتی ہے اس میں یار۔ مشک نافہ ایسا ہوتا ہے؟ کیوں فلسفی بازی کر رہے ہو یار۔ ہی ہی ہی۔ ہی ہی ہی اختر الایمان بھی کرتا تھا" اب مشک کہا گیا تھا تو اور وہ بھی سائل دہلوی کے پاس رکھا ہوا تو شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ میرا مذاق اڑاتا۔ وہ سائل دہلوی کے خلاف نہیں تھا مگر وہ "گرداب" کا مصنف تھا۔

شاید اس نے سچ کہا تھا شاید یہ بھی سچ ہو کہ سائل دہلوی بڑے شاعر نہیں تھے مگر یہ سچ میرا موضوع نہیں ہے میں شاعری کا ناقد نہیں ہوں نہ میں نے ان کو شاعر کی حیثیت سے پرکھا۔ اصل میں وہ اتنے خوبصورت اور اچھے انسان تھے کہ ان کے بارے میں کوئی گھٹیا یا چھوٹی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ وہ اچھا پڑھتے تھے اچھا سوچتے تھے میں نے تو ان کا بڑھاپا دیکھا تھا مگر آج تک اس قد و قامت اور ناک نقشے کا آدمی نظر نہیں آیا۔ گورا بھبو کا رنگ   جو جوانی میں گلابی مائل ہوگا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں' چوڑی گھندار داڑھی' کمایا ہوا بدن' انگرکھا تو پہنتے ہی تھے   مگر اپنی وضع کی اچکن بھی ایجاد کی تھی جس کے گریبان پر ایک چوڑی سی پٹی ناف تک آتی تھی۔ چوگوشیہ ٹوپی ان سے مرتے دم تک نہ چھوٹی۔ وہ ہندوستان بھر کے خوش لباسوں میں ممیز کیے جاتے تھے۔

شاید ۱۹۱۱ء میں یہ ہوا کہ میرے والد اور وہ کسی دربار میں شامل ہوئے۔ وہ میرے والد کے چچازاد بھائی اور ان کی پہلی بیگم کے چھوٹے بھائی بھی تھے عمر میں چند برس چھوٹے مگر جگری دوست تھے۔ اس دربار میں دونوں ایک ہی رنگ اور ایک ہی کپڑے کا لباس پہن کر گئے۔ واپسی میں میرے والد نے گویا ان سے یوں کہا ہوگا۔

"بھئی سراج الدین خان۔ کپڑے قیمت سے نہیں جچتے۔ سلائی بھی اچھی ہونی ضروری ہے۔"

"بھائی سرکار آپ والئِ ریاست ہیں میرا آپ کا کیا مقابلہ۔"

"تو پھر مقابلہ نہ کرو اور کرو تو مقابلے کی طرح۔" یہ کہہ کر میرے والد نے اپنی چست پوشاک کو دیکھا ہوگا مخملیں

انگرکھا ہوگا جس میں سے ان کا سینہ ان کے بازو اور کلائیاں پھٹے پڑتے ہوں گے۔ آستینوں کی سلوٹیں لپک لپک کر چڑتی ہوں گی اور چوگوشیہ ٹوپی پر جھنڈ جھلملا رہا ہوگا۔

چچا جان آداب کر کے فٹن سے اتر گئے اور اپنے بہنوئی اور پیارے دوست سے کئی برس بعد ملے جن میں انہوں نے رہتکن کا آدمی بلا کر چار گھنٹے روز محنت کر کے کپڑے قطع کرنا اور سینا سیکھ لیا تھا۔

ایک دن انہوں نے مجھے ۲۳۔ ۲۴ء کا ایک خط دکھایا۔

"بھائی سراج الدین سلمہ۔

ہر گاہ کہ پرسوں سے تمہارا انتظار شام و پگاہ کیا مگر تم نہ آئے کس واسطے کہ دو ماہ میں ہمارا لندن جانا مقرر ہے۔ اور فراک کوٹ اور ڈنر سوٹ تمہیں قطع کرنے ہیں نہ معلوم تم وعدہ کر کے کیوں مکرتے ہو یہ کام تو ان کا ہے جن کے لئے تم نے اپنی بیاض سیاہ کی ہے۔

آثم

امیر الدین۔ فقط

اب مجھے یاد نہیں شاید معمولی کرتے' پاجامے تو مغلانیاں سی دیتی ہوں مگر اتنا مجھے یاد ہے کہ آنکھیں ہوتے انہوں نے باہر کا لباس کسی اور سے قطع کرا کے نہیں پہنا۔ کیا مجال جو کسی کی قینچی ان کے کپڑوں کو لگ جائے۔ تراش ٹیڑھی ہو جائے یا سلائی موٹی ہو تو سائل دہلوی کو لوگ کیا کہیں گے۔ آخر آخر آنکھوں نے جواب دے دیا تھا تو ناکوں کو پھکوں پر سے انگلیوں پر لپیٹ لپیٹ کر پیارے پیارے گچھے بناتے رہتے۔ عزیزوں اور دوستوں اور شاگردوں کے لئے تحفے بھی اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے بھیجتے۔ کسی کو کڑھا ہوا رومال کسی کو اپنے ہاتھ کے قط لگے ہوئے قلم۔ آج شاید بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ اچھا قط لگانا کیا ہوتا تھا اور اچھے قلم کیسے ہوتے تھے۔ یہ شیفرز جس سے میں لکھ رہا ہوں جس میں سے سیاہی آپ ہی آپ بہتی ہے جو ہزاروں لفظ بے ڈوبائے لکھ جاتا ہے اس وقت جیسے میری ہنسی اڑا رہا ہے کہ میں سائل دہلوی کے قط لگائے ہوئے قلموں کو یاد کر رہا ہوں اور لاکھوں میل پرے زن زن کرتے ہوئے لیونک اور مونک اور سپوتنک میری یادوں کی فتنیں اور پالکیاں اور ڈولیاں دوڑائے لئے جاتے ہیں اور میرا قلم پھریری کرنے لگتا ہے۔ اختر الایمان والی ہی ہی جس میں بیسویں صدی کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں کے چھناکے ضرور تھے۔ مگر جو انیسویں صدی کے بند در بند غلافوں کی خوشبو نہیں سونگھ سکتا تھا اور یہ قلم جس پر قط نہیں ہے اور جو کونک سے بھرا ہوا ہے چلے جاتا ہے اور میرے سامنے قط لگے ہوئے قلم ناچنے لگتے ہیں۔ سائل دہلوی کے قلم جو اپنے قلموں کے نیزے مہینوں کی چھان بین کے بعد منتخب کرتے تھے' استاد جلیل مانک پوری اور دوسرے دوست انہیں پتہ نہیں کہاں کہاں کے جنگلات سے نیزے بھیجتے جنہیں ہفتوں خوشبودار پانی میں بھگویا جاتا اور پھر ان کے سروں پر کیکری کٹاؤ والی ہاتھی دانت کی مہریں وصل کی جاتیں جنہیں عجیب عجیب مصالحوں سے پالش کیا جاتا۔ اب ایک دن مقرر ہوتا اور شاگردوں اور شوقینوں اور مداحوں میں دھوم مچ جاتی کہ آج نواب سائل قلموں پر قط لگائیں گے۔ شوقین خوش نویس ترشے ہوئے نیزے لے کر آتے کہ شاید فرصت

مل جائے اور ہم بھی دو چار قط لگوالیں۔ اب مقررہ دن کو لوگ حلقہ باندھے بیٹھے ہیں عطریات سے تواضع ہو رہی ہے اور چچا جان ہاتھی دانت سے مزین چاقو لئے چاندی کی ہتھوڑی اور صندل کی چھوٹی سی تپائی سامنے رکھے قط لگا رہے ہیں۔ سامنے موٹے موٹے عنابی رنگ کے بے لائن والے کاغذ رکھے ہیں اور کتھئی رنگ کی سیاہی سیپیوں میں بھری ہوئی ہے جس سے وہ لکھائی کی پڑتال کرتے جاتے ہیں۔ کوئی بڑا منہ چڑھا لاڈلا شاگرد ہوا تو منہ پھوڑ کر دیں قلم مانگ بیٹھا ورنہ سب چپ چاپ منتظر رہتے اور دیکھتے رہتے کہ آج کس پر عنایت ہوتی ہے۔ (میں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک ان کے پرانے سرمائے میں سے اٹھارہ قلم چرا کر نااہلوں کو صرف دھونس جمانے کے لئے بانٹ دیئے)۔

قلموں پر قط لگانے میں وہ ایسی ہی احتیاط برتتے تھے جیسی زبان کے معاملے میں۔ زبان انہیں بہت عزیز تھی۔ "نقش فریادی" دلی پہنچی تو کالج میں شور مچ گیا۔ میں نے تمام رات بیٹھ کر وہ روشن اور شاندار کتاب پڑھی اور صبح ہی بھناّیا ہوا چچا جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"جناب دیکھئے یہ ہے نیا ادب۔ یہ ہے نئی شاعری۔ آپ زبان لئے پھرتے ہیں۔" میں نے ایک دم وہ سب دہرا دیا جو مجھے اختر الایمان بتایا کرتا تھا۔

انہوں نے پوری کتاب پڑھوا کر سنی۔ اس دوران میں وہ کہیں کہیں داد بھی دیتے رہے۔ پھر خاموش ہو گئے۔

"یہ لڑکا اچھی زبان لکھ سکتا ہے۔ خوبصورت اور جدید زبان۔ مگر ابھی جدید زیادہ ہے"۔ یہ انہوں نے فیض صاحب کے بارے میں فرمایا۔

"اور شاعر کیسے ہیں۔ یہ تو بتایئے جناب۔" میں انہیں کریک کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"بہت اچھا ہے۔ ہونہار ہے۔ جگر کی طرح اپنے انداز رکھتا ہے۔ جگر بھی ایسے ہی چلا تھا بڑا ہونہار لڑکا تھا" اپنے جگر صاحب کو ۱۹۴۱ء میں لڑکا کہنے والے کی آواز میں کتنا اطمینان کتنی گمبیرتا تھی۔ کتنا پیار تھا۔ جگر اور فیضؔ ان کے لئے دونوں لڑکے تھے۔

مگر شاید لوگ اس کا برا مان جائیں گے۔

"چچا جان زبان کس کی درست ہے۔"

"بہتوں کی۔ کیفی ہیں۔ ثاقب ہیں۔ بیخود ہیں۔ نوح ہے "نوح ہے" کا مزا یہ تھا کہ نوح صاحب 'سترے بہترے' ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہیں اور چچا جان گھرک رہے ہیں۔ "تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو جی" "بیٹھ جایا کرو۔ تلافی بعد میں ہو لے گی۔"

"میں حضور بے معافی نہیں بیٹھوں گا۔ تقصیر ہوئی ہے ندامت کیسے نہ ہو۔"

معلوم ہوا کہ نوح ناروی صاحب جو یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں صبح چچا جان کو سلام کرنے سے پہلے کسی ملاقاتی سے ملنے بیٹھ گئے ۔ نوح صاحب داغ کے آخری شاگردوں میں سے ہیں اور چچا جان کے بڑے چہیتے خواجہ تاشؔ دوست اور محبوب۔

"اچھا اور نثر کون درست لکھتا ہے یعنی سب سے زیادہ درست یعنی اردو؟"

"بہت کم۔ مثلاً شیخ عبدالقادر اور خواجہ حسن نظامی۔ مگر خواجہ صاحب سادہ بہت ہیں۔"

"شیخ عبدالقادر؟ وہ تو لاہور کے ہیں۔"

"ہاں وہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور وہ بہترین اردو لکھتے ہیں۔ بیٹا پہلے پڑھو لکھو اور پھر لوگوں کے وطن تلاش کرو بیٹے۔ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میرا شعر یاد ہے تمہیں۔ میں کون ہوں۔

تاج ارشد جامِ غالب ماہِ داغ
سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

غالب تو خیر غالب تھے اور داغ بھی داغ تھے۔ ارشد تھے مرزا ارشد گورگانی۔ دلی دربار کی آوازوں کا ارتعاش ہوں گے۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا ان سے چچا جان کو سسرالی نسبت کے علاوہ شاگردانہ عقیدت تھی۔ ویسے وہ سلاطین زادے تھے مگر برے زمانے بھی آسودگی سے گزار گئے۔

"یاد ہے تمہیں میں کون ہوں"۔۔۔؟

اب مجھے وہ شعر یاد آئے ہیں۔ گارڈن روڈ پر میرے گھر کے سامنے سے دھڑا دھڑ موٹر رکشائیں اور ٹیکسیاں اور بسیں گزر رہی ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کوئی صاحب سامنے کا دروازہ نہایت بدتمیزی سے دھڑ دھڑا رہے ہیں۔ مگر سائل صاحب کی مترنم آواز آہستہ آہستہ پھیلتی جاتی ہے۔

سائل مجھ کو کہتے ہیں شاد میں اس سے ہوتا ہوں
دنیا مجھ پر ہنستی ہے دنیا پر میں روتا ہوں
منگتا ہوں یا ہوں بھکیا بول نہ ہوگا کیوں بالا
غالب میرے دادا تھے غالب کا میں پوتا ہوں

"اچھا بھئی یہ غالب ان کے دادا کیسے تھے اور تھے تو کیا کمال تھا۔" کافی ہاؤس میں کوئی تمسخر بھری آواز ابھرتی ہے۔ کافی ہاؤس سے مجھے بڑی محبت ہے۔ کافی ہاؤس والے میرے لئے بیسویں صدی کے نمائندے ہیں۔ نہ میں ان سے لڑ سکتا ہوں نہ ان سے بھاگ سکتا ہوں نہ انہیں منگتا اور بھکیا کی خوبصورتی دکھا سکتا ہوں۔

دادا تو ایسے تھے کہ ایک تو ان سے الٰہی بخش خان صاحب معروف کی بیٹی امراؤ بیگم بیاہی تھیں اور الٰہی بخش خان احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ جو سائل صاحب کے دادا کے باپ تھے۔ (اور میرے پردادا کے باپ) اور یوں بھی تھے کہ نیر رخشاں غالب کے شاگرد تھے اور سائل رخشاں کے پوتے اور یوں بھی تھے کہ غالب کے جد امجد کوئی بیگ ہوں گے جو ہمارے جد امجد کسی خان کے بھائی ہوں گے اور بقول تاثیر مرحوم اس زمانے میں سبھی ماورالنہر سے آتے تھے۔

یوں خاندانیت پر ناز سبھی پرانے لوگ کرتے تھے کیا دلی کیا لکھنؤ کیا لاہور۔ یہ لوگ تھے بہت بور بڑی بوگس باتیں کرتے تھے۔ میں "بری صحبت" میں خراب ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چچا جان مجھے سمجھاتے۔

"بیٹا لوگ داؤ لگاتے وقت گھوڑے کی نسل بھی دیکھتے ہیں۔ کتے خریدتے وقت بھی تمام سلسلے نکال کر پرکھتے ہیں ہم تو انسان ہیں۔ ہائے آلِ ورود اولادِ علائی اور ایسے خیالات!" انہی کے اور بھائی بند حیوانوں سے بدتر بھی ثابت ہوتے تھے۔ مگر وہ خود خاندانیت کے سبب یا تربیت یا افتادِ طبع کی وجہ سے ایک بہترین انسان ضرور تھے۔ اتنے برس میں میں نے ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیخود صاحب کی بھی۔

بیخود صاحب ایک الگ مضمون کے مستحق ہیں۔ مگر سائل دہلوی کے سلسلے میں ان کا نام ضرور آئے گا۔

بیخود صاحب بھی "جانشینِ داغ" تھے۔ وہ سخت تیز مزاج اور تیز زبان تھے۔ کھرے سید' جلالی' تبری' بامحبت۔ وہ سائل صاحب کو بالکل خاطر میں نہ لاتے۔ دلی میں ان کے شاگرد کافی تھے اور ہندو امراء خاص طور پر انہی کی سرپرستی کرتے۔ مدتوں دونوں نے ایک ساتھ مشاعرہ نہ پڑھا جب کھلے تو جس مشاعرے میں سائل و بیخود پہنچ جائیں خلق خدا ٹوٹ پڑتی تھی۔

بیخود صاحب کھلے بندوں سائل صاحب کو برا کہتے مگر سائل صاحب کے بڑے صاحبزادے قطب الدین فصیح بیخود صاحب کے شاگرد تھے وہ چپ بیٹھے باپ کی برائی سنتے رہتے۔ باپ ہی نے تو ان کا شاگرد کرایا تھا۔ ایک بار دونوں کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں جنگ ہوگئی جھگڑا سائلیوں کو داد ملنے اور بیخودیوں کو داد نہ ملنے پر بڑھا (داد یہ لوگ پرے باندھ کر خود ہی دیتے تھے) اور خوب جوتم پیزار ہوئی۔ قاعدے کے مطابق دونوں استادوں نے اپنے اپنے پوت شاگردوں کی برأت کی کوشش کی اور نتیجتاً خود الگ ہوگئے۔ بیخود صاحب نے طعن و تشنیع سے گزر کر دشنام طرازی پر کمر باندھی مگر سائل صاحب معتکف ہوگئے۔

"چچا جان بیخود صاحب بڑے بوگس آدمی ہیں۔" ایک دن میں نے جل کر کہا۔

"بس خبردار جو تم نے ایک حرف اور بولا۔ تمہارا یہ درجہ نہیں جو بھائی کے لئے ایسی بات کہو' : وہ بگڑ گئے۔

"پھر وہ بھی تو سوچیں نا۔ یہ کیا بات ہے صاحب۔" میں واقعی ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔

"بھئی وہ جہاں استاد کے شاگرد ہیں۔ دلی والے ہیں۔ میرے دوست رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سید زادے ہیں۔ ہم تم مغل بچے ہم انہیں کیا کہہ سکتے ہیں۔"

مغل بچہ پھر بھی نہ سمجھا اور آج تک نہیں سمجھ سکا کہ سید زادے کیا چیز ہوتے ہیں۔

○

ایک بار ایک شہدے صاحب عید کا سلام کرنے آئے۔ دور سے ہی انہوں نے آداب عرض کیا۔ اور دعائیں مار مار کر دعائیں دینی شروع کیں۔ چچا جان پلنگڑی پر بیٹھے تھے۔ ہاتھ پٹی پر جما کر گویا کھڑے ہونے لگے اور آگے جھک کر تعظیم دی۔ میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ انہوں نے شہدے صاحب سے ایک آدھ بات کی اور انہیں رخصت کر دیا۔

"ارے چچا جان آپ اسے تعظیم دیتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"تو کیوں۔ یہ کیا آداب ہیں صاحب" میں بد تمیز تو تھا ہی۔

"تم سے کیا۔"

"اچھا تو اب میں بھی یہی کروں گا۔" ڈومنیاں آئیں تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور جھک جھک کر آداب کروں گا اور قوال آئیں گے تو......"

"ارے۔ ارے لڑکے کیا بے ہودہ باتیں کرتا ہے۔ اچھا تو میں۔"

انہوں نے تو بڑا لمبا واقعہ بیان کیا۔ مگر ہوا یوں کہ جب دلی میں بجلی عام نہیں تھی اور گھروں میں قندیلیں' جھاڑ اور فانوس جلتے تھے۔ یعنی اب سے ساٹھ سال پہلے تو ایک شام یہ شہدا سلام کرنے آیا۔ ٹشپٹی نے دلیز دکھائی اور وہ آگے بڑھا۔ چچا جان صحن میں دور بیٹھے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا شمعیں چھوٹی تھیں اور دور رکھ دی گئی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر قد سے گمان ہوا کہ حکیم اجمل خان آئے ہیں۔ فوراً تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ اب جو دیکھا تو شہدے خان۔ مگر لمحہ بھر میں انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور اسے بٹھا کر خود بیٹھ گئے۔ اس واقعہ پر چالیس برس گزر گئے تھے مگر وہ جب بھی آیا انہوں نے تعظیم دی۔

"بھئی وہ یہ سوچتا۔ نہ معلوم کیا سوچتا۔ خیال تو آتا ہی کہ نواب صاحب ایک بار تعظیم دے گئے اور اب اپنی وضع کو بھول گئے ہیں"۔ انہوں نے آخر میں کہا۔

یہ کیا چکر تھا۔ یہ کیا وضع داری تھی۔ اس وضع داری میں کیا عوامل بر سر کار تھے۔ وہ چالیس برس ایک "نیچ قوم" کو اسے نیچ سمجھتے ہوئے بھی کیوں تعظیم دے رہے تھے۔

شاید اس لئے کہ میں ۱۹۳۵ء میں یہ بات دیکھ کر کم از کم ۱۹۶۰ء تک یاد رکھوں گا یا اس لئے کہ ------ واللہ اعلم

شہدے تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے نا۔ اب بھی خال خال پرانے شہروں میں نظر آجاتے ہیں۔ یہ نہ ڈوم ہوتے ہیں نہ میراثی نہ قوال۔ گاتے بجاتے نہیں۔ لکھنؤ میں نے نہیں دیکھا لاہور میں شاید یہی طبقہ کسی اور نام سے جانا جاتا ہوگا۔ دلی میں یہ لوگ پیشہ ور تہنیت دینے والے ہوتے تھے انہیں تمام خاندانوں کے شجرے سات سات پشت تک یاد ہوتے تھے۔ جہاں نکاح کے بول ختم ہوئے ایک دم مجلس کے کسی کونے سے دھاڑیں مارنے کی آوازیں آتی تھیں۔ اللہ کی امان۔ رسول کا صدقہ۔ اسلم بن مسلم بن اجمل بن ----

اے اللہ رکھے پٹودی والے ہیں۔ دو جانے والے ہیں۔ سید ہیں' ان کا باپ فلاں ان کا دادا فلاں۔ اللہ کی امان۔"

شہدے نقلیں بھی کرتے تھے۔ چچا جان کبھی کبھی نقال شہدوں کو بلواتے۔ مرے گرے' دانت ٹوٹے نقال' میرے وقت میں نقال رہے نہیں تھے۔ انہی میں سے ایک آدمی تھا جسے انہوں نے اپنے ایک سہو کی بناء پر چالیس سال تک تعظیم دی۔ اس دلی میں جہاں کفو غیر کفو کے چکر میں کنواریوں کے سر سفید بالوں سے پک جاتے تھے۔

وہ اپنے سہو کی قیمت خود مقرر کرتے اور ایمان داری سے ادا کرتے۔

جنگ کے زمانے میں دلی میں ایک مائیکرو فون اسٹیشن بن گیا تھا۔ جہاں سے سیرگاہوں میں نصب لاؤڈ اسپیکرز تک

طرح طرح کے پروگرام پہنچائے جاتے۔ ان میں مشاعرے بھی ہوتے۔ یہ اسٹیشن ہارڈنج لائبریری میں بنایا گیا تھا جو کمپنی باغ میں واقع تھی۔ چچا جان معمولاً ہوا خوری کو ادھر جاتے تو کبھی کبھار اسٹیشن بھی پہنچ جاتے۔ ان کے لئے مائیکرو فون باہر لایا جاتا اور مہتمم صاحب بڑے فخر و اہتمام سے دو چار شعرا اہالیان دلی کو سنوا دیتے۔ ایک مرتبہ جو ادھر پہنچے تو میری عمر کے ایک صاحب لمبے لمبے بال جمائے پان چباتے ہوئے کچھ مترنم چال میں برآمد ہوئے۔

"آپ ہیں نواب سراج الدین سائل" مہتمم صاحب نے تعارف کرایا۔

ان صاحب نے بے نیازی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہم لوگ بزرگوں سے اول تو ہاتھ ملاتے ہی نہیں تھے اور ملاتے بھی تھے تو دونوں ہاتھوں سے۔

چچا جان نے مسکراتے ہوئی ہاتھ ملایا۔ رکشا قاعدے سے کھڑی کرائی اور ان کی طرف متوجہ ہوئے وہ ایک بوگس سے شاعر نکلے۔ کسی ضلع کے تھے۔

چچا جان نے نمونہ کلام کی فرمائش کی۔

"بھئی میں کیا سناؤں۔ نواب صاحب تم ہی سنا دو۔ میں صرف بڑے بڑے مشاعروں میں جاتا ہوں آج یہ بختیاری صاحب کھینچ لائے۔" یہ کہہ کر نہایت بھونڈی آواز میں ہنسے اور ہم سب کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا۔

وہ بیکار تھے۔ چچا جان نے ایک روپیہ روزان کا وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک ان کا مقرر کردہ ایک دوکان دار ان کو ایک روپیہ روز دیتا رہا اور وہ سائل صاحب سے جب ملتے بھی نواب صاحب تم کیسے ہو کہہ کر مخاطب کرتے۔

میں ان کا نام نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ وہ بھارت میں رہتے ہیں۔ یہاں ہوتے اور انہیں صفائی کا موقع ہوتا تو میں نام لیتے ذرا نہ جھجکتا۔ ویسے وہ آج بھی بوگس آدمی ہیں۔ بے چارے شہرت بھی نہ پا سکے۔ شاعر تو خیر کیا تھے۔

○

"بھائی نظام الدین مر گئے۔"

"انا للہ۔ کیا تار آیا ہے۔"

"جی ہاں۔ فوجی حکام نے ایران سے بھیجا ہے۔"

یہ غالباً ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔ نظام الدین ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اور فوج میں افسر تھے' شاید لیفٹیننٹ تھے۔ وہ ایران پہنچے اور نمونیہ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔

"انا للہ۔ بیگم کو خبر ہوئی۔"

"جی ہاں۔"

"رکشا منگاؤ" جیسے وہ اپنے معمولات پورے کرنے چلے گئے۔

پہلے انہوں نے ساحر صاحب کو خبر دی۔ پھر اردو بازار میں اپنے شاگرد کی دکان کے آگے رک کر چائے پی اور پھر کمپنی باغ کی طرف چلے گئے۔

اس کے بعد دیکھئے صفحہ نمبر۔ 552

ایک نوجوان نے جو مغموم نہ تھا مگر پریشان نظر آتا تھا کنور مہندر سنگھ کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا۔
"عزیز المناقب کنور صاحب
بعد دعا واضح ہو کہ حامل رقعہ ہذا میرے محلے کا بچہ ہے۔ شریف زادہ اور صاحب علم ہے۔ اس سے مجھے مہرِ مفرط ہے۔ آپ اس کے لئے روزگار کی سبیل مہیا کریں گے تو سائل ممنون ہو گا۔"
"جھوٹا۔" کسی نے کہا۔ کنور صاحب سخت جذباتی ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ خط نواب صاحب نے لکھوایا تھا تو میں اپنی نوکری چھوڑ دوں گا مگر اسے نوکری دلوا کر رہوں گا۔ سفارش کرنا ان کی عادت تو تھی ہی۔
میں نے کہا میں نے نہیں لکھا۔
"جھوٹا ہے جی۔" ایک اور فاضل شاگرد نے کہا۔
"سچا ہے۔ حرامزادو یہ سچا ہے۔" "یہ سراج الدین ہی کا خط ہے۔" بے خود صاحب بے اختیار گرجے۔
"وہ کیسے استاد۔" کنور نے آنسو پونچھے۔
"ہائے اب یہ بھی بتاؤں۔" (بیخود صاحب پھر چیخے) "ارے اب دلّی میں کون رہ گیا ہے جو مہرِ مفرط کی ترکیب یوں روانی سے استعمال کر جائے۔"
کافی ہاؤس والے پھر قہر بھری نظر سے دیکھتے ہیں۔ "دلّی کا بچہ" ان کی آنکھیں چیختی ہیں۔
دلّی کا بچہ سہم کر گردن جھکا لیتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے کراچی میں دلی کا ذکر بلکہ نام تک عجیب معلوم ہوتا ہے۔ (میں نے ۱۹۴۷ء سے اب تک دلّی کا ذکر نہیں کیا۔ دلی میرے لئے ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو مر گئی تھی جب میں نے کراچی کا رخ کیا تھا)۔
دلّی، دلّی۔ سالے زبان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں"۔ کافی ہاؤس والے اور جیم خانے والے شاید میری بات نہیں سمجھیں گے۔ اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی بڑا تیر مار دیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ انہیں اپنے اندھیروں سے سخت محبت ہو گئی ہے۔ اندھیرے اور انتشار اور ہما ہمی جہاں اقدار کی روشنی نہیں ہے۔ انہیں دلی کوئی ایسی جگہ معلوم ہوتی ہے جہاں خلق خدا گروہ در گروہ محاوروں کی سڑتی ہوئی لاشیں اٹھائے گھوم رہی ہو جن کے تعفن سے ان کے دماغ پھٹے جاتے ہوں۔ محاورے جو قدروں کے نمائندے ہیں قدریں جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہوں یا ایک طویل تہذیبی عمل کی ان میں سکون تھا۔ ٹھہراؤ اور تسلسل۔ لاہور میں چند نہایت سمجھدار اور مشہور ادیب باتیں کر رہے تھے۔
"او یار۔ تو سید عبداللہ کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے۔ تجھے بزرگ ہستیوں میں کیا مزا آتا ہے۔ تو ہماری نسل کا آدمی ہے اپنی طرف آ۔"
شاید وہ سچ کہتے تھے۔ مجھے بزرگ پرستی میں مزا آتا ہے۔ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کو صرف بزرگی کی بناء پر بے وقوف نہیں سمجھتا۔ مجھے ان کی آنکھیں گدلی گدلی نہیں لگتیں وہ آنکھیں روشن اور صاف ہیں۔ شاید انہوں نے "اسٹڈیز ان ڈائنگ کلچر" نہیں پڑھی اور میں نے "قرور اسٹڈیز" بھی پڑھی ہے، مگر میری آنکھیں دھندلی اور تاریک ہیں ان بنتی اور ٹوٹتی ہوئی قدروں کے پاٹوں میں ایک پوری نسل کس طرح پس گئی ہے۔ یہ نسل جو بہت خوش قسمت ہے اور بہت بد قسمت۔

گنجفہ اور چوسر کھیلتے میں نے صرف ایک بار دیکھا وہ میرے سامنے حکیم حسین احمد عباسی سے رمی کھیلتے تھے۔ رمی داؤ لگا کر ہوتی۔ ۷۵ ہزار روپیہ پوائنٹ کھیلتے تھے۔ سینکڑوں پوائنٹ کی ہار جیت پر کروڑوں کے حسابات نکلتے اور اعداد شمار اس غضب کے ہوتے کہ پسینے آجاتے۔ میں نے بہت کہا لاکھوں میں یا صفر والے اعداد سے کھیلا کیجئے کہ شمار میں سہولت رہے مگر وہ نہ مانے۔ انہیں مشکل حساب اور پیچیدہ رقموں میں مزہ آتا تھا۔

"آدمی رئیس ہو تو رئیسوں کی طرح رہے" وہ سوچتے ہوں گے۔ رمی کی محفل روز جمتی جس دن نہ جمتی حکیم صاحب کا ہرکارہ قرض واپس مانگنے آتا۔

"سوا دو کروڑ روپے منگائے ہیں کہا ہے باقی پھر بھجوا دیجئے گا۔ آج ذرا ضرورت پڑ گئی ہے۔" وہ مسکراتے اور کن انکھیوں سے ہم لوگوں کو دیکھتے۔

"بھئی یہ امروہے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں' افسوس طبیبوں میں بھی لالچ آگیا ہے۔"

طبیبوں سے ان کی دوستی بڑی پرانی تھی۔ حکیم اجمل خان سے انہیں خاص تعلق تھا۔ بار بار اصرار پر بھی ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ بس آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

"موت اس پر عاشق تھی اس کی سفارش پر ہزاروں لاکھوں کو چھوڑ دیا مگر خود اسے لے گئی" ایک بار انہوں نے کہا۔ شاید یہ حکیم اجمل خان کی پوری داستان ہے۔

موت کا ذکر ان سے بار بار رہا ان کا تصور بہت واضح تھا۔ اس میں پیری وغیرہ کا کچھ ایسا دخل نہیں تھا۔ بلکہ ان کی صاف دماغی کسی کنفیوژن کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"بس میں مر جاؤں گا اور کیا۔ میرے باپ مر گئے دادا مر گئے والدہ مر گئیں دادی مر گئیں بیٹا گیا بیٹی گئی میں بھی جاؤں گا مجھے بھی جانا ہے۔"

"اور تمہیں بھی جانا ہے۔" یہ جواب تھا میرے پیچیدہ سوالات کا جو میں فلسفہ مرگ پر کرتا

اور ایک دن وہ مر گئے۔ ان کا شاندار خوبصورت چہرہ زرد سے سفید ہو گیا۔ ان کی سفید پلکیں آنکھوں کے نیچے گویا ان کے پچکے ہوئے گالوں سے چپک گئیں۔ اور ان کی چوڑی ہڈیاں سیدھی سیدھی لیٹ گئیں میں دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ تو یہ ہیں چچا جان۔ ایک شاندار آدمی۔ انہوں نے ریاستی وظیفوں کے لئے ایجنٹ اور گورنر جنرل تک محضر پہنچائے مگر کبھی کسی رئیس کے آگے سر نہ جھکایا۔ عشق کیا۔ شطرنج کھیلی شکار کھیلا ہلٹوڈ کے چیمپئن رہے دو لاکھ شعر کہے۔ کسی کو برا نہ کہا۔ کسی کے لئے برا نہ سنا اور وضع کے پابند رہے اور مر گئے۔ کیا یہ کوئی بڑے آدمی تھے۔ معلوم نہیں۔ بڑے آدمی کیسے ہوتے ہیں۔ اچھے آدمی اور بڑے آدمی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

جب انہیں دفن کیا جا رہا تھا تو کنور مہندر سنگھ سحر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور بیخود صاحب اپنے آپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ وہ جنازے پر نہیں آتے تھے مگر زبردستی لائے گئے۔

"مر گیا سالا' ہمیشہ کا جھوٹا دغا باز تھا نا۔ مجھے چھوڑ گیا خود چل دیا۔ خود چل دیا۔ خود چل دیا۔" وہ کہے جاتے تھے۔

"جی بہتر مگر یہ تو قافیہ ردیف ہیں نواب صاحب۔ میں تو قافیئے اور ردیفیں بناتا ہوں۔"

استغفراللہ۔"

ان سے میراجی زیادہ نہیں ملے مگر جب ملے خوب ملے۔

جب میں نے انہیں جانا وہ بہتر برس کے تھے۔ دو چار برس بعد میں نے سوچا کہ بڑے میاں جہاندیدہ آدمی ہیں کیا کیا زمانے دیکھے ہیں ان سے ان کی خود نوشت سوانح عمری لکھواؤ' چلو پرانے واقعات ہی لکھدیں گے۔ زبان فرسٹ کلاس ہوگی۔ پرانی شخصیتوں کا ذکر آئے گا۔ ادبی معرکوں کی باتیں ہوں گی۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا گیا۔

"میں نے خود کیا کیا ہے۔ جو میں سوانح عمری لکھوں۔" انہوں نے فرمایا"۔ عمر تو بے شک گزاردی ہے مگر سوانح کہاں سے لاؤں۔"

یعنی کیا ان کی زندگی میں کوئی سانحہ نہیں گزرا تھا (یوں چلئے) اب وہ بزرگ کہاں ڈھونڈیئے جو ان کے ہم عمر بھی ہوں' دوست بھی ہوں اور ہمیں بھی گھاس ڈالیں۔

لے دے کر رہی بیخود صاحب۔

بیخود صاحب گویا مارنے دوڑے

"اے اس بڈھے کھوسٹ کے کارنامے مجھ نوجوان بانکے چھبیلے سے پوچھنے آیا ہے میں کیا جانوں کل یہ کیا کرتا تھا۔ میں تو آج کا آدمی ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ حضور کیا بات فرمادی ہے۔" ایک خوشامدی شاگرد بولا۔

"ہائیں" بات فرمادی" ہے کیا چیز ہوتی ہے جی۔" وہ گرجے وہ مجھے بھول گئے۔

"تقصیر ہوئی حضور۔"

"خیال رکھا کیجئے۔"

"بہتر حضور۔"

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے پوچھا استاد صحیح بولا جاتا تو کیا بولا جاتا۔

"جا کے اپنے چچا جان سے پوچھو۔" وہ پھر بھنا گئے۔" "ہاں تو آپ ان کی زندگی کے حالات پوچھ رہے تھے۔"

سائل صاحب خوش رو تو کمال کے تھے۔ نوعمری میں ایک طوائف پر (حسب دستور) عاشق ہوگئے۔ وہ شطرنج بے مثال کھیلتی تھیں اور انہیں پرند اور ہرن کا گوشت بھی پسند تھا۔ چنانچہ صبح ہوئی اور گھر سے نکلے' دوپہر سے پہلے چند پرند اور ایک چکارا یا کالاان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سہ پہر کو شطرنج کھیلتے اور شام کو شہر سواری کے لئے جاتے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان سے اولاد بھی ہوئی۔

اس زمانے میں دلی کے شرفا رات کو مجرے سننے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ گھر پر یا باغوں میں محفلیں جماتے۔ بہت ہی عاشق زار ہوئے تو دن میں ملاقات فرمائی۔

"اقبال ہمارے دوست تھے وہ بہت اچھے انسان اور بہت بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے کئی علوم میں دست گاہ بہم پہنچائی تھی۔ میاں ذوالفقار علی خان کے ہاں ایسی ایسی صحبتیں رہتی تھیں کہ تم لوگ کیا یہ پوری صدی نہ دیکھ پائے گی۔ سمجھے!

"جی"

"چچا جان آپ ان کے شعر اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے ہم سمجھتے ہیں۔"

"یعنی"

"یعنی ہم لوگ تو ان کا فلسفہ خودی پڑھتے ہیں انہیں مسلم نشاۃ الثانیہ کا مبلغ جانتے ہیں نا۔"

"ہم" یہ بیزاری کا اعلان ہوتا۔

"تو آپ بھی ایسے ہی جانتے ہیں انہیں۔"

"ہُم"

"کچھ فرمایئے نا۔"

"بھئی ہم تو انہیں شاعر جانتے ہیں۔ وہ ایک بے مثال شاعر ہے۔ بانکا اور صاحب طرز شاعر، فلسفہ ہم نے بھی پڑھا ہے مگر فلسفیوں کا مقام اور ہے وہ تو شاعر تھا۔"

اور یہ صوفی نے تو ژدی پر ریز کیا ہے۔"

"یہ زبان کی غلطی ہے۔"

"تو پھر۔"

"تو پھر کیا بس یہ ایک غلطی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ استاد کی صحبت میسر نہ ہوئی۔ خط کتابت ہی رہی۔ چار دن ساتھ بیٹھتے تو عمر بھر چوک نہ ہوتی۔"

"اور عمر بھر شاعر بھی نہ ہوتے۔"

"استغفراللہ۔"

○

ایک دن وہ بھی آیا کہ میں میراجی مرحوم کو لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ میراجی پہلے تو بھڑکے۔ پھر فوراً گھل مل گئے۔ اب ڈی۔ ایچ لارنس والے میراجی نواب سائل دہلوی سے صرف و نحو کی باتیں کر رہے ہیں۔ میراجی اور نواب سائل خاصا عجیب مضمون ہے۔ (مگر افسوس کہ میں دونوں میں سے کوئی مضمون نہ پڑھ سکا)

جب میراجی سے وہ تھوڑے سے کھل گئے تو باتوں میں اور بھی مزا آنے لگا۔ وہ انہیں شاعر ناموزوں کہتے تھے۔ مگر روز ان کی نظمیں سنتے تھے۔

"بھئی تم یہ گولے مت بنایا کرو میراجی۔"

بتائیں گے۔

"وہ تھا شیخ محمد اقبال۔" وہ ہمارے استاد کا سب سے بڑا شاگرد تھا۔ بعد کا تھا مگر سب سے بڑا۔

لو صاحب یہ علامہ اقبال کو ابھی تک داغ کے شاگردوں میں شمار کر رہے ہیں۔ ارے صاحب مر گئے دونوں۔ کاہے کی شاگردی کس کی شاگردی' اس زمانہ میں داغ کا شاگرد ہونا فیشن اور اعزاز بھی تھا مگر علامہ اقبال تو جاوید نامہ اور بال جبریل کے مصنف تھے۔ میں جل بھن کر رہ گیا۔

"علامہ اقبال کو داغ کی شاگردی سے کیا فائدہ پہنچا وہ تو اور اسکول کے آدمی تھے۔"

"بھئی یہ بات تم انہیں سے پوچھتے تو بہتر تھا۔ میں کیا جانوں کس کو کس سے کیا فائدہ پہنچا۔ تمہارے علامہ صاحب تو جانتے ہوں گے۔"

"اچھا تو داغ ان کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے تھے۔" میں نے بات بڑھائی۔

"چند غزلیں تو میرے سامنے بنائیں بلکہ اس وقت میں کاتب تھا پھر کہہ دیا کہ بس جو کو بھیج دیا کرو تم اور شئے ہو ہم تم پر صرف فخر کیا کریں گے۔"

"تو علامہ کا کیا رویہ ہوا پھر۔"

"کیا رویہ ہوتا؟ وہی جو شاگردوں کا ہوتا ہے۔ وہ تم جیسا عالی دماغ تھوڑا ہی تھا عالم تھا' ادیب تھا' فاضل تھا اور بزرگوں کو بزرگ جانتا تھا۔ وہ جو کچھ کہے گیا۔ بھیجے گیا' استاد خوش ہو ہو کر سب کو دکھاتے تھے۔"

"آپ لوگ تو جلتے ہوں گے۔" میں نے داؤ مارا۔

انہوں نے جواب نہیں دیا۔

"تو آپ لوگوں نے انہیں جانشین داغ کیوں نہ مانا۔ آپ سب لوگ اپنے آپ کو جانشین داغ جو لکھتے ہیں تو انہیں بھی لکھا کرتے۔" یہ اس وقت ہندوستان میں ایک الگ ریکٹ تھا اور میں اس میں سخت دلچسپی لیتا تھا۔

"جانشین داغ تو کوئی بھی نہیں ہوا۔ کوئی سلطنت تھی جس کی جانشینی طے ہوتی سب اپنی اپنی نسبت پر مفتخر ہوتے ہیں اور بس اور تم نے داغ کا مرثیہ پڑھا ہے جو اقبال نے لکھا تھا۔

"ہاں"۔

"پہلا دیوان رکھا ہے ان کا۔ نکالنا ذرا یہ کونسا ایڈیشن ہے۔"

وہ دیوان "بانگ درا" تھی۔

"اس میں وہ مرثیہ شامل ہے۔ ہے نا۔

"جی ہاں۔"

"بزرگوں کے بارے میں محتاط رہا کرو۔"

"جی اچھا۔"

اس روز کوئی اور ان کے ساتھ نہ جاسکا۔

اس دن وہ چھپ کر روئے۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعہ کے بعد وہ روز روتے تھے۔ اور ہم لوگوں کے پہنچتے ہی آنسو خشک کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے بزاج دان بھائی نظام کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ مگر میں تقریباً ہر روز اپنے طور پر ان کا غم غلط کرنے کے لئے مرحوم کا ذکر کرتا۔

"چچا جان ! آپ کو ان سے محبت تھی نا۔"

"ہاں بیٹا۔" معظم کے بعد قلب کمزور ہو گیا تھا۔ وہ منہ پھیر لیتے تھے اور شاگرد مجھے گھورنے لگتے۔ معظم الدین بہت پہلے ہی مر چکے تھے۔

پھر ایک دن۔

"ہائے قدسیہ ہائے جواں مرگ ہو گئی۔"

گھر میں سے ماتم کی آوازیں آرہی تھیں۔ قدسیہ بیگم ان کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ لاہور میں بیاہی تھیں۔ دلی علاج کے لئے آئیں اور انتقال کر گئیں۔ ایک بچہ چھوڑا۔ وہ گھبرایا گھبرایا سب کو دیکھتا تھا۔

چچا جان نے اس کے بعد بھی دامن صبر نہ چھوڑا۔ مگر وہ اندر ہی اندر گھلنے لگے۔ وہ آہیں بھرتے اور مسکراتے۔

"چچا جان کیا آپ کا یہ زندگی کا سب سے تلخ تجربہ ہے۔" میں ان کی تحلیل نفسی کرتا۔ میں نے فرائڈ جھوٹوں پڑھ لیا تھا۔ اور ان کے علاج پر تلا ہوا تھا۔

"تلخ نہ کہو تجربہ نہ کہو۔ اللہ کی مرضی ہے۔" وہ سسکیاں روک لیتے۔ تہتر' چوہتر پچھتر برس کا بوڑھا اپنے پیاروں کی موت سے بڑی ملنساری کے ساتھ پیش آتا تھا۔

○

یوم داغ منایا گیا۔ داغ کے سارے شاگرد ہندوستان کے گوشے گوشے سے پہنچے۔ مصرع طرح بھی داغ کا رکھا گیا۔

کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

لوگ سائل صاحب کو لے جانے پر مصر تھے۔ یہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے ان کا بالکل آخری زمانہ تھا۔

"ارے بھائی مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ انہوں نے معہد عوئین کو ٹالا۔ بیخود کو لے جاؤ بس استاد کا نام تازہ ہو جائے گا۔"

میں خدائی فوجدار بن کر بیچ میں کود پڑا۔

"تو چچا جان بیخود صاحب ہی کیوں۔ ان کے سب سے بڑے شاگرد کو صدر بنوایئے۔"

"وہ مر چکا ہے۔"

"کون صاحب تھے وہ۔ آغا شاعر یا...." ہم سب نے پوچھا۔ میں نے سوچا کوئی اپنے سے دس برس بڑا خواجہ تاش

یہ نسل جس نے ایک عظیم جنگ دیکھی اور قوموں کو آزاد ہوتے اور نئے سرے سے غلام ہوتے دیکھ رہی ہے۔ جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کی ٹکریں کھا رہی ہے۔ جو ملکی اور نسلی اور جغرافیائی قومیتوں کی کش مکش سے دوچار ہے۔ جس کے سامنے مذہبوں کی کلیاں ایک ایک کر کے مرجھا رہی ہیں اور جس کے لئے سچ اور جھوٹ اور اچھائی اور برائی کے جامد اصول "مینگ آف مینگ" کی آنچ میں تپ تپ کر پگھلتے جاتے ہیں اور یہ نسل نہیں جانتی کہ ڈاکٹر عبداللہ یا مولوی عبدالحق یا مولانا صرت۔ محبت کیوں کی جائے اور نہ یہ جانے گی کہ سائل دہلوی کے کردار نے انہیں کتنا سکون اور اطمینان بخش رکھا تھا اور انہوں نے زندگی اور موت سے کیسے پیارے آرام دہ سمجھوتے کر رکھے تھے۔ سائل دہلوی جو عمر بھر کسی سے نفرت نہ کر سکے اور جو میٹھا سوچتے تھے اور میٹھا بولتے تھے اور جن کا عطا کردہ مشک نافہ اب بھی میرے پاس رکھا ہے مگر جس سے میرے ملنے والوں کے خیال میں خوشبو کی بجائے بو آتی ہے۔

☆۔ سائل صاحب کے دادا نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں (شاگرد غالب) والی لوہارو نواب امین الدین خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی ذریت میں کبھی کبھی بیٹیاری کے حوالے سے ہنسی مذاق ہو جاتے تھے۔ "جونیئر برانچ" کہلانے لگے تھے وظائف بھی کم تھے۔ یہ اس طرف اشارہ تھا۔عالی

☆☆۔ داغ لاولد تھے۔ لاڈلی بیگم داغ کی سالی کی بچی تھیں جنہیں داغ نے گود لے لیا تھا۔ تقسیم کے بعد اپنے صاحبزادے قطب الدین فصیح کے ساتھ لاہور آئیں۔ وقت تحریر حیات تھیں۔عالی

ماہنامہ ہم قلم
اگست 1960 کراچی

جمیل الدین عالی

اظہاریوں سے ایک نثری نمونہ

بائی بانو اور کامیابی

دیکھا کہ ایک وسیع و عریض کمرہ ہے۔ نہایت آراستہ۔ چاندنی کا فرش' اس پر یہ بڑا قالین' اوپر جھاڑ فانوس۔ چاروں طرف دبیز اطلس کے پردے۔ مخمل کی مسندیں' ان کے کونوں پر کارچوبی ترنجیں بنی ہوئی۔ کلابتون کی جھالریں لگی ہوئی۔ مشجر کے گاؤ تکیے۔ سامنے چاندی کی چنگیروں میں جوہی کے گجرے (یہ جاڑے کا ذکر ہے) گجروں پر بھاری تورہ پوش جن کی جھالریں قیطون کی تھیں۔ آگے حسن دان مگر نئی نسل حسن دان کیا سمجھے گی۔ چلو تم لوگ چھوٹا پاندان سمجھ لو۔ ہاں تو چھوٹے پاندان مگر ساتھ ہی بھاری۔ گول پاندان بھی۔ ان سے ملے ہوئے گنگا جمنی ناگروان' ان میں سرخ ٹول کی گیلی گیلی صافیاں۔ صافیوں پر لچکے اور چپا کی ٹکائی۔ منقش اگالدان جن کے نیچے مخمل کے کارچوبی زیر انداز۔ کیا سمجھے' اگالدان چاندی پر ایسے ننگے ہی نہیں رکھے ہوئے تھے بلکہ زیر اندازوں پر تھے اب اس "شے" کو شاید کشن کہتے ہیں۔

جب ہم اٹھارہ انیس برس کے تھے تو ایک ذرا سینئر مگر نہایت معقول شاعر کے بہکائے میں آکر ایک بڑے مشہور کوٹھے پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں میں اس وقت تک بعض ڈیرہ دار طوائفیں کہلاتی تھیں۔

قدم بڑھایا تو ایک گاؤ تکیے کا سہارا لئے ایک صاحب نظر آئے بس وہ صدر میں نہ تھے اور کمرہ بھی خالی ہی تھا۔ صدر سے کافی ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے مگر ایک نہایت شاندار چیز لگ رہے تھے۔ موٹے تازے بھاری بھرکم۔ ادھیڑ عمر' گھنی گھنی کھچڑی مونچھیں عجب بہار دے رہی تھیں۔ اشرفی بوٹی کی چکن کا کرتا۔ جامہ وار کی شیروانی' تن زیب کا چوڑی دار پاجامہ جس کی سیونوں پر ہاتھ سے کیکری کی سلائی ہوئی تھی۔ سفید اور سنہری ٹسر کی پگڑی۔ دونوں ہاتھوں میں موتی چور کے چھلے۔ دائیں چھنگلی میں یہ موٹے فیروزے کی انگوٹھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک۔ پلکیں خاصے وقفے سے اور

وقار کے ساتھ جھکتی تھی۔ بھویں گراوٹ کے آثار میں دبی جاتی تھیں مگر صاف معلوم ہوتا تھا بڑھاپے کے حملوں سے تن کر لڑ رہی ہیں۔

ہمارے دوست کو دیکھا تو اٹھا کر کے اٹھے۔ جھک کر کورنش بجائی۔ انہیں اور ہمیں صدر والے گاؤ تکیے کے آگے بٹھایا اور خود مودب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔

ہمارے شاعر دوست نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا لوہارو کے نوابزادے ہیں۔ خوش گو شاعر بھی ہیں۔
(ہم ریاستی یقیناً تھے مگر اس وقت صرف ایک مفلس نوجوان "انقلابی" خیالات رکھنے والے فارغ التحصیل اور پرانی وضع کے غزل گو تھے) یہ بھی کہا کہ خانوادۂ درد ان کی ننھیال ہے۔

تیس پران صاحب نے ایک مختصر مگر جامع تقریر دل پذیر ہمارے بزرگوں کی فن نوازی وغیرہ پر کی۔ حضرت خواجہ میر درد کے اشعار جستہ جستہ سنائے۔ غنا و مزامیر (یعنی میوزک اینڈ میوزیکل انسٹرومنٹس) پر مختلف صوفیا کے تائیدی خیالات کا حوالہ دیا۔ خود ہمارے طور طریق' نشست و برخاست اور صورت شکل کی توصیف بھی فرمائی۔ اے حضرات آج ہمارے حلیئے کا مذاق اڑا لو مگر کبھی دیدہ ور لوگ ہماری بھی ستائش کرتے تھے۔

پھر ان کو خطاب کر کے فرمایا حضور یہ پہلی بار تشریف لائے ہیں اس ڈیرے کی روایت ہے کہ جو کرم فرما پہلی بار سر پرستی فرمائیں انہیں ریشمی پارچوں کا ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے اجازت ہے ؟

ہم کچھ سمجھے' کچھ نہ سمجھے' وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ ہمارے ساتھی (اب بتائے دیتے ہیں شکیل بدایونی تھے) مسکراتے رہے۔ وہاں ہم نے کہا بھائی یہ ہمارے لئے کوئی تحفہ آرہا ہے۔ تم نے ہماری نوابزادگی کی بجادی ہے۔ خدا تم سے سمجھے۔ ہمارے پاس تو کل دس (۱۰) روپے ہیں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے فوراً نکالو۔ شکیل نے چپڑ چپڑ کی مگر ہم نے زبردستی ان کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چھا مشاعروں میں بہت کماتا تھا۔ اس وقت بھی سو سو کے تین نوٹ دبائے بیٹھا تھا۔ اس وقت پچاس کے نہیں ہوتے تھے اور سو اور دو سو اور ہزار اور دو ہزار کے ہوتے تھے) ویسے سو روپے کا مطلب آج ہزار جانو۔

ہم نے شکیل سے سو روپے چھین لئے اور جم کر بیٹھ گئے۔ وہ صاحب ایک نہایت بیش قیمت چینی کا مرتبان اور چاندی کی خالی' بڑی' طشتری لائے۔ طشتری ہمارے سامنے رکھی۔ مرتبان اپنے سامنے۔ مرتبان میں ہاتھ ڈالا تو ریشم کا ایک موٹا سا گچھا نکلا۔ اسے لہرا کر طشتری میں کھول دیا۔ پھر کھڑے ہو کر آداب کیا اور دونوں ہاتھوں سے طشتری ہمیں پیش کر دی۔

دیکھتے ہیں کہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے یعنی اسٹینڈرڈ سائز کے تاش برابر بے شمار رومال ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے یا سلے ہوئے ہیں۔ ایسے لگ رہے ہیں جیسے آج کل کیو بک آرٹ چل رہا ہے۔ فرق یہ تھا کہ ان میں ایک ترتیب و امتزاج رنگ کا اندازہ ہوتا تھا۔ گلابی' فیروزی' کاسنی' بسنتی' زرد' سرخ' سبز' اودا' کاہی' موتیا' عنابی' جامنی' تربوزی' صندلی' فاختئی' سرمئی' سلیٹی' نارنجی' زعفرانی' بنفشی' کتھئی' فالسئی' سیاہ' سفید' دھوانلا' پستئی' شفتالو' پیازی' قرمزی'

کرمچی، اتنے رنگ تو یاد ہیں، شاید اور بھی ہوں، بس ایک گلدستہ رنگ و نقش تھا۔ اس منظر سے زیادہ خوبصورت شاید کسی کی محبوبہ ہی ہوتی ہوگی۔ آہ!

وہ کامیاب بزرگ

وہ صاحب ان صاحبہ کے "چچا" تھے جن کا ذکر ہم جیسے تو صرف اپنی سوانح عمری میں کر سکیں گے۔ مگر ہاں کبھی یہ نہ سمجھئے کہ ہم ان صاحبہ پر عاشق واشق ہوئے تھے۔ عاشق ہم یوں بھی کسی پر نہیں ہوتے تھے (اور اب بھی نہیں ہونا چاہتے) عشق میں سخت توہین انا کا چکر چلتا ہے۔ بس وہ ایک دلچسپ اور خوش گلو صاحبہ نکلیں۔ ہم دلی میں ان سے ایک دو بار ملے۔ سنا ان کے متعلق بہت کچھ، پھر انہیں چند بار کراچی میں دیکھا مگر دور سے۔ یہاں بھی ان کے متعلق سنا بہت کچھ۔ مگر وہ الگ کہانی ہے۔ اسی قصے میں اتنی دیر ہو گئی کہ ہم مطلب پر آنے کے لئے چھلانگ مارنا چاہتے ہیں۔

وہ بارعب صاحب ان صاحبہ کے "چچا" تھے۔ "چچا" کو آپ صرف چچا پڑھیں گے تو ہمارا مطلب ادا نہیں ہوگا۔ آپ اسے "چچّا" بالتشدید پڑھیئے تو شاید کئی مطالب خود کھل جائیں۔ پرانے لوگ البتہ جانتے ہیں کہ "چچا" ایسی فنکار خواتین کے والد، ماموں، محافظ مینجر اور دلال کا ایک مروج لقب ہے۔

ہاں، وہ خاتون ایک مشہور گانے والی تھیں۔ چند برس حیدر آباد دکن کے ایک شہزادے کی منظور نظر رہ چکی تھیں۔ "چچا" مستند، زیرک اور دور بین آدمی تھے۔ کئی گاؤں اور کئی کوٹھیاں ان کی ملک ہو چکی تھیں۔ کوٹھے کے نیچے اس وقت کی ایک بڑی فورڈ بھی کھڑی رہتی تھی۔ رہن سہن ہی اچھا نہ تھا جمع جتھا بھی بہت تھا۔

اس واقعہ کے چند برس بعد کراچی میں "چچا" کو دیکھا۔ ایک اتنی ہی بڑی موٹر میں چند چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچوں کو لئے کلفٹن پر ہوا خوری کرا رہے تھے۔ ہم بھی اپنے دو شیر خوار بچوں کو ہاتھ کی رکشہ میں لاد کر کلفٹن پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے پہچان کر گاڑی روکی۔ اتر کر کچھ دیر ساتھ گھومے۔ ہماری حالت پر آب دیدہ ہوئے۔ (حالانکہ ہم دلی کی نسبت کراچی میں زیادہ خوش تھے) اپنے اچھے حالات بیان فرمائے دو حج کر آئے تھے۔ کلیم کے ذریعے نہیں، بلکہ نقد ادا کر کے اچھی خاصی جائیداد یہاں بھی خرید لی تھی۔ وہ بچے ان کے نواسے یا پوتے یعنی انہی بائی بانو کی اولاد تھے۔ "بائی بانو" ان خاتون کا گھریلو لقب تھا۔ فرمایا فسادات نے بڑا نقصان پہنچایا مگر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ گاؤں اور جائیدادیں وقت پر بک گئیں۔ نقد بمبئی کے ایک بینک میں تھا وہ بھی مل گیا۔ عزت سے گزر ہو جاتی ہے۔

اصل مضمون

اصل مضمون تھا "کامیابی" کیا ہے۔ پچھلے اتوار کو جو ہم نے مضمون نگاری کا اعادہ کیا تو قارئین سے ایک وعدہ کر بیٹھے۔ انشاء جی کے بقول دھمکی دی کہ اب "کامیابی" کے معانی و مفاہیم پر لکھیں گے۔ ہوا یہ تھا کہ مہینوں ہوئے چون لڑکوں لڑکیوں نے ایک مشترکہ خط لکھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم اپنے ذاتی مستقبل کے بارے میں سخت کنفیوزڈ ہیں اور چاہتے ہیں کہ "کامیابی" پر کچھ پڑھیں کچھ سوچیں۔ اندازہ ہے کہ آپ نے کچھ تاریخ پڑھی ہے اور زندگی تو خاصی دیکھی ہے۔ "کامیابی" کے معانی و مفاہیم اور اسے حاصل کرنے کے بارے میں بھی کچھ لکھیئے۔

جب یہ خط ملا تو ہم خود اپنی ناکامیوں کا شمار کر رہے تھے جواب کیا دیتے۔ پھر مضمون نویسی کی بجائے اتوار شعر چھپوانے لگے۔ اب ایک تو مضمون کا احیاء ہوا دوسرے ہم نے اس پورے مسئلے پر جم کر سوچا اور پھر زور میں آکر وعدہ کر لیا کہ اس پر لکھیں گے۔

لیکن اب دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایک خاصا طویل مقالہ چاہتا ہے اور اس کالم کی محدودات اتنی اجازت نہیں دیتیں۔ قسطوں میں لکھنا شاید ممکن ہو' لیکن پڑھنے میں مزا نہیں آئے گا۔ ابھی انشاء جی مل کر گئے ہیں۔ فرمایا حضرت لکھنے کے لئے ایسے ہی موضوع رہ گئے ہیں کیا یہ موضوع آج کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ کیا لوگ اس کے بارے میں جانتے نہیں۔ کیا اس پر پہلے نہیں لکھا گیا۔ میاں ایسے موضوعات پر زبان و بیان میں شگفتگی کیسے آسکتی ہے۔ یہ بزر جمہریاں آپ ہی کے لئے رہ گئی ہیں۔

وہ چلے گئے تو ہم مخمصے میں پڑ گئے۔ مگر لکھنا شروع کر دیا۔ لکھتے لکھتے دیکھا تو کہانی بنتا جاتا تھا۔ مگر اب ہمیں اس موضوع پر بات کرنے کا آسان اسٹائل ضرور مل گیا ہے۔

یہ ایک کھاتے پیتے خوشحال گھرانے کی کہانی تھی۔ ذرا تنگی ہے مگر ہے سچی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سب کھاتے پیتے خوشحال لوگوں کی بنیاد میں "طوائفیت" ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آج جتنے لوگوں کے جلوہائے کامیابی ہمیں نظر آتے ہیں (عہدے' موٹر' مکان اور ان کی آرائش اور نقد اور دولت) ان میں کسی کی کامیابی بھی "طوائفیت" کی مرہون منت نہیں۔

مگر "طوائفیت" کی قسم صرف ایک ہی نہیں۔ آج اس کی مثال ذرا واضح دی گئی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس کی دوسری قسمیں بھی بتائی جائیں گی۔

اگلے مضمون تک ذرا ان چند باتوں پر سوچئے۔ اگلی بار پڑھ کر دیکھئے گا کہ ہماری آپ کی فکر میں کتنی مماثلت اور کتنا اختلاف ہے۔

پہلے تو اس طرح سوچئے کہ کیا "کامیابی" کا تعلق کسی قسم کی اخلاقیات سے بھی ہے۔ یا کامیابی کوئی بالکل ہی الگ واقعہ اور نتیجہ ہے جو ہر حال میں اچھا سمجھا جائے۔

یہ بھی سوچئے کہ کیا آپ بھی مندرجہ ذیل طبقوں کے مشاہیر کو کامیاب انسان سمجھتے ہیں۔

(۱) فاتحین (۲) موروثی حکمران (۳) جاگیردار صاحبان اور ان کی خوش حال اولاد (۴) تمام اعلیٰ عہدے پا جانے والے سیاستدان (۵) مقابلے کے مروجہ امتحانوں یا نامزدگی کے ذریعے افسر بن کر بڑی طاقت حاصل کرنے والے افسران (۶) بڑے بڑے تجار اور صنعت کار (۷) بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے' لمبی موٹریں رکھنے والے اور ماڈرن آراستہ مکانوں میں رہنے والے ایگزیکٹو۔ اور یہ بھی سوچئے کہ کیا آپ کے خیال میں ہماری صدی' ہماری دنیا' ہمارے معاشرے میں سب محنت کرنے والوں کو آگے بڑھنے کے لئے برابر کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو ناکاموں کی ناکامی میں کن عناصر کا کتنا دخل ہے اور کامیابوں کی کامیابی میں ظلم' ناانصافی اور ناہمواری کی روایات کا کتنا حصہ ہے۔ کچھ ہے تو کا ہے

کی ناکامی اور کا ہے کی کامیابی۔ اگر استحصال محض نعرہ نہیں تو کیا ہوتا ہے۔ اس کے اثرات کتنی دور سے کتنی دور تک جارہے ہیں۔

اگر آپ نے جم کر سوچا تو شاید ہمارے اگلے مضمون کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

(کتاب "صدا کر چلے" سے)

(۴ جون ۷۳ء)

روزنامہ "جنگ" کراچی ۴ جون ۱۹۷۳ء

غزل

دل آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے
جب ترا ذکر چھڑا نام کئی یاد آئے

تجھ سے چھٹ کر بھی گزرنی تھی سو گزری لیکن
لمحہ لمحہ سحر و شام کئی یاد آئے

ہائے تو عمر ادیبوں کا یہ انداز بیاں
اپنے مکتوب ترے نام کئی یاد آئے

آج تک مل نہ سکا اپنی تباہی کا سراغ
یوں ترے نامہ و پیغام کئی یاد آئے

کچھ نہ تھا یاد بجز کار محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

اپنی تخصیص پہ خوش ہوں مگر اس وقت مجھے
کشتگانِ ستمِ عام کئی یاد آئے

خود جو لب تشنہ تھے جب تک تو کوئی یاد نہ تھا
پیاس بجھتے ہی تھی جام کئی یاد آئے

کس قدر سادہ و بے باک ہے عالی کہ ہمیں
اس پہ لگتے ہیں جو الزام کئی یاد آئے

(۱۹۵۶ء)

"غزلیں، دوہے، گیت"

عالی جس کا فن سخن میں ایک انداز نرالا تھا
نقد سخن میں ذکر یہ آیا وہ بے پڑھنے والا تھا

چند نئے شعروں کے شعلے کیسی لے میں بھڑکتے تھے
تم آکر سنتے تو سنتے کل ساری رات اجالا تھا

جانے کیوں لوگوں کی نظریں تجھ تک پہنچیں ہم نے تو
برسوں بعد غزل کی رو میں اک مضمون نکالا تھا!

کیا وہ گھٹا ترے گھر سے اٹھی کیا وہ تو نے بھیجی تھی
بوندیں روشن روشن تھیں گو بادل کالا کالا تھا!

اجنبیوں سے دھوکے کھانا پھر بھی سمجھ میں آتا ہے
اس کے لیے کیا کہتے ہو وہ شخص تو دیکھا بھالا تھا

ہم نہ ملے اور جب بھی ملے تو دونوں نے اقرار کیا
ہاں وہ وعدہ ایسا تھا جو پورا ہونے والا تھا

فکر و نظر کے پرچم اک دم کس نے آکر چھین لیے
دل والوں نے کیا کچھ دے کر یہ میدان سنبھالا تھا

تپتی دھوپوں میں بھی آکر ساتھ بہت دے جاتے ہیں
چاند نگر کے انشا صاحب عالی جن کا ہالا تھا

(۱۹۷۹ء)

"لاحاصل"

(ستاون شعر کی فی البدیہہ غزل سے)

گزر گیا ہے جو وقت اس میں جا کے دیکھتے ہیں
طرح قبول غزل آزما کے دیکھتے ہیں

اسی طرح میں سربزم فی البدیہہ کہو
حضور کیوں میرے قیمت بڑھا کے دیکھتے ہیں

دکانِ کم سخنی کی بھی منفعت مت پوچھ
ہم اپنے آپ کو برسوں گنوا کے دیکھتے ہیں

کہاں ہیں روز وہ سر پھوڑنے کی آوازیں
مجھے ترے در و دیوار آ کے دیکھتے ہیں

مجھے وجود دیا پھر اسے حباب کیا
اب آپ کیا اسے گردش میں لا کے دیکھتے ہیں

ہر آدمی پہ ہوئی وحیٔ کائنات ارزاں
سب اپنے طور سے جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

سنو عزیزو یہ ہے سنگ عشق بس چھو آؤ
یہ بوجھ وہ نہیں جس کو اٹھا کے دیکھتے ہیں

میں کونپلوں کی طرح پتھروں سے نکلا ہوں
تو باغباں بڑی حیرت میں آ کے دیکھتے ہیں

ذرہ ذرہ ہے مگر ایک دم چمکتی ہے
وہ جب بھی مری تصویر اٹھا کے دیکھتے ہیں

ابھی نہ کہہ کہ خلا بھی نہیں ہے لا محدود
ذرا طیور تخیل اڑا کے دیکھتے ہیں

دل تباہ و فسردہ تمہیں قبول نہیں
کہو تو عطف و اضافت ہٹا کے دیکھتے ہیں

انھیں یقین نہیں آیا کہ ہم ہیں اہلِ زباں
لغت نکالی ہے معنی حیا کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ تحری خود کو لکھوائے
مجھے ہٹا، مرا دیوان اٹھا کے دیکھتے ہیں

اسی زمیں میں وہ طرزِ خرام کاشت ہوئی
کہ جھوم جھوم کے جھونکے ہوا کے دیکھتے ہیں

پچاس سال جو ہم نے بہم گزارے دیے
تو ملک ملک کے عشاق آ کے دیکھتے ہیں

رکھا ہے گر یہی معیار اگلی نسلوں کا
تو ہم بھی شعر میں واسوخت لا کے دیکھتے ہیں

ہمالیہ سے بھی نیچے بلندیاں ہیں بہت
گرانے والے مجھے کیا گرا کے دیکھتے ہیں

یہ محنتِ سخنِ یک نشست حاضر ہے
اب انتخاب ترا آزما کے دیکھتے ہیں

ابوظبی ترے صدقے کہ ہم کو دی یہ غزل
مگر اسے ابھی گھر میں سنا کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک نہ کھلی اپنی حیثیتِ عالی
اب آنے والے زمانوں میں جا کے دیکھتے ہیں

"اے مرے دشتِ سخن" (۱۹۹۴ء)

دوہے

جیسے سر سوتی کے گن ہیں کام کلا سنگیت
جب بھی کہنا ایسے ہی کہنا غزلیں دوہے گیت

جب بھی جلنا ایسے جلنا باقی بچے نہ راکھ
راکھ بچے تو گر جائے گی من اگنی کی ساکھ

جب بھی لکھنا چاند سے لکھنا سورج سے اشلوک
سورج جس کی روشنیوں میں کوئی روک نہ ٹوک

جب بھی گانا گاتے ہی رہنا کھینچے رہنا تان!
اس اک تان کی آس پہ جس میں کھنچ جائے گی جان

عالی کا کیا ذکر کرو ہو کوی تو وہ کہلائے
جو ناخن سے وہ پربت کاٹے اور پربت کٹ جائے

("لاحاصل" سے)

انتخاب از ڈاکٹر احسان احمد شیخ

پاکستان کتھا

اس کلجگ نے دل والوں سے جو جو بوجھ اٹھوائے
ایک بھی جس پربت پر رکھ دیں وہ پربت پھٹ جائے

عالی اپنے دیس کی لکھیں اور ٹوڈی کہلائیں!
سورما لوگ بدیسی پیسہ کھائیں اور اترائیں!

پیسے کمانے کی ترکیبیں نقد وظیفہ سیر!
اب جو کوئی جس کا کھائے مانگے اسی کی خیر!

کوئی کھل کر جاپان گھمائے مانگے اور کوئی چھپ کر چین
کہیں بدیسی ڈفلی باجے کہیں بدیسی بین

پی ای این کے پوجن ہارے جگ کی سیر کو جائیں
عالی دیسی سبھا جما کر اپنی ہنسی اڑوائیں

جن کے پڑوسی بھی نہیں جانیں ہیں ان کے شبھ نام
لندن، بمبئی، ہالی وڈ میں وہ سب کوبتارام

کوئی چھٹ بھیا پیرس پہنچے اور لیکھک بن جائے
کوئی افسر نیو یارک کے بل پر کتھا کلا سکھلائے

- - - - - - - - - - -

ہائے وہ دوت گھروں کی شامیں وہ انجانے کھوج
شیتل مدرا، جلتی ناریں، میٹھے میٹھے بھوج

برہم گیانی مگن وچاری بدھی جائیں بھول
ایسے ہنس ہنس بولیں جیسے رواں رواں ہو پھول

واپس گھروں کو ٹھنڈے پہنچیں لیکر من میں آگ
اے بھگون بس اب تو جگا دے اپنے سوئے بھاگ

کوئی کٹھ پتلی سبھا رچائے کوئی افسر پر چھائے
جب یہی روز کے دھندے ٹھہرے ایک نہ اک چل جائے

کویتا، کلاشا، چتر کلا، کا سودا روز کا کھیل
اندر من کی آنکھیں نیچی باہر مونچھ پہ تیل

دس ڈالر میں شولو خوف کو نتگا ناچ نچائیں
دس روبل میں ہیمنگوے کے سو سو عیب گنائیں

- - - - - - -

ابھی پاؤں میں ٹوٹی جوتی ابھی کر میں شال!
یہ ہر اک پانی کے باسی نا کالے نا لال

کیا کیا جنتر منتر والے بن گئے گرستھ کار
مایا مہاٹھگنی ہے بھیا اسکے روپ ہزار

کوئی سمبندھک، کوئی بن یوجک، کوئی سبھا پردھان
کوئی مچھل والا، کوئی نل والا، کوئی کپٹ کرپان

سمی سمی کرنے والے زندہ ہی ہی کرتے بھانڈ
نرمل کمل کلا کے پیچھے یوں دوڑیں جیوں سانڈ

رت کے ساتھی، سمے کے سنگی، بے دھرمے بے ذات
جو جس دم ہو ان کا افسر اونچی اسی کی بات

افسر بولے یارو ہم کو بھائے نہیں اقبال
یہ بولیں جی شبد کا دھوکا دھیان کا خالی جال

افسر بولے دینو بھاٹ کی کویتا میں سو ٹھاٹ
یہ بولیں جی کالی داس کا باپ ہے دینو بھاٹ

افسر بولے روشن آرا کیا سمجھیں سرتال
یہ بولیں جی سر اوتار تو ہے جمن قوال

افسر بولے فیض نراجی یہ بولیں غدار
افسر بولے عینی* انگمٹر یہ بولیں مکار

افسر بولے کوئی عالی کو چپ رہنا سکھلاؤ
یہ بولیں جی چپ نہ رہے تو ملک بدر کراؤ

عالی کا کیا دوش ہے بھیا جو ہر کوئی بل کھائے
عالی سب کے من کا کانٹا جب ابھرے چبھ جائے

- - - - - - - - -

اونچے اونچے جن کے سنگھاسن بڑے بڑے گودام
اپنی دکھی کلانگری میں ان کا تھا کیا کام!

نا یہ جیون بھید کے روگی نا انہیں ہر دم سوچ
نا یہ دن کی سختی جانیں نا یہ رات کا لوچ

نا انہیں دیپک راگ جلائے نا یہ میگھ پہ روئیں
نا یہ کھو کر پانا جانیں نہ یہ پا کر کھوئیں

نا ان سے کوئی بھول ہو نا یہ مفت کے رنج اٹھائیں
نا یہ بیری شما کریں اور نا یہ حشر گنوائیں

ان کے لیئے تو ان کا پورا جیون ہے بیوپار
ان کے لیئے تو ان کے سوا ہے خالی سب سنسار

لندن پریم لگن میں کس کو چک جھرے کی سوجھ
او رکبھی یہ دیس پہیلی تو اسے خود ہی بوجھ

ان کا دھندا پلّو بندھن یہ سب کے دلّال
یہ کیا جانیں یہ کیا سمجھیں اپنے دیس کا حال

وہاں کہاں جیوتش کے دھندے جن سے پھانسیں نار
وہاں تو ہے ہر ہاتھ کی ریکھا جیتے خون کی دھار

سوکھے جسم اور بھوکی روحیں مانگیں جن کی لاکھ
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی بنتے جائیں راکھ

کتنی ہیریں کتنے رانجھے اک دوجے سے دور
یہ کیوں سمجھیں یہ کیوں جانیں کون ہے کیوں مجبور

دور ہی دور سے آس کی کرنیں چمک دمک دکھلائیں
جن کے گھروں میں گھور اندھیرے ان کے پاس نہ آئیں

آج بھی اپنے کرتا دھرتا سنیں انھی کی بات
کل تک جن کا دھرم تھا سونا روپا جن کی ذات

آج بھی کتنی کومل کلیاں کانٹوں کی خوراک
آج بھی کوئی نہیں پہچانے کیا کندن کیا خاک

بس اکلیں ہیں جن کی زبانیں سڑ گئے جن کے نام
آج بھی جب بن برکھا برسے آئے انہیں کے کام

آج بھی ہاری کھیت کو ترسے کاریگر بے کار
آج بھی بچے ان پڑھ گھر میں اور مائیں بیزار

آج بھی روئے کومل بانی کوے ماریں تان
آج بھی ویر کھلے بیٹھے اور بھانڈ چلائیں بان

آج بھی پربھا کالک چیپے اوشا نیر بہائے
آج بھی چھایا کتھک ناچے مایا گیان سکھائے

سورنگوں کے سو بادل لیں چار طرف سے گھیر
سورج تڑپ رہ جائے دور نہ ہو اندھیر

عالی تو جو چاہے کہے ظاہر ہے ترا انجام
سوراون ترے بیری اور تو ناچن نا رام

مطبوعہ ہفتہ وار "لیل و نہار" لاہور
جولائی ۱۹۵۹ء
مجموعہ "لاحاصل"

☆ چک جھمرہ۔ گاؤں کا نام جہاں ترقی پسند شاعر احمد ریاض کی بیوہ اور صغر سن بچی رہتی تھیں۔ کلڈ نے انکے لئے ایک ماہانہ وظیفہ مقرر کرایا تھا۔ ناشرین

میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

سرفروشی ہے ایماں تمہارا
جراتوں کے پرستار ہو تم
جو حفاظت کرے سرحدوں کی
وہ فلک بوس دیوار ہو تم

اے شجاعت کے زندہ نشانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

بیویوں، ماؤں، بہنوں کی نظریں
تم کو دیکھیں تو یوں جگمگائیں
جیسے خاموشیوں کی زباں سے
دے رہی ہوں وہ تم کو دعائیں

قوم کے اے جری پاسبانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

تم پہ جو کچھ لکھا شاعروں نے
اس میں شامل ہے آواز میری
اڑ کے پہنچو گے تم جس افق پر
ساتھ جائے گی پرواز میری

چاند تاروں کے اے پاسبانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

"جیوے جیوے پاکستان" (۱۹۶۵ء)

جیوے جیوے پاکستان

پاکستان پاکستان جیوے پاکستان

مہکی مہکی روشن روشن پیاری پیاری نیاری
رنگ برنگے پھولوں سے اک سجی ہوئی پھلواری
پاکستان

جیوے جیوے جیوے پاکستان

من پنچھی جب پنکھ ہلائے کیا کیا سر بکھرائے
سننے والے سنیں تو ان میں ایک ہی دھن تھرائے
پاکستان

جیوے جیوے جیوے پاکستان

بکھرے ہوؤں کو بچھڑے ہوؤں کو اک مرکز پر لایا
کتنے ستاروں کے جھرمٹ میں سورج بن کر آیا
پاکستان

جیوے جیوے جیوے پاکستان

سب محنت کش گلے ملے اور ابھرا اک پیغام
اس پیغام کو سمجھو یہ ہے قدرت کا انعام
پاکستان

جیوے جیوے جیوے پاکستان

جھیل گئے دکھ جھیلنے والے اب ہے کام ہمارا
ایک رکھیں گے ایک رہے گا ایک ہے نام ہمارا
پاکستان

جیوے جیوے جیوے پاکستان

(۱۹۷۱ء)

قومی ترانہ
قمۃ الاسلامیہ

(یہ ترانہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی اس کانفرنس کے لئے منتخب ہوا تھا جو لاہور میں فروری ۱۹۷۴ء میں منعقد ہوئی۔ اسکے ترجمے پانچ زبانوں میں ہوئے اور گراموفون ریکارڈوں میں لاکر اسلامی ممالک میں تقسیم ہوئے۔ اب بھی جب کہیں سربراہی کانفرنس یا اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس منعقد ہوتی ہے لاہور قرارداد کے مطابق یہ الیکٹرانک میڈیا پر ہر اسلامی ملک میں نشر کیا جاتا ہے۔

ہم تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں
ہم مصطفوی مصطفوی مصطفوی ہیں
ہم مصطفوی ہیں
دین ہمارا دین مکمل
استعمار ہے باطل ارزل
خیر ہے جدوجہد مسلسل
عنداللہ
عنداللہ
اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر

سبحان اللہ یہ وحدت فرقانی

روح اخوت مظہر قوت مرحمت رحمانی

سب کی زباں پر سب کے دلوں میں اک نغمہ قرآنی

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہم تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں

ہم مصطفوی ہم مصطفوی مصطفوی ہیں
ہم مصطفوی ہیں
دین ہمارا دین مکمل
استعمار ہے باطل ارزل
خیر ہے جدوجہد مسلسل
عنداللہ
عنداللہ
اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر

امن کی دعوت کل عالم میں مسلک عام ہمارا

داد شجاعت دور ستم میں یہ بھی کام ہمارا

حق آئے باطل مٹ جائے یہ پیغام ہمارا

اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر
ہم تابہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں
ہم مصطفوی ہم مصطفوی مصطفوی ہیں
ہم مصطفوی ہیں
دین ہمارا دین مکمل
خیر ہے جدوجہد مسلسل
عنداللہ
عنداللہ
اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر

۱۹۷۳ء
"جیوے جیوے پاکستان"

گیت

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

کتنے اچھے کتنے پیارے
کیسے کیسے دوست ہمارے
کیا کیا باتیں کر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

کتنے گہرے تال پرائے
جن سے ہوں منسوب افسانے
بس اک بوند سے بھر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

کیا کیا بانکے مرد جیالے
کن کن آدرشوں کے پالے
کس کس چیز سے ڈر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

سخت اور تیز کلہاڑوں جیسے
دیکھے لوگ پہاڑوں جیسے
کتنی جلد بکھر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

آدم سے عالی تک آئے
سب کے سب اک جیسے پائے
پیدا ہوکر مر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

(۱۹۳۸ء)

ایمن

یہ ساز نہیں
آواز نہیں

یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر روپ نرالا ہے
ساز نہیں......

خود تماشہ ہے خود ہی تھم ہے
جھن جھنن جھنن، جھن جھنن جھنن
تنہا تنہا، پھیلا پھیلا
دھندلا دھندلا، روشن روشن
خود چندا ہے، خود ہالا ہے
یہ ساز نہیں
آواز نہیں
یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر روپ نرالا ہے
یہ ساز نہیں ...

دھادھن دھن دھا، دھادھن دھن دھا
کوئی بندش کوئی تال کہے
سب گائک درپن میں الجھے
کوئی اندر کا بھی حال کہے
کیوں پردے میں من مالا ہے
یہ ساز نہیں
آواز نہیں
یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر روپ نرالا ہے
یہ ساز نہیں...

سب تان پلٹ، سب گت سنگت
کیوں پیار کی دھن پہ چلتے ہیں
کیوں خالی جی کے گیتوں میں
سر اگنی بن کر جلتے ہیں
کیا کوئی بجھنے والا ہے
یہ ساز نہیں

اپریل ۱۹۷۳ء

بھیرویں

وہ سدا سہاگن راگنی
وہ آٹھ پہر کی بھور
جب گائے کوئی گانے والا
جگ ناچے بن کر مور
وہ سدا سہاگن راگنی

کھرج ریکھب گندھار اور مدھم
پنچم دھیوت اور نکھاد
چار سروں سے سرگم ابھرے
تین سے ابھرے واد
وہ سدا سہاگن راگنی

لمبے لمبے بالوں میں پھندے
کلیوں سے بھرپور
کندھوں پہ ہے سانپ لپیٹے
آنکھیں نشہ سے چور
وہ سدا سہاگن راگنی

مدھم مدھم اور کومل تیور
اس نغمے کی ساکھ
خسرو پہ جو جلیں پتنگے
عالی ان کی راکھ
وہ سدا سہاگن راگنی

(۱۹۷۵ء)

اے خدا

میں نے دیوارِ کعبہ سے اک دم چمٹ کر کہا
اے خدا
اے خدا
اے خدا
اور پھر کچھ نہیں کہہ سکا

(اپریل ۱۹۷۳ء)

ارتقا

اگر ارتقا اب بھی تخلیق و تفتیش و تحقیق کا سلسلہ ہے
تو پھر ارتقا خود ہی کہنے لگا ہے
کہ اس کا بھی مخزن خدا ہے
خدا ارتقا ہے اور اس سے سوا ہے
اور اس سے سوا کیا ہے

وہ

وہ خدا ہے

"لاحاصل" ۱۹۸۳

تہجی

خداوندا

مرے عجزِ بیاں کی معذرت

جس آگ کی بھٹی میں برسوں بعد پھر جلنے لگا ہوں وہ بجھانے میں

وہ سارے بحر و دریا نقش ہائے رنگ رنگ اک تنگنائے بن گئے ہیں

ان میں رہ کر اپنے افکار و بیاں کا حاصلِ بے حوصلہ ہی آزمانے میں

مری مشقِ سخن ننگِ سخن نکلی

کئی علم خانوں میں دانش کے مینا سے بھی صورتِ جان من جاناں من نکلی

کبھی کی سمت تو جانے کی ہمت ہی نہ تھی جس صنف کو جتنا بھی اپنایا

مثالِ دلبریِ یاں حسن نکلی

فلک سے کچھ اشارے استعارے مانگنے اٹھا تو اس کی رہ بھی کوئے خو شتن نکلی

مرے عجزِ بیاں کی معذرت

گنجِ گہرہائے بزرگاں محترم ہیں

وہ سب مخصوص لہجے بھی جو میرے دور پر چھائے ہوئے مادال' پناہ پیروان تازہ دم اور خوب اونچے اونچے پرچم ہیں

دلبستانِ مراتب' صد مناقب' سجدۂ تعظیم کے ارکانِ واجب' اپنا اپنا ایک عالم ہیں

میں ان کی خوشہ چینی سے نہیں تقلید میں امکانِ گستاخی سے ڈرتا ہوں

جو ان سے فیض اٹھا کر اونچے جائیں وہ بڑے ہی خوش قلم' مقبولِ عالم' اور عجب تقدیر والے ہیں

مگر وہ صاحبانِ طرزِ خود بھی تو بڑی توقیر والے ہیں

کہاں ان کے خزانے اور کہاں میرے یہ بے رس، بے تراوش، تشنگانِ جمل اور محرومِ ایمائیت اظہار کے
جمال و فن سے بیگانے
مودب ان نقوشِ پا سے اک لمسِ جبیں کو بھی غنیمت جان کر تو اگزرتا ہوں
اور اپنی آرزو اس کمزوری اور بے روایت یعنی اپنی ہی زباں میں عرض کرتا ہوں

خداوندا
مجھے تو کم سے کم اتنی ہی صدیاں اور دے
دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں، کچھ کام کر جاؤں
اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائق انعام کر جاؤں
نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اب یا عہد آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہِ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

ابھی تک میں نہیں سمجھا
جو میرا حق بھی تھا اور فرض بھی اور آنے والوں جانے والوں کی طرف سے قرض بھی ہوگا
کہ اتنی کہکشاؤں، ماورائوں، کے عناصر
باطن و ظاہر
اور ان کے بھی علاوہ جو بھی ہیں وہ کیسے بنتے، کیسے رہتے کس طرح چکر لگاتے ہیں
مری تقویم میں کیوں ساعتوں سے لے کے صدیوں تک کے پیمانے ہی آتے ہیں
مری تفہیم وہ شیشے ہی کیوں ٹھہرے جو فوراً ہی بکھر کر ٹوٹ جاتے ہیں
سنانے والے بے نام و نشاں، تاریک، بے دیوار و در، غاروں کے قصے بھی سناتے ہیں
وہ کہتے ہیں یہ مردہ ثابت و سیار ہیں ایسے کشش آثار
جن کے سامنے سے روشنی گذرے تو وہ اس کو بھی اندر کھینچ لاتے ہیں
غضب یہ ہے کہ سب سے میرا رشتہ بھی بتاتے ہیں
وہ کیا رشتہ ہے یہ پوچھو تو لگتا ہے طنزاً بے بسی سے مسکراتے ہیں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

رہی وہ عشق کی تقویم
شاید کوئی کیفیت جو ہو نا قابلِ تقسیم
اشارہ کر گئے ہیں گر کھلی اور جب کھلی جانے وہ کیا ہوگی
کبھی آجائے گی ادراک میں بھی یا سدا ہی ماسوا ہوگی
رہا وہ جوہرِ تفہیم
وہ ہے مزدِ جگر کاوی کوئی ابہام، تا امروز بے تسلیم
کبھی کوئی جلوۂ معنی بھی دکھلائے گا یا تا عمر اسی آشوب گاہِ جستجو ہی کی فضا ہوگی
سنگولے رہیں، یکتائی، سنگولے رہیں
وہ نقطہ ایک بے اندازہ کمیت کا جس کا اسم ثانی
جسم جانی
کردیا ثابت توانائی
سمجھ میں آکے بھی اب تک نہیں آئی
وہ کیا شے تھی
وہ کیا ہے کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے
کیا کبھی واپس بھی آئے گی جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہوگی
اور اس سارے زمان بے زماں میں اور مکان بے مکاں میں کس جگہ میری یہ جان مبتلا ہوگی
کہ میں ایک جاں بھی ہوں اور چونکہ جاں ہوں مبتلا بھی ہوں
مگر اس بے یقینی یا یقیں میں اس وجود و زندگی پر بے خطا بھی ہوں
مجھے میثاقِ آدم کی قسم اس سے خفا بھی ہوں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

خیال آیا
جو چھایا
یہاں تک آکے بھی انعام کا امکان شامل ہے
تو پھر آئندہ بھی تجھ کو ہوس کارِ تمنا ہی کہا جائے گا تجھ سے کام مشکل ہے
سمجھی؟

تجلی' کہکشائیں' ماورائیں' دائرے' غار' ان کے اسرار' کشش' تقویم عشاقی؟
گزر کر خار و گل کچھ الفتوں سے' عشرتوں سے' چشم و ابرو لذتوں سے رہ گیا جب بے مئے و ساقی
ترا دیوانہ گرد ہن اب تڑپتا ہے برائے منصبِ تفہیم خلاقی
ارے بے ذوق تجھ منتہائے شوق تجھ سے ہو نہ پائے گی
یہ دیوار ازل پر موٹے موٹے لفظ کندہ دیکھ کیا لکھا ہے
یہ لکھا ہے کہ تجھ جیسوں کے حصے میں کبھی جمعیتِ خاطر نہ آئے گی
پڑا رہ بس اسیرِ فانی و باقی

خداوندا
خداوندا

خیال آیا اور اب کی بار جھلایا
اڑانوں کے بیانوں سے نئی مہلت کی اتھلی آرزو پر کچھ تو شرماؤ
کلفِ آزادگاں کی داستانِ خوں چکاں وہ جہدِ اسمائے عظیمِ رفتگاں
ایسا تمہارا مرجع بنا جس میں وہ تم نہ دہراؤ
ابھی اتنا ہی بتلاؤ
تجلی میں بھی تھی تجرید ہی کے زیر و بم میں صوتِ بالا کی صدا بندی
تمہیں آئی نہ اب تک حرفِ اول کی توانمندی
تمہارے سارے موضوعات میں حاوی رہی ہے اس کرے پر زندگی جو آنی جانی ہے
ہزاروں صدیاں چلتی جائیں پھر بھی مختصر اور نامکمل اک کہانی ہے
مگر تم کو بہ جبرِ تحریر پیدائش یہی دھن ہے کہ تم ثابت کرو تم میں کوئی شے جاودانی ہے

تمہیں کافی تھا بس اس کے دفینوں اور خزینوں کا ہی دم بھرنا
حرب' شہوات' تحریکات' منطق' امن' حسن و عشق' اوہام' انکشاف' ایجاد
وہ سب مجبوریاں' بے ساکھیاں' سب اصطلاحیں' شاد اور ناشاد
کبھی آباد کبھی برباد
انھی میں کاوشِ و وہم بقا کی عزت و شہرت کے ٹکڑوں پر بسر کرنا

اب اپنے مرتبے سے بڑھ رہے ہو

زمیں سے آسمان پر چڑھ رہے ہو

خیر

لیکن ہضم کی قوت سے بڑھ کر تو نہیں کھاؤ

اس اپنی تفتہ جانی سرگرانی کو خود اپنے مغز کے کچھ سالموں کی تہ میں لے آؤ

اگر خود لذتی بے شہرتی کا غم دبا لے گو یہ مشکل ہے مگر کوشش تو فرماؤ

جو لمحے رہ گئے ہیں وہ انھی کی کائناتِ اندروں میں گھومتے پھرتے سکوں کی یا جنوں کی نذر کر جاؤ

نہ جانے کیا ملے جو بے نیاز این و آں کر دے

نہ جانے کیا نہاں اور کیا عیاں کر دے

سلگ لے رہی وہ اک چیستاں

سرِ رواں

جس میں بقول ماہرینِ دو جہاں تم کو بھی ضم ہونا ہے شاید جنبشِ یک نیوٹرون تم کو اس کا راز داں کر دے

اگر وہ ہے

کوئی بھی شئے، چلو لاشے

تو شاید تم سے بھی اپنی کوئی منزل کرا دے طے

ارے سادہ بیانی خوش معانی تیری جے جے جے

خیال الٹا

مگر پلٹا اور اب کی بار چلایا نہ جھلایا بڑی ہی تمکنت کے ساتھ فرمایا

تمہارا ہی اجارہ تو نہیں اس جستجو پر گفتگو پر

کسی سرچشمۂ یکتائی سے پیدا کسی بے تاب جوئے آرزو پر

بہت سے تشنگانِ بے زباں و خوش بیاں آئے ہیں آئیں گے

اگر تم پی گئے سب کچھ تو اپنی پیاس وہ کیسے بجھائیں گے

مگر اے صاحبِ عالم تمہاری فہم نا محرم کو ایسے دم دلاسوں کے پس پردے کوئی جھلکی کیا دکھائیں گے

تمہیں تو فکر صرف اپنی بقائے زندگی کی ہے

تمہیں تو ماندگی میں کاوش اپنی تازگی کی ہے

اگر تم واقعی جل ہی رہے ہو تو پھر ان شعلوں کو بھی دیکھو
جو نسلوں بعد نسلوں میں جگر گاہِ تجسس کو جلاتے ہیں
نہ جانے کیسے کیسے قاعدے اور کلیئے صدیوں فروزاں
حکمرانانِ جہاں
کس بے بستی سے اور خوشی سے لو معارف انکشاف و تجربہ کے ایک ہی جھٹکے سے گر کر لمحہ بھر میں ٹوٹ جاتے ہیں
اور اب اس دور کی اس تیزیِ یلغار پر بھی کس قدر آزاد و خود مختار و علوت کار افکار و مسائل ہیں
کوئی اب بھی نہیں کہتا کہ دنیا بھر کی اس بزمِ حکیماں مثلِ افواجِ سلیماں پاس ان پر فتحِ کامل کے وسائل ہیں
پرانی گتھیوں میں نئے نشانے اس زمانے کے وہ قانونوں سے مستثنیٰ ضوابط بے روابط کے مراحل ہیں
جو گاہے نظم سے آزاد گاہے اس میں شامل ہیں
مثلاً" انتشار
اور اس کے سب آثار
کیا امواجِ بے اسباب ہیں
بحرِ خلا کے رکن بے آداب ہیں
یا اپنی وضع و طرز کے کچھ عاشقانِ قربِ ساحل ہیں
یہ سب کیا ہیں کسی جانب رواں ہیں یا فقط آزادگانِ بے منازل ہیں
سنگولے ریٹی' یکتائی
وہ روحِ مادۂ جسمِ توانائی
وہی کیوں
اور بھی کوئی حقیقت جو ہے رمزِ غیب و پیدائی
کس کو کچھ نہیں معلوم کیا اسرار ہیں اس کے
بس اپنی تربیت جذباتیتؔ افکاریت کی رو میں ہی اقرار اور انکار ہیں اس کے
یہ اندازِ نظر رہتا ہے تازہ
جو بھی ہے کوئی داستاں اک تشنگی یا سرخوشی کی ہے
تم اتنا جان لو یہ جب سے ہے گر ہے تو صرف اپنے لئے ہے یا سبھی کی ہے
نہ پہلے تھی کسی کی اور نہ آئندہ کسی کی ہے

ارے تم تو یہ سمجھو تمہاری جان' جانِ جلا یا خوش فضا جیسی بھی ہے اول سے آخر تک اسی کی ہے
جو اکثر کہتے آئے ہیں اسے اپناؤ دل بہلاؤ وقت آنے پہ مرجاؤ
نہ اپنی آتشِ فکر و تشکک یا تجسس کے ان ایسے بے محابا' خام
یقیں والوں کی بزمِ مطمئنہ میں ہمیشہ سے بہت بدنام
سرگشتہ شراروں کو گلستانِ سخن میں چھوڑ کر
وہ حسن و فن کی پیاری کیاریاں جو اتنی محنت اور محبت سے بنی ہیں توڑ کر
ان کے فسونِ صد سکوں کے پھول جلواؤ
نہ اپنے چھوٹی موٹی جیسے کو پگھلاؤ
نہ اپنے ذہن میں جو تھک رہا ہے دربدر کی ٹھوکریں کھاؤ

تمہیں چھ سات سو صدیاں بھی مل جائیں تو کیا ہو گا
یہی کچھ ماجرا ہو گا
یہی ہے نا کہ جواب ہے ذرا اس سے سوا ہو گا
مگر گزری ہوئی سب منزلیں خود ہی بتاتی ہیں
اگر مڑ جاؤ اور پھر آؤ تو اک اک راہ کے ہر ذرے پر لکھا دکھاتی ہیں
کہ جتنے مرحلے طے کرتے جاؤ سامنے اک مرحلہ ہو گا

جنہیں تم مانتے ہو خود وہ کہتے ہیں ابھی یہ پانچ چھ یا چند ارب سال اور گرمی کی گرانی ہے
اسے رہنے دو اگلوں کے لئے ان کو بھی آخر بانگی اپنی دکھانی ہے
مگر تم اور وہ سب معتبر در زعمِ خود اہلِ نظر اس بات سے کب تک رہیں گے بے خبر
اب ہم کہاں تک تم کو لے جائیں
کہاں تک ان کو سمجھائیں
سکڑ لے رہی یکتائی
وہ روح مادہ' جسم توانائی
جنہیں تم مانتے ہو خود وہ کہتے ہیں ابھی پھر نقطہ بننی ہے
سب اپنی قوتوں کو مرتکز اور جذب کر کے
سلب کر لے گی تمہاری کہکشاؤں' ماوراؤں اور سارے کج اداؤں کو

زمانوں کو مکانوں کو خلاؤں کو
یہ جس نے ابتدائے نیر کی تھی اک دھماکے سے
دھماکے ہی سے یہ واپس بھی جاتی ہے
کوئی بھی سورۂ معنیِ الٹ لو
آخرِ مفہوم سے محروم ہی رہنا ہے تم سب کو
قیامت بھی تو آنی ہے

وہ اس کے بعد شاید پھر متحرک ہو اور کیا جانے کیا بن جائے
وہ خود ہی یا کوئی جو اس سے برتر ہو نئے کھیلوں کے کس کس قاعدے قانون استثنا سے جی بہلائے
یہ فرسودہ یہ تازہ جنتِ افکار
ظہور و بے ظہوری کا وجوب و اختیار
اس وقت کیا ہو اور کیا کہلائے
یہ وہ جانے جو اس کو پائے

خداوندا
خیال اک زائرِ خوش گفتگو کو بے تسلّی اک حریفِ آرزو نکلا
میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا
مجھے تو میرے ہی آئینوں میں عکسِ نمود نکلا
مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آجائیں
انھی سے ایک زباں 'تعبیرِ ہر کون و مکاں' اپنی بنانی ہے
مجھے سب ہوشمندانِ زرافشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی
مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں مقید ہے
دوانی ہے
مگر اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاشِ بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

(۴۱ے مرے وحشت کَہن)

اسی سلسلے کی اگلی اشاعت میں لکھنے والوں کے اسمائے گرامی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری	
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	عالی کے من کی آگ
پروفیسر جگن ناتھ آزاد	جمیل الدین عالی
پروفیسر شبیر علی کاظمی	عالی کا نظریہ نگارش
سلیم احمد	اس آئینہ خانے میں
سلیم احمد	پرستش برق کی افسوس حاصل کا
مولانا سلیم جعفر مرحوم	غزلیں دوہے گیت (تبصرہ)
ڈاکٹر عرش صدیقی	پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء (اقتباسات)
ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی (علیگڑھ)	عالی کے دوہے (عروضی اعتبار سے)
ایچ۔ایم۔عسکری	منزل مابعد منزل
ڈاکٹر فہیم اعظمی	اے مرے دشت سخن
جمال پانی پتی	کویتا کا بن باس
جمال پانی پتی	دیکھ کبیرا رویا
پروفیسر نظیر صدیقی	منزل سے پرے منزل
حمید کاشمیری	جمیل الدین عالی
امراؤ طارق	پانچواں شہزادہ' چوتھی سمت
"خلیج ٹائمز" دبئی۔ ۲۴ جون ۱۹۹۷	نئے آہنگ کی تلاش (تبصرہ)
ڈاکٹر عبدالقوی ضیا (کینیڈا)	جمیل الدین عالی
"ڈان" کراچی۔بتاریخ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۷	عالی کے "حرفے چند" (تبصرہ)

جسے اعلیٰ ترین کوالٹی کی بنیاد پر "یورپین کوالٹی ایوارڈ" دیا گیا۔
واضح رہے کہ یہ بین الاقوامی اعزاز اب تک پاکستان میں صرف
ڈنٹونک کو ملا ہے۔ اس سے آپ خود ڈنٹونک کی خوبیوں اور اسکی
عالمگیر شہرت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

EUROPEAN
AWARD

ALA CHEMICALS

اعلےٰ کیمیکلز پوسٹ بکس 2110 کراچی 74600
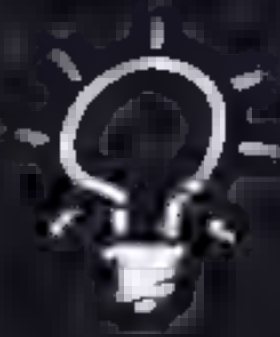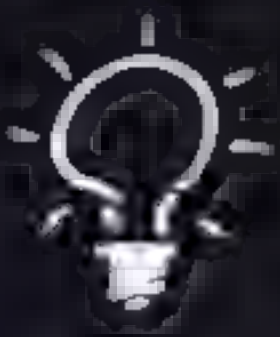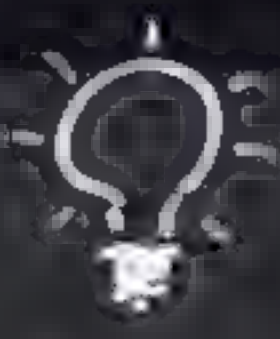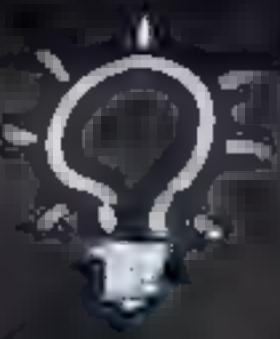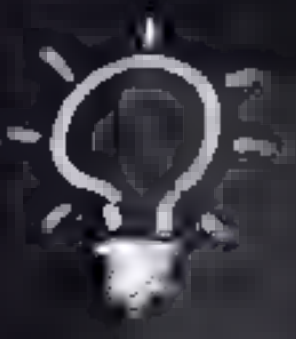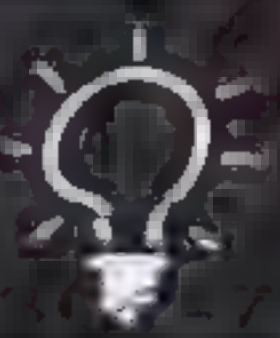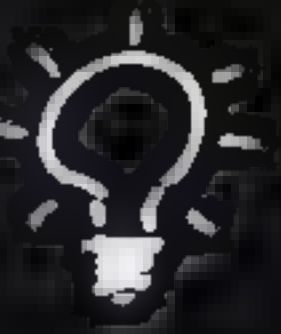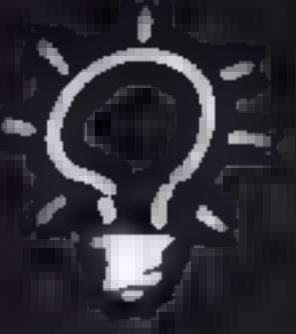
ORIENT/McCANN

Where Beauty
Meets Strength...
Jubilee
Karach
New
Cotton King
SPINNING
& WEAVING MILLS
KARACH

PEPSI
PEPSI
پنجاب بیوریج کمپنی لمیٹڈ فیصل آباد